روشن اندھیرے

امجد جاوید

امجد جاوید کا صنم خانہ

رُوشن اندھیرے۔! معاشرے میں موجود اُن اندھیروں کی داستان ہے جو ہمارے سامنے روشن تو ہیں، لیکن ہم انہیں دیکھ نہیں پاتے۔ یا پھر دیکھتے ہوئے انہیں نظرانداز کر دیتے ہیں اور جیسے یہ ہمارے لیے کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ اندھیرے ہمارے معاشرتی نظام میں بھی ہیں، معاشرے کے افراد میں بھی اور ان متصادم قوتوں کے درمیان بھی جو کسی نہ کسی حوالے سے بھی اپنا تسلط برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ اسی کشمکش میں سے پیدا ہونے والے حالات و واقعات ہی اس داستان میں پیش کیے گئے ہیں۔ جوان کرداروں کا رویہ اور ان کا اظہار ہے۔ جس سے معاشرہ اور افراد کے تعلق کو بہت حد تک سمجھا جاسکتا ہے۔ یوں معاشرتی نظام، کردار اور متصادم قوتوں جیسی ٹھوس حقیقتوں کے تناظر میں لکھی گئی کہانی اپنے تاثر میں ایک سنگ میل کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

جناب امجد جاوید کی زیرِنظر کہانی ''روشن اندھیرے'' اپنے ٹیمپو میں تیز اس لیے ہے کہ ان کے نزدیک اس کہانی میں حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ مقصدیت پر زیادہ دھیان دیا گیا ہے۔ امجد جاوید ایک عام سے کردار کے گرد اپنی کہانی کی بُنت ایسے کرتے ہیں کہ نہ صرف وہ کردار اہمیت اختیار کر جاتا ہے بلکہ ہمارے اردگرد ہونے والے واقعات ہی سے وہ کہانی جنم لے کر اپنے منطقی انجام تک جا پہنچتی ہے۔ اس طرح وہ اپنا پیغام بھی دے جاتے ہیں اور تمام تر خوبیوں کے ساتھ کہانی بھی بیان کر جاتے ہیں۔ روشن اندھیرے میں یہ خوبی پوری طرح موجود ہے۔

''رُوشن اندھیرے'' کو اگر جناب امجد جاوید کا صنم خانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کہانی کے حالات و واقعات کے تسلسل میں کچھ کردار تو مستقل ہیں اور کچھ کردار کہانی میں جلوہ گر ہو کر پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ ہر کردار اپنے ساتھ ایک پوری کہانی رکھتا ہے۔ کہانی ختم

کرتے ہی قاری کے ذہن میں امجد جاوید کا صنم خانہ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ یہ کردار اپنی پوری جولانیوں کے ساتھ ذہن پر اپنی شبیہ چھوڑ جاتے ہیں اور قاری ان کرداروں کو سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ کردار نہ صرف ہمارے اردگرد ہیں بلکہ یوں محسوس بھی ہوتا ہے کہ جیسے ہم روزانہ ہی ان سے ملتے ہیں، انہیں محسوس کرتے ہیں اور انہیں دیکھتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ یہ ماننا پڑتا ہے کہ کردار نگاری میں مصنف کو ایک خاص طرح کی مہارت حاصل ہے، جیسے لفظوں میں کفایت کے ساتھ بھرپور کردار کی تشکیل، بہر حال ستائش طلب صلاحیت ہے۔اس کہانی کے مطالعے سے مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ جیسے جناب امجد جاوید کا صنم خانہ اندھیرے میں پڑا ہوا ہے۔ جہاں بے شمار کردار اس انتظار میں پڑے ہوئے ہیں کہ انہیں ظاہر کیا جائے۔ وہ جس کردار کو دکھانا چاہتے ہیں، اس پر اپنی نگاہ کی روشنی ڈال دیتے ہیں اور وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔اسی طرح جب نئے کردار پر روشنی پڑتی ہے تو پہلا کردار اندھیرے میں ہونے کے باوجود اپنا احساس ضرور رکھتا ہے۔

''رُوشن اندھیرے''۔! عام سے کرداروں اور عام سے حالات واقعات کے ساتھ ایک خاص کہانی کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ پیغام جو جناب امجد جاوید اپنے قارئین تک پہنچانا چاہتے ہیں اس کا پوری طرح ابلاغ ہو جاتا ہے۔اس داستان میں بہت سے ایسے مقامات بھی ہیں جہاں پر آکر وہ چاہتے تو ''لذّت'' کے لیے صفحات کے صفحات بھر دیتے مگر ان کا یہ مزاج نہیں ہے اور نہ ہی وہ لذّت کے لیے کہانی لکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا میری تمام تر معروضات آپ پر اس وقت عیاں ہوں گی جب آپ یہ داستان پڑھ لیں گے۔سو میں انہی لفظوں کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

گل فراز احمد

وہ اُلجھے ہوئے موسم کی تڑختی ہوئی دوپہر تھی، جب میں اپنے دفتر کے استقبالیہ پر پہنچا اور وہیں مجھے استقبالیہ کلرک نے یہ اطلاع دی کہ سلیم فارانی ایڈیٹر بن گیا ہے۔ اگرچہ اخباری دنیا میں کہیں بھی، کچھ بھی ہوسکتا ہے، تاہم آنے والے وقت کے لیے تھوڑے بہت اندازے ضرور ہوتے ہیں۔ اس لیے جب اندازے غلط ہوجائیں تو حیرت ضرور ہوتی ہے۔ یہ خبر جہاں میرے لیے حیرانگی کا باعث بنی، وہاں محتاط ہوجانے کا الارم بھی میرے ذہن میں بج گیا۔ انہی لمحات میں اک بے نام سی الجھن نے مجھے گھیر لیا جیسے دریا میں اچانک کسی طرف سے کوئی سٹیمر آجائے اور اپنے ساتھ لہروں کا شور مچاتا ہوا دور نکل جائے یا پھر بہت سارے پرندوں کے اچانک اڑنے سے پیدا ہوجانے والی پھڑ پھڑاہٹ کی دیر تک رہنے والی گونج ہو۔

میں اُلجھا ہوا استقبالیہ سے رپورٹنگ سیکشن تک آیا۔ وہاں کا ماحول قدرے کھردرا ہو چکا تھا، میرے آنے سے پہلے ہی وہاں یہ بحث ہو چکی تھی کہ اب میرا اور حسن کا اس اخبار میں کام کرتے رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا۔ یہ اندازہ بعید از قیاس نہیں تھا۔ سلیم فارانی کی یہ کوشش ہوسکتی تھی کہ وہ ہم دونوں کو اخبار ہی میں نہیں، اس شہر ہی میں نہ رہنے دے۔ ہمارے لیے کسی دوسرے اخبار میں چلے جانا، معمولی سی بات تھی۔ حسن نے تو اسی وقت سے سوچنا شروع کر دی تھا جب ہمدانی صاحب کو اچانک امریکہ جانا پڑا تھا۔ وہ کافی عرصے سے بیمار چلے آرہے تھے۔ ان کی بیٹی وہاں تھی۔ وہ آئی اور ضد کر کے انہیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ یہ سب آنا فانا ہوا تھا۔ ہمدانی صاحب کے امریکہ جانے اور سلیم فارانی کے ایڈیٹر بن جانے میں صرف دو دن کا وقفہ تھا۔ بہت سارے نام سامنے تھے۔ لیکن فارانی کا نام کہیں بھی نہیں تھا۔

میرے یہ دو دن ہمدانی صاحب کے ساتھ گزر گئے تھے۔ انہیں ائیر پورٹ سے سی آف کر کے میں گھر چلا گیا تھا۔ انہی دو دنوں میں یہ تبدیلی آ گئی تھی۔ حسن کے ذہن میں تھا کہ اگر کوئی ایسا بندہ ایڈیٹر بن جائے، جس سے ہماری نہ نبھ سکے تو اس صورت میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

رپورٹنگ سیکشن میں آنے کے تھوڑی دیر بعد سلیم فارانی کی طرف سے پیغام آ گیا کہ میں اسے اس کے آفس میں ملوں۔ مجھے ایک دم کوفت کا احساس ہوا۔ یہ میرے اندر کا فطری رد عمل تھا۔ میں نے چیف رپورٹر کی جانب دیکھا، وہ ایک لمبی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ تبھی حسن نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا پھر موجودہ صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔

''وہ اگر کوئی فضول بکواس کرے تو ٹھوک دینا جان جی۔'' اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ تب میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''دماغ کو ٹھنڈا رکھو حسن۔! اس کی یہ ہمت نہیں ہو سکے گی کہ میرے دو بدو مجھے کوئی غلط بات کہہ سکے۔ وہ ایک منافق شخص ہے، اتنی جرأت نہیں رکھتا۔ تم پرسکون رہو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔''

''ٹھیک ہے'' اس نے ایک دم سے کہا اور مسکرا دیا اور میں سلیم فارانی کے آفس کی جانب چل دیا۔

ائیر کنڈیشنر سے کمرے کا ماحول خاصا یخ ہو رہا تھا۔ میں سلام میں پہل کرتا ہوا اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''فرمایئے۔!''

ابھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اس نے دوسری گھنٹی بجنے سے پہلے ہی ریسور اُٹھا لیا۔ تب مجھے یہ احساس ہوا کہ فون کی گھنٹی نے اسے سنبھل جانے کا موقع دے دیا ہے وہ فون پر دھیرے دھیرے باتیں کرنے لگا۔ اور میں ذہن میں اُٹھنے والی لا تعداد سوچوں کی لگام تھامے بظاہر پرسکون تھا۔

سلیم فارانی۔! میری توقع کے برعکس ایڈیٹر بنا تھا۔ بلاشبہ وہ کرائم رپورٹنگ میں کامیاب تھا مگر ہم سب کے درمیان اس کی حیثیت کم درجے کی رہی تھی۔ اس میں دیگر وجوہات کے علاوہ اس کا اپنا ذاتی کردار بھی تھا۔ حسد اور چھچھورا پن اس میں کمینگی کی حد تک تھا۔ مجھے اس سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی۔ لیکن اس نے آتے ہی نہ صرف ایک لابی بنالی بلکہ ہم چند دوستوں کے خلاف محاذ بنالیا۔ یوں ہوتا ہے تاکہ جب بندہ دوسرے کی کارکردگی سے آگے نہ بڑھ پائے تو وہ اوچھی حرکتوں پر اتر آتا ہے۔ اس نے بھی کچھ ایسا ہی کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ

بہت سوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے، اپنے مخصوص ہتھکنڈے آزما کر ایڈیٹر بن گیا تھا۔ میں فطری طور پر اپنے کام میں بہت محنت کرتا تھا۔ لیکن جب ایک مخالف گروپ تشکیل پا گیا تو میرا کام اور نکھر گیا۔ ہمدانی صاحب مجھ سے بہت خوش تھے۔ میرا ان سے ایک روحانی تعلق بن گیا تھا۔ چونکہ میرا مقصد دولت کمانا نہیں بلکہ ایک اچھا صحافی بننا تھا اس لیے ہمدانی صاحب میری ہر طرح سے رہنمائی کرتے تھے۔ یوں ان کی سرپرستی اور میری محنت کے باعث اخباری حلقوں میں میرا نام اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ جہاں مخلص اور پیارے دوست مل جائیں، وہاں پر منافق اور حاسد بھی خواہ مخواہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ کسی خاص پلاننگ سے نہیں ہوتا بلکہ خود بخود فطری طور پر یونہی ماحول بن جاتا ہے۔ جہاں آگے بڑھنے کی دوڑ ہو، اپنی اہمیت بنانے کی جستجو ہو اور مقصد کا حصول سامنے ہو تو ایسا ہونا خلاف توقع نہیں ہوتا۔ ایسا ہونا کبھی مجبوری بن جاتا ہے اور کبھی ضرورت، غلط فہمیاں، ارد گرد لوگوں کے مفاد، اپنے اندر کا لالچ، دوستوں کی مدد اور اپنے وقار و معیار کو برقرار رکھنا، ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب تک مخالف کا اندیشہ نہ ہو، کام میں تنقید نہ ہو، حوصلہ شکنی کا ڈر نہ ہو تو کام کے معیار پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا۔ جب مخالفت، تنقید اور حوصلہ شکنی کا محاذ کھلا ہو تو بندہ ایک عزم سے کام کرتا ہے۔ جس سے کام کا معیار بلند ہو جاتا ہے۔ مگر سب کچھ اس وقت ہو پاتا ہے جب سوچ مثبت ہو۔ میرے سامنے بیٹھا سلیم فارانی بھی میرے انہی بہی خواہوں میں تھا۔ جنہیں میرا وجود برداشت نہیں ہوتا تھا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ میں نے بھی اس کے ساتھ کبھی مصلحت آمیز یا نرم رویہ نہیں رکھا تھا۔ یوں ہمارے درمیان اک بے نام سی کشمکش ضرور تھی۔ اب وہ کئی لوگوں کو پچھاڑتا ہوا ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میری سوچیں قلانچیں بھرتے ہوئے نجانے کہاں سے کدھر نکل گئی تھیں۔ میں چونکا اس وقت جب اس نے ریسور رکھا۔ اس نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے سگریٹ نکالا، پھر لکون سے لائٹر جلا کر سلگالی اور میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس نے سگریٹ کا بھر پور کش لیا اور اپنی کنچی آنکھوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ ہمارے درمیان میں سگریٹ کا وہ دھواں تھا جس کے مرغولوں میں سے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ دھواں تحلیل ہونے میں چند لمحے لگے تبھی اس نے کلین شو میں سے ابھرے ہوئے کالے اور موٹے ہونٹوں کو جنبش دی۔

''میں تمہاری بیٹ بدل رہا ہوں۔ اب تم سیاست کی بجائے شوبز کرو گے۔'' وہ چند ثانیے رُکا تاکہ میرا ردعمل دیکھ سکے۔ میں اپنے چہرے کو جذبات کے معاملے میں یخ کر چکا

تھا۔ اس لیے میرے چہرے پر سے کوئی تاثر نہ پا کر بولا۔ ''اس بارے کوئی سوال؟''
میرے ذہن میں ایک دم سے غصے میں لپٹے ہوئے بے شمار سوال ابھرے، جن کا منطقی نتیجہ نزاعی کیفیت تھی اور میرے خیال میں وہ یہی چاہتا تھا کہ ایسی ہی کوئی بحث چھڑ جائے۔ سو میں نے کسی تاثر یا ردعمل کے بغیر کہا۔

''او کے۔! میں شوبز دیکھ لوں گا۔ کچھ مزید کہنا ہے۔''

''نہیں۔!'' اس نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا، پھر عجیب سے لہجے میں بولا، ''وش یو گڈ لک۔'' شاید اسے میرے اس طرح کے رویئے کی توقع نہیں تھی۔ ماحول کھردرا ہو چکا اس لیے میں نے اُٹھتے اس سے ہاتھ نہیں ملایا بس اُٹھ کر دفتر سے باہر آ گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس لیے میں بہت پرسکون ہو گیا تھا۔ رپورٹنگ سیکشن تک پہنچتے ہوئے میں اپنے دماغ کو ٹھنڈا کر چکا تھا۔

اصل میں وہ مجھے زچ کرنا چاہتا تھا کہ میں بھڑک اُٹھوں اور اسے میرے بارے میں افواہیں پھیلانے کا موقعہ مل جائے۔ اس وقت میں نے یہی سمجھا تھا اور میں نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس کے رویئے کو برداشت کر لیا تھا۔ میرے ذہن میں بہت کچھ تھا لیکن یہ نہیں تھا کہ وہ میری بیٹ (دائرہ کار) تبدیل کر دے گا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر مجھے وہ بیٹ دے دی تھی جس کا مجھے تجربہ نہیں تھا۔ میں اس معاملے میں اناڑی تھا۔ کیونکہ اس شعبے سے میرے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ بات یہ نہیں تھی کہ میں فلمیں نہیں دیکھتا تھا یا پھر مجھے اس شعبے میں کام کرنا نہیں آتا تھا۔ اصل میں ہوتا یوں ہے کہ جب کوئی صحافی اپنی بیٹ میں کام کر رہا ہوتا ہے تو اس میں نہ صرف اس کا تجربہ بہت زیادہ ہو جاتا ہے بلکہ وہ اندر کی خبروں تک سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ جس سے کارکردگی اور معیار بڑھتا جاتا ہے۔ میں اپنے شعبے میں بہت آگے تک چلا گیا تھا۔ سلیم فارانی مجھے اچانک اس راستے پر سے روک کر ایک نئی راہ پر لگانا چاہتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ مجھے اپنے کیریئر میں دوبارہ صفر پر لانا چاہتا تھا۔ فلمی دنیا یا شوبز کے بارے میں اخباری تبصرے بھی دیکھتا تھا۔ سیاست اور شوبز کے درمیان ربط کے بارے میں بھی واقفیت رکھتا تھا۔ کسی بھی شعبے کا اپنا ماحول ہوتا ہے اور اس ماحول میں ''خبری ذرائع'' بھی مختلف ہوتے ہیں۔ شوبز سے متعلق میری دلچسپی عام لوگوں کی طرح ہونے کی وجہ سے سلیم فارانی نے اسے میری کمزوری سمجھا اور اپنی طرف سے بھرپور وار کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ ماننا پڑا کہ وہ ذہین اور زبردست قوت کے مشاہدہ رکھنے والا بندہ ہے۔ وہ معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چونکہ ذہین دشمن کی قدر کرنا میرا وطیرہ رہا ہے، اس لیے میں نے

یہ اعتراف کرنے میں ذرا سا بھی بخل سے کام نہیں کہ وہ بہر حال ایک ذہین دشمن ثابت ہوا ہے جو میرے لیڈر ئیر کو داؤ پر لگا چکا ہے۔ وہ مجھے اس نہج پر لے آیا کہ یا تو میں اخبار چھوڑ کر چلا جاؤں یا پھر اس کی مرضی کے مطابق چلوں۔ میرے سامنے یکدم ''روڈ بلاک'' کا بورڈ آویزاں کر کے اپنی مرضی کی راہ پر ڈالنے کی کوشش اس نے کر لی تھی۔ وہ میری محنت کو لمحوں میں ضائع کر دینا چاہتا تھا۔ میں ان ساری باتوں کو سمجھتا ہوا مسکرا دیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ رپورٹنگ روم میں چلا گیا۔ میں جیسے ہی اندر گیا، میری نظر سامنے بیٹھی ماریہ عمران پر پڑی جو مجھے دیکھتے ہی مسکرا دی تھی۔ تبھی حسن نے جلدی سے پوچھا۔

''جان جی۔! کیا جھک ماری ہے اس نے؟'' حسن نے اپنے مخصوص تکیہ کلام کے ساتھ بڑے تجسس سے پوچھا تو میں نے سکون سے بیٹھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''اس نے کہا ہے کہ میں شوبز کروں۔''

''اوہ۔!'' چیف رپورٹر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''یہ کیا کیا اس نے؟''

''دکھا دی نا خباثت اس نے جان جی۔'' حسن نے انتہائی نفرت سے کہا، پھر اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''چل چھوڑ۔! نکل یہاں سے، میں نے بات کر لی ہے۔''

''بیٹھ۔! ہم نے کہیں نہیں جانا۔'' میں نے تحمل سے کہا تو وہ چونکتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے میری جان کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے، کیا وہی کچھ ہونے دیا جائے''

''تم کیا چاہتے ہو جان جی؟'' وہ تجسس سے بولا۔

''ہم یہیں اسی اخبار میں رہیں گے اور میں شوبز کروں گا۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو ماریہ عمران قہقہہ لگاتے ہوئے انتہائی طنزیہ لہجے میں بولی۔

''تو اب آپ ہیرو اور ہیروئنوں کی شان میں قصیدے لکھا کریں گے، کس قدر اعلیٰ جاب ملا ہے، اپنے شجاع الرحمٰن صاحب کو''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' چیف رپورٹر نے ناگواری سے کہا۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ اس کے مطلب کا کام ہے، خوب دل جمعی سے کام کریں گے، موقعہ ملا تو کہیں اداکاری بھی کر لیں گے۔'' وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

''ماریہ جی، آپ اپنا منہ بند رکھو۔'' حسن نے چڑتے ہوئے کہا۔

''سچی بات ہے نا، بری تو لگے گی۔'' ماریہ مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ وہ صرف میرے ساتھ ایسا رویہ رکھتی تھی کہ وہ کوئی ایسا موقعہ ضائع نہیں کرتی تھی جب مجھ پر وہ طنزیہ

جملوں، ہتک آمیز فقروں اور تضحیک والی باتیں نہ کرے۔ وہ بے چاری مجبور تھی اور مجھے اس پر ترس آیا کرتا تھا۔ وہ اس وقت مخالف کیمپ میں تھی اور اپنی طرف سے میری تضحیک کر رہی تھی۔

''بات سچی ہے یا جھوٹی، آپ کو بہر حال دخل نہیں دینا چاہیے'' چیف رپورٹر نے برا مانتے ہوئے کہا تو وہ بڑی دلیری سے بولی۔

''اقبال صاحب! آخر یہ ہمارے کولیگ ہیں، اس پر ہم تبصرہ نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟......آپ مجھے نہیں روک سکتے۔''

''کل اگر آپ کو شوبز رپورٹنگ کرنے کے لیے کہہ دیا گیا تو پھر......؟'' وہ تیزی سے بولا۔

''تو کوئی بات نہیں۔ میں جاب چھوڑ دوں گی لیکن اسے انا کا مسئلہ نہیں بناؤں گی جیسا کہ یہ اس وقت بنائے بیٹھے ہیں۔''

''پھر کیا ہونا چاہیے، ماریہ جی......؟'' حسن نے جلدی سے کہا۔

''اگر ان میں جان ہے تو یہ اپنی سیاست والی بیٹ ہی لیں ورنہ کسی اور اخبار میں چلے جائیں اور اگر کہیں اور جگہ نہیں ملتی تو مجھ سے کہیں، انہیں نوکری دلوا دوں گی۔'' آخری لفظ کہتے ہوئے اس نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا۔ میرے لبوں تک چند لفظ سرسرائے لیکن میں نے انہیں وہیں دفن کر دیا اور کچھ نہیں بولا۔ چیف رپورٹر نے اس کی بات کو نظر انداز کیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ایک قابل کامرس رپورٹر کو ضائع کرنے پر مجھے افسوس ہو رہا ہے لیکن اب جو سلیم نے کہہ دیا ہے وہ فائنل تو نہیں، میں مالکان سے بات کروں گا۔''

''کوئی ضرورت نہیں، وہ اگر اپنی پلاننگ سے مجھے شوبز کی طرف لے آنا چاہتا ہے تو میں اسے مجبور کر دوں گا کہ وہ مجھ سے درخواست کرے کہ میں اپنی بیٹ کی طرف آجاؤں اور۔۔۔''

''تب تک طوائفوں اور میراثیوں کے قصیدے لکھوں گا۔'' ماریہ میری بات کاٹتے ہوئے زور سے ہنس کر بولی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''ماریہ! وہ لوگ بھی فنکار ہیں، فنکار کی حوصلہ افزائی کرنے کا مقصد فن کی قدر افزائی ہوتی ہے، تم بھی فنکار ہو۔''

''میرے اور ان کے فن میں بہت فرق ہے۔ یہ آپ کی گھٹیا سوچ ہے جو آپ نے میرے فن کو ان کے فن کے ساتھ لا کھڑا کیا ہے۔ میں جسم اور ادائیں نہیں بیچتی، قلم مزدوری کرتی ہوں۔ آپ جنہیں فنکار کہہ رہے ہیں، ہمارے معاشرے میں یا ہماری معاشرتی اقدار میں ان کی

حیثیت شوپیس جیسی ہی ہے۔کوئی بھی ایڈیشن اُٹھا کر دیکھ لو، کیا اس میں فن زیر بحث ہوتی ہے؟"

"میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا، ماریہ! لیکن ایک بات ضرور کہوں گا۔ تمہاری مخالفت مجھے حوصلہ دیتی ہے۔ تم مخالفت کرتی رہنا ورنہ میں سمجھوں گا تمہاری ساری صلاحیتیں سلب ہوگئیں ہیں۔" یہ کہہ کر میں رک گیا۔ اس کا چہرہ سن ہوگیا تھا۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتی چلی جارہی تھی۔ پہلی بار میں نے اس سے سخت لہجے میں بات کی تھی اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میں یوں بھی، اس لہجے میں ڈانٹ سکتا ہوں۔ تبھی میں نے ذرا سے سخت لہجے میں کہا۔ "اب اُٹھواور اپنی سیٹ پر جاؤ، ہمیں بات کرنے دو۔"

وہ چند لمحے اسی طرح میری طرف دیکھتی رہی، پھر اپنا پرس اور موبائل فون اٹھا کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔ ماحول قدرے جھنجھنا سا گیا تھا۔ میں چند لمحے خود کو معمول پر لانے کے لیے خاموش رہا تبھی حسن اٹھتے ہوئے بولا۔

"چلو پریس کلب چلتے ہیں، وہاں آرام سے بات ہوگی۔"

"ڈونٹ وری، شجاع! میں دیکھتا ہوں۔" چیف نے میری دیکھ کر کہا۔

"لیکن جو میں نے کہا ہے، ویسے، آپ گواہ رہنا کہ شروعات آپ کے ایڈیٹر کی طرف سے ہوئیں ہیں۔"

"ہاں، یہ تو ہے، میں نثار شاہ سے کہہ دوں گا کہ وہ تمہاری مدد۔۔۔"

"نہیں، مجھے مدد نہیں چاہیے، میں خود دیکھ لوں گا۔ آپ کی آفر کا بہت شکریہ۔" میں نے کہا اور رپورٹنگ سیکشن سے اٹھ آیا اور پھر ہم دفتر سے باہر آگئے۔

"بہت سوچ کر اس نے پلاننگ کی ہے۔" حسن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔

"وہ تو ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اس نے۔۔۔" حسن بولا۔

"مگر اس طرح کی توقع نہیں تھی، لگتا ہے، اس کے ذہن میں پہلے سے ہی تھا۔" میں نے اپنی رائے دی۔

"پہلے سے تو شاید نہ ہو۔" اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا، پھر تیزی سے بولا۔ "اس کے اس سیٹ پر ہونے کی بھی تو توقع نہیں تھی۔ مجھے کچھ معاملہ ہی اور لگتا ہے، خیر دیکھا جائے گا جو بھی ہوگا، جان جی۔!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بھی ذہن پر چھائی مکدر فضا کو ہٹانے لگا۔ گاڑی مال روڈ پر آگئی تھی۔ حسن نے ٹیپ کا بٹن آن کر دیا تو ہلکی موسیقی گاڑی میں پھیل گئی۔ چند لمحے ہم میں خاموشی رہی، تبھی مجھے یاد آیا تو میں نے پوچھا۔ یونہی باتیں

کرتے ہم پریس کلب پہنچ گئے۔ ہم آگے پیچھے سیڑھیاں اتر رہے تھے کہ عین سامنے کی سیٹ پر عابد گوندل قہقہہ لگاتا ہوا نظر آیا، اسی لمحے حسن نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور انتہائی خوشگوار لہجے میں بولا۔

''لو، جان جی! تمہاری مشکل حل ہوگئی، گوندل کو دیکھ رہے ہو؟''

''میرے ذہن میں بھی یہی آیا ہے۔ خیر، چلو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اگلی سیڑھی اتر گیا۔

گوندل چند سال پہلے ہی اخباری دنیا میں آیا تھا۔ یونیورسٹی سے اردو میں ماسٹر ڈگری لی ہوئی تھی، بہت ذہین اور باصلاحیت شخص تھا۔ وہ آتے ہی شوبز کی طرف چلا گیا اور وہاں کچھ ایسا کھویا کہ پھر اس نے اِدھر اُدھر نہیں دیکھا۔ شوبز کے حوالے سے صحافتی دنیا میں اس کا ایک نام تھا اور وہ ہمارے بڑے اچھے دوستوں میں شمار ہوتا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی گرم دماغی میں اس کا نام ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ شاید ٹھنڈے دماغ سے سوچنے پر اسی کا نام سب سے پہلے میرے ذہن میں آتا، ہمیں دیکھتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور خالص لاہوری انداز میں بڑی گرمجوشی سے ملا۔ ''او، آیئے صاحب جی! کہاں گم ہوگئے ہو، میں نے تو سنا ہے کہ ملک کا نظام تم ہی چلا رہے ہو؟'' اس کے لہجے میں خوشگوار مزاح تھا۔

''بس یار وہ ہمدانی صاحب کی وجہ سے مصروف ہوگیا تھا نا یار۔'' میں نے مسکراتے ہوئے بتایا اور ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا، حسن اس کی دوسری جانب جا بیٹھا۔ کچھ دیر ہم میں یونہی گپ شپ چلتی رہی، پھر حسن نے ہی گوندل سے کہا۔

''اوئے، گوندل! اپنا شجاع بھی اب شوبز کرے گا۔''

''ہائیں، وہ کیوں بھئی، تمہیں کیا ضرورت ہے خوا مخواہ ادھر گند۔۔۔''

''بات یہ نہیں ہے۔'' میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا اور پھر مختصر سے انداز میں سلیم فارانی کے رویئے اور منافقت کے بارے میں اسے بتا دیا۔ وہ حیران رہ گیا۔

''کمال ہے، یار! اسے تو تم سے دوستی رکھنا چاہیے۔'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ پھر سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کوئی مسئلہ نہیں، ڈونٹ وری۔ تم جیسا بااعتماد اور ذہین شخص ہفتوں میں نہیں، دنوں میں سب کچھ سیکھ جائے گا۔ کہو تو میں سب کچھ تمہارے لیے کر دیا کروں گا، سب لوگوں سے بھی ملوا دوں گا اور۔۔۔'' وہ پرجوش تھا، میں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''گوندل! مسئلہ شوبز کو فقط سمجھنا اس کی رپورٹنگ ہی نہیں اور نہ ہی یہ کہ میری فلم کے لوگوں سے جان پہچان نہیں ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ سلیم یہ نہ سمجھے کہ میں کچھ نہیں کر سکا۔

میں دھانسو کام چاہتا ہوں۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں اس شعبہ میں رہوں گا نہیں لیکن وہ جسے میری کمزوری سمجھ رہا ہے، میں اسی سے ہی اسے پریشان کر دینا چاہتا ہوں۔''

''یہ ہوئی نا، بات، مجھے بھی کئی لوگوں سے خار ہے۔'' وہ آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ ''میری مجبوری ہے کہ میں ادھر ہوں، مصلحتیں آڑے آجاتی ہیں۔ اب مزا آئے گا۔''

''جان جی! کام واقعی دھانسو ہونا چاہیے۔'' حسن نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا نا، کوئی مسئلہ نہیں، زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ، میری جان! محض ایک ہفتہ، تم سب سمجھ جاؤ گے۔ میں ہوں نا، بس ایک ہفتہ برداشت کرلو۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر شوخ انداز میں بولا۔ ''تم میں ایک اضافی خوبی ایسی ہے جس سے تم بڑا کام لے سکتے ہو۔''

''وہ کیا؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''سوہنے منڈے ہونا، بڑی ٹپکیں گی تم پر، سنبھل کر رہنا۔'' اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا

''اس معاملے میں یہ درویش ہے۔'' حسن نے اونچے سر میں قہقہہ لگایا تو میں بھی ہنس دیا۔

''اچھا چلو، چھوڑو، کچھ کھا پی لیا جائے۔'' میں نے دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کافی یا چائے پینی ہے تو پی لو۔ آج پہلے دن ہی میں تمہیں ایک ایسی خاتون سے ملواؤں گا جس کی جڑیں فلم انڈسٹری میں بڑی مضبوط ہیں، کھانا وہیں کھائیں گے۔'' گوندل نے کہا تو حسن مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔

''بات سن اوئے، جان جی بندہ بڑا صاف ستھرا ہے، خیال رکھنا۔''

''اب اس کے خیال کرنے والے بہت ہو جائیں گے، جان جی۔'' گوندل نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا تو میں ہنستے ہوئے کہا دیا

''کھانا کیا وہاں ضروری ہے، ہم کیوں؟''

''ارے، درویش صاحب! بارش میں نکلو گے تو بھیگنا پڑے گا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ یا تو ماحول کو اپنی پسند کے مطابق کرلو یا پھر ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرلو تبھی کامیابی ممکن ہے۔ اس دنیا کے انداز بڑے نرالے ہیں، آگے دیکھو گے تو بڑے انکشاف ہوں گے۔ معمولی سی شناسائی کبھی بڑا فائدہ دے جاتی ہے اور کبھی بہترین جاننے والے جڑیں تک کاٹ دیتے ہیں۔ یہ اندھیروں کی دنیا ہے۔ کب، کس وقت، کون کیا کر دے، کچھ معلوم نہیں ہوتا۔'' گوندل واقعی بھاری سنجیدگی سے کہہ رہا تھا، تبھی حسن نے کہا۔

''چل اُٹھ، کافی ڈائننگ ہال میں جا کر پیتے ہیں۔''

گوندل کے ملنے سے میرے دماغ میں جو جھکڑ چل رہے تھے، یکدم پر سکون ہو گئے۔ اس کا اندازہ بالکل صحیح تھا کہ مجھے محض ایک ہفتہ چاہیے تھا۔ کافی کا آرڈر دینے سے پہلے اس نے اسی خاتون کو فون کر کے بتا دیا کہ وہ آ رہا ہے اور پھر ہم آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ انہی باتوں کے دوران میرے ذہن میں ایک ایسا خاکہ ابھر آیا جس سے میں سلیم فارانی کو بہت بہتر انداز میں جواب دے سکتا تھا۔ میں نے اس ابتدائی خاکے کو اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ کر لیا تا کہ بعد میں پورے سکون سے اس پر سوچ سکوں۔

''میں چلتا ہوں، یار۔'' کافی پیتے ہی حسن اُٹھ کھڑا ہوا۔

''دیکھو، اب دماغ کو ذرا ٹھنڈا ہی رکھنا، سمجھے!'' میں نے اسے سمجھایا۔

''فکر نہیں کرو، جان جی! اللہ حافظ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہم بھی بل دے کر باہر آ گئے۔ میرے پاس بائیک نہیں تھی، وہ وہیں دفتر کی پارکنگ میں تھی۔

''اب کیا پروگرام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نیلم کی طرف چلتے ہیں۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ ہم آ رہے ہیں۔'' گوندل نے کہا۔

''تو چلو پھر۔۔۔'' میں نے کہا تو وہ پارکنگ سے اپنی گاڑی نکالنے چل دیا۔ پھر ہم دونوں نیلم کے گھر کی طرف چل دیئے۔ ہمارا سفر ماڈل ٹاؤن کی ایک بڑی سے کوٹھی کے سامنے جا کر ختم ہوا۔ چوکیدار شاید گوندل کو جانتا تھا اس لیے کسی تکلف کے بغیر ہم اندر چلے گئے۔ ایک بڑے سے خوبصورت سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یار! یہ نیلم وہی ہے نا، جو ماضی کی ایک مقبول اداکارہ رہی ہے اور اس کا بیٹا آج کل فلموں میں ہیرو آ رہا ہے؟''

''ہاں، بالکل وہی ہے۔'' گوندل نے تصدیق کر دی۔ میں شاید اور بات کرتا مگر اسی لمحے ایک موٹی سی، سانولے رنگ کی خاتون مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ اس کے انداز میں اک وقار تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اب بھی زندگی کے وہ رنگ لہرا رہے تھے جنہیں ماضی کا پرتو کہا جا سکتا تھا۔ وہ آتے ہی بولی۔

''آیئے، گوندل صاحب! کیسے یاد کر لیا ہمیں؟'' اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور پھر سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے غور سے میری جانب دیکھا۔ میں نے واضح طور پر اس کی

آنکھوں میں چمک دیکھی جو عموماً مجھے دیکھ کر ایک خاص قسم کی عورتوں کی آنکھ میں آجاتی ہے۔ نیلم تو پھر ایک ایسی دنیا سے تعلق رکھتی تھی جہاں عورت حکمرانی کے خواب دیکھا کرتی ہے۔ یہ حکمرانی دلوں پر ہی نہیں، اعصاب پر بھی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس نے مجھے نظر انداز کیا تھا لیکن اس کی آنکھیں مجھ میں دلچسپی کے راز کھول گئی تھیں، اس کی شدت کا اندازہ میں نے اس بات سے لگایا کہ وہ یہ بات چھپا نہیں پائی تھی۔ گوندل اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ ان حالوں کو محض چند منٹ گزرے ہوں گے کہ نیلم نے پہلو بدلا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''میرا خیال ہے، یہ صاحب پہلی بار تشریف لائے ہیں؟''

''جی، آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے، آپ شجاع ہیں۔ حضرت اچھے خاصے صحافی ہیں لیکن اب ان پر عتاب یہ ہے کہ آپ شوبز کریں گے۔''

''او، تو آپ صحافی ہیں؟'' نیلم نے قدرے حیرانگی سے کہا، پھر جلدی سے بولی۔ ''یہ عتاب کیوں؟'' میری توقع کے عین مطابق اس نے سوال کر دیا تھا۔ کہیں گوندل اسے رُوداد ہی نہ سنانے لگ پڑے۔

''جی، میں صحافی ہی ہوں۔ آپ نے کیا سمجھا تھا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میں سمجھی کہ شاید اداکاری کا شوق رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں ہی آپ مجھ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔ اکثر ہوتا ہے کہ ایسے لڑکے لڑکیاں کسی حوالے سے آجاتے ہیں اور پھر ماشا اللہ آپ ویل ڈریسڈ، وجیہہ۔۔۔''

''۔۔۔اور باقی رہی شوبز کے عتاب والی بات تو بس ایسے ہی دماغ میں آگیا کہ یہ تجربہ بھی کر دیکھیں۔ بندے کو ورسٹائل ہونا چاہیے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' نیلم نے کہا۔ پھر بولی۔ ''کافی پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں آپ۔۔؟''

گوندل ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ صحافی نہ ہوتا تو کسی یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوتا، پتہ نہیں کس نے اسے مشورہ دیا کہ یہ اخباری لائن میں آجائے۔''

''خیر، صحافت کوئی ایسا پیشہ تو نہیں جسے کم درجے کا شمار کیا جائے۔ میں تو کہتی ہوں ایک نڈر، بے باک اور دلیر لوگوں کا پیشہ ہے۔ گولی جب چلتی ہے تو کچھ لمحوں بعد اپنا وجود کھو دیتی ہے، لکھنے والوں کے لفظ تو تاریخی اعتبار سے بھی ثبت ہو جاتے ہیں'' وہ چند لمحے جیسے ماضی میں جھانکتی رہی، پھر اچانک بولی۔ ''چلیں، یہ اس طرف آئے ہیں تو خوشی ہے کہ پڑھے لکھے لوگ ادھر آئے، ویسے شوبز اتنا وسیع یا پھیلا ہوا شعبہ نہیں جس میں بندہ بہت آگے نکل

جائے۔'' نیلم نے گویا معلومات دیں۔

'' آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اور پھر خصوصاً اپنے ملک کا شوبز تو اور بھی محدود ہے۔'' گوندل نے کہا۔

'' ہاں، ایسا ہی ہے۔'' نیلم نے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔'' آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ہم سے جو بھی خدمت بن پڑی، ضرور کریں گے۔''

'' بہت شکریہ، میڈم۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔تبھی ایک نوخیز سی لڑکی ہاتھوں میں ٹرے تھامے ڈرائنگ روم میں آئی، ٹائیٹس کے ساتھ سلیولیس بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ لمبے بال شانوں پر پھیلائے ہوئے اور پاؤں میں نہایت سبک سلیپر تھے۔ایک انجان سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ اس نے بڑی ادا سے ٹرے گوندل کے سامنے رکھ دی اور اسی سبک خرامی سے واپس چلی گئی۔

'' ایسی بہت ساری ''چیزیں'' یہاں ہوتی ہیں''نیلم نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے جھینپ سا گیا، اس نے میری نظروں کا تعاقب کر لیا تھا، پتہ نہیں، وہ کیا سمجھی اور میری نگاہوں کا اس نے کیا مطلب اخذ کیا تھا؟ گلاسوں میں سوڈا تھا، گوندل نے اٹھایا تو میں نے بھی گلاس تھام لیا۔ پھر بات انہی لڑکیوں سے شروع ہوئی اور فلم انڈسٹری تک جا پہنچی۔ ڈھیر ساری باتیں ہوئیں۔اس دوران دوپہر کا کھانا بھی کھا لیا گیا۔جب ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو نیلم نے کہا۔'' شجاع! پھر کہوں گی کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور اچھا ہوا، آپ آج میرے ہاں تشریف لے آئے۔کل ہی میرے ایک محدود سی پارٹی ہے۔آپ بھی ضرور آیئے گا، گوندل تو ہوگا ہی۔۔۔''

'' جی، میں ضرور آؤں گا۔اب اجازت۔۔۔'' میں نے کہا۔

'' اوکے، خدا حافظ!'' اس نے کہا تو ہم وہاں سے نکل آئے

نیلم کی باتوں سے مجھے ایسی بہت ساری باتیں معلوم ہوگئی تھیں جن کا اگر میں تعاقب کرتا اور ان پر تھوڑی محنت کر لیتا تو اپنے مطلب کے کام کی شروعات کرنے میں کوئی مشکل نہیں تھی۔ نیلم نے بہت اچھا رسپانس دیا تھا اور انہی باتوں کے باعث میں پر اعتماد بھی ہوگیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں بہت جلد اس ماحول سے نہ صرف مانوس ہو جاؤں گا بلکہ سب کچھ کر سکوں گا جو میرے ذہن میں تھا۔ گوندل مجھے دفتر چھوڑ کر چلا گیا۔اس نے مجھے رات سٹوڈیو آنے کو کہا، وقت اور جگہ بھی بتائی جہاں وہ آسانی سے مجھے دستیاب ہو سکتا تھا۔

میں اپنے فلیٹ سے سٹوڈیو کے لیے نکلا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔میرے پاس

وقت بہت تھا۔ میں کم رفتار سے گاڑی چلاتا اور دھیمے سر میں کوئی گیت گنگناتا اس سٹوڈیو کی جانب چل پڑا جہاں مجھے گوندل نے ملنا تھا۔ میں پہلی بار وہاں جا رہا تھا اس لیے اک ذرا سی جھجک بھی میرے اندر تھی۔ اسی جھجک کو دور کرنے کے لیے میں نے انہی سے متعلق ایک وزیر کا فون سٹوڈیو کے مالک کو کروا دیا۔ تا کہ اگر گوندل مجھے نہ بھی مل سکے تو کم از کم میں اپنے طور پر کام کا آغاز کر سکوں۔

میں اسی آہستہ روی سے سٹوڈیو کا گیٹ پار کر گیا۔ سامنے ہی پارکنگ میں مجھے گوندل کی گاڑی کھڑی نظر آئی، اس کے ہونے کے احساس سے میں پرسکون ہو گیا کیونکہ ایک وہی تھا جو وہاں پر مجھے جانتا تھا ورنہ وہاں سب میرے لیے اجنبی تھے۔ میں نے پارکنگ میں گاڑی لاک کی اور عمارت کے اندر چلا گیا۔ وہ عین سامنے چبوترے پر کچھ لوگوں کے ساتھ کھڑا گیٹ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا، مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ مطمئن سا دکھائی دینے لگا۔ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ وہاں بھی شوبز رپورٹرز تھے اور ان کا تعلق مختلف اخباروں، رسالوں اور نیوز ایجنسیوں سے تھا۔ اپنے اپنے انداز سے ہر کوئی ملا۔ اس تعارف کے بعد ایک خوشگوار فضا ہمارے درمیان بن گئی تھی۔

”زیادہ دیر تو نہیں ہوئی مجھے آنے میں؟“ میں نے گوندل سے کہا۔

”نہیں، بس ابھی کچھ دیر پہلے ہی آیا ہوں اور شکر ہے کہ تم وقت پر آ گئے ورنہ ہمیں ایک دوسرے کو تلاش کرنا پڑتا“

”یہ کون سا ہالی وڈ ہے جہاں.....“ ایک چھریرے بدن کے لڑکے نے مضحکہ خیز انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا جس پر سبھی ہنس دیئے۔ اس لڑکے کا نام ندیم تھا، تعارف کے دوران ہی وہ مجھے اپنے پہلے تاثر میں عجیب سا لگا تھا۔ پہلی نظر میں یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ بنگلہ دیشی ہو۔ پھر کچھ ایسی ہی باتوں پر تبصرہ ہوتا رہا۔ اس دوران ایک رپورٹر شیڈول دیکھ آیا کہ کس ہال میں فلم کی شوٹنگ ہونا ہے۔ اس رات صرف ایک سیٹ پر شوٹنگ تھی۔ سب ہی کا خیال تھا کہ وہ خاصی دیر سے شروع ہوگی۔

”آؤ، شجاع! تمہیں سٹوڈیو کے مالک سے ملواؤں“ گوندل نے میری خواہش پر کہا اور چبوترے سے اترنے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ ان میں صرف ندیم ہمارے ساتھ آیا، باقی سب ادھر اُدھر بکھر گئے۔ سٹوڈیو کے مالک کے دفتر تک پہنچے تو گوندل آگے تھا، وہ بلا جھجک بغیر دستک دیئے اس کے آفس میں جا گھسا۔ وہ اکیلا نہ تھا، اس کے ارد گرد چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں دو چار خواتین بھی تھیں اور خواتین میں اس دور کی سب سے مقبول ترین ہیروئن ہما

بھی موجود تھی۔

''آیئے، گوندل صاحب!''سٹوڈیو کے مالک نے کھڑے ہو کر ہمارا استقبال کیا، پھر باری باری ہم سے ہاتھ ملاتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔ جس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وزیر کا فون کارآمد ثابت ہوا ہے۔ سٹوڈیو کا مالک خاصا خوش لباس اور خوش اخلاق لگ رہا تھا، فرنچ کٹ داڑھی اس کے چہرے پر خوب جچ رہی تھی۔ ہمارے آنے سے پہلے شاید وہ لوگ بھی عام سی گفتگو ہی کر رہے تھے کیونکہ کسی کے چہرے پر بھی کوئی تناؤ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی گفتگو شروع ہوئی بلکہ میرے تعارف کے بعد یونہی رسمی سی باتیں شروع ہو گئیں اور پھر فلم انڈسٹری کے بحران اور مشکلات کا ذکر چل پڑا۔ ہر کوئی اپنے طور پر اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا۔ اس سے فضا خاصی بے تکلف ہو گئی اور گفتگو میں مزہ آنے لگا۔ میں ان سب کی سنتا رہا، وہیں مجھے احساس ہوا ہما اپنی بات انگریزی میں ہی کر رہی تھی۔ میں نے ہما کے لہجے اور انگریزی بولنے کے انداز پر غور کیا تو نجانے کیوں مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ محض فیشن کے طور پر یا پھر مرعوب کرنے کی خاطر ہی انگریزی بول رہی ہے۔ اب تک چونکہ وہی لوگ بول رہے تھے اور میں چپ تھا اس لیے محض سوچ کر رہ گیا کہ ان دنوں اک فیشن چل نکلا تھا کہ فلمیں دوسرے ممالک میں جا کر بنائی جائیں۔ اس بارے میں بہت سی باتیں سننے کو ملی تھیں کہ فلمیں غیر ممالک میں بنانے سے فلم ساز کو کیسا اور کس قدر فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ میری دلچسپی نہیں تھی اس لیے کبھی میں نے اس پر دھیان نہیں دیا تھا۔ ہما کی انگریزی سے مجھے لگا جیسے اس نے باقاعدہ سیکھی ہو کیونکہ اس کی گفتگو کے پیچھے کوئی علمیت یا قابلیت نظر آ رہی تھی جو کم از کم مجھے کھل رہی تھی۔ انگریزی بولنے کی ایسی بھی کیا مجبوری؟ میں یہ سب سوچ رہا تھا کہ سٹوڈیو کے مالک نے پوچھا۔

''شجاع صاحب! آپ بتائیں، آپ اس پر کیا کہتے ہیں؟''

مجھے اس وقت ذرا بھی اندازہ نہیں ہوا کہ یہ سوال اس نے کس مقصد کے تحت کیا تھا۔ وہ واقعی فلموں کے بارے میں میری رائے جاننا چاہ رہا تھا یا پھر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں شوبز میں وارد تو ہو گیا ہوں، کوئی شد بد بھی ہے اس معاملے میں؟۔ میرے ذہن میں فوراً جو بے لاگ تبصرہ آیا تھا، اس سے یا جو بھی میں کہتا، اس سے وہ میرا رخ متعین کر سکتے تھے اس لیے میں نے کسی بھی طرح کی رائے دینے سے احتراز کیا۔ بس یونہی گول مول سی چند باتیں کہہ دیں جس میں فلم کے ہر پہلو کو بہتر بنانے اور خصوصاً اداکاری کے معیار کو بلند کر کے نئے چہروں کو متعارف کرانے کی بابت ذکر کیا۔ پڑھے لکھے تکنیک کاروں اور دیگر شعبوں میں تعلیم یافتہ

لوگوں کی ضرورت کو محسوس کیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ایک آرٹ ہے اور اسے اسی حوالے سے ہی
پیش کرنا چاہیے، محض پیسہ کمانا ہی مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ اس وقت میں نے کچھ اور باتیں بھی
کی تھیں۔ میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ہما نے منہ بناتے ہوئے قدرے تضحیک آمیز
لہجے میں انگریزی زبان میں ہی کہا۔

''آرٹ ایک الگ چیز ہے اور پڑھا لکھا ہونا ایک الگ خصوصیت۔۔۔فنکار نے تو
ادا کرنا ہوتا ہے جو اس سے کہا جائے۔ پھر آپ صحافی حضرات ہی تو اسے فن کی بلندیوں کا نام
دے دیتے ہیں۔ آپ لوگ بھی تو بے جا تعریف اور بے جا تنقید کرتے ہیں۔ معاف کیجیے گا،
آپ لوگ بھی اس فن سے واقف نہیں ورنہ یونہی انٹ شنٹ نہیں لکھا جاتا ہے۔ پہلے آپ تو
سیکھیں اور جانیں کہ فن ہوتا کیا ہے؟''

میں اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ میں اب تک اردو میں ہی بات کر رہا تھا لیکن ہما کو
جواب دینے کے لیے میں نے انگریزی میں کہا۔

''میڈم! میں جانتا ہوں کہ فن کیا ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر مجھے ان پر عبور نہیں تو
ان کے بارے میں معلومات ضرور رکھتا ہوں۔ میں نے آپ کی بھی دو ایک فلمیں دیکھی ہوئی
ہیں۔ اگر میں انہیں فن کے اسی معیار پر رکھوں تو آپ صفر بھی نہیں ہیں۔ اداکاری کیا ہوتی ہے،
اس بارے بھی آپ کچھ نہیں جانتیں۔ مردوں کو لبھانا، ڈانس کے نام پر اچھل کود اور اداکاری،
یہ مختلف چیزیں ہیں۔''

''عوام کیا چاہتی ہے، ان کا معیار کیا ہے، ہم اس پر پورا اتر رہے ہیں۔ لوگ مجھے پسند
کرتے ہیں اور میرے نام پر فلم بکتی ہے۔ میری اس کامیابی کو آپ کس کھاتے میں ڈالیں گے؟''

''کیا آپ یقین سے کہہ سکتی ہیں کہ آپ محض اداکاری کے بل بوتے پر ہی یہ
کامیابی حاصل کر پائی ہیں یا اور بہت ساری دیگر وجوہ کی بنا پر؟''

''یہ حقیقت ہے کہ میں کامیاب ہوں، میری تعریف کرنا تم صحافی لوگوں کی مجبوری
ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟'' ہما نے کہا اور میں اس کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ چائے لا
دی گئی۔ اک ذرا سی ہلچل پیدا ہوئی تو وہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میرے سامنے کپ رکھا گیا تو
اسٹوڈیو مالک نے بڑے نفیس انداز میں کہا۔

''پلیز، لیجیے۔۔۔''

''شکریہ۔۔۔'' میں نے کہا اور چائے کا سپ لے لیا، تبھی سٹوڈیو کا مالک بولا۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ بہت اچھی گفتگو کر رہے ہیں۔ آپ کی باتوں سے بہت

سارے سوال میرے ذہن میں پیدا ہو گئے ہیں۔''

''کہیں۔۔۔؟'' میں نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہی سوال کہ آپ کے نزدیک فلم کیا ہے یا آپ اسے کس انداز سے لیتے ہیں؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''دیکھیں، فلم مختلف فنکاروں کے باہمی اشتراک سے تخلیق کیا جانے والا ایسا عمل ہے جس میں فن کے تمام وسیلوں کو یکجا کر دیا جاتا ہے۔ اصولاً اسے موثر، طاقتور اور حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے اس فن کی نسبت جس میں محض ایک وسیلہ پر بھروسہ کیا جاتا ہے، ابلاغ کے اس میڈیم کو طاقتور ہونا چاہیے اور ہوتا بھی ہے لیکن جہاں عقل اور شعور سے کام لیا گیا ہو جبکہ ہمارے ہاں ایسی صورت حال نہیں ہے۔'' میں نے آہستہ اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''مجھے یہ سمجھ نہیں آیا کہ آپ فن کو کس طرح لیتے ہیں؟''

''فن، حقیقت کا عکاس ہوتا ہے۔ اب حقیقت تلخ ہے یا شیریں، بحث اس سے نہیں بلکہ حقیقت سے ہے۔ حقیقت کو اس انداز سے پیش کرنا کہ وہ اثر رکھتی ہو''

''آپ حقیقت سے کیا مراد لیتے ہیں؟'' ایک اور موٹے سے شخص نے پوچھا۔

''یہی ہماری چلتی ہوئی زندگی۔۔۔ فنکار اسی زندگی کی ٹھوس اور کھردری حقیقتوں کو اپنے تصور اور تخیل کے سانچوں میں یوں ڈھالتا ہے کہ حقیقت مسخ بھی نہ ہو اور پورا پورا اظہار ہو جائے۔ اب وہی فن سب سے زیادہ موثر یا عظیم ہوگا جو زندگی کے قریب ترین ہوگا۔ میرے نزدیک فن زندگی سے بحث کرتا ہے۔''

''ہمارے ملک کی فلمیں آپ کے معیار فن پر تو پورا نہیں اترتیں؟''

''بالکل نہیں، وہی ایک روایتی انداز۔ ہیرو، ہیروئن اور ولن اور اس کا ماحول ہماری جیتی جاگتی زندگی سے ذرا بھی تعلق نہیں رکھتا۔ سبھی فلمیں محض تخیلاتی بنیادوں پر بنائی جاتی ہیں، ان کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا سو یہ فن کی گھٹیا ترین صورت ہے۔''

''یہاں میں آپ سے اختلاف کرتا ہوں۔'' اسی موٹے شخص نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، پھر بولا۔ ''ہالی وڈ میں تخیلاتی فلمیں بنتی ہیں اور کامیاب ہوتی ہیں اور آپ کے کہنے کے مطابق بڑی موثر بھی ہوتی ہیں۔ اس پر آپ کیا کہتے ہیں؟''

''آپ بات کو اپنے دیس کی فلموں سے باہر لے جا رہے ہیں۔ اس کی نوعیت کچھ اور ہے آپ ہی مجھے بتائیں کیا ہماری فلمیں عالمی لیول کی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہم اس تناظر میں بات کرتے ہیں، ورنہ موضوع کو اپنے دیس کی فلموں تک ہی محدود رکھنا ہوگا۔''

"چلیں اپنے دیس کی فلمیں گھٹیا فن تخلیق کر رہی ہیں، وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ یہاں کا فنکار ایک خاص سرمایہ دارانہ ذہن رکھنے والے ٹولے کے ہاتھوں بلیک میل ہے جس کا لازمی اثر تخلیق فن پر پڑتا ہے۔"

"میں کہتی ہوں کہ پھر لوگ ہماری فلمیں کیوں دیکھتے ہیں، کامیاب کیوں ہوتی ہیں؟" ہما نے انتہائی نخوت سے کہا۔

"کتنی کامیاب ہوتی ہیں؟" میں نے کہا اور کوئی جواب سنے بغیر بولا۔ "جس طبقے کے لیے آپ فلم بنا رہے ہیں اس کے پاس تفریح کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ وہ طبقہ مزدوروں اور کسانوں کا ہے، وہ مجبور ہے اور بظاہر مطمئن بھی۔ آپ اس کا شعور نہیں بڑھا پا رہے اور آہستہ آہستہ وہ طبقہ بھی آپ کھو دیں گے۔"

"وہ کیسے کھو دیں گے؟" سٹوڈیو کے مالک نے کہا۔

"وہ طبقہ یا تو ختم ہو جائے گا یا پھر باشعور ہو جائے گا۔ وہ آپ کی فلم نہیں بلکہ مارکیٹ میں موجود اور تفریح کی طرف چلا جائے گا۔ آپ کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ آپ نے انتہائی موثر ترین میڈیم کو یوں ضائع کر دیا۔"

"اچھا چھوڑیں جی اس فضول بحث کو۔۔۔" ہما نے اکتاتے ہوئے کہا۔

"ہما! یہ بحث فضول نہیں ہے، بڑی۔۔۔" سٹوڈیو کے مالک نے کہنا چاہا تو اس نے بات کاٹ دی۔

"لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہیں۔" وہ نخوت سے بولی۔

"ظاہر ہے، تمہیں کیا سمجھ آئیں گی" یکلخت ندیم بول اُٹھا۔

"کیا مطلب؟" وہ تنک کر بولی۔

"مطلب یہ ہے کہ تمہیں صرف وہی باتیں سمجھ میں آئیں گی جو نوٹ کی زبان میں ہوں کیونکہ تم وہی سمجھ سکتی ہو۔ اس کے لیے تمہیں جو کرنا پڑے، تم کر گزرو گی۔" ندیم نے کہا۔

"تم لوگ، دو ٹکے کے صحافی مجھے ایسا کہو گے؟" وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

"اے، بی بی! زبان سنبھال کر۔" ندیم جیسے یکدم غصے میں آ گیا۔

"ہاں، ہما! تمہیں زبان پر قابو رکھنا چاہیے۔" گوندل نے بڑے تحمل سے کہا۔

"مجھے کہہ رہے ہو، مجھے؟ تمہارے جیسے کئی ٹٹ پونجیئے میرے سامنے ہاتھ باندھے رہتے ہیں۔" پھر ذرا رک کر بولی۔ "بولو، گوندل! تم لیتے نہیں مجھ سے پیسے؟"

"لیتا ہوگا یہ پیسے۔۔۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ کیوں دیتی ہیں یہ پیسے؟" میں نے

جلدی سے بات سنبھالی۔ پھر بڑے تحمل سے کہا۔ ’’لیکن اب کم از کم میرے ساتھ تمہیں بہت سوچ سمجھ کر بات کرنا ہوگی۔‘‘

’’تم۔۔۔‘‘ ہما نے نخوت زدہ حیرت سے کہا۔ ’’تمہارے جیسے کئی آئے اور گئے اور اگر میں چاہوں تو تم خود شوبز چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤ۔‘‘ اس نے گویا مجھے دھمکی دے دی جس پر بجائے مجھے غصہ آنے کے ہنسی آ گئی۔

’’مجھے پتہ ہے کہ تم کیا ہو اور تمہیں کیسا ہونا چاہیے۔ میرے یہ شایانِ شان نہیں کہ تم جیسی عورت کے منہ لگوں، تاہم میرا یہ خیال ہے کہ تم وہی رہو جو ہو، جاؤ۔۔۔! کم از کم مجھ سے بات کرنے کے لیے اپنی انگریزی ٹھیک کر لو پہلے، پھر بعد میں جو چاہے سو کرنا۔‘‘

’’چھوڑیں، شجاع صاحب! ختم کریں‘‘ سٹوڈیو کے مالک نے کہا کیونکہ اس تلخی میں فضا خاصی مکدر ہو گئی تھی مگر ہما بپھر گئی تھی۔ وہاں پر بیٹھے اس کے حاشیہ بردار یکدم ہی بولنا شروع ہو گئے تھے جس پر ہما اور شہہ پکڑ رہی تھی۔ گوندل چپ بیٹھا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا جبکہ ندیم پوری طرح ہر بات کا جواب دینے کی کوشش کرتا رہا۔ چند لمحے کے لیے تو وہ دفتر مچھلی منڈی بن گیا۔ کون کیا کہہ رہا ہے، کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ طوفان بدتمیزی کم ہوا تو سٹوڈیو کے مالک نے کہا۔

’’ہما جان! آپ جاؤ پلیز‘‘

’’نہیں، پہلے اس کو نکالو یہاں سے‘‘ اس نے میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے نہایت غصے میں کہا تو ندیم تڑخ کر بولا۔ نجانے وہ کب سے اس پر خار کھائے بیٹھا تھا۔

’’تمہارا باپ بھی ہمیں یہاں سے نہیں نکال سکتا۔ اگر ہمت ہے تو بلا لو، جس کو بھی بلانا ہے۔ تم نے ہمیں سمجھا کیا ہے؟‘‘

اس دوران سٹوڈیو کے مالک نے اپنے کچھ لوگوں کو اشارہ کر دیا کہ ہما وغیرہ کو باہر لے جائیں۔ انہوں نے کوشش کی تو ہما نے دروازے میں کھڑے ہو کر غصے میں کانپتے ہوئے کہا۔

’’نہیں چھوڑوں گی تمہیں‘‘ میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ منہ پھیر کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ ماحول پرسکون ہوا تو اسٹوڈیو کا مالک بولا۔

’’سوری۔۔۔ آپ پہلے دن میرے آفس میں آئے اور یہ‘‘

’’کوئی بات نہیں، بھول جائیں۔ میں اسے محسوس نہیں کروں گا۔‘‘ میں نے آرام سے کہا۔

’’میرا خیال ہے کہ چائے کا ایک دور اور ہو جائے‘‘ اس نے ندیم اور گوندل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہم چلتے ہیں" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔"اب تو آنا جانا لگا رہے گا اور ہم آپ سے چائے بھی پیتے رہیں گے۔"

میرے ساتھ دوسرے لوگ بھی اُٹھ گئے۔ ہم نے ہاتھ ملایا اور وہاں سے آگئے۔ گوندل خاموش تھا، میں نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی جبکہ ندیم بڑبڑاتا رہا تھا۔ دفتر میں ہونے والی تلخ کلامی کی خبر سٹوڈیو میں گردش کر گئی تھی، اس کا اندازہ مجھے سیٹ پر جا کر ہوا۔ میرے صحافی دوست پوری بات جاننے کے لیے بڑے فکر مند نظر آرہے تھے۔ انہوں نے کئی سوال کر ڈالے۔ میں اس معاملے میں نہیں بولا، ساری تفصیل ندیم اور گوندل نے دی۔ سیٹ پر کوئی گانا فلمایا جانے والا تھا۔ چند عورتیں اور لڑکے ریہرسل کر رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ کئی نظریں مجھے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ میں سمجھ نہ پایا کہ ایسا ہم سے پہلے پہنچنے والی خبر ہے یا پھر میری ذات کی وجہ سے ہے۔ میں اور گوندل ہدایتکار سے تعارف کے بعد باتیں کر رہیں تھے کہ چند لوگ بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھے، سبھی شکل سے غنڈے لگ رہے تھے۔ ہمارے قریب آتے ہی ان میں سے ایک بڑے ہی گندے انداز میں بولا۔

"ہماجی کے ساتھ کس نے بدتمیزی کی ہے......؟"

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ میں توقع نہیں کر رہا تھا کہ اتنی جلدی اس کا ری ایکشن سامنے آجائے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ پوچھتا، میں نے بڑے تحمل سے کہا۔

"میں نے کی ہے بدتمیزی۔۔۔ بولو، کیا کہنا ہے؟" میرے لہجے میں کچھ تھا جس سے وہ ایک لمحہ کو جھجک گیا۔ پھر جلد ہی سنبھل کر دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

"تمہیں جرأت کیسے ہوئی اُوئے" اس نے اپنی بات ایک گندی گالی پر ختم کی تو مجھ سے نہیں رہا گیا۔ اس کے لفظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ میں نے زناٹے کا تھپڑ اس کے منہ پہ مارا۔ شاید یہ اس کے لیے انتہائی غیر متوقع بات تھی، اس کی آنکھوں سے حیرت اُبل پڑی۔ میں لڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا اور شاید میں اگلے لمحے اس پر حملہ کر دیتا کہ اسٹوڈیو کا مالک آن پہنچا، وہ تیزی سے تقریباً بھاگتا ہوا آیا تھا اور ہانپ رہا تھا۔

"کیا۔۔۔ کیا ہو رہا ہے یہ۔۔۔؟" اس کے منہ سے بمشکل لفظ نکلے۔

"اس۔۔۔ نے۔۔۔" اس غنڈے نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

"شٹ اپ۔۔۔ اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔ جانتے ہو، یہ کون لوگ ہیں؟"

"دیکھ لوں گا میں، یہ کون ہیں۔۔۔" غنڈے نے قہر آلود نظریں مجھ پر ڈالیں۔

"بتا دینا اپنی میڈم کو کہ وہ اپنے آپ میں رہے، میں ایسے ڈرامے برداشت نہیں

کر سکتا۔۔۔'' سٹوڈیو کے مالک نے کہا اور پھر میری طرف مڑ کر بولا۔'' ویری سوری۔۔۔ مجھے میرے ملازموں نے بتایا لیکن خیر، میں وقت پر پہنچ گیا۔''

'' کوئی بات نہیں، آپ مت گھبرائیں۔۔۔ ویسے آپ کا بہت شکریہ۔'' میں نے کہا۔

'' او کے، میں چلتا ہوں۔ آپ اپنا خیال رکھئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ مڑ گیا۔ اس وقت تک میں خود پر قابو پا چکا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہما اس معاملہ کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لے گی۔ میں ایسی ہی سوچوں میں کھو گیا کہ ندیم کی آواز نے چونکا دیا۔

'' بڑی بات ہے، یار! پہلے ہی دن ہیرو جیسی انٹری۔۔۔''

'' یہ سب اچھا نہیں ہوا۔ اس کے اثرات۔۔۔'' گوندل نے خواب ناک سے انداز میں کچھ کہتے کہتے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

'' کیا مطلب۔۔۔؟'' میں نے پوچھا۔

'' تم نہیں جانتے، تمہیں احساس نہیں۔۔۔ خیر، آؤ چلیں۔۔۔'' گوندل کا لہجہ افسردہ تھا۔

'' بھول جاؤ کہ کیا ہوا تھا اور کل کیا ہوگا۔ اس سے پریشان نہیں ہونا۔ میں دیکھ لوں گا سب۔۔۔ چلو، اب چلتے ہیں۔'' میں نے اس کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

'' مگر کھانا کھا کے میری طرف سے۔۔۔'' ندیم نے جلدی سے کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ پہلی ہی نظر میں مجھے اچھا لگا تھا اور وہ بڑے خلوص سے آفر کر رہا تھا۔

'' چلو۔۔۔'' میرا عندیہ پاتے ہی وہ خوش ہو گیا۔ وہ ہمیں فلم کے ایک دفتر میں لے گیا، وہیں کھانا منگوایا اور کھایا گیا۔ اس دوران بہت ساری باتیں چلتی رہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ندیم کے لہجے میں اک احتجاج سا ہے۔ گوندل اس دوران معاملے کے اثرات پر بہت کچھ کہتا رہا۔ میں نے سب کی سنی لیکن کوئی رائے نہیں دی۔ میں قبل از وقت اپنا دماغ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ان کی باتوں سے میں محتاط ضرور ہو گیا تھا۔

میں دفتر وقت پر پہنچ گیا لیکن رات گئے گھر لوٹنے اور معمول میں انتہائی درجہ کی تبدیلی آ جانے کی وجہ سے دماغ بہت بوجھل تھا طبیعت میں خاصی کسلمندی تھی اور ہما سے ہونے والی چخ کا لاشعوری اثر بھی تھا۔ میں رپورٹنگ سیکشن میں آیا تو اگلے ہی لمحے سلیم فارانی بھی آ گیا۔ نہ اس نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ ہی میں نے کوئی بات کرنا مناسب سمجھی۔ یوں میٹنگ ختم ہو گئی اور وہ چلا گیا۔ حسن میرے ساتھ والی سیٹ پر ہی بیٹھتا تھا، اس نے میری طرف دیکھا اور ہنس دیا۔

'' کیا بات ہے، حسن۔۔۔؟'' میں نے اس کا مطلب سمجھنے کے باوجود پوچھا۔

''یہ تیرے ایڈیٹر کا دماغ، جان جی۔۔۔!'' وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

''چھوڑو اسے۔۔۔'' میں نے آرام سے کہا۔ ''تم ایک اچھی سی چائے بنواؤ میرے لیے۔۔۔''

''ٹھیک ہے، میری جان۔۔۔!'' اس نے میرا موڈ سمجھتے ہوئے پیون کو چائے کا کہا تو میں نے نظر دوڑائی کہ فون سیٹ کدھر پڑا ہے۔ تبھی میری نظر ماریہ پر پڑی، وہ مسلسل میری طرف دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں کیا کچھ تھا، میں سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے جیسے ہی اس سے نگاہیں پھیریں تو وہ کہہ اُٹھی۔

''بہت تھکے ہوئے دکھائی دے رہے ہو، شجاع۔۔۔؟'' میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور شاید اسے میری طرف سے کسی جواب کی امید بھی نہیں تھی اس لیے فوراً بولی ''لگتا ہے، فلمی پریوں میں کچھ زیادہ ہی دل لگ گیا ہے جو راتوں کی نیند بھی اُڑ گئی۔''

''ہاں جی، وہاں تو راتیں جاگتی ہیں۔۔۔'' کسی نے لقمہ دے دیا۔

''یار! شوبز ہے۔ اس کی چکا چوند تو بڑوں بڑوں کو اپنا آپ گنوا دینے پر مجبور کر دیتی ہے'' ایک خاتون رپورٹر سلمٰی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کچھ لوگوں کو راجہ اندر بننے کا شوق بھی تو ہوتا ہے۔۔۔'' ماریہ نے طنزیہ انداز میں کہا اور پھر براہ راست میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔ ''شجاع! کہیں تمہیں بھی تو یہ شوق نہیں ہو گیا؟''

''کیا مطلب......؟'' میں نے اسے نظر انداز کرنا چاہا۔

''ہوتا ہے کہ بعض لوگ جو اوپر سے نظر آ رہے ہوتے ہیں، اندر سے کچھ اور ہوتے ہیں۔ تم۔۔۔ بظاہر لیے دیئے رہنے والے شخص لیکن تمہارے اندر بھی کوئی ایسا شخص موجود ہے جو انہی طوائفوں کو چاہتا ہو، ان سے تعلق پر خوش ہوتا ہو۔۔۔'' اس کا لہجہ انتہائی طنزیہ اور [illegible] تھا۔

''ماریہ! مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔۔۔؟'' میں سمجھتے ہوئے انجان بنا۔

''تم سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہ رہے ہو لیکن میں تمہیں اتنا سمجھا دیتی ہوں کہ تم ایک [illegible] اس دنیا سے نکل آؤ۔''

''ماریہ جی! آپ اتنا کیوں پریشان ہو۔۔۔ آپ اپنے کام سے کام رکھو۔ شجاع جو [illegible] آپ کو اس سے کیا؟'' حسن نے پریشان لہجے میں الجھتے ہوئے کہا۔

''اصل میں اس کی عادت ہے، یہ یونہی مشورے۔۔۔'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹ دی۔

''عادت نہیں، اور بہت کچھ بھی ہے؟'' ماریہ نے جذبات میں بھیگے ہوئے لفظ کہہ دیئے۔

''اور وہ جو بہت کچھ ہے، اسے اپنے تک محدود رکھو۔ مجھے تمہارے گھٹیا قسم کے مشوروں کی ضرورت نہیں۔'' میں نے یکدم ہی انتہائی تلخی سے کہا تو سب خاموش ہوگئے۔ شاید کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ میں اتنی سخت بات کہہ جاؤں گا...... چند لمحے رپورٹنگ روم میں خاموشی طاری رہی، پھر فون کی گھنٹی نے سب کو چونکا دیا۔ پیون میرے سامنے چائے رکھ گیا۔ میں نے بے نیازی سے کپ اُٹھا لیا۔ تبھی میری نظر ماریہ پر پڑی۔ وہ انتہائی خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے نگاہیں پھیر لیں۔ اس سے پہلے کہ میں دوسرا سپ لیتا، وہ تیزی سے رپورٹنگ روم میں سے نکلتی چلی گئی۔

''میری جان! اتنی سختی۔۔۔؟'' حسن نے آہستہ سے کہا۔

''چھوڑو۔۔۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''او کے، او کے۔۔۔'' حسن نے کہا تو میں سلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ چائے پیتا رہا۔ مجھے پرسکون ہونے میں کافی وقت لگا، تبھی میرا سیل بول اُٹھا۔ میں نے سکرین پر نمبر پڑھے تو وہ عامر بشیر کے تھے۔ اگرچہ اس کا باپ ایک بڑا صنعت کار تھا لیکن اس کا اپنا بزنس بھی تھا اور ابھی درمیانے درجے کے صنعت کاروں میں شمار رکھتا تھا، اس سے میری شناسائی دوستی میں بدل چکی تھی۔

''ہیلو۔۔۔!'' میں نے کہا

''اوئے کدھر ہو یار، تم......کوئی فون نہیں اور نہ ہی اپنے دفتر آنے کی اطلاع دی ہے؟''

''وہ یار، آتے ہی بس ڈسٹرب ہوگیا۔۔۔ میں آج تمہیں فون کرنے والا تھا۔''

''خیریت۔۔۔ کیا ڈسٹربنس ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اب میں شوبز۔۔۔'' میں نے کہنا چاہا لیکن بات ادھوری چھوڑ دی۔

''مجھے معلوم ہے لیکن یہ کوئی اتنی بھی مصروفیت والی جاب نہیں۔۔۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا......؟'' میں حیران تھا۔

''یار! ہم دوستوں کی خبر رکھتے ہیں...... خیر، آج شام کیا کر رہے ہو؟''

''خیریت۔۔۔؟'' میں نے پوچھا۔

'' ایک چھوٹی سی پارٹی ہے، وی وی آئی پی قسم کے لوگوں کی نیلم کے گھر۔۔۔'' اس نے بتایا تو مجھے یکدم یاد آیا، نیلم نے تو مجھے بھی دعوت دی تھی۔ کیا اس نے عامر کو بتا دیا ہے کہ مجھے بھی دعوت دی گئی ہے یا یہ اپنے طور پر ہی مجھے بلا رہا ہے۔ میں نے اسے ٹٹولنا چاہا۔

''انہوں نے مجھے۔۔۔'' میرا لہجہ محتاط تھا۔

''میں کہہ رہا ہوں نا! میں شاید تمہیں نہ بتاتا لیکن اب میں چاہوں گا کہ تمہارا تعارف اس سے ہو جائے۔ وہ شوبز کی دنیا میں بڑی پہنچی ہوئی چیز ہے'' اس نے تیزی سے کہا تو مجھے احساس ہو گیا کہ یہ اپنے طور پر ہی مجھے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ تب میں نے کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے''

''تم تیار رہنا، تمہیں کال کر کے پک کرلوں گا، او کے!''

''بائے'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ عامر کی اس فون کال سے میں مطمئن نہیں ہوا تھا۔ نجانے کیوں، مجھے اس کا لہجہ پریشان کر گیا۔ میں نے خود سے اس کی وجہ معلوم کرنا چاہی تو مجھے سمجھ نہیں آیا۔ کافی دیر خود سے الجھتے رہنے کے بعد میں نے یہی گمان کیا کہ کسلمندی اور تھوڑی دیر پہلے کی مکدر فضا کے باعث مجھے عامر کا لہجہ بھی عجیب لگا۔ میں نے اپنے طور پر خود کو دلیلیں دے کر مطمئن کر لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں زیادہ دیر یہاں بیٹھا رہا تو مزید الجھتا رہا ہوں گا سو میں پریس کلب جانے کے لیے اُٹھ گیا۔

''کدھر، جان جی؟'' حسن نے پوچھا۔

''پریس کلب، چلنا ہے؟'' میں نے جواب دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تم چلو، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں'' اس نے کہا تو میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔ میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ ماریہ میرے سامنے آ گئی۔ وہ اپنے کمرے سے نکلی تھی اور شاید میرے باہر نکلنے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اب وہ میرے سامنے کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی نفرت سے میں بخوبی واقف تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ کوئی زہریلی بات ہی کرے گی اس لیے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی، پھر زہرخند لہجے میں بولی۔

''تمہیں راجہ اندر بننے کا بہت شوق ہے، چھوڑ کیوں نہیں دیتے یہ؟ ہما جیسی تھرڈ کلاس عورتیں تمہارے منہ کو آ رہی ہیں۔'' اس نے کہا تو میں حیران رہ گیا۔

''تمہیں کیسے پتہ؟''

"میں۔۔۔ میں تمہارے بارے میں خبر نہ رکھوں، کیا ایسا ممکن ہے؟"

"اوہ، تو اس کا مطلب ہے؟"

"کچھ بھی مطلب ہو لیکن یہ تمہارے شایان شان نہیں۔۔۔ فوراً شوبز چھوڑ دو۔ کوئی اور اخبار نہیں ملتا تو مجھے کہو، میں تمہارے لیے اچھی سے اچھی ملازمت کا بندوبست کر دوں گی۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو۔۔۔ میں تمہارا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا اور تم مجھے ملازمت کی آفرز دے رہی ہو؟ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم میرے راستے میں مت آیا کرو۔"

"کیا کر لو گے میرا، بولو؟؟"

"یہی تو بات ہے کہ عورت ذات سے انتقام لینے کی بابت میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"یہی تمہاری سب سے بڑی کمزوری ہے"

"تم سمجھتی ہو تو سمجھتی رہو پر میں تمہیں جو سمجھا رہا ہوں، اسے سمجھو"

"شجاع! تمہیں پتہ ہے کہ جو کھلونا مجھے پسند آ جاتا ہے، اسے حاصل کرنے کی آخری حد تک کوشش کرتی ہوں ورنہ اسے توڑ دیتی ہوں" اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"سمجھو کہ میں تمہارے لیے ٹوٹ گیا" میں نے دھیرے سے کہہ دیا۔

"شجاع! سوچ لو۔۔۔!" اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"مزید بکواس مت کرنا۔۔۔ مجھے تم سے شدید نفرت ہے، ناؤ یو گٹ لاسٹ۔" میں نے اپنے اندر کی تلخی کو دباتے ہوئے دھیرے سے کہا اور اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ میرا دماغ سلگ اُٹھا تھا، خود کو پرسکون کرنے اور ماریہ کو ذہن سے نکالتے ہوئے میں پریس کلب جا پہنچا۔ خلاف معمول ندیم کو وہاں دیکھ کر میں خوش ہو گیا، رسمی باتوں کے بعد اس نے کہا۔

"میرا معمول تو نہیں کہ میں یہاں آؤں پر آج آ گیا"

"گوندل نہیں آیا ابھی تک؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے نہیں دیکھا۔۔۔ آ جائے گا۔" ندیم نے لاپرواہی سے کہا اور پھر ہم شوبز کی دنیا سے متعلق باتوں میں کھو گئے۔ میں زیادہ سے زیادہ باتیں سننا چاہ رہا تھا اور وہ بتانا چاہ رہا تھا۔ یوں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اتنے میں گوندل بھی آ گیا، یوں دوپہر کا کھانا کھا کر بھی باتوں میں مگن رہے۔ سہ پہر کے بعد ہم وہاں سے نکلے۔ میں دفتر گیا اور وہاں پر خبریں لکھنے اور فائل کرنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ میں اب اپنے فلیٹ پر جا کر فریش ہونا چاہتا تھا سو دفتر سے نکل گیا۔ رستے میں مجھے عامر کا فون ملا تو میں نے اسے دفتر آنے کی بجائے

پارٹی پر آنے کا کہہ دیا، یہ اچھا ہوا، ورنہ گوندل نہیں آ رہا تھا۔ میں تیار ہو چکا تھا جب وہ آیا۔ اس نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہی فون کر کے متوجہ کر لیا۔ پھر کچھ دیر بعد ہی ہم نیلم کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ نیلم نے ہمارا استقبال بڑی گرمجوشی سے کیا۔ وہ اپنے وسیع لان میں تھی جہاں چند اور مہمان بھی تھے جو ذرا فاصلے پر پڑی کرسیوں پر بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ نیلم کی پہلی نظر جب ہم دونوں پر پڑی تھی تو اس کی نگاہوں میں ایک لمحہ کو حیرت اتر آئی تھی مگر چونکہ وہ بہت اچھی اداکارہ رہی تھی اس لیے اگلے لمحے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ نیلم کی آنکھوں میں موجود ایک لمحے کی حیرت میرے ذہن میں کھب گئی۔ اس نے پہلے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو عامر کے ساتھ دیکھ کر خوشی ہوئی۔۔۔ آپ کو اپنے گھر پر خوش آمدید کہتی ہوں۔"

"بہت شکریہ۔۔۔ عامر میرا دوست ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"او، بڑی بات۔۔۔!" یہ کہہ کر اس نے عامر سے ہاتھ ملایا اور بولی۔ "خوش ہو عامر، آپ کا دوست بہت پیارا ہے۔"

"نیلم جی! یہ میرا دوست ہے، اس لیے پیارا ہے"

"مگر میں یہ کہوں گی کہ یہ پیارا ہے اس لیے آپ کا دوست ہے" اس کے ساتھ اس نے قہقہہ لگایا اور عامر کو جواب کا موقع نہ دیتے ہوئے کرسیوں کی جانب اشارہ کر دیا، شاید اسے اور مہمانوں کا انتظار تھا۔ ہم دونوں ایک خالی میز کے گرد جا بیٹھے تو ایک بیرا ہمارے سامنے کولڈ ڈرنک رکھ گیا۔ ہم دونوں ہی اس ماحول کو دیکھ رہے تھے جو پرسکون سی شام میں قدرے خاموش تھا۔ وہ اکتوبر کے اوائل دن تھے، خنکی بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ مدہم روشنی میں قہقہے اور باتوں کی آوازیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ہم سے کچھ ہی فاصلے پر ایک بوڑھا سا آدمی، ایک جوان لڑکی کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر ایک ادھیڑ عمر خاتون دو لڑکیوں کے ساتھ الگ تھلگ انداز میں باتیں کر رہی تھیں، ایک طرف دو شخص سرگوشیوں کے انداز میں محو گفتگو تھے۔ نیلم نے کہا تھا کہ یہ پارٹی بڑی محدود سی ہوگی اور اس میں جو مہمان آنے والے ہیں، وہ اپنی جگہ اہم مہمان حیثیت رکھتے تھے۔ مجھے تجسس ہی تھا کہ میں ان سے ملوں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ایک گاڑی پورچ میں رکی اور اس میں سے جو شخص نکلا اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ سیٹھ افراسیاب تھا، شہر کا سب سے بڑا صنعت کار۔۔۔ اس کے ساتھ ایک نوخیز سی لڑکی اور ادھیڑ عمر شخص تھا۔ نیلم کی گرمجوشی دیدنی تھی۔ اس نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ سیٹھ افراسیاب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ چند لمحے سرگوشی نما باتوں کے بعد وہ لان میں آ گئے۔ کچھ

دیر نیلم اور افراسیاب ٹہلتے ہوئے باتیں کرتے رہے پھر وہ اندر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے تو نیلم فرداً فرداً سب مہمانوں سے ڈرائنگ روم میں آنے کو کہتی رہی۔ میں وہاں پہلے بھی آ چکا تھا لیکن اس وقت وہ ڈرائنگ روم نہیں، ہال نما لگ رہا تھا جس میں چند میزیں اور ان کے اردگرد کرسیاں دھری ہوئی تھیں، ہلکا ہلکا میوزک فضا میں تیر رہا تھا۔ میں اور عامر بشیر ایک میز پر جا بیٹھے۔ کچھ ہی دیر بعد میوزک بند ہو گیا اور نیلم کی اونچی اور بھرپور آواز گونجی۔

''خواتین وحضرات! یو آر ویلکم۔۔۔آپ میں میرے چند مہمان ایسے بھی ہیں جو پہلے ایک دوسرے سے متعارف نہیں، میں فرداً فرداً تعارف کرائے دیتی ہوں'' یہ کہہ کر وہ میزوں کے قریب جاتی رہی اور وہاں پر موجود لوگوں کا تعارف کرواتی رہی۔ وہاں پر دو سیاست دان تھے جن میں ایک رکن اسمبلی بھی تھا، دو ہی بیوروکریٹ تھے اور ان میں ایک سیٹھ افراسیاب کے ساتھ آیا تھا۔ ایک فلمی ہیرو جس کی فلمیں تو ابھی ریلیز نہیں ہوئی تھیں لیکن چند فلمیں ایسی تھیں جو یا تو زیر تکمیل تھیں یا پھر سنسر کے بعد نمائش کے لیے تیار تھیں۔ فلمی حلقے اس کے بارے میں اچھی توقع کر رہے تھے۔ سیٹھ افراسیاب کے بعد عامر بشیر تھا جنہیں انڈسٹریلسٹ کہا جا سکتا تھا۔ میں ایک ہی وہاں پر صحافی تھا۔ تقریباً پانچ ماڈل گرلز تھیں جن میں چند پرانے چہرے اور کچھ نئے تھے۔ ایک ڈریس ڈیزائنر تھی جس کا تعارف ہو رہا تھا تو عامر نے سرگوشی میں اس کے اصل کاروبار کے بارے میں بتایا۔ ایک بیگم شہوانی تھی۔ پتہ نہیں کیوں، میں اس کا نام سن کر چونک گیا تھا۔ اگرچہ اس کا شمار فیکٹری اونرز میں ہوتا تھا لیکن اصل میں وہ کیا تھی، میں یہ کبھی بھی نہیں جان پایا تھا۔ میری پہلے بھی اس سے ملاقات ہو چکی تھی لیکن گفتگو ہمارے درمیان نہیں ہوئی تھی۔ تعارف کا سلسلہ ختم ہوا تو نیلم نے ایک کونے میں پڑی بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ دیا جس کا جتنا جی چاہے اور جس برانڈ کی چاہے، پی سکتا ہے۔ وہ یہ کہہ کر سیٹھ افراسیاب کے پاس جا کر بیٹھ گئی، تب میوزک پھر سے ہال میں تیرنے لگا۔

''ہاں بھئی، کیا خیال ہے۔ پھر ہو جائے ایک آدھ پیگ؟'' عامر نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے پوچھا۔

''نو، نیور، میں نہیں پیتا، تمہیں تو پتہ ہے۔'' میں نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آج سے شروع کر لو۔ ابھی تو ان میں ایک پری بھی۔۔۔'' اس نے پھر آنکھ مارتے ہوئے واہیات انداز میں اشارہ کیا تو نہ جانے کیوں وہ مجھے گھٹیا سا لگا۔ تب مجھ سے تلخی نہ چھپائی گئی، میں نے تقریباً چڑتے ہوئے کہا۔

''تم چاہے جو کرو، میں نہیں روکوں گا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔''

''او کے، جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا اور اُٹھ گیا۔ میں نے دیکھا، تقریباً سبھی ہاتھوں میں گلاس لے چکے تھے۔ میں اپنی میز پر بیٹھا رہا۔ نیلم کچھ دیر بعد میرے پاس آ گئی، میرے ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ تھا۔

''شجاع! بھئی آپ کیوں نہیں لیتے ڈرنک؟'' اس کے چہرے پر حیرت بھری مسکراہٹ تھی۔

''میں پیتا نہیں ہوں، بس سوفٹ ڈرنک اور یہ'' میں نے ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کی طرف اشارہ کیا تو وہ ہنس دی۔

''او کے، چلو سوفٹ ڈرنک ہی لے لو، آؤ تو سہی'' اس نے بڑے نرم انداز میں میرا بازو پکڑا اور اُٹھا لیا۔ پھر اس نے میرے بازو میں ہاتھ ڈال کر بڑے دل ربا لہجے میں کہا۔ ''پیتے کیوں نہیں ہو، ظالم!''

''بس نہیں پیتا'' میں نے انتہائی مختصر جواب دیا۔ اتنے میں ہم اس کونے تک پہنچ گئے۔ ایک طرف سیٹھ افراسیاب کھڑا تھا۔ نیلم نے مجھے گلاس تھما کر اس میں سوفٹ ڈرنک ڈال دیا، میرا سیٹھ افراسیاب سے آمنا سامنا ہوا تو میں نے سلام میں پہل کر دی۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ رسمی باتوں کے بعد اچانک اس نے ایسی بات کہی جس سے میں چونک گیا۔ اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

''کبوتر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ جتنا بھی اونچا اڑ لے، آخر باز کے ہاتھوں مر جاتا ہے اس لیے کبوتر کو کبوتر رہنا چاہیے نا؟''

''سیٹھ صاحب! ظاہر ہے کہ کبوتر تو کبوتر ہی ہوتا ہے، وہ باز نہیں بن سکتا۔''

''اس میں باز کی فطرت آ بھی نہیں سکتی'' وہ دھیرے سے بولا

''جی، بالکل'' میں نے کہا۔

''تو پھر اسے کبوتر رہنا چاہیے۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''وہ کبوتر رہے گا، سیٹھ صاحب! اس لیے کہ وہ کبوتر ہے۔''

''بس یہی بات میں تمہیں سمجھانا چاہ رہا ہوں'' اس نے کچھ اس انداز اور لہجے میں کہا کہ میں چونک گیا۔ بظاہر وہ ایویں سی بات کر رہا تھا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہ رہا ہے۔ میں خاموش رہا تو وہ پھر بولا۔ ''چڑیا بھی چڑیا ہی ہوتی ہے اور کوا صرف کوا۔۔۔ یہ سب باز نہیں بن سکتے۔ میری بات سمجھ رہے ہو، نا؟''

''جی بالکل، سیٹھ صاحب! نہ سمجھا تو سمجھ جانے کی کوشش ضرور کروں گا۔''

''ویری گڈ، میرا خیال ہے کہ سمجھ جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔ کبوتر کو بلی بھی پکڑ لیتی ہے اور۔۔۔''اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔''کتا بھی۔''

''اب آئی نا، بات سمجھ میں۔ چلو اس خوشی میں '' یہ کہہ کر اس نے اپنا گلاس میرے گلاس سے ٹکرانے کے لیے آگے بڑھا دیا لیکن اگلے ہی لمحے رک گیا۔''ایک یہ فرق بھی دیکھ لو، تمہارے ہاتھ میں محض سوفٹ اور میرے ہاتھ میں ہارڈ۔ اب یہ گلاس کس طرح۔۔۔ چلو پھر بھی'' یہ کہہ کر اس نے گلاس ٹکرا دیئے اور کوئی بات کہے بنا آگے بڑھ گیا۔ میں اس کی باتوں کو ذہن میں دہرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ عامر۔نے آ کر پوچھا۔

''کیا کہہ رہا تھا، سیٹھ؟'' تب میں نے اس کی ساری مہمل گفتگو اسے سنا دی۔ جب تک وہ میری بات سنتا رہا، اس کے چہرے پر انتہائی درجہ کی سنجیدگی تھی۔ بات مکمل ہوتے ہی گویا اس نے اطمینان کا سانس لیا اور ہنس کر بولا۔''بڈھا سٹھیا گیا ہے، اوپر سے یہ پریاں اسے پاگل کر رہی ہیں، بھول جاؤ کہ کیا بکواس کر رہا تھا۔''

''تم اتنا کیوں غصہ کر رہے ہو؟'' میں نے عام سے انداز میں کہا۔

''بس یونہی، تمہیں سمجھا رہا ہوں۔''

''بڑی مہربانی۔'' میں شاید کچھ اور کہتا کہ یکدم میوزک بدل گیا، اس کی آواز تیز ہو گئی اور روشنی مدہم کر دی گئی۔ تبھی ایک طرف سے کافی ساری لڑکیاں ہیجان خیز لباس میں آن وارد ہوئیں۔ وہ میوزک کے ساتھ تھرک رہی تھیں۔ ماحول یکدم ہی بدل گیا۔ عامر کی شاید کسی ماڈل سے دوستی چل رہی تھی، وہ اس کی طرف بڑھ گیا اور میں اپنی میز پر جا بیٹھا۔ میرے سامنے کئی تھرکتے ہوئے بدن تھے اور میں اک نئے قسم کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے علاوہ صرف بیگم شہوانی ایسی خاتون تھی جو اپنی میز پر اکیلی بیٹھی سب کو دیکھ رہی تھی۔ مدہم روشنی کے باعث میں اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے سیٹھ افراسیاب کو دیکھا کہ وہ اس بڑھاپے میں بھی اپنے ساتھ لائی نوخیز سی لڑکی کے ساتھ لہک رہا تھا۔ مجھے اس جوڑے پر ہنسی آ گئی، تبھی نیلم پھر میری طرف بڑھ آئی اور بڑی حیرت سے بولی۔

''شجاع! بھئی کیوں جھجک رہے ہو، اپنے کپل کے لیے کوئی ایک بھی چن لو۔'' پھر چند لمحے کو رک گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔''چلو آؤ میں تعارف کروائے دیتی ہوں۔''

''نو، میڈم! مجھے ناچنا نہیں آتا اور میں انہیں دیکھ کر زیادہ انجوائے کر رہا ہوں'' میں نے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے لیکن جب دل چاہے تو شرمانا مت، او کے!''اس نے میرے بال بگاڑ دیئے اور چلی گئی۔ میں ان سب کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ دھن ختم ہو گئی تو اور شروع ہو گئی۔ میرے دل میں خواہش نہیں ابھری سو میں اپنی میز پر ہی بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد بیگم شہوانی اٹھی اور نیا پیگ لینے کونے تک گئی۔ وہ پیگ لے کر واپس مڑی تو اس کی نظر مجھ پر پڑی، مجھے دیکھ کر وہ مسکرادی اور میری طرف ہی بڑھ آئی، میرے قریب آکر اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

''ہیلو، ینگ مین! کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں۔ آیئے، تشریف رکھیں''میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور محسوس کیا کہ اگر میں اسے نہ بھی بیٹھنے کو کہتا تو بڑے سکون سے بیٹھ جاتی۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ فطری طور پر میں نے اس کا بھرپور جائزہ لے لیا۔ زیادہ سے زیادہ وہ پینتیس سال کی لگ رہی ہوگی۔ اس کی شفاف گوری جلد بچوں کی جلد کی طرح لگ رہی تھی۔ شانوں تک کٹے بال، گول چہرہ، پتلے ہونٹ، ذرا تیکھی اور خمیدہ سی ناک، آنکھیں کبھی بہت خوبصورت رہی ہوں لیکن اس وقت ان کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ کھلے گریبان کے ساتھ تنگ کپڑوں میں وہ جس قبیل کی لگ رہی تھی اس کا مجھے اندازہ ہوگیا تھا۔ میں نے پہلی ملاقات میں اسے اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً وہ بھی مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ چند لمحے یونہی خاموش رہی، پھر دھیرے سے بولی۔

''غالباً آپ کا نام شجاع بتایا تھا نیلم نے؟''

''جی، مجھے شجاع ہی کہتے ہیں۔''

''اوہ نائس، میں بیگم شہوانی۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔۔۔''اس نے دوبارہ ہاتھ بڑھا دیا، میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر ہماری باتیں میرے نہ پینے سے شروع ہو کر نجانے کدھر سے کدھر نکل گئیں۔ تب تک وہ میرے حساب سے چار پیگ لے چکی تھی لیکن پھر بھی ہوش و حواس میں باتیں کر رہی تھی۔ کافی دیر بعد ان سب کا ناچ ختم ہوا تو سب لان میں چلے آئے۔ عامر اپنی دوست کے ساتھ مصروف تھا اور میں بیگم شہوانی کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر کھانے کے دوران کئی لوگوں سے باتیں ہوئی، یوں رات گئے یہ پارٹی ختم ہوگئی۔ ان میں کئی مدہوش ہو چکے تھے، میں نیلم سے رخصت ہو کر عامر کو دیکھنے لگا تو وہ غائب تھا مگر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ میں سکون سے ایک طرف بیٹھ گیا کہ وہ آئے تو ہم چلیں۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ بیگم شہوانی آ گئی۔

''آپ گئے نہیں ابھی تک۔۔۔؟''اس کا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا۔

''میں اپنے دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ پتہ نہیں کدھر ہے''

''آپ کی اپنی گاڑی؟''

''میں اس کے ساتھ ہی آیا تھا'' میں نے جلدی سے کہا۔

''چلیں، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گی۔'' اس نے عالم مدہوشی میں کہا۔

''بہت شکریہ وہ آجائے تو۔'' لفظ میرے منہ میں ہی تھے کہ عامر اپنی دوست کے ساتھ آتا نظر آیا۔ ان کی حالت اچھی نہیں تھی، لڑکی نے اپنا سر اس کے کندھے کے ساتھ ٹکایا ہوا تھا۔ بیگم شہوانی نے اس کی طرف دیکھا اور ہلکے سے مسکرادی، پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

''شجاع! کم آن، انہیں جانے دو۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عامر پورچ کے قریب آکر رک گیا اور متلاشی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے بیگم شہوانی کو بائے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی اس کی دوست لڑکی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی ساتھ جائیں گے؟''

''ہاں ہنی! تمہیں پتہ نہیں، یہ میرا بہت پیارا دوست ہے۔''

''اوہ۔۔۔!'' اس نے برا سا منہ بنایا تو مجھے بڑا دھچکا لگا۔ ایک معمولی سی کال گرل میرے وجود کو گراں سمجھ رہی ہے۔ مجھے کچھ اور سمجھ نہ آیا تو میں نے بہانہ بنایا۔

''عامر! مجھے نیلم سے ایک ضروری کام ہے، تم چلو، میں اپنے گھر پہنچ جاؤں گا۔''

''او کے، ڈیئر! یو آر سویٹ۔۔۔'' عامر سے پہلے ہی وہ لڑکی بولی۔ میں کچھ بھی مزید سننے کی بجائے گاڑی سے اتر گیا، سامنے ہی بیگم شہوانی لڑھکتی ہوئی آرہی تھی۔

''یقیناً تم میرے ساتھ جانا پسند کرو گے۔۔۔ آؤ۔۔۔'' اس نے آگے بڑھ کر میرا بازو تھام لیا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا شوفر گاڑی کے قریب ہی تھا، اس نے جلدی سے پچھلا دروازہ کھولا اور ہم بیٹھ گئے تو چند لمحوں بعد شوفر نے گاڑی بڑھا دی۔ بیگم شہوانی میرے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی اور مجھے اس سے الجھن ہو رہی تھی۔ گاڑی اب مین روڈ پر چڑھ چکی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب ٹریفک بہت کم ہو جاتی ہے۔ بیگم شہوانی مسلسل باتیں کرتی چلی جا رہی تھی۔ میں شوفر کو بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے کہاں ڈراپ کرے۔ تبھی پیچھے سے ایک گاڑی بڑی تیزی سے آئی، اس نے ہمیں کراس کیا اور پھر چند گز کے فاصلے پر جاتے ہی اس کے دونوں طرف سے گنیں برآمد ہوئی۔ میری اچانک ہی نظر پڑی تھی۔ میں بیگم شہوانی کو لیے نیچے دبک گیا، اسی لمحے گولیوں کی تڑتڑ سے ماحول گونج گیا۔ ان کا نشانہ ہماری گاڑی ہی کی طرف تھا۔ جونہی فائرنگ ہوئی، ڈرائیور نے بریک لگا دیئے۔ جس سے ٹائروں کی شدید چرچراہٹ

پیدا ہوئی، اس کے ساتھ ہی ونڈ سکرین کا شیشہ چھنا کے سے ٹوٹ گیا۔ گاڑی کی رفتار تیز نہیں تھی لیکن اچانک بریک لگانے سے گاڑی بے قابو ہو گئی، تبھی مجھے ڈرائیور کی فکر لاحق ہوگئی کہ کہیں کوئی گولی اسے تو نہیں لگ گئی؟ بیگم شہوانی خوفزدہ ہو گئی تھی، میں نے ہی اسے دبوچ کر فوراً نیچے کر لیا تھا اور وہ اپنی پوری قوت سے میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ میں نے ایک لمحہ کو اسے دیکھا، اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اسے خود سے جدا کیا اور ڈرائیور کی طرف بڑھا تا کہ اسے دیکھوں۔ گاڑی ڈگمگا رہی تھی، میں نے سامنے دیکھا تو وہ گاڑی دور جاتی نظر آئی جس سے فائرنگ ہوئی تھی۔ میں نے اس کی نمبر پلیٹ دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ پتہ نہ چلا، شاید اس کی نمبر پلیٹ تھی ہی نہیں۔ میں نے ڈرائیور کو دیکھا، وہ پوری توجہ سے گاڑی سنبھالنے کی فکر میں تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ نہ کیا۔ گاڑی سڑک کے ایک طرف نیچے اُتر گئی اور پھر رک گئی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور ڈرائیور سے پوچھا کہ تم ٹھیک ہو؟

''جی، صاحب جی! میں ٹھیک ہوں، بیگم صاحبہ کیسی ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں، ارشد۔۔۔!'' بیگم نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں باہر نکلا تو بیگم شہوانی بھی اتر آئی، تبھی کئی لوگ ہمارے اردگرد رک گئے۔ میں نے گاڑی کا جائزہ لیا تو ونڈ سکرین کے علاوہ بونٹ میں بھی گولی گھس گئی تھی، اس کے علاوہ کہیں نشان نہیں تھا۔ کیا حملہ آوروں کا ارادہ ہم دونوں میں سے کسی کو قتل کرنے کا نہیں محض دھمکانا تھا؟ گاڑی کا جائزہ لینے کے بعد پہلی سوچ میرے ذہن میں یہی آئی تھی۔ اس وقت بیگم شہوانی ... میں تھی اور ہمارے اردگرد لوگ جمع ہو گئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے بیگم کو گاڑی میں بٹھایا اور وہاں موجود لوگوں کو یہی تاثر دیا کہ وہ اس اچانک حادثے کی وجہ سے خوف زدہ ہو گئی ... حملہ آور کون تھے؟ اس وقت اگرچہ یہی بات سوچنے کی تھی لیکن لوگوں کے اکٹھا ہو جانے کے باعث وہاں سے نکلنا ہی سب سے پہلا مسئلہ تھا جو درپیش تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ فوراً گاڑی نکالے۔ اس نے کوشش کی لیکن شاید انجن میں خرابی ہو جانے کی وجہ سے گاڑی سٹارٹ نہیں ہو پا رہی تھی، انجن ذرا سا جاگتا لیکن جلد ہی خاموش ہو جاتا۔ میں جھنجھلا گیا۔ مجھے ... تھا کہ کوئی پولیس موبائل ادھر نہ نکل آئے ورنہ خواہ مخواہ اک نئی صورت حال پیدا ہو جانا ... ہی تھا ... کچھ دیر کوشش کے باوجود جب گاڑی سٹارٹ نہ ہوئی تو لوگ اسے دھکا لگانے آ ... اس وقت انہی لوگوں کے باعث میں دوہری کیفیت میں مبتلا تھا۔ مجھے کوفت ہو رہی تھی ... کوئی نیا ہنگامہ جنم نہ لے لے اور خوشی تھی کہ ابھی ہم میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ سڑک پر ... جانے کے باعث سارے نہیں تو کچھ لوگ مدد کے لیے آجاتے ہیں۔ تبھی بیگم شہوانی

گاڑی سے باہر نکل آئی۔

''شجاع! چھوڑو اسے، گھر سے دوسری گاڑی منگوا لو یا پھر ٹیکسی دیکھ لو'' اس نے خمار آلود لہجہ میں کہا۔

''بیگم صاحبہ! آپ بیٹھیں گاڑی میں، سٹارٹ ہو جائے گی یہ'' میں نے اسے تسلی دی۔

''نہیں، گھر فون کرو میرے '' وہ تیز لہجہ میں بولی۔

''ڈونٹ وری۔۔۔ آپ بیٹھیں، میں فون کرتا ہوں۔'' میں آرام سے بولا۔

''ابھی کرو۔۔۔'' اس نے انتہائی تحکمانہ لہجے میں کہا۔ میں نے سیل نکالا اور کہا۔

''ٹھیک ہے، بتائیں نمبر۔۔۔؟'' میں نے نمبر پوچھنے کے لیے بیگم شہوانی کی طرف دیکھا ہی تھا کہ ایک خالی ٹیکسی وہاں آن رکی۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور ڈرائیور سے کہا۔

''اگر ٹھیک ہو جائے تو لے آنا۔ ہم چلتے ہیں۔۔۔'' یہ کہہ کر میں نے بیگم شہوانی کا ہاتھ پکڑا اور ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ میں نے ''چلو'' کہا تو وہ چل دیا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ اس کا گھر کدھر ہے، اس لیے میں نے اس کے کان کے پاس منہ لا کر پوچھا۔

''کدھر جانا ہے؟'' اس نے بڑی ادا سے میری طرف دیکھا اور اپنا پتہ بتا دیا۔ ایک بڑے سے گیٹ والی کوٹھی کے سامنے ہم اترے۔ میں نے ٹیکسی والے کو کرایہ دیا۔ چوکیدار گیٹ کھول چکا تھا۔ ہم ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے تو ایک بوڑھا سا ملازم گھبرایا ہوا آ گیا، میری طرف دیکھتے ہوئے بیگم سے بولا۔

''خیریت تو ہے، بیگم صاحبہ! گاڑی کدھر ہے؟''

''تم ان کے لیے ایک بہترین کپ کافی کا بنا کر میرے بیڈ روم میں لے آؤ'' پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''آؤ شجاع......!'' وہ اٹھی اور ڈرائنگ روم سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر چل دی، میں اس کے پیچھے چلتا گیا۔ اس کا بیڈ روم بہت ہی خوبصورت تھا۔ وہ جاتے ہی ایک کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ وہ ادھیڑ عمر عورت خاصی تھک چکی تھی۔ اس نے جوتے اتارے اور لاپرواہی سے ایک طرف پھینک دیئے۔ چند لمحے سوچنے والے انداز میں بیٹھی رہی، پھر سر اٹھا کر بولی۔ ''خاصا خوف ناک حادثہ تھا......''

''ہوں۔۔۔'' میں نے ہنکارہ بھرا اور پھر بولا۔ ''ہو سکتا ہے، اب پولیس کا پھڈا بھی پڑے لیکن میں۔۔۔''

''کچھ نہیں ہوتا، میں دیکھ لوں گی مگر یہ فائرنگ کیوں ہوئی، کس نے کی؟''

''یہی میں سوچ رہا ہوں'' میں نے پوری سنجیدگی سے کہا تو وہ ہنس دی۔
''چھوڑو، اب مت سوچو، آرام کرو، صبح ہوگی تو دیکھا جائے گا۔'' اس نے کہا ت
فطری طور پر میری نظر گھڑی پر پڑی، رات کے دو بج چکے تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھ
اور پھر بیڈ کی طرف، تب وہ بولی۔ ''جہاں جی چاہے، سو جاؤ۔ میں ابھی کچھ دیر اور جاگوں گی۔''
''وہ کس لیے؟'' میں نے یونہی لاشعوری طور پر پوچھ لیا۔
''میرا سارا موڈ غارت ہوگیا۔ اگر تم چاہو تو میرا ساتھ دے سکتے ہو۔''
''نہیں، میں اب سو جاؤں گا'' میں نے کہا۔ اسی لمحے دروازے پر ہلکی سی دستک
ہوئی اور وہ ملازم کافی کا مگ تھامے اندر آ گیا۔ اس نے مگ ایک سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور مڑ گیا۔
اس کے جاتے ہی بیگم نے ایک الماری کھولی۔ اس میں مختلف برانڈ کی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔
پھر اس نے فریج سے برف، سوڈا اور شاید اسی مقصد کے لیے رکھے ہوئے گلاس نکالے اور پینے
بیٹھ گئی۔ جب تک میں نے کافی ختم کی، اس وقت تک وہ دو پیگ پی چکی تھی۔ اس دوران ہم
میں باتیں بھی چلتی رہیں جو صرف اور صرف پارٹی کے بارے میں ہی تھیں۔ تیسرے پیگ کے
بعد بیگم موڈ میں آ گئی، اس کا اندازہ مجھے اس کے لہجے سے ہوا۔ پھر جلد ہی اس نے سب کچھ
سمیٹ دیا اور بیڈ کے ایک طرف آ لیٹی۔ وہ لیٹنے کے بعد خاموش رہی جبکہ میری آنکھوں سے
نیند کوسوں دور تھی۔ میرے ذہن سے وہ حادثہ نہیں نکل رہا تھا۔ فائرنگ اس انداز سے ہوئی تھی
جیسے محض وارننگ دی گئی ہو۔ حملہ آوروں کا مقصد قتل کرنا نہیں تھا ورنہ جس طرح وہ پیچھے سے
آئے تھے، برابر آ کر گولی چلاتے تو میں یا پھر بیگم شہوانی یا پھر دونوں ہی قتل ہو جاتے۔ اسی لمحے
میرے ذہن میں خیال آیا کہ آخر وہ تھے کون؟ اس کے ساتھ ہی خیال شدت سے ابھرا کہ وہ
مارنا کس کو چاہتے تھے۔ مجھے یا پھر بیگم کو؟ یہی سوچ کا وہ دوراہا تھا جہاں میں آ کر ششدر رہ گیا،
بیگم شہوانی کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اپنے بارے میں وثوق سے یہ سوچ
سکتا تھا کہ حملہ مجھ پر نہیں ہوا۔ میرا کوئی ایسا دشمن نہیں تھا جو اس حد تک چلا جاتا اور پھر اگر کوئی تھا
بھی تو اتنے نزدیک کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے کیا پتہ کہ میں ایسی عورت کے ساتھ جا رہا ہوں جس
سے محض میری دوسری ملاقات تھی؟ اگر اس نے میرے لیے پلان بنا بھی لیا ہوگا تو عین وقت پر
اس عامر بشیر کا ساتھ چھوڑ گیا تھا، اس صورت میں حملہ عامر بشیر کی گاڑی پر ہونا چاہیے تھا۔ ایسی
ہی کئی سوچوں سے مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ حملہ مجھ پر نہیں، اس ادھیڑ عمر عورت پر ہوا ہے جو نشے
میں مدہوش میرے ساتھ ایک ہی بیڈ پر پڑی ہے۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو چار بجنے میں
کچھ وقت رہتا تھا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ لاک کیا، لائٹ آف کی اور ایک کونے میں سمٹ کر

لیٹ گیا۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں۔

میری آنکھ کھلی تو بیڈ روم روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ بیگم شہوانی ایک ایزی چیئر پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی، اس کی پشت پر کھڑکی تھی جس کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور یہ روشنی وہیں سے آرہی تھی۔ وہ اس وقت فریش تھی، اس کے بھیگے بالوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ نہا چکی ہے۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، میری آنکھ بھی معمول کے مطابق کھلی تھی حالانکہ رات میں بہت دیر سے سویا تھا۔ ابھی نیند کا خمار میری آنکھوں میں تھا لیکن پھر بھی میں کروٹ لے کر اٹھ گیا، آہٹ پر بیگم نے اخبار ہٹا کر میری طرف دیکھا اور پھر مسکراتے چہرے سے بولی۔

"صبح بخیر، شجاع۔۔۔!"

"صبح بخیر۔۔۔" میں نے کہا اور سرہانے کے نیچے سے سیل اٹھا کر اسے آن کر دیا۔

"اب جلدی سے فریش ہو جاؤ، پھر ناشتہ کرتے ہیں۔" اس نے اخبار سمیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ اخبار چونکہ وہی تھا جس سے میں وابستہ تھا اس لیے فطری تجسس کے تحت اسے اٹھالیا۔ میں نے سرسری نظر ڈال کر اسے رکھنا چاہا تو بیگم شہوانی نے کہا۔

"اپنے بارے میں خبر پڑھی؟"

"اپنے بارے میں؟" میں نے پھر سے اخبار کھولتے ہوئے کہا۔

"پچھلے صفحہ پر اوپر، دائیں طرف" اس نے مجھے بتایا۔ وہ دو کالمی خبر تھی اور اس میں صرف قاتلانہ حملے کی خبر تھی، ساتھ ہی ایک "سماجی خاتون شخصیت" کا ذکر تھا۔ بیگم شہوانی کا نام کہیں نہیں تھا۔ اس کا نام نہ آنا اگرچہ اچھی بات تھی لیکن خبر کے شائع ہونے سے میری پریشانی بڑھ گئی تھی۔ یہ خبر کیسے لگی؟ اگرچہ حادثہ والی جگہ پر ہم اتنی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرے تھے۔ لوگ جمع ہوئے تھے مگر اخبار والوں کو کیسے پتہ چل گیا کہ اس میں شجاع نامی کوئی صحافی بھی تھا۔ ہوسکتا ہے کسی نے بیگم شہوانی کے ڈرائیور سے پوچھ لیا ہو۔ لیکن اسے میرے بارے میں کیا علم، یا پھر کوئی اور۔۔۔ یہ جواب طلب سوال اپنی جگہ مگر۔ اب پتہ نہیں کتنے لوگوں کے، کیسے کیسے سوالوں کے جواب دینا پڑیں گے مجھے؟...... میں نیسیل بند کر دیا۔

"چھوفریش ہو جاؤ، باقی باتیں بعد میں سوچ لینا" بیگم شہوانی نے اٹھتے ہوئے کہا تو میں باتھ روم میں جا گھسا۔ ناشتے کی میز پر بیگم نے کہا۔ "شجاع! تمہیں اپنی بہت زیادہ حفاظت کرنا چاہیے۔ اس حملے سے تو بچ گئے"

"بیگم صاحبہ! میرا کوئی ایسا دشمن نہیں ہے، بلکہ میں تو آپ کے بارے میں سوچ رہا

"نہیں، میرا بھی کوئی دشمن نہیں ہے۔ کوئی مجھے مار کر کیا کرے گا؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں اسے دلیلیں دینے لگا جو رات میرے ذہن میں آئیں تھیں۔

"تمہاری دلیلیں بجا ہیں لیکن میں پھر بھی یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ حملہ مجھ پر نہیں ہوا۔ وہ تمہارے ہی دشمن ہو سکتے ہیں"

"ایسا یقین۔۔۔ آخر کس بنیاد پر۔۔۔؟" میں نے تقریباً جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو، شجاع! میرا دشمن کوئی کیوں ہوگا، میرے مرنے سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہونے والا اور میں نے اپنی پوری زندگی میں کسی سے بھی زیادتی نہیں کی حتیٰ کہ اپنے ملازمین سے بھی نہیں۔۔۔ میں نے بھی سوچا ہے کہ حملہ کیوں ہوا؟ میں نے موجودہ حالات کو بھی غور سے دیکھا، کہیں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جسے میں کہہ سکوں کہ یہ میرا دشمن ہے اور اس حد تک ہے کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کروا سکتا ہے۔"

"کہیں نہ کہیں کوئی معاملہ۔۔۔؟" میں نے جرح کرتے ہوئے کہنا چاہا۔

"شجاع! میں تمہیں بتاتی ہوں۔۔۔ میں اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھی۔ میرا سابقہ شوہر کون ہے، اسے چھوڑو۔ وہ جاگیردار ہے اور خاصا مشہور آدمی ہے۔ ہمارے درمیان محبت پروان چڑھی، ہم نے خفیہ شادی کی اور اس نے مجھے اپنے خاندان سے الگ رکھا۔ میرا ایک بیٹا بھی ہے جو اس وقت امریکہ میں ہے، اس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ انتہائی خوشحال زندگی گزار رہا ہے۔ میرے اور میرے شوہر کے درمیان ایک ایسا وقت آیا جب میرا شوہر مجبور ہو گیا کہ مجھے طلاق دے دے۔ میں نے یہ تلخ فیصلہ قبول کر لیا، اس کے عوض اس نے اپنی مرضی سے مجھے اتنا کچھ دیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔۔۔ میرا بیٹا جوان ہوا، اس نے بزنس کیا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے تو میں نے سب کچھ اس کے نام کر دیا۔۔۔ طلاق کے بعد میں اپنے شوہر کے ساتھ ایک بار بھی نہیں ملی۔" یہ سب کہتے کہتے وہ یکدم خاموش ہو گئی۔ پھر چند لمحے سانس لینے کے بعد بولی۔ "شجاع! میرا سابقہ شوہر یا اس کے خاندان سے کوئی تنازعہ نہیں، پچھلے سات سالوں سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ میرے نام کچھ نہیں۔ یہ گھر، فیکٹری، بینک بیلنس سب بیٹے کے نام ہے۔ میرے مرنے کے بعد اس طرح کسی کو فائدہ نہیں ہونے والا" اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

"چلیں ٹھیک ہے، ابھی تک تو سب کچھ اندھیرے میں ہے"

"ہاں۔۔۔ تم سوچو اور غور کرو اور میرا مشورہ مان کر اپنی حفاظت کا بندوبست کرو"

"موت جب آنی ہے، تو وہ آجاتی ہے سارے حفاظتی بند توڑ کر بھی، میں موت سے

نہیں ڈرتا۔''

''اچھی بات ہے، تا ہم پھر بھی '' وہ پوری سنجیدگی سے بولی۔ ہم ناشتہ کب کا ختم کر چکے تھے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، دفتر جانے کا وقت ہو رہا تھا۔

''او کے، بیگم شہوانی! آپ کا ساتھ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا''

''تم مجھے اچھے لگے ہو۔ جب چاہو اور جس وقت چاہو، میرے گھر کے دروازے تم پر کھلے ہیں۔''

''او کے'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔

میں ٹھیک وقت پر دفتر پہنچ گیا۔ استقبالیہ سے ہوتے ہوئے جب میں رپورٹنگ کی طرف جانے لگا تو میں نے سیل آن کر لیا۔ اسی لمحہ بیل بج اُٹھی، دوسری طرف حسن تھا۔

''کہاں ہو، یار! فون کیوں بند کیا ہوا ہے؟''

''میں دفتر میں ہوں، ابھی آیا ہوں۔''

''اوہ، چلو آ جاؤ پھر'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں جب رپوٹنگ میں پہنچا تو سبھی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ ہر کسی کے ذہن میں اپنی نوعیت کا کوئی سوال ضرور ہو گا، سبھی اس واقعہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہوں گے۔ میں نے سب کی طرف دیکھا، پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر بولا۔

''آپ سب لوگ اس واقعہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ تقریباً سب کا ردعمل ایک جیسا ہی تھا۔ میں نے انتہائی مختصر انداز میں بیگم شہوانی کا نام لیے بغیر سارا واقعہ کہہ دیا۔

''اب کیا سوچا ہے؟'' چیف نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، میں کیا سوچوں گا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے جواباً کہا۔

''نہیں ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ پولیس وغیرہ سے مدد لی جائے، معلوم تو ہو وہ کون لوگ تھے؟'' چیف نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''فی الحال میرا ارادہ تو نہیں ہے۔ موت چونکہ اس کے ہاتھ میں ہے جس نے زندگی دی ہے اس لیے میں ایسے حالات سے فکر مند نہیں ہوں۔ اگر میرے دشمن کا ارادہ مجھے قتل کرنے ہی کا ہے تو وہ پھر دوبارہ سامنے آئے گا، تب دیکھ لوں گا۔''

''آپ کو بہر حال محتاط رہنا چاہیے۔'' ایک ساتھی صحافی نے فکر مند لہجے میں کہا۔

''ظاہر ہے، بندہ جب راجہ اندر بننے کے چکر میں ہو گا، پھر ایسے حالات تو ہور

گے۔'' ماریہ نے انتہائی نخوت سے کہا تو ماحول یکدم بدل کر رہ گیا۔ اس سے بات کرنے کا مطلب تھا کہ مزید تلخ باتیں بڑھتیں۔ میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ایک دم ہی غصہ میری کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ میں نے ضبط کیا اور اپنا سیل فون بند کر کے میز پر رکھ دیا، گویا میں اپنی طرف سے بات ختم کر کے میٹنگ کی شروعات کا انتظار کرنے لگا۔ معمول کی میٹنگ میں سارے فون آف کر دیئے جاتے تھے تا کہ کوئی خلل نہ پڑے۔ میٹنگ ختم ہوتے ہی پہلا فون بیگم شہوانی کا ملا، اس نے بڑے اطمینان بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''متعلقہ تھانے سے اس کے انچارج کا فون تھا، وہ اس بارے میں مجھ سے تفصیل پوچھ رہا تھا اور یہ بھی کہ اب میں اس سلسلہ میں کیا چاہتی ہوں؟''

''پھر آپ نے کیا کہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ میں تھوڑی دیر بعد فون کر کے بتاتی ہوں۔ میں تم سے مشورہ چاہ رہی تھی کہ کیا کیا جائے؟''

''میرے خیال میں ابھی اس کو اہمیت ہی نہیں دینی چاہیے۔ دشمن اندھیرے میں ہے، پولیس کے درمیان میں آجانے سے معاملہ خوامخواہ طول پکڑ جائے گا۔ پہلے اسے اپنی طور پر تو سمجھیں ''

''یہ ٹھیک ہے، میں اسے تمہارے بارے میں کہہ دیتی ہوں، تم اسے مطمئن کر دینا ورنہ پھر میں سارا معاملہ خود دیکھ لیتی ہوں۔''

''میں دیکھ لوں گا اور آپ کو فون کی ضرورت نہیں، وہ انچارج مجھ سے ضرور رابطہ کرے گا۔''

''او کے، سی یو۔۔۔''

بیگم شہوانی نے کہا اور فون بند کر دیا۔ حسن میرے ساتھ بیٹھا تھا اور اس نے اب تک مجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ وہ یقیناً فرصت کے لمحات کا منتظر تھا۔ پھر میرے کئی ملنے والوں کے فونز کا تانتا بندھ گیا، اس میں پولیس انسپکٹر کا فون بھی تھا۔ میں نے اسے ہر طرح سے مطمئن کر دیا اور اسے یہ باور کرا دیا کہ میں کوئی کاروائی نہیں چاہتا۔ اس نے مجھ سے خاصی دیر بحث کی۔ وہ چاہتا تھا کہ کاغذی کاروائی کی حد تک سہی، مجھے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے دماغ میں کیا بات ہے، وہ اتنا اصرار کیوں کر رہا ہے۔ پھر بھی میں نے کوئی بھی کاروائی نہ کرنے کی بابت کہہ دیا۔ اس دوران عامر بشیر کا فون بھی آیا۔ سب سے پہلے تو

اس نے مجھ سے معذرت کی، مجھے معلوم تھا کہ وہ اس وقت دو آتشہ نشے میں مخمور تھا۔ پھر اس نے تفصیل جاننا چاہی تو میں نے اسے بھی مختصراً انداز میں بتا دی، وہ ایک بار پھر سے معذرت کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے ساتھ چلا آتا تو شاید یہ واقعہ پیش نہ آتا۔ اب ہونی کو تو کوئی نہیں ٹال سکتا تھا، ایسا ہی تاثر دے کر میں نے بات کسی اور کسی اور وقت کے لیے ٹال دی۔ میں نے فون بند کیا تو میرے سامنے کی میز پر ماریہ ایک ایک لفظ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی ممکن ہے اس نے میرا فون سنا بھی ہو میں نے بس ایک لمحہ دیکھا اور پھر نگاہیں پھیر لیں۔ دفتر میں اب تک میں نے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور فون سن سن کرا کتا چکا تھا، ایک ہی بات بار بار کہنے سے طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ میں نے اس لمحے پریس کلب جانے کا سوچا تو حسن کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں اس کے آجانے تک رک گیا۔ اسی وقت ہمارے اخبار کا آرٹسٹ رپورٹنگ روم میں آگیا۔ گول شیشوں کی عینک میں سے اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئیں تھیں، وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ اور منمنائے ہوئے انداز میں ہاتھ ملا کر بولا۔

''شجاع صاحب! آپ کا ایڈیشن ہے اور آپ نے ہمیں ڈمی ہی نہیں دی؟''

''ہائیں، تمہیں کس نے کہا ہے کہ ایڈیشن میں دوں گا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہمیں جو شیڈول ملا ہے، اس میں تو آپ ہی کا نام ہے۔'' اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

''اور نثار شاہ؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''وہ صرف ٹی وی اور تھیٹر دیکھے گا، ایڈیشن آپ دیں گے'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بڑی مہربانی کہ تم نے مجھے مطلع کر دیا'' میں نے مسکراتے ہوئے آرٹسٹ سے کہا تو ماریہ کی طنزیہ آواز ابھری۔

''اب شجاع صاحب لکھیں گے فنکاروں کی شان میں قصیدے، میں بھی پڑھوں گی کہ کیا کچھ فرماتے ہیں آپ''

''ماریہ بی بی! ایسا نہیں کہتے۔'' آرٹسٹ نے اپنے مخصوص انداز میں اس کو ٹوکا۔

''اور مجھے کوئی روک بھی نہیں سکتا، تمہارے شجاع صاحب بھی نہیں۔ میرے من میں جو آئے گا، وہ میں کہوں گی'' ماریہ نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے سے کہا تو میں نے آرٹسٹ کی توجہ اپنی طرف کی۔

''چھوڑو، یار! تمہیں آج کسی وقت ڈمی مل جائے گی''۔

''میں انتظار کروں گا۔'' وہ یہ کہہ کر چل دیا تو فطری طور پر میری نگاہیں ماریہ کے چہرے پر ٹک گئیں، وہاں سوائے خفگی کے اور کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ جس بے بسی سے گزر رہی تھی، وہ میں ہی جانتا تھا۔ اس کا احساس کرتے ہی میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھے چلی جا رہی تھی۔ میری مسکراہٹ نے اس پر جلتی کا کام کیا، اس نے غصے میں کاغذ لیے اور اٹھ کر چلی گئی۔ اس وقت میں حسن کو ڈھونڈنے کے لیے فون اٹھانا چاہ رہا تھا کہ فون بج اُٹھا۔ میں نے ریسور اٹھایا تو مچلتی ہوئی ''ہیلو'' میرے کان میں گونج اٹھی، دوسری طرف ہما تھی۔

''جی فرمائیے؟'' میرا لہجہ نجانے کیوں سخت ہو گیا۔

''کل رات کے واقعہ پر مجھے بہت افسوس ہوا، میں نے ابھی پڑھا ہے، کہیں نقصان تو نہیں ہوا آپ کا؟'' مجھے یوں لگا جیسے اس کے لہجہ میں طنز ہی نہیں بلکہ دھمکی چھپی ہوئی ہے۔

''جی نہیں ۔۔۔ بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے فون کیا۔'' میں نے خود پر جبر کرتے ہوئے ملائم انداز میں کہا۔

''میں نے محض افسوس کرنے کے لیے ہی تو آپ کو فون نہیں کیا بلکہ ۔۔۔''

''بلکہ کیا؟'' میں نے سرد سے لہجے میں پوچھا۔

''میں یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ نے یکدم ہی کتنی شہرت لے لی۔ ہم تو ترستے ہیں کہ کوئی نقصان بھی نہ ہو اور ڈھیروں شہرت مل جائے۔ آپ نے تو ہم شوبز کے لوگوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔''

''میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟'' میں نے اس کی باتوں میں چھپی ہوئی بات کو محسوس کرتے ہوئے انجان بن کر کہا۔

''آپ نہ ہی سمجھیں تو اچھی بات ہے۔ بہر حال، میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہ رہی تھی اگر قبول ہو جائے تو؟'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''بولیں'' میں نے پوچھا۔

''آپ میرے ساتھ اسکینڈل کیوں نہیں بنوا لیتے۔ یقین جانیں، آپ کو بھی بہت فائدہ ہوگا'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک دم سے قہقہہ لگا دیا۔

''یہ آپ کیا باتیں کر رہی ہیں، مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا؟'' میں نے سختی سے کہا۔

''میرے پاس آؤ، آپ کو سب کچھ سمجھا دوں گی، بائے دا وے، سٹوڈیو جانے سے پہلے آپ کا پروگرام کیا ہے۔ کھانا اکٹھے کھاتے ہیں؟'' وہ پھر سے ہنسی تو میں نے انتہائی سنجیدگی

سے کہا۔

"دیکھیں، ہما بی بی! آپ جو کچھ بھی مجھے کہنا چاہ رہی ہیں وہ میں پوری طرح سمجھ رہا ہوں۔آپ جس انداز سے مجھے دعوت دے رہی ہو، کل میں بھی آپ کو ایسی ہی دعوت دے سکتا ہوں۔آج میں تو آ جاؤں گا لیکن آپ نہیں آؤ گی" میرا لہجہ نرم تھا۔

"شاید آپ کے پاس وہ ماحول نہ ہو جو میرے پاس ہے، مدہوش کر کے رکھ دوں گی۔"

"لیکن میں آپ کو ہوش مند دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے انتہائی نرم انداز میں کہا۔

"میں کہتی ہوں، دوستی کا ہاتھ بڑھا لو، اچھے رہو گے۔" وہ میری بات پر اچانک ہی بھڑک اٹھی تھی۔

"دیکھو، ہما! آپ تو فقط دوستی کی بات کر رہی ہو، میں کچھ اور بھی چاہتا ہوں۔"

"بولو، میں پورا کروں گی۔" وہ تیزی سے بولی۔

"وقت کا انتظار کرو" میں نے دھیرے سے کہا۔

"میں انتظار کروں گی، شام کو ملتے ہیں۔" اس نے جلدی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

اس کے فون نے میرے دماغ کی چولیں تک ہلا کر رکھ دی تھیں۔ میں نے ریسور کریڈل پر رکھا اور اس کی ایک ایک بات یاد کرنے لگا۔ بڑی معنی خیز باتیں کی تھیں اس نے اور وہ بھی بڑے اعتماد کے ساتھ۔ اس کا لہجہ میرے دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس کی ایک ایک بات اور دعوت دینے کا انداز کس قدر دھمکی آمیز تھا۔ تبھی اچانک میرے ذہن میں بجلی کی طرح یہ خیال کوندا کہیں رات والا حملہ ہما نے تو نہیں کروایا محض مجھے ڈرانے یا دھمکانے کے لیے؟ میں جیسے جیسے سوچتا چلا جا رہا تھا، مجھے اس کی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ تو اس قدر جذباتی ہوگئی تھی کہ اس کے کارندے سٹوڈیو میں ہی مجھے پر چڑھ دوڑے تھے۔ تو ہما اس سطح پر بھی اتر سکتی ہے؟ میں شاید اس بات پر مزید سوچتا، اسی لمحہ حسن اندر آ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"آج کھانے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے کیا، جان جی؟"

"نہیں، بس چلتے ہیں، پھر واپس بھی جلدی آنا ہے، ایڈیشن کی ڈمی دینا ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر راستے میں باتیں کرتے ہوئے ہم پریس کلب جا پہنچے۔ سیڑھیاں اترتے ہی سامنے ندیم کو بیٹھا ہوا پا کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

"شجاع بھائی! میں نے خبر پڑھی لیکن فون اس لیے نہیں کہ آپ ایک تو بہت فون سن چکے ہوں گے، دوسرا تفصیل فون پر تو نہیں بتائی جا سکتی اس لیے میں یہاں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

"بتاتا ہوں، کیا گوندل نہیں آیا ابھی تک۔۔۔؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ آکر چلا گیا ہے، کہہ رہا تھا کہ شام کو سٹوڈیو ہی ملیں گے" ندیم نے کہا تو مجھے قدرے افسوس سا ہوا۔ پھر کھانے کے دوران میں نے اسے رات ہونے والے واقعہ کے بارے میں بتا دیا اور صبح سے اب تک جو فون تھے، وہ بھی بتا دیئے۔ تبھی حسن بولا۔

"ہما کے بارے میں تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے، اس سے بہت محتاط رہنا"

"میں بھی یہی کہوں گا" ندیم نے چائے کے کپ کو آہستہ سے گھماتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟" میں نے تجسس سے پوچھا تو ندیم نے دھیرے سے کہا۔

"وہ اگر آج ٹاپ کلاس اداکارہ ہے تو وہ صرف اپنے بل بوتے پر نہیں آئی، ایک پوری لابی ہے اس کے پیچھے۔ اس میں کون کون لوگ ہیں، تفصیل سنو گے تو چکرا کے رہ جاؤ گے اور لوگوں کو چھوڑیں، ہمارے صحافی بھائی بھی شامل ہیں۔"

"تمہارا خیال ہے، گوندل؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی، مگر یہ افسوس کرنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ اس دنیا میں ہر بندہ اپنا فائدہ چاہتا ہے۔" ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے بتاؤ، ندیم! ہما کے پیچھے کون لوگ ہیں؟" میں نے تیزی سے اک خیال کے تحت پوچھا۔

"شجاع بھائی! میں آپ کو سب کچھ بتا دینے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ آپ نے اس شعبہ میں نہیں رہنا۔ جو وقت گزرتا ہے، اسے گزار لیں۔" ندیم نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"لیکن اس طرح تو میں اندھیرے میں۔۔۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہے، میں ہوں نا! میں گوندل نہیں ہوں اور نہ ہی کسی طوائف کی کمائی سے حصہ دار ہوں۔" ندیم نے اپنے مخصوص احتجاجی لہجے میں کہا۔

"چلو ٹھیک ہے، جیسے تم کہو۔ میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں" میں نے بات ختم کرنا چاہی تو حسن نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اسی موضوع پر باتیں کرتے رہنے کے بعد میں نے ندیم سے اپنے [illegible] کے بارے میں مشورہ کیا۔ اس نے بڑے خلوص سے مجھے بہت ساری باتیں [illegible] پھر شام کی چائے پی کر ہم وہاں سے اُٹھ گئے۔ میں دفتر چلا گیا اور حسن نکل گیا، ندیم [illegible] سٹوڈیو میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

شام ڈھل رہی تھی اور شفق ابھی واضح تھی۔ میں فریش ہونے کے بعد اپنے فلیٹ کی کھڑکی میں کھڑا کافی پی رہا تھا۔ میرے ذہن میں تیزی سے خیال گردش کر رہے تھے۔ میں جب سے ہمدانی صاحب چلے گئے تھے اور میں دوبارہ آفس آیا تھا تب ہی سے میں یکدم ہی بے سکون ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے سلیم فارانی تھا۔ اک انجانی دنیا میں چلے جانے کے باعث معاملات بجائے سلجھنے کے مزید الجھتے چلے جا رہے تھے۔ دفتر میں اور دفتر سے باہر بھی اک عجیب طرح کی بے اطمینانی پھیل گئی تھی۔ اگرچہ میں اپنے مخصوص ماحول سے نکلا تھا جہاں صرف سیاست کی زبان ہی سمجھی جاتی تھی لیکن شوبز کی دنیا میں آ کر بھی مجھے کوئی رنگینی نظر نہیں آئی تھی حالانکہ شوبز کو رنگین شعبہ سمجھا جاتا ہے جبکہ یہی میرے لیے سنگین بن گیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک اداکارہ میری راہ میں اس طرح آن کھڑی ہو گی کہ لوگ مجھے محتاط ہو جانے کے مشورے دینے لگیں گے۔ مجھ میں اتنی برداشت تھی کہ میں ہر طرح کے حالات کا سامنا کر سکوں اور میں ہر طرح کے حالات کا سامنا کرتا بھی آیا تھا لیکن یوں اچانک چکرا دینے والے حالات سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا

”کیا محض دو دنوں میں ہی گھبرا گئے؟“ میرے اندر سے یہ آواز ی اٹھی تو میں مسکرا دیا۔ میرا جواب ”نہیں“ میں تھا۔ دراصل انہی چند دنوں میں حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہوئے تھے کہ میں خود کو تیار نہیں کر پایا تھا۔

”تو کرونا خود کو تیار۔۔“ میرے اندر کے آدمی نے مجھے فوراً ہی مشورہ دے دیا۔

یہی وہ لمحہ تھا جس سے میں پر اعتماد ہو گیا۔ حالات جیسے بھی ہوں، مجھے ان کا سامنا کرنا تھا چاہے مجھے اس کے لیے چومکھی لڑائی ہی کیوں نہ لڑنا پڑے مگر میری ایک اپنی سطح تھی، میری اپنی شخصیت جس پر بہر حال میں کوئی داغ نہیں لگنے دینا چاہتا تھا۔ یہ دنیا چاہے جیسی بھی تھی، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے تو اس چیلنج کا سامنا تھا جو خواہ مخواہ مجھ پر مسلط کر دیا گیا تھا۔

شوبز جو فن اور فنکاروں کی دنیا ہے۔ اس کو بھی بڑے عجیب و غریب حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ کبھی اس میں وہ لوگ تھے جنہیں اگر غرض تھی تو محض فن سے، وہ تخلیق کار تھے۔ ان کے نزدیک دولت اتنی اہمیت نہیں رکھتی تھی جتنی فن کی قدر افزائی ان کے نزدیک اہم تھی۔ جہاں مادہ پرستی نے زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا وہاں شوبز کے حالات بھی تبدیل ہوتے چلے گئے۔ کالے دھن کو سفید کرنے والے اس دنیا میں وارد ہوئے تو ماحول ہی تبدیل ہو گیا۔ یہاں ہر چیز کو دولت سے ناپا جانے لگا، یہاں تک کہ جذبے بھی دولت کے زیر اثر آ گئے۔ فن کی قدر بہت پیچھے رہ گئی، اک نئی طاقت جو اس دنیا میں وارد ہو چکی تو سبھی اسی کے سامنے جھکنے لگے تھے۔ وہ

لوگ جنہیں قلم کی حرمت کا پاس تھا، وہ بھی اس میں بہہ گئے۔ اور جو بچے وہ سکرین کے پیچھے گھور اندھیرے میں کھو گئے۔ منٹو جو ایک کہانی کار تھا اور ساغر صدیقی جو گیت نگار تھا ان راہوں پر۔۔۔ فون کی گھنٹی نے مجھے خیالوں سے واپس آنے پر مجبور کر دیا۔ کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے گھونٹ بھرا اور مگ ایک طرف رکھ کر فون ریسو کیا۔ دوسری طرف ندیم تھا، اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''شجاع بھائی! کہاں ہیں آپ؟''

''ابھی تک تو گھر میں ہوں'' میں کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔

''تو آ جائیں نا! وہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''کوئی خاص بات؟'' میں نے یونہی پوچھا۔

''آج میں آپ کو اپنی دوست سے ملواتا ہوں، وہ ادھر ہی ہے'' اس نے تیزی سے کہا۔

''بس آ رہا ہوں نا، یار!'' میں نے کہا، اور پھر تھوڑی دیر بعد سٹوڈیو کی طرف نکل گیا۔

خلاف توقع مجھے ندیم دکھائی نہیں دیا۔ میں کچھ دیر سٹوڈیو میں گزار کر واپس پارکنگ میں آیا کہ ایک گاڑی زن سے آئی اور مجھ سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ اگلے ہی لمحہ اس میں سے ہما نکلی، شاید وہ مجھے گاڑی میں ہی دیکھ چکی تھی اس لیے اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے گارڈ اس کے دائیں بائیں تھے۔ میں اسے نظر انداز کرتا ہوا پارکنگ کی طرف جانے لگا تو اس نے مجھے آواز دے لی۔

''حضور! ہمارے ساتھ ناراضگی ہے کیا؟'' ہما نے چبھتے ہوئے لہجے میں ہنستے ہوئے کہا۔ میں رک گیا اور چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لا کر بولا۔

''ہماری دوستی تو اب شروع ہوئی ہے، اس میں ناراضگی کہاں سے ٹپک پڑی؟''

''شکر ہے، آپ نے ہماری دوستی کو مانا تو۔۔۔ خیر آئیں، کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔''

''ابھی وقت نہیں ہے۔۔۔ آپ کا سیٹ پر انتظار ہو رہا ہے اور مجھے بھی کام ہے۔ ملتے ہیں کسی وقت۔''

''میری آفر ہر وقت آپ کے لیے ہے'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں سمجھتا ہوں'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھی بات ہے کہ آپ سمجھ جائیں ورنہ سمجھانا پڑتا ہے۔'' اس بار اس کا لہجہ نرم نہیں تھا۔ تب غصے کی ایک لہر میرے دماغ کو چڑھ گئی، تاہم میں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''اصل میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سمجھ بہت جلدی جاتے ہیں لیکن اس کا

اظہار نہیں کرتے، کچھ سمجھتے ہوئے بھی نہیں سمجھنا چاہتے اور کچھ لوگ سمجھتے بعد میں ہیں لیکن سمجھا پہلے دیتے ہیں اس لیے تم بھی سمجھو۔ کہیں تمہیں سمجھانے کے لیے وقت نہ نکالنا پڑ جائے ل یو، بائے!''

ہما نے میری اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بس مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے پارکنگ سے گاڑی نکالی اور اسے نظر انداز کرتا ہوا نکل پڑا، میں نے سٹوڈیو کا گیٹ کراس کیا ہی تھا کہ ندیم کا فون آ گیا۔

''بھئی، کہاں ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''یہیں ملتان روڈ پر ایک پی سی او سے فون کر رہا ہوں، آپ کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا تو میں نے اسے بتا دیا، تب وہ بولا۔ ''چلیں، آپ آ جائیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے پی سی او کا نام اور لوکیشن بتا کر فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں وہاں پہنچ گیا۔ وہ سڑک کے ساتھ ہی ذرا ہٹ کر کھڑے تھے، اس کے ساتھ ایک نوخیز سی لڑکی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا، بلاشبہ وہ حسین لڑکی تھی۔ ایک ہی نظر میں اس کی کشش نے توجہ حاصل کر لی تھی، رسمی سی باتوں کے بعد ندیم بولا۔ ''شجاع بھائی! میں اسے سٹوڈیو نہیں لے جانا چاہ رہا تھا، ایویں خواہ مخواہ نظروں میں آ جاتا اور ابھی میں اس کے بارے میں بتانا بھی نہیں چاہ رہا ہوں''

''تو بابا، اسے کسی ریستوران میں لے جاتے''

''وہی تو چاہ رہا تھا۔ آپ نے دیر سے آنے کا کہا تو ہم گھر سے ہی دیر کر کے نکلے ہیں۔''

''اوہ۔! تو چلو، اب چلتے ہیں'' میں نے کہا۔

''مجھے ایویں ذرا سا کام ہے سٹوڈیو میں، بس گیا اور آیا۔ آپ اتنی دیر میں دونوں ہی بور نہیں ہوں گے، ہو سکتا ہے، ہم کھانے کے بعد آپ ہی کے ہاں ٹھہر جائیں۔'' ندیم ہنستے ہوئے بولا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے آنے تک آپ اچھے خاصے بے تکلف ہو چکے ہوں گے، میں نے غائبانہ تعارف کرا دیا ہے۔'' اس نے کہا تو میں نے وہیں سڑک پر کھڑے ہو کر اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے میں نے سختی سے کہا۔

''گاڑی میں بیٹھو۔'' یوں وہ دونوں چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے گاڑی بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اگر بہت ضروری کام ہے نا تو ہمیں ڈراپ کر کے گاڑی لے آنا، پھر سکون سے اپنا کام کر کے واپس آ جانا۔''

''جی ٹھیک ہے'' اس نے دھیرے سے کہا اور پھر دبئی چوک کے اوپن ائیر

ریستوران تک ہمارے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ وہ پارکنگ ہی سے گاڑی لے گیا۔ سلمیٰ میرے سامنے والی میز پر بیٹھی اور میری جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ندیم آپ کی بڑی تعریف کرتا ہے، حالانکہ اسے آپ سے ملے چند دن ہی ہوئے ہیں۔''

''ہاں۔! ایسا ہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کی اچھائی ہے'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''اعتماد تو آپ پر ایسا ہے کہ جیسے برسوں سے آپ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔'' وہ آنکھوں میں ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں۔! کچھ لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں کہ پہلی نگاہ میں یہ احساس دے جاتے ہیں کہ وہ اپنے ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

تب میں نے اس کا بھرپور جائزہ لیا۔ پہلی نظر میں اس کی آنکھیں متوجہ کر لینے والی تھیں۔ قدرے کھڑی ناک کے ساتھ پتلے پتلے ہونٹ، لمبی گردن، سفید رنگ، خوب گھنے بال اور پتلی سی، اس کے بدن پر لباس اتنا زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ کان میں پڑے بندے شاید سونے کے رہے ہوں گے۔ ہمارے بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد بیرا آ گیا۔ میں نے فی الحال اسے کولڈ ڈرنک لانے کو کہا، وہ واپس مڑ گیا اور ہمارے درمیان باتیں شروع ہو گئیں۔ وہ بی ایس سی کر چکی تھی اور اب مزید پڑھنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی کوشش میں تھی۔ ندیم سے اس کی ملاقات چند ماہ پہلے ہی ہوئی تھی۔ اصل میں وہ شوبز میں آنا چاہ رہی تھی۔ بقول اس کے، یہ اس کی خواہش ہی نہیں بلکہ مجبوری بھی تھی۔ میں نے یہ تو معلوم نہیں کیا کہ اس نے اس بارے میں کیا کیا خواب دیکھے ہیں اور اس نے شوبز ہی کو کیوں چنا تاہم میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ اگر کوئی اسے سہارا دے دے تو اس میں اتنی صلاحیت لگتی تھی کہ وہ اپنا نام بنا جائے۔ اب اس کی تقدیر کیا تھی، میں اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ اپنی خواہش یا مجبوری کے تحت شوبز میں آنے کا ہچتی بھی رہی لیکن انتہائی محتاط انداز میں، پھر کالج فنکشن میں نمایاں طور پر سامنے آ جانے کی ہے ایک خاتون رپورٹر سے اس کا رابطہ ہوا تو اس نے ندیم سے ملوا دیا، یوں یہ تعلق دوستی میں بدل گیا۔ میں نے اس کے گھریلو معاملات جاننے کی ذرا بھی کوشش نہ کی اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت تھی، بس یونہی شوبز کے حوالے سے اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ ہمیں باتیں کرتے کافی وقت گزر گیا لیکن ندیم نہ پہنچا۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا کہ اگر اسے دیر لگا کر آنا تھا تو پہلے ہی بتا دیتا یا پھر اسے فون کر دینا چاہیے تھا۔ مجھے وقت کا احساس اس وقت ہوا جب بیرا

دوسری بار پوچھ کر چلا گیا۔ میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

’’اسے ایسا پتہ نہیں کیا کام پڑ گیا جو ابھی تک نہیں پہنچا؟‘‘

’’مجھے بھی خیال آرہا تھا لیکن میں نے اظہار نہیں کیا؟‘‘ سلمیٰ نے دھیرے سے کہا۔

’’کیوں نہ اسے تھوڑی سی سزا دے دی جائے؟‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’کیا مطلب۔۔۔سزا کیسے؟‘‘ وہ بولی۔

’’ہم کھانا کھا لیتے ہیں۔ وہ جب آئے گا تو دیکھ لیں گے‘‘ میں نے کہا اور اشارے سے بیرے کو بلا لیا، اسے آرڈر لکھوایا تو وہ چلا گیا۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ندیم نے دیر کیوں کر دی؟ اس وقت تک سلمیٰ کی جھجک دور ہو چکی تھی لیکن ندیم کے نہ آنے کے باعث اک عجیب سے وسوسے نے مجھے آن گھیرا، سلمیٰ کا وجود مجھے کھٹکنے لگا۔ محض چند دن کی ملاقات اور ندیم پر بھروسہ کہیں کسی اور ہی کہانی کی بنیاد نہ بن جائے۔ آخر وہ مجھے اس سے کیوں ملوانا چاہتا تھا اور پھر میرے پاس چھوڑ کر وہ خود غائب ہو گیا، آخر یہ کیا معمہ ہے۔ ابھی سارا دن پچھلی رات کے ہونے والے واقعہ کی بازگشت ختم نہیں ہو پا رہی تھی اور اب۔۔۔؟

’’کیا سوچنے لگے آپ۔۔۔؟‘‘ سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے بڑی ادا سے کہا۔

’’یہی کہ ندیم کیوں نہیں آیا؟ میں واقعی اس کے بارے میں پریشان ہو گیا ہوں۔‘‘

’’وہ ایسا ہی ہے، کبھی کبھی مجھے اس کا بہت انتظار کرنا پڑتا ہے۔‘‘ وہ بولی۔

’’یہ اچھی بات تو نہیں ہے نا۔‘‘ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

’’ہاں، اچھی تو نہیں لیکن بس چل رہا ہے۔۔۔‘‘ سلمیٰ نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔

کھانے کے دوران ایسے ہی ہلکی پھلکی باتیں چلتی رہیں جبکہ میرے اندر کے وسوسے زیادہ شدت سے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔ وہ شوبز کی دنیا میں چانس کی تمنا رکھتی تھی۔ ایسا چانس دودھا کہ خیز ہو، ایسا نہیں کہ بس چھوٹے چھوٹے کرداروں کے سہارے آگے بڑھا جائے۔ آہستہ آہستہ وہ کھل رہی تھی۔ مجھے احساس ہو گیا کہ وہ کیا چاہتی ہے لیکن میں نے اپنے احساس کا اس پر اظہار نہیں کیا۔ میں فطری طور پر خاموش ہو چکا تھا، بس اس کی سنتا رہا۔ نجانے کیوں میں اس وقت سلمیٰ سے جان چھڑا لینا چاہتا تھا۔ اس وقت ہم کھانے کے بعد کولڈ ڈرنک پی رہے تھے کہ میرا فون بج اُٹھا۔ میں نے جلدی سے آن کر کے ’’ہیلو‘‘ کہا تو ایک اجنبی سی آواز تھی، اس نے پوچھا۔

’’آپ شجاع صاحب ہیں؟‘‘

’’جی، فرمایئے؟‘‘

''میں شان ہسپتال سے بات کر رہا ہوں۔ آپ کے دوست ندیم کو حادثہ پیش آ گیا ہے، وہ ادھر ہمارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے اطلاع کرنے کے لیے کہا ہے۔''

''وہ خیریت سے ہے؟'' میں بوکھلا گیا تھا۔

''اتنا زیادہ سیریس نہیں ہے، آپ خود آ کر دیکھ لیں۔'' اس نے غیر جذباتی انداز میں کہا تو میں نے اس کا پتہ سمجھ کر فون بند کر دیا۔

''خیریت؟'' سلمٰی نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

''نہیں، خیریت نہیں ہے۔ ندیم کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔۔۔ آؤ چلیں'' میں نے جلدی سے بل ادا کیا اور رکشے میں جا بیٹھا۔ میں قدرے پریشان ہو گیا تھا۔ جس قسم کے پے در پے حالات سامنے آ رہے تھے، ان میں کچھ بھی ممکن تھا۔ یہی سوچتے سوچتے اچانک مجھے یہ خیال آیا کہ مجھے ٹریپ کرنے کے لیے تو حادثہ کا ذکر نہیں کیا گیا؟ یہ خیال آتے ہی میں مضمحل سا ہو گا، ایک بے چینی تھی جو میرے اندر سرائیت کر گئی۔ اک لمحہ کو میں نے اس کا سامنا کرنے کے لیے متبادل سوچنا چاہا لیکن میرے اندر کے ضدی اور انا پرست شخص نے ذرا بھی قبول نہیں کیا، کوئی میرے اندر بیٹھا بول رہا تھا۔۔۔ ''مرد بنو، مرد! حالات کا سامنا کرو۔ کیا ہو جائے گا، تمہیں مار ڈالیں گے تو پھر کیا ہے۔ موت سے ڈرتے ہو؟ اگر تم ڈر گئے تو تمہیں ڈرانے والے اور بہت سارے لوگ پیدا ہو جائیں گے۔'' میرے اندر کے شخص نے مجھے ڈھیروں حوصلہ دے دیا۔ ہسپتال کے عین سامنے رکشا رکا تو میں نے پیسے دیئے اور استقبالیہ پر جا پہنچا۔ وہ ایک پرائیویٹ ہسپتال تھا۔ کاؤنٹر پر ایک سانولا سا شخص بیٹھا تھا، وہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے ندیم کے بارے میں پوچھا۔

''اچھا تو آپ شجاع ہیں، میں نے ہی آپ کو فون کیا تھا'' پھر ایک وارڈ بوائے نما شخص کو بلا کر اس نے ندیم سے ملوانے کا کہہ دیا۔ چند لمحوں بعد ہم ندیم کے پاس تھے۔ اس کے بازو پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور باقی جسم کمبل میں تھا۔ وہ ہوش میں تھا، مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ میں اس کے قریب جا بیٹھا اور دھیرے سے پوچھا۔

''کیسے ہوا یہ سب؟'' اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میں ابھی سٹوڈیو سے کچھ فاصلے پر تھا کہ ایک جیپ میرے دائیں طرف سے آئی اور اس نے مجھے سائیڈ ماردی، رفتار زیادہ تیز نہیں تھی اس لیے اتنی زیادہ چوٹیں نہیں آئیں۔ میں سڑک پر گر گیا تو مجھ پر دو فائر ہوئے جو مجھے نہیں لگے پھر وہ اچانک ہی غائب ہو گئے۔''

''تم نے انہیں دیکھا، کسی کی شکل یا جیب پہچان سکتے ہو؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''نہیں، میری کوشش تھی کہ میں دیکھ لوں مگر نہیں دیکھ سکا۔''

''اور چوٹیں، میرا مطلب کوئی ہڈی وغیرہ؟''

'' خدا کا شکر ہے، کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی۔'' اس نے پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو مجھے حوصلہ ہوا۔ پھر وہ سلمٰی سے باتیں کرنے لگا۔ چند باتوں کے بعد وہ سلمٰی سے کہنے لگا۔

''تم اگر جانا چاہو تو چلی جاؤ''

''نہیں۔ میں ادھر ہی رہوں گی، تمہارے پاس'' سلمٰی نے جذباتی سے انداز میں کہا تو میں نے ندیم سے پوچھا۔

'' مجھے یہ بتاؤ، تم سٹوڈیو لینے کیا گئے تھے؟''

'' میں نے کہا نا، کوئی کام تھا'' وہ دھیرے سے بولا۔

'' کیا کام تھا؟'' میں نے تلخی سے پوچھا تو اس نے سلمٰی کی طرف دیکھا پھر میری طرف، میں سمجھ گیا کہ وہ اس کے سامنے بتانا نہیں چاہ رہا۔ میں نے سلمٰی کو باہر بھیج دیا تو اس نے کہا۔

'' شجاع بھائی! آج میرے پاس ایک ٹکا بھی نہیں تھا۔ یہ اچانک ہی مجھے مل گئی، اب میں اس سے یہ تو اظہار نہیں کرسکتا تھا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں نے اپنے ایک دوست سے پیسے مانگے تھے، اس نے سٹوڈیو میں لے لینے کا کہا۔ پھر میں نے بہت سوچ کر آپ کو فون کیا۔''

'' اوہ، تو یہ بات تھی، مگر بے وقوف! جب میں آ گیا تھا تو پھر تمہیں کہیں جانے کی ضرورت کیا تھی؟''

'' بس ایویں لالچی سا ہو گیا تھا کہ آپ کے سامنے بھی بھرم رہ جائے'' اس نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا تو مجھے اس پر بہت پیار آیا۔

'' آئندہ ایسا نہیں سوچنا'' یہ کہہ کر میں نے سلمٰی کو آواز دے دی، وہ آ کر ایک طرف بیٹھ گئی تو میں نے کاؤنٹر پر جا کر کچھ پیسے جمع کروا دیئے۔ ڈاکٹر سے مل کر اس کی صحیح صورت حال کے بارے میں پوچھا، اس نے مجھے تسلی دی کہ اتنا زیادہ سیریس نہیں ہے اور ٹسٹ وغیرہ کے بعد مزید تسلی ہو جائے گی۔ اس کا خیال تھا کہ دو چار دن میں گھر چلا جائے گا۔ وہاں سے پوری تسلی کرنے کے بعد میں ندیم کے پاس آ گیا اور اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''محض روڈ ایکسیڈنٹ

بتانا، فائرنگ کا ذکر نہیں کرنا۔ یونہی بات کا بتنگڑ بنے گا‘‘

’’کیا آپ دشمنوں سے خوفزدہ ہیں؟‘‘ سلمٰی جلدی سے بولی۔

’’نہیں، وہ اندھیرے میں ہیں۔ ہم اگر وار کرنا بھی چاہیں تو کس پر کریں؟‘‘ میں نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’آپ پر اور مجھ پر۔۔۔ کہیں یہ ایک ہی طرف سے تو تسلسل نہیں ہے؟‘‘ ندیم نے کہا۔

’’نہیں، کچھ اور ہے یا پھر ہو بھی سکتا ہے لیکن خیر، تم دماغ مت کھپاؤ۔ وہ ڈاکٹر تمہیں نیند کا انجکشن لگا دے گا۔ تم آرام کرو، صبح ملاقات ہوگی۔‘‘

’’ایک بات اور۔۔۔‘‘ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

’’بولو؟‘‘ میں اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

’’یہ سلمٰی کو اپنے ساتھ لے جائیں، صبح یہ چلی جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر والوں کے یا اور کسی کے سامنے۔۔۔ آپ سمجھیں نا......!‘‘

’’او کے، لیکن تمہارے گھر والوں کو کیسے پتہ چلے گا؟‘‘

’’میں انہیں صبح مطلع کر دوں گا، سلمٰی کی وجہ سے میں نے ابھی انہیں نہیں بتایا۔‘‘

’’چلو ٹھیک ہے۔ کسی بھی معاملے میں پریشان نہیں ہونا، بس جلد از جلد ٹھیک ہونے کی کوشش کرنا، سمجھے!‘‘ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ پھر سلمٰی اس سے باتیں کرنے لگی تو میں کمرے سے نکل گیا۔ کیا یہ میری طرح کا ہی ندیم پر قاتلانہ حملہ تھا۔ میں تمام راستے یہی سوچتا ہوا آیا۔ اس حملے انداز بھی مجھ پر ہونے والے حملے جیسا ہی تھا۔ محض دھمکانا۔ وہ کس لینے پر ہی یوں حملہ آور ہو رہے تھے۔ ان کی پشت پر کون ہو سکتا تھا؟ میں اسی سوال کا جواب چاہتا تھا۔ میرا گمان مجھے یہ کہہ رہا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے، خود سامنے آنے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا۔ اسے مجھے ہی ڈھونڈ نکالنا ہوگا اور اس کے لیے برداشت اور حوصلہ چاہیے تھا۔ میں اب کوئی ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے میرے اردگرد اندھیرا ہی رہے اور میں روشنی [illegible] ملوں۔ مجھے ندیم کے زخمی ہو جانے کا بے انتہا دکھ تھا، یہی دکھ میرے اندر کے وحشی پن کو ابھارنے کا باعث بن رہا تھا۔ حالات مجھے برداشت کرنے اور حوصلہ نہ ہارنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ یہ تضاد میرے اندر اک نئی قسم کی کشمکش پیدا کرنے کا محرک بن گیا تھا۔ میں نے فلیٹ کا دروازہ کھولا تو سلمٰی نے دھیرے سے پوچھا۔

’’آپ یہاں تنہا رہتے ہیں؟‘‘

’’ہوں؟‘‘ میں نے ہنکارا بھرا اور بتیاں روشن کر دیں۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی تو

میں نے پوچھا۔'' کچھ کھاؤ پیو گی؟

''میرا تو دل نہیں چاہ رہا لیکن آپ چاہیں تو میں آپ کو بنا دیتی ہوں؟''

''مجھے اس وقت کافی کی شدت سے طلب ہو رہی ہے اور میں نے ابھی کام بھی کرنا ہے۔''

''میں ابھی بنا دیتی ہوں، کچن کدھر ہے؟'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ پھر میرے بتانے پر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی اور میں باتھ روم سے فریش ہو کر لکھنے کی میز پر آ بیٹھا۔ میں نے کاغذ سیدھے کیے اور سب کچھ ذہن سے نکال کر ایڈیشن کے بارے میں سوچنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کافی کا مہکتا ہوا مگ لے کر آ گئی۔

''اپنے لیے نہیں بنائی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، میرا جی نہیں چاہ رہا'' وہ میرے پاس کھڑے بولی تو میں نے کہا۔

''سلمٰی مجھے کام کرتے ہوئے شاید دیر ہو جائے۔ تم جاؤ، سو جاؤ، میں معذرت خواہ ہوں کہ تم سے باتیں نہیں کر پا رہا ہوں۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، گڈ نائٹ!'' وہ یہ کہتے ہوئے مڑ گئی اور میں نے اپنی پوری توجہ لکھنے کی طرف مرکوز کر لی۔ صبح معمول کے مطابق ہی میری آنکھ کھلی، نیند کا خمار مجھے بستر سے اٹھنے نہیں دے رہا تھا مگر جی نہ چاہنے کے باوجود میں اُٹھ گیا۔ میں نے اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولا تو سامنے ہی سلمٰی اخبار پڑھنے میں منہمک تھی، تبھی میرے ذہن میں آیا کہ وہ بھی یہیں موجود ہے۔ آہٹ سے اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دی، جواباً میں بھی مسکرا دیا۔

''آپ تو ابھی سے اُٹھ گئے۔ میں تو سوچ رہی تھی، آپ کافی دیر سے اُٹھیں گے۔'' سلمٰی نے خوش دلی سے کہا۔

''برسوں سے عادت ہے اس لیے آنکھ کھل گئی '' پھر میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' لگتا ہے، تم فریش ہو چکی ہو؟''

''جی، آپ نہا لیں، میں ناشتہ بنا دیتی ہوں۔ کیسا کرتے ہیں ناشتہ؟''

''جیسا تمہارا من چاہے، میرا خیال ہے، فریج میں اتنا کچھ تو ضرور ہوگا۔ دیکھ لو، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں مارکیٹ سے لے آتا ہوں۔''

''میں نے دیکھا ہے، سب کچھ ہے، آپ فریش ہو لیں۔'' اس نے کہا تو میں باتھ روم میں جا گھسا۔ ناشتہ کے دوران سلمٰی نے اچانک پوچھا۔

''آپ کے خیال میں ندیم پر کس نے حملہ کیا ہوگا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ سوچتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔
''میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بات تمہارے سوچنے کی نہیں ہے''
''وہ کیوں، میرے سوچنے کی کیوں نہیں ہے؟'' وہ تنک کر بولی۔
''اس لیے کہ نہ تمہیں پس منظر کا پتہ ہے اور نہ ہی موجودہ صورت حال کے بارے میں خبر ہے، سوچو گی تو الجھ جاؤ گی، خیر، یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا پروگرام ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دل تو چاہتا ہے کہ یہیں رہوں لیکن جانا تو ہے نا'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو میں چونک گیا۔ وہ اپنے لفظوں میں مجھے کچھ اور ہی معنی سمجھا رہی تھی یا پھر میرا وہم تھا۔ میں نے سمجھنے کے لیے پوچھا۔
''مطلب؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی۔
''مطلب یہ کہ اتنی پرسکون تنہائی اور پھر سب کچھ اس چھوٹے سے فلیٹ میں موجود ہے'' اس نے بڑی حسرت سے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کس خواہش کے تابع ایسا کہہ رہی ہے۔
''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، تم رہو یا جاؤ'' میں نے اس کا دل رکھنے کو کہہ دیا۔
''بہت شکریہ، اب میں کبھی کبھی آجایا کروں گی'' اس کے لہجے سے حسرت نہ گئی تھی۔
''جیسا تم چاہو'' میں نے چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ نکلنا چاہو تو ٹھیک ورنہ جب چاہو، چلی جانا'' مجھے اس پر ترس سا آگیا تھا۔
''میں ابھی کچھ دیر بعد جاؤں گی'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔
''اوکے، میں جا رہا ہوں'' یہ کہہ کر میں نے سگریٹ سلگایا اور فون اٹھا کر نکلتا چلا گیا۔ میرے ایڈیشن کا مواد میری جیب میں تھا۔ میں دفتر پہنچا اور میٹنگ سے پہلے ہی مواد کمپوز ہونے کے لیے دے دیا۔ تبھی حسن آن پہنچا تو میں نے اسے رات کی صورت حال کے بارے میں بتا دیا۔

''اوہ، یہ تو بہت برا ہوا، اب کیسی طبیعت ہے اس کی، جان جی؟''
''ٹھیک ہے وہ، میٹنگ کے بعد چلتے ہیں'' میں نے کہا تو وہ سوچنے والے انداز میں بولا۔

''شجاع، یار! یہ یکدم کیا ... ع ہو گیا ہے، ہما کو اتنا کیا کہہ دیا ہے جان جی، کہ وہ اس طرح کی دھمکیوں پر اتر آئی ہے، عجیب غنڈہ گردی ہے، تم کچھ کرتے کیوں نہیں ہو؟''
''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ہم آئی جی سے بات کرتے ہیں اور دوسری طرف ایسا ہی کوئی تماشا اسے بھی دکھا دیتے ہیں، جان جی!'' اس نے چٹکی بجا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں، وہ عورت ہے اور میں اس سے انتقام لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، یہ میری مردانگی کے خلاف ہے۔''

''جب گولی تمہارے جسم کے آر پار ہو جائے گی تب تمہاری مردانگی کی۔۔۔''

''تم نہیں سمجھو گے، یار! لیکن مجھے پوری طرح یہ بھی تو یقین نہیں ہے کہ یہ سب ہما ہی کے ایما پر ہو رہا ہے'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''پھر کون ہے؟'' وہ الجھتے ہوئے بولا۔

''یہی کنفرم کرنا ہے اور جب یہ کنفرم ہو گیا تو پھر دیکھنا حسن! میں اندھیرے میں اپنے تیر ضائع نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے کہا اور ہم رپورٹنگ روم کی طرف چل پڑے۔

''آ گئے راجہ اندر۔۔۔!'' ماریہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا تو یکدم غصہ میرے دماغ کو چڑھ گیا مگر میں نے برداشت کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''تمہیں کیسے پتہ کہ میں راجہ اندر ہوں؟'' میرے اس طرح کہنے پر وہ یکدم بوکھلا گئی۔ پھر اگلے ہی لمحے خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''تم نے ہی تو بتایا ہے مجھے'' اس کے جواب میں میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا مگر اسے کہہ نہ سکا، بس اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔ ''بولو۔۔۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟''

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی میز پر جا بیٹھا۔ میں چیف رپورٹر کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئے تو میٹنگ شروع ہو، تبھی پیون نے آ کر کہا۔

''آپ کو فارانی صاحب بلا رہے ہیں'' اس کے اس طرح کہنے پر مجھے غصہ آ گیا۔ اسے پتہ تھا کہ میں یہاں ہوں اور وہ انٹرکام پر بھی مجھے بلا سکتا تھا یا کوئی جو بات کرنا تھی، کر سکتا تھا۔ پیون کو بھیج کر مجھے یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ براہ راست بات کرنے کے لیے ریسور اٹھانے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔

''جاؤ، اسے کہو کہ میرے پاس وقت نہیں ہے، ارجنٹ ہے تو فون پر بات کر لے۔''

''سر، آپ کو فارانی صاحب نے۔۔۔'' پیون نے حیرت سے کہا۔

''تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ تیزی سے

مڑ گیا۔ میٹنگ ختم ہو جانے تک فارانی کی طرف سے کوئی ردعمل نہ ہوا۔ میں نے حسن کو لیا اور ندیم کی طرف چل دیا۔ کافی دیر تک ہم میں خاموشی رہی۔ حسن اپنی گاڑی خود ڈرائیو کر رہا تھا، تب اچانک اس نے کہا۔

''یار! ماریہ تمہارے ساتھ اس قدر بدتمیزی سے کیوں پیش آتی ہے؟''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ وہ تمہارے ساتھ طنزیہ گفتگو کرتی ہے۔ تم غصے میں بھی آتے ہو، پلٹ کر کوئی جواب بھی نہیں دیتے ہو اور بس سلگتے رہ جاتے ہو''

''تم کیا سمجھتے ہو؟'' میں نے جان بوجھ کر بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھنا ہی تو چاہ رہا ہوں۔ آج اس نے جو بات کی، اس کے ردعمل میں تم نے فارانی کے پیغام پر سخت رویہ اپنا لیا۔ یہ سلگنا نہیں تو اور کیا ہے، جان جی؟''

''اب یہ تو ماریہ سے ہی پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟'' میں نے دھیرے سے کہا

''اب اسے بھی کہنا کہ تمہاری مردانگی ہے کہ تم اس سے یہ تک نہیں پوچھ سکتے؟'' وہ بولا

''تم اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یار! بات ہی ایسی ہے۔ وہ جب چاہے، کسی کے بھی سامنے اول فول بک دیتی ہے اور تم خاموش رہو''

''کہنے دو، ہمارا کیا لیتی ہے۔''

''بہت کچھ لیتی ہے۔ مجھ سے ایسی کوئی ایک بات کہے تو میں چار سنا دوں۔ آخر تمہاری کیا کمزوری اس کے ہاتھ میں ہے جو تم اس کے سامنے نہیں بول سکتے؟''

''چھوڑو، ابھی وقت نہیں ہے، پھر کبھی تمہیں تفصیل سے بتا دوں گا۔''

''اب کیوں نہیں؟'' اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہ۔

''وقت کا انتظار کرو، تمہیں سب پتہ چل جائے'' میں نے خوش دلی سے کہا تو وہ بڑ بڑانے لگا جس کی مجھے قطعاً سمجھ نہیں آئی۔ کچھ دیر بعد ہم ندیم کے پاس پہنچ گئے۔ اس کے گھر والے آئے ہوئے تھے اس لیے ہم کچھ دیر ہی ٹھہرے۔ چلتے وقت میں نے کچھ نوٹ اس کے ہاتھ میں چپکے سے تھما دیئے، وہ انکار کرنے لگا تو میں نے زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیے۔ تب اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سلمٰی کے بارے میں پوچھا، میں نے اشارے میں اسے مطمئن کر دیا۔

وہ میرا سارا دن دفتر میں گزر گیا۔ شام سے ذرا پہلے عامر بشیر آ گیا۔ میں اس وقت اپنے ایڈیشن کی کاپی بھجوا کر اس انتظار میں تھا کہ کاپی چھپ جائے تو میں ایک نظر دیکھ لوں۔ حسن کہیں گیا ہوا تھا، وہ اسی کی سیٹ پر آ بیٹھا۔ رسمی سی باتوں کے بعد اس نے کہا۔

''یہ ہما سے تمہارا کیا پھڈا چل رہا ہے؟''

''میرا تو کوئی نہیں ہے، وہ اگر سمجھتی ہے تو سمجھتی رہے''

''مجھے خبر ملی تھی کہ تم پر کوئی حملہ ہو گیا ہے''

''یہ تو پرانی بات ہے، اس بارے میں ہماری بات ہو گئی تھی ''

''نہیں، میں رات کی بات کر رہا ہوں لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ تم نہیں، کوئی اور تھا۔'' اس نے کہا تو میں ٹھٹک گیا۔ اسے ایسی معلومات کہاں سے مل جاتی ہیں؟ میں اگر اس سے پوچھتا تو لازماً اس واقعہ کی تصدیق کر دیتا اور وہ اگر بتانا نہ چاہتا تو ہنس کے یہ کہہ سکتا تھا کہ میں دوستوں کی خبر رکھتا ہوں۔ تب میں نے گوندل کے سے انداز میں پوچھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میرے اس طرح کہنے پر وہ یکدم پریشان ہو گیا، پھر اضطراری انداز میں بولا۔

''یار! مجھے پتہ چلا تھا کہ تم پر دوبارہ حملہ ہوا ہے اور حملہ آوروں کا نشانہ کوئی اور بن گیا ہے''

''تمہیں یہ بات معلوم کیسے ہوئی؟ اپنے ذرائع کو درست کرو۔''

''خیر، تم اب نہ مانو تو الگ بات ہے۔ مجھے تو تفصیل سے پتہ ہے''

''میں تمہیں تفصیل سے کیا بتاؤں اگر تمہیں پتہ ہے تو ۔۔۔ مگر اس سے یہ بھی گمان کیا جا سکتا ہے کہ تم حملے کروا رہے ہو مجھ پر؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بہت افسوس ہے، یار! اگر تم یہ گمان کرو، یہ افسوس تم پر نہیں، مجھے اپنی ذات پر ہو گا۔ میں تو پورے خلوص سے تمہارے بارے میں خبر رکھتا ہوں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

'' اور میں پورے خلوص سے یہ پوچھنے میں حق بجا ہوں کہ تمہارا ذریعہ کون سا ہے جو تمہیں میرے بارے میں خبریں دیتا ہے؟'' میں نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اصل میں میری حسن سے اس بارے میں خاصی بحث ہوئی ہے، اس نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہیں سمجھاؤں'' اس نے پریشان ہوتے ہوئے سارا سسپنس توڑ دیا۔

''کیا سمجھانا چاہ رہے ہو مجھے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دو باتیں۔ ایک تو یہ کہ تم اپنی حفاظت کے لیے کچھ بندوست کرو اور دوسرا قانونی

طور پر۔۔۔"

"مثلاً کیا کروں میں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اپنی حفاظت کے لیے کوئی گارڈ، کوئی سیکورٹی، کسی طرح بھی کوئی بندوبست کرلو اور حسن ٹھیک کہتا ہے کہ ہمیں آئی جی سے بات کرنی چاہیے۔" وہ بڑے نرم انداز میں بولا۔

"وہ ٹھیک ہے، ہم آئی جی سے بات کر لیتے ہیں۔ ایسا ہونا چاہیے لیکن یہ گارڈ وغیرہ، کیا مضحکہ خیز لگے گا، یار۔!" میں نے الجھتے ہوئے کہا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تمہیں شاید میرے ماضی کا نہیں پتہ، میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں۔ یار۔! یہ ہتھیار وغیرہ کبھی میرے لیے کھلونے رہے ہیں اور یہ جو تماشے میرے ساتھ ہو رہے ہیں، یہ کوئی نئے نہیں ہیں۔ میرا دشمن اندھیرے میں ہے، وہ بل میں گھسا ہوا ہے۔ میں اسے باہر لانا چاہتا ہوں۔ وہ جو کوئی بھی ہے، میں اس سے نپٹ لوں گا۔"

"حسن تو ہما کی وجہ سے کہہ رہا تھا"

"ہو سکتا ہے، وہی ہو لیکن میرا دل نہیں مان رہا۔ حالات کو دیکھوں تو وہی لگتی ہے لیکن نہیں، وہ ہو نہیں سکتی۔"

"تمہیں شاید نہیں پتہ، تم اسے صرف ایک ہیروین ہی سمجھ رہے ہو۔ یہ ایک پورا گروہ ہے بلکہ مافیا سمجھو اسے۔۔۔ ان کے لیے بقول تمہارے، یہ کھیل تماشے کی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔"

"عامر! مجھے جس لمحہ یہ کنفرم ہو گیا کہ یہ سب ہما ہی کروا رہی ہے تو پھر وہ چاہے گروہ ہے یا مافیا، سمجھو کہ وہ اپنا وجود کھو بیٹھا ہے۔"

"دیکھو، ہم تمہارے دوست ہیں اور نہیں چاہتے کہ تم ایسے کسی جال میں پھنس جاؤ، سیدھا سیدھا اپنی حفاظت کرو۔ اس کے لیے تمہیں شوبز چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دو، اخبار چھوڑنا پڑے تو وہ بھی چھوڑ دو یا کچھ دنوں کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ ہمیں تمہاری سلامتی چاہیے۔"

عامر نے جذبات میں آ کر اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ اس کا خلوص دیکھ کر اپنی کچھ دیر پہلے کی سوچوں پر مجھے شرمندگی ہونے لگی۔

"عامر! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور مجھے اپنے دوستوں کی بات مان لینی چاہیے لیکن کیا میں بزدلوں کی طرح چھپ کر پردے میں بیٹھ جاؤں؟ تمہیں یقین ہے نا، جس دن موت آنی ہے وہ آ کر رہتی ہے، اسے کوئی نہیں روک سکتا؟"

"میں مانتا ہوں لیکن کم از کم اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ۔۔۔"

''چلیں ٹھیک ہے میں اپنی حفاظت کا بندوبست کرلوں گا اور کل ہی آئی جی سے مل لیتے ہیں۔''

''شکر ہے، تم نے اتنی بات تو مانی'' عامر ایک لمبا سانس لیتے ہوئے پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔ ''کیا کرو گے؟''

''کچھ نہ کچھ ہو جائے گا، تم اب فکر مت کرو'' میں نے ہنستے ہوئے۔

''میں اب چلتا ہوں۔ کل کسی وقت پھر''

''او کے، کل میری آف ہے، میں فون کر کے تمہارے پاس آجاؤں گا۔''

''حسن کو بھی لیتے آنا۔'' اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور رپورٹنگ روم سے نکلتا چلا گیا۔ ایڈیشن کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں تھکن محسوس کرنے لگا تھا لیکن ابھی مجھے ندیم کے پاس جانا تھا۔ میں میز پر بکھری چیزیں سمیٹ کر دراز میں رکھ رہا تھا کہ میرے سامنے رکھا فون بج اُٹھا، دوسری طرف سلیم فارانی تھا۔

''بولو'' میں نے اپنے لہجہ کو انتہائی نرم رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ میرے دفتر تک تشریف لا سکتے ہیں؟'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''کوئی کام ہے مجھ سے؟'' میں نے انتہائی رکھائی سے کہا۔

''جی، کام ہی ہے تو بلا رہا ہوں ورنہ......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''یہیں فون پر بتا دیں'' میں یکدم سخت ہوگیا۔

''تو گویا آپ دفتر تک آنا ہی نہیں چاہتے'' اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''ظاہر ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے میرے لہجہ میں تلخی گھل گئی۔

''اوہ، لیکن میرے ماتحت کام کرنا ضرور پسند کرتے ہو۔ او کے، فون پر ہی بتا دیتا ہوں۔ یہ جو تم پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے، اس بارے تم نے ابھی تک اپنے اخبار کو مطلع نہیں کیا؟''

''میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔''

''کیا یہ تمہارا نجی معاملہ ہے؟''

''یہ آپ اتنے سوال کیوں کر رہے ہیں مجھ سے؟''

''آپ جس اخبار میں کام کرتے ہیں، اس کے مالک کی طرف سے یہ پوچھا گیا ہے۔''

''آپ نے مطلع کر دیا؟ میں خود ان سے بات کرلوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

قاتلانہ حملے کے واقعہ کو شاید میں اتنا سنجیدگی سے نہ لیتا اور اگر اسے اہم سمجھ کر کچھ

کرتا بھی تو وہ میری اپنی سوچ ہوتی۔ میرے اردگرد کے لوگوں نے اس واقعہ کو اس قدر شدید بنا دیا تھا کہ مجھے یہ واقعات سرے سے ہی احمقانہ لگ رہے تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی بھی مجھ سے اس بارے میں سوال نہ کرے کیونکہ جب بھی کوئی اس بارے میں بات کرتا تھا، مجھے اپنی اس بے بسی کا احساس ہوتا کہ میرا دشمن میرے سامنے نہیں ہے۔ میرا دشمن جیسا بھی تھا، جو بھی تھا، جتنا طاقتور یا کمزور تھا، مجھے اس سے غرض نہیں تھی۔ میں ان لوگوں میں تھا جو اپنی ایک گولی بھی ضائع نہیں کرتے بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک گولی سے کئی سارے ختم ہو جائیں۔ حالات ہما کے مخالف جا رہے تھے، لوگ بھی یہی کہہ رہے تھے لیکن میرے اندر بیٹھا آدمی یہ بات مان نہیں رہا تھا کہ وہ اتنا آگے جا سکتی ہے۔ پھر میرے سامنے یہ سوال آن کھڑا ہوا تھا کہ اگر وہ نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ یہ سوال مجھے بھول بھلیوں میں بھٹکنے پر مجبور کر دیتا۔ میں اگر ان حالات کے شروعات پر نظر دوڑاتا تو میری شوبز میں آمد ہی سے سب شروع ہوا تھا۔ میں کئی بار اپنے طور پر تجزیہ کر چکا تھا لیکن فی الحال مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سب سوچوں کو جھٹکا اور دفتر سے باہر آ گیا، پھر وحدت روڈ سے ہوتا ہوا ندیم کے پاس جا پہنچا۔ اس کے پاس دوستوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ میرے آنے سے ذرا سی ہلچل ہوئی، خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد میں اُٹھ گیا۔

''شجاع بھائی! ابھی سے؟'' ندیم جلدی سے بولا۔

''میں ابھی گھر جاتا ہوں، فریش ہو کر دوبارہ آتا ہوں۔ آج رات کافی دیر تمہارے پاس رہوں گا، کل میری آف ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا'' ندیم نے کہا تو میں نے سب سے ہاتھ ملایا اور وہاں سے آ گیا۔ میں نے گاڑی نیچے پارک کی اور انگلی میں چابی گھماتا ہوا اپنے فلیٹ کے دروازے پر آن پہنچا، دروازہ لاک تھا لیکن اندر روشنی ہو رہی تھی۔ ایک لمحہ کو خیال آیا کہ سلمیٰ جلتی ہوئی لائٹ چھوڑ گئی ہو گی لیکن اسی وقت اندر سے پانی گرنے کی آواز آئی جیسے کوئی باتھ روم میں ہو۔ میں ایک لمحہ کو ٹھٹک گیا۔ ''اندر کون ہو سکتا ہے؟'' میں اپنے فلیٹ کے دروازے پر کھڑا اندر ہونے والی آہٹوں کو غور سے سن رہا تھا۔ چند لمحوں بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ اندر باتھ روم میں کوئی نہا رہا ہے ''کیا سلمیٰ ابھی تک اپنے گھر نہیں گئی؟ میں نے چابی کی ہول میں ڈالی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ پورے گھر کی بتیاں روشن تھیں۔ میں کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ڈرائینگ روم میں جا بیٹھا۔ کچھ دیر بعد پانی گرنے کی آواز بند ہوئی تو گنگنانے کی آواز ابھر آئی، اس لمحے میرے تنے ہوئے اعصاب یکدم ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ سلمیٰ ہی تھی۔ اس کے یہاں

ہونے کے احساس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں کئی سارے سوال ابھر آئے۔ میں نے انہیں یکسر نظر انداز کرتے ہوئے غور کیا تو پورے فلیٹ کی صفائی ستھرائی کے بعد ترتیب تک بدلی ہوئی تھی، میں نے سگریٹ سلگایا اور اس کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے وہی رات والے کپڑے پہنے ہوئے تھے مگر ان پر کوئی شکن نہیں تھی، گیلے کپڑوں اور سر پر بندھے تولیے کے ساتھ وہ فریش فریش سی اور بڑی جاذب نظر لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی چونک گئی، پھر فوراً ہی نارمل ہوتے ہوئے ہنس دی۔

''آپ۔۔۔کب آئے؟''اس نے بڑی ادا سے پوچھا تو میں نے خشک سے لہجے میں سوال کیا۔

''سلمیٰ! تم اپنے گھر کیوں نہیں گئی ہو؟''

''اوہ۔!''اس کے منہ سے یوں سرسراتا ہوا ہنکارا انکلا جیسے اسے شاک پہنچا ہوا۔ وہ چند لمحے یونہی ساکت سی رہی، پھر دبی ہوئی آواز میں بولی۔''میرا یہاں رہنا آپ کو برا لگا؟''

''نہیں، برا نہیں لگا، تم سارا دن یہاں اکیلی رہی ہو، تمہارے گھر والے کیا سوچتے ہوں گے؟''میں نے نرمی سے کہا تو وہ وہیں کھڑے کھڑے بولی۔

''میرے گھر میں میرا کوئی انتظار نہیں کرتا، مجھے ایسی کوئی فکر نہیں اور نہ ہی میرے گھر والوں کو ہے۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''شاید میں آپ سے اپنا تعارف ٹھیک طرح سے نہیں کرواسکی خیر، اگر آپ کو برا لگا ہے تو میں ابھی چلی جاتی ہوں''اس نے حسرت ناک مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر زبردستی لاتے ہوئے کہا۔ میں نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں وہ کیا تھی، کیا کہنا چاہتی تھی اور کس مجبوری کے تحت یوں سہاروں کی تلاش میں تھی؟ اسی لمحے مجھے اس کے بارے میں جاننے کا تجسس ہوا، تب میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایسے کیوں سوچ رہی ہو، سلمیٰ؟ چلو چھوڑو ان باتوں کو، جلدی سے تیار ہو جاؤ، پھر ندیم کے پاس چلتے ہیں۔ میں اتنے میں فریش ہو جاؤں، کھانا بھی کھا آئیں گے۔''

''میں نے کھانا بنایا ہے۔''اس نے گویا یوں کہا جیسے قلعہ فتح کرلیا ہو، پھر تیزی سے بولی۔''آپ فریش ہو جائیں، میں کھانا لگاتی ہوں''اس کے چہرے پر تازگی امنڈ آئی تھی، میرے ذرا سے حوصلہ افزا لفظوں سے جیسے وہ کھل گئی تھی۔ میں نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کھانے کے نام پر خاصا اہتمام کر رکھا تھا، کچن میں

موجود سہولیات سے بھرپور فائدہ اٹھایا گیا تھا۔ کھانا خاصا مزیدار تھا جس کی بہر حال مجھے توقع نہیں تھی۔ سلمٰی نے اس دوران باتیں کرنا چاہیں مگر میں نے اسے روک دیا۔ کھانے کے بعد ہم ندیم کی طرف چل دیئے۔ وہ سلمٰی کو میرے ساتھ دیکھ کر چونک گیا۔ اس وقت اس کا چھوٹا بھائی ہی اس کے قریب تھا، وہ گھر کا ایک چکر لگانے کا کہہ کر نکل گیا۔ رسمی سی باتوں کے بعد اچانک ندیم نے پوچھا۔

''سلمٰی! تم گھر ہی نہیں گئیں یا گھر سے ہو کر پھر آ گئی ہو؟''

''میں گئی ہی نہیں، سارا دن فلیٹ پر رہی ہوں'' سلمٰی نے آرام سے کہہ دیا تو وہ چپ سا کر گیا۔ کئی لمحے یونہی خاموشی میں گزر گئے، پھر ندیم میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''شجاع بھائی! یہ سلمٰی کوئی آوارہ یا کسی بھی طرح غلط قسم کے کردار والی لڑکی نہیں ہے۔ یہ میرے محلے کی ہے۔ اس کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کا باپ بچپن میں فوت ہو گیا تھا۔ پھر اس کی ماں بیاہ کر ہمارے محلے میں آ گئی۔ یہ زیادہ عرصہ اپنے ننھیال میں رہی ہے، یہ کچھ عرصہ یہاں آتی اور پھر واپس چلی جاتی رہی ہے۔ پچھلے دو سال سے یہاں پر ہے۔ اس نے یہاں لاہور میں آ کر بی ایس ای کیا۔ یہاں اسے کسی کی بھی توجہ نہیں ملی'' وہ کہتے کہتے رک گیا تو میں بولا۔

''تمہاری توجہ ملی۔ تمہیں یہ ذرا منفرد سی لگی اور یوں تمہارا دل۔۔۔''

''نہیں، شجاع بھائی!'' اس نے تیزی سے کہا، پھر ذرا رک کر دھیرے سے بولا۔ ''میں اسے اپنے محلے میں آتے جاتے دیکھتا رہا تھا لیکن کبھی بھی توجہ نہیں دی تھی۔ ایک دن میں نے اسے ایک ایسی عورت کے ساتھ دیکھا جو بظاہر تو ایک تھرڈ کلاس میگزین کی رپورٹر ہے لیکن اس کا دھندا کچھ اور ہے۔ میں چونک گیا، ایک ہمدردی سی اس کے ساتھ ہو گئی۔ میں نے اس کے بارے میں پتہ کیا تو مجھے اس کی رپورٹ صحیح ملی۔ تب میں نے خود اس سے رابطہ کیا اور اس عورت سے ملنے کے لیے منع کر دیا۔''

''میں اس عورت کے بارے میں جانتی تھی، اس کی باتوں سے سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بہت سہانے خواب دکھا رہی تھی'' سلمٰی نے دھیرے سے کہا۔

''کیا اسی نے ہی تمہیں اداکارہ بننے کی راہ دکھائی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، میرا پہلے ہی سے یہ شوق تھا مگر میں خود کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی، اسی لیے تو فوراً اس سے رابطہ ختم کر دیا'' وہ صاف انداز میں گویا ہوئی تو میں نے مزید پوچھا۔

''ندیم اگر شوبز رپورٹر نہ ہوتا تو کیا پھر بھی تم اس کی طرف۔۔۔''

'' شاید میں ندیم سے بات کرنا بھی پسند نہ کرتی '' اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا، پھر فوراً ہی بولی۔ '' مگر یہ اچھا ہوا کہ ندیم کی صورت میں مجھے ایک اچھا دوست مل گیا۔ اس نے شوبز سے متعلق مجھے اتنا کچھ بتایا کہ اب میں ہمت نہیں کر پا رہی ہوں''

'' پھر کیا پروگرام بنایا ہے تم نے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ پوری سنجیدگی سے بولی۔

'' میں پڑھوں گی، اس کے لیے مجھے جو کچھ بھی کرنا پڑے۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں جاب کروں گی۔''

'' یہ جو تم نے کہا ہے کہ چاہے مجھے جو کچھ بھی کرنا پڑے، اسے واضح کر سکو گی؟'' میں نے پھر پوچھا۔

'' مطلب، میں جاب کروں گی۔ مطلب، تعلیم مکمل کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ مجھے پیسہ چاہیے۔ اس کا کوئی نہ کوئی راستہ تو ڈھونڈوں گی۔'' اس نے دھیرے سے کہا تو ہم میں چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ تب ندیم نے کہا۔

'' میں نے اسے آفر کی ہے۔ اگر یہ محض تعلیم ہی حاصل کرے گی اور کسی خرافات میں نہیں پڑے گی تو میں میں اسے افورڈ کر لوں گا۔''

'' ندیم! تمہارے جذبات سر آنکھوں پر، لیکن میں بوجھ نہیں بنوں گی۔ تمہیں خود پتہ ہے کہ میں نے کتنی بار تمہیں جاب کے لیے کہا ہے اور جب تم نے شجاع صاحب کے بارے میں بتایا تو مجھے کچھ امید ہوئی۔ میں آج سارا دن ان کے فلیٹ پر کیوں رہی ہوں، صرف اس لیے کہ جب یہ آئیں تو میں اس بارے میں بات کروں'' وہ صاف گوئی سے ذرا جذباتی لہجے میں بولی تو ندیم نے تلخی سے کہا۔

'' یہ بات تم مجھ سے بھی کہہ سکتی تھیں، میں خود ان سے بات کر لیتا۔''

'' ڈونٹ وری، کوئی بات نہیں۔ وہ اپنی راہ خود بنانا چاہتی ہے تو بنانے دو۔'' میں نے ندیم کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ پھر سلمٰی کی طرف دیکھ کر بولا۔ '' میں تمہارے لیے کوشش کروں گا، ہو جائے گا کچھ نہ کچھ، تم اپنی تعلیم کی طرف دھیان دو۔''

'' اور اب رکشہ پکڑو اور اپنے گھر جاؤ۔'' ندیم نے تلخ سے کہا تو وہ چند لمحے بیٹھی رہی، پھر اٹھ گئی۔ تب میں نے کہا۔

'' تمہارے پاس میرا خیال ہے، کوئی پیسے نہیں ہیں، کیسے جاؤ گی گھر؟''

'' بس میں چلی جاؤں گی۔'' اس نے بھرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"ادھر آؤ" میں نے اسے بلایا۔ اپنے ملاقاتی کارڈ پر موبائل نمبر لکھا اور پھر چند بڑے نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے رابطہ رکھنا یا پھر میں ندیم کو بتا دوں گا"

"ادھر دیکھو، میری طرف " ندیم نے پیار سے کہا تو اس نے ڈبڈباتی آنکھوں اور مسکراتے ہوتٹوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ہنس دی۔ ندیم نے مجھ سے کہا کہ شجاع بھائی، آپ اسے ڈراپ کر دیں۔ ہم کچھ دیر بیٹھے رہے۔ ندیم کے بھائی کے آجانے پر ہم اُٹھ گئے۔ سلمٰی کو میں نے اس کے گھر کے نزدیک ڈراپ کیا اور فلیٹ پر آکے اطمینان سے سو گیا۔ میری آنکھ فون بیل بجنے سے کھلی۔ سیل فون میرے سرہانے پڑا ہوا تھا، میں نے نمبر پڑھے تو حسن کے گھر کے تھے۔ میں نے فون آن کر کے "ہیلو" کہ تو حسن بولا۔

"تمہیں یاد ہے کہ آج آئی جی سے ملنا ہے؟"

"بالکل یاد ہے۔" میں نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

"اب پروگرام یہ ہے کہ تم میری طرف آؤ گے، عامر بھی یہیں آجائے گا۔" حسن نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اوکے، میں آجاؤں گا" میں نے جان چھڑانے والے لہجے میں کہا۔

"آجاؤں گا نہیں، بس آجاؤ جان جی! ناشتہ ادھر ہی کرنا، اب اُٹھ جاؤ! ناشتہ ادھر ہی کرنا۔" حسن نے لفظ چباتے ہوئے کہا۔

"میں اُٹھ گیا، بس کچھ دیر میں پہنچ جاؤں گا" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ میں دوبارہ نہیں سو سکتا تھا اس لیے اُٹھنے میں ہی عافیت جانی۔ حسن ناشتے کی میز پر میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں بھابی اور بچوں سے ملنے کے بعد اس کے پاس جا بیٹھا، جلد ہی ناشتہ لگا دیا گیا۔

آئی جی سے ملاقات میں وہی کچھ ہوا جو میرے ذہن میں تھا، بس نشستیں برخاستن والی بات تھی۔ انہوں نے ہماری بات بڑے غور سے سنی اور پھر مختلف قانونی پہلو واضح کر کے بات ہم پر ہی چھوڑ دی کہ شک کس پر ہے؟ حتمی طور پر ہم بھی کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ پھر متعلقہ تھانے کو کہہ دینے اور قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کروا دی گئی۔ واپسی پر حسن نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"شجاع! تم ٹھیک کہتے ہو۔ جو کچھ بھی کرنا ہے، ہمیں خود کرنا ہے۔"

"میں تو آپ لوگوں کو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔"

"مگر سیکورٹی بھی تو ضروری ہے۔" عامر نے کہا۔

''عامر! میں نے اس حد تک سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ آپ لوگوں کا خلوص اور جذبات ہی میرا حوصلہ ہیں مگر پھر بھی میں چاہوں گا کہ مجھے اپنے طریقے سے کچھ کرنے دیا جائے، میں سب سنبھال لوں گا۔''

''خیر، ہم تمہیں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتے۔'' حسن نے سنجیدگی سے کہا۔

''اور ہاں، اب تم فلیٹ میں نہیں رہو گے۔ تمہارے لیے میں نے مین روڈ پر ایک پورشن کا بندوبست کر دیا ہے۔ نیچے فرم کا دفتر ہے، اوپر تم رہو گے۔ میں بندے بھجوا دوں گا۔'' عامر بولا۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے'' حسن نے کہا۔ ''اس طرح یہ خاصا محفوظ رہے گا''

یونہی باتوں ہی باتوں میں ہم حسن کے گھر آ پہنچے، وہاں میں دوپہر تک رہا اور کھانا کھا کر ہی نکلا۔ میرا رخ گوالمنڈی کی طرف تھا جہاں مجھے آصف چوہدری سے ملنا تھا۔ وہ میرا کلاس فیلو تھا اور ہم اکٹھے ہی کالج تک پڑھے تھے۔ میں ہی نہیں، ہمارا پورا گروپ اس کی دلیری کو مانتا تھا۔ ہمارے گروپ میں اس کا کام ہر مسئلہ کو فیس کرنے کا تھا جب کہ میں ان لوگوں میں سے تھا جو سامنے آئے بغیر اپنا کام کر جاتے تھے۔ ایک عرصہ ہو گیا تھا مجھے اس سے ملے ہوئے، تاہم اس کے بارے میں خبریں مجھ تک پہنچتی رہتی تھیں۔ چند ماہ پہلے اس نے مجھے فون کر کے کچھ معلومات چاہی تھیں جو میں نے دے دی تھیں، پھر اس کے بعد میرا اس کا رابطہ نہیں رہا تھا۔ کالج سے نکلنے کے بعد سارا گروپ ہی بکھر گیا تھا۔ جس کو جو میدان ملا، ادھر نکل گیا مگر آصف چوہدری ایک خاص ڈگر پر چلتا ہوا اتنا آگے نکل گیا جہاں سے واپسی کا راستہ ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ ایک مخصوص علاقے ہی میں نہیں بلکہ سیاسی اور تجارتی ایوانوں میں طاقت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ذہنی طور پر میں اس قدر شدت کے خلاف تھا۔ نوجوانی کے دنوں میں جو کر لیا سو کر لیا لیکن طاقت کا نشہ بھی مکڑی کے جال کی مانند ہوتا ہے کہ جو اس میں پھنس گیا، پھر نکلنے کی راہ نہیں رہتی۔ یہ الگ بات ہے کہ طاقت کا روپ کون سا ہے۔ میں انہی خیالوں میں بھٹکتا ایک بینچ مارکہ ہوٹل کے سامنے جا پہنچا۔ وہاں مجھے مخصوص چہروں میں سے کسی ایک کی تلاش تھی۔ اس ہوٹل کا مالک مجھے اچھی طرح جانتا تھا لیکن وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا، اس کی جگہ اس کے بیٹے نے لے لی تھی اور پھر ہم بھی دنیا کی بھیڑ میں گم ہو گئے تھے۔ وہاں رکتے ہی مجھے ماضی کی بے ساختہ یاد آ گئی۔ جیب میں ایک دھیلا بھی نہیں ہوا کرتا تھا لیکن روٹی کی کبھی فکر نہیں ہوا کرتی تھی۔ یہاں لمبا ادھار چلتا۔ طالب علمی کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا۔ میں نے گاڑی ایک طرف کر کے بند کر دی۔ میں ایک نظر میں اس ہوٹل میں موجود لوگوں کا جائزہ لے چکا تھا۔

کاونٹر پرایک نوجوان سالڑکا بیٹھا تھا، تبھی اس سے ذرا فاصلے پر ایک بوڑھے شخص پر نظر پڑی۔ میں نے بہت غور سے دیکھا تو اس کی توجہ بھی میری طرف ہوگئی۔ وہ بھی میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا تو میں اس کے نزدیک پڑی پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب وہ بولا۔

''تمہارا چہرہ دیکھا بھلا سا لگتا ہے، کیا نام ہے تمہارا؟''

''میرا نام شجاع ہے، تایا برکت۔!'' میں نے کہا تو وہ پھڑک اُٹھا، پھر انتہائی خوشی سے بولا۔

''اوئے، تو تو بھئی چنگا بھلا بھائی بن گیا ہے۔ اتنے عرصے بعد تجھے دیکھا ہے، کیسا ہے تو؟'' اس نے پوچھا

''آصف سے ملنا ہے مجھے'' میں دھیرے سے بولا۔

''خیریت ہے نا؟'' تائے برکت کا لہجہ یکدم سنجیدہ ہوگیا۔

''بالکل خیریت ہے، بس اس سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے'' میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہاں بیتی یادیں امنڈتی چلی آرہی تھیں۔ یہی تایا برکت کبھی یہاں ہیڈ ویٹر ہوا کرتا تھا۔ اس نے کس کس طرح ہماری خدمت نہیں کی تھی۔ مجھے ملائی کھانے کا شوق ہوتا تھا اور تایا برکت اکثر رات کے کھانے پر میرے لیے ملائی رکھ چھوڑتا تھا۔ میں تائے برکت کے چہرے پر گزرے دنوں کے اثرات دیکھ رہا تھا، خاصا کمزور لگ رہا تھا۔

''اس کا فون نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''نہیں ہے، اسی لیے تو یہاں بھٹکتا پھر رہا ہوں'' میں نے خوش دلی سے کہا تو تائے نے میرا موبائل نمبر لے کر کاونٹر پر موجود لڑکے کو دیا۔ لڑکے نے نمبر ملائے، چند لمحوں بعد رابطہ ہو جانے پر دو چار باتیں کیں جس کا ایک لفظ بھی مجھے سنائی نہیں دیا۔ اس نے فون رکھ دیا۔ میں تائے برکت سے باتیں کرنے لگا۔ دو تین منٹ گزرے ہوں گے کہ میرا موبائل جاگ اٹھا۔ دوسری طرف آصف تھا۔

''ابے کہاں ہے تو؟'' اس نے انتہائی شوخ لہجے میں کیا۔

''تیرے علاقے میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔'' میں نے سرسراتے ہوئے کہا۔

''اب اپنا علاقہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ میں گاڑی بھیجتا ہوں''

''میرے پاس ہے گاڑی'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''تو پھر یہ فون کاونٹر پر موجود جو کوئی بھی ہے، اسے دے۔'' آصف نے جلدی سے

کہا تو میں نے فون اس نوجوان کو دیدیا۔ اس نے دوسری طرف سے چند لمحے سنا اور پھر فون میری طرف بڑھا دیا، لائن آف ہو چکی تھی ۔ میں نے فون بند کر کے جیب میں رکھا تو وہی نوجوان کاونٹر سے نکل آیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک بڑے سے مکان کے باہر جا رکے جہاں پہلے ہی سے ایک پیجیرو کھڑی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ہی گاڑی پارک کی اور اس نوجوان کے ساتھ اس مکان میں چلا گیا، سامنے ہی کرسیوں پر بیٹھے لوگ ہمیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ میرے ساتھ آئے نوجوان نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ انہیں آصف بھائی کے پاس لے جائیں۔ یہ کہہ کر وہ واپس مڑ گیا۔ ان میں ایک بھاری مونچھوں والے نے میرا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''آئیں جی!'' یہ کہہ کر وہ بڑھ گیا اور میں اس کے پیچھے چند راہداریاں عبور کر کے اوپری منزل پر کچھ ہی دیر بعد آصف کے سامنے تھے۔ اس کے چہرے پر پختگی آ گئی تھی۔ وہ معصومیت جو کبھی اس کے چہرے کو روشن رکھتی تھی، اب کرختگی میں بدل گئی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھا اور میرے گلے لگ گیا، کافی دیر گلے لگے رہنے کے بعد اس نے مجھے چھوڑا اور انتہائی خوشی اور حیرت کے ملے جلے لہجے میں بولا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم مجھے یوں آن ملو گے۔''

''یار! زندگی میں لوگ ملتے بچھڑتے ہی رہتے ہیں، کیا ہوا جو ہم ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اتنا عرصہ نہیں ملے۔''

''بس، یار! کیا بتاؤں '' اس نے ٹھنڈا سانس لیا، پھر بولا۔ ''بیٹھو'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ تب میں نے وہاں موجود دوسرے شخص پر غور کیا۔ وہ خاصے ڈیل ڈول والا شخص تھا۔ بھاری مونچھوں کے ساتھ بارعب چہرہ، سفید کاٹن شلوار کے ساتھ وہ خاصا جچ رہا تھا۔ آصف نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، شاہ جی! تمہارا کام ہو جائے گا لیکن میں نے جو کہا ہے، میں اتنا ہی لوں گا۔''

''میں دینے کو تیار ہوں مگر۔!'' وہ کہتے کہتے جھجک گیا۔

''کام تمہاری مرضی کا اور۔۔۔'' آصف نے جلدی سے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

''مجھے منظور ہے......'' اس نے جلدی سے کہا اور جیب سے ایک گڈی نکال کر بولا۔ ''یہ پیشگی ہے اور تصویر میں تمہیں دے چکا ہوں۔ کام صاف طریقے سے ہو گیا تو جو ڈن ہے اس سے بھی زیادہ ہو جائے گا۔ یاد رہے کہ میرا حوالہ کہیں بھی نہ آئے۔'' وہ تسلی چاہ رہا تھا۔ تبھی

آصف نے کہا۔

''او، شاہ جی! کیسی باتیں کر رہے ہو۔''

اس کے لہجے میں قدرے غصہ جھلک گیا تو وہ شاہ جی گھبراتے ہوئے اٹھ گئے، آصف بیٹھا رہا اور اس سے ہاتھ ملا کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے یہ خیال بھی نہیں کیا کہ شاہ جی کب کمرے سے گئے۔ ہم یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد کافی سارے لوازمات کے ساتھ سوڈا آ گیا تو آصف نے پوچھا۔

''میری یاد کیسے آ گئی؟''

''تمہاری ضرورت پڑنے پر۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا تو وہ ہنس دیا۔ تب میں نے مختصر سے انداز میں اسے ساری بات کہہ دی۔ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہما۔۔۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میرا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں۔ میں فقط یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے؟ میں خود معلوم کر لیتا لیکن مجھے سلیم فارانی کو بھی جواب دینا ہے، میں اسے بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس نے اپنے فیصلہ پر کتنا بھیانک خمیازہ بھگتا ہے۔''

''میں اسے بھی دیکھ لوں گا۔ تو اب فکر نہ کر، تیری طرف اب کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔'' اس نے سفاک لہجے میں دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میں جلدی سے بولا۔

''لیکن میں کسی بے گناہ کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا، یہ بات دھیان میں رہے۔''

''اوے، او کے'' پھر اپنا موبائل فون نکال کر نمبر پش کرنے لگا۔ رابطہ ہو جانے پر لرزتے لہجے میں بولا۔ ''وہ اداکارہ ہما ہے نا، میرے دوست شجاع پر حملے کروا رہی ہے۔ اسے بتا دو کہ وہ صرف شوبز رپورٹر نہیں، میرا جگری یار ہے۔ یہ بات اسے اچھی طرح سمجھا دینا۔''

اس نے بس حکم دیا اور پھر فون آف کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ پھر چند لمحے سوچ کر پھر سے نمبر پش کرنے لگا، رابطہ ہو جانے پر اس نے میرے اخبار کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا ایڈیٹر سلیم فارانی ہے، ذرا اسے چیک کرو''

وہ شاید کچھ اور کہتا لیکن میں نے جلدی سے کہا۔

''نہیں، آصف! بند کر دو فون۔۔۔''

''کیوں، کیا ہوا؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''وہ میرا شکار ہے اور اس کے ساتھ صرف میں نے کھیلنا ہے'' میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا تو اس نے فون پر دوبارہ کچھ نہ کرنے کی بابت کہہ کر فون بند

کر دیا۔ پھر ہم میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی، تب میں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"اور سناؤ، آج کل کہاں کہاں تک اڑانیں ہیں؟" میرے اس طرح کہنے پر وہ ذرا سا مسکرایا اور پھر باتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ یہ سلسلہ اس قدر پھیلا کہ پھر وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا۔ اس وقت سورج ڈھل رہا تھا جب میں اس کے ہاں سے نکلا۔

☆☆☆

آصف چوہدری سے ملاقات میرے لیے عجیب سا تاثر لیے ہوئے تھی۔ اس تاثر کو میں کوئی نام نہیں دے پایا تھا۔ لاشعوری طور پر میں اپنا اس سے موازنہ کرتا چلا گیا۔ ہم جب سے الگ ہوئے تھے، وہ کسی اور راہ کا راہی بن گیا جہاں سوائے اندھیرے کے اور کچھ نہیں تھا جبکہ میں نے روشن راہوں کا انتخاب کیا تھا لیکن ہم میں مشترک بات یہی تھی، لڑنا دونوں ہی کو پڑ رہا تھا۔ وہ اسلحہ اٹھائے ہوئے تھا جبکہ میں قلم سے اپنی جنگ جاری رکھے ہوئے تھا۔ اصل میں ہمارا نظام ہی کچھ اس طرح کا بن گیا ہے، ہمیں لاشعوری طور پر ایک اَن دیکھی جنگ میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ نت نئی طاقتیں ہم پر مسلط ہوتی چلی جاتی ہیں اور ہم ان سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس طرح ہارتے ہیں کہ باقی کچھ بھی نہیں بچتا۔ میں نے اپنی روشن راہوں میں محبتوں کا فروغ ہی چاہا تھا لیکن انہی چند دنوں میں میرے اردگرد ایسے حالات بنتے چلے گئے کہ جنہیں میں اب تک ذہنی طور پر قبول ہی نہیں کر پایا تھا۔ جو ہو رہا تھا، میں وہ نہیں چاہتا تھا مگر یہ سب مجھ پر مسلط کر دیا گیا۔ مجھے اس بات کا پورا احساس تھا کہ میں نے اگر انہی کی زبان میں جواب دینا شروع کر دیا تو مجھ میں اور آصف میں کچھ فرق نہیں رہ جائے گا۔ میں نے اپنے اندر کے وحشی پن کو کسی طرح بھی جاگنے نہیں دیا جسے برسوں پہلے میں نے سلا دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ میرے اَن دیکھے دشمن چاہے گولی کی زبان میں ہی بات کرتے ہیں لیکن میں انہیں بہترین انسانی رویئے کی صورت میں جواب دوں گا۔ پھر اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے، تب اس کی بنیاد پر میرا آئندہ لائحہ عمل ہوگا۔ انہی خیالات کے تانے بانے بنتا میں ندیم کے پاس جا پہنچا، وہ اس وقت اپنے گھر جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

"میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا ورنہ ڈاکٹر نے تو مجھے دو گھنٹے پہلے چھٹی دے دی تھی۔" اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"مگر ابھی تمہارے زخم تو۔۔۔" میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ان کی پٹی تو روز ہوگی، وہ میں آ کر کروا جایا کروں گا۔" ندیم جلدی سے بولا۔

"ٹھیک ہے، آؤ، میں تمہیں چھوڑ دوں۔" پھر اس کے بھائی سے کہا۔ "سامان

ٹیرہ گاڑی میں رکھو۔'' مختصر سامان ذرا سی دیر میں اکٹھا ہو گیا۔ میں ندیم کو سہارا دے کر باہر گاڑی تک لے آیا۔ پھر وہ مجھے اپنے گھر کا راستہ بتاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک ایسی کچی آبادی میں تھے جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ لوگ نہ جانے کس طرح کی زندگی گزار رہے ہوں گے؟ جیسے ہی مین سڑک سے آبادی میں جانے والی کچی سڑک پر اترے تو اچانک ندیم بولا۔

''شجاع بھائی! ہم ایسی ہی غریب بستی میں رہتے ہیں اور میں۔۔۔''

''آگے کچھ مت کہنا محلوں میں رہنے والے کسی بد دیانت، کرپٹ اور بے غیرت شخص سے اس بستی کے غریب ترین مگر مخلص شخص کی قدر میرے نزدیک زیادہ ہے۔ سمجھے تم! اور جو تم نے خود پر غریبی کا خودساختہ لیبل چپکا لیا ہے اور اپنے تئیں احساس کمتری کو اپنے کاندھوں پر لادے پھر رہے ہو، اتار دو اسے۔ تم کتنے اچھے انسان ہو، اس کو دیکھو۔ یہی تمہارا معیار ہونا چاہیے۔'' یکدم ہی میں جذباتی ہو گیا اور میں نے اچھی خاصی تقریر جھاڑ ڈالی، ندیم کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''سوری، شجاع بھائی! آپ کی عزت میرے دل میں۔۔۔''

''ندیم! عزت ہمیشہ دل سے کی جاتی ہے اور اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہوتا۔ خیر چھوڑو اس چکر کو، بتاؤ اب کدھر مڑنا ہے؟'' میں نے دوراہے پر گاڑی کو بریک لگاتے ہوئے کہا تو وہ پھر سے مجھے راستہ بتانے لگا۔ جلد ہی ہم ایک گھر کے سامنے جا رکے جس کا گیٹ لکڑی اور لوہے کی پتری سے بنا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک چھوٹے سے صحن میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بوڑھے ماں باپ خوش تھے۔ ندیم کا ایک چھوٹا بھائی اور پھر اس کے بعد ایک بہن تھی۔ یہ چھوٹا سا کنبہ قدرے عزت کی روٹی کھا رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر ان کے درمیان بیٹھا رہا اور پھر اجازت چاہی۔

''نہیں بھائی! آپ کھانا کھا کے جائیں گے۔'' اس کی بہن نے کہا جس کا لہجہ ادب ہونے کے ساتھ قدرے شوخ تھا۔ میں ہنس دیا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر مجھے اپنی بہن یاد آ گئی، تب میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، لیکن پکایا کیا ہے؟''

وہ آنکھیں گھما کر بڑے لاڈ سے بولی۔ ''دال چاول بنائے ہیں مگر آپ کے لیے بھائی نے کچھ منگوایا ہے۔''

''میں دال چاول ہی کھاؤں گا اور جو کچھ تم نے منگوایا ہے، وہ تم ہی کھانا۔ اب جلدی سے لے آؤ، بھوک لگی ہے۔'' میرے اس طرح کہنے پر ندیم ہنس دیا۔ اس لمحے مجھے اس

قدر خوشی کا احساس ہوا کہ کوئی الجھن، کوئی پریشانی جیسے تھی ہی نہیں۔کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے ہمارے پاس کوئی نہیں تھا۔تب میں نے کسی کا ذکر کیے بغیر اسے بے خوف ہو جانے کا کہا اور ڈھیروں حوصلہ دے ڈالا۔پھر میں ان سے رخصت ہو کر سٹوڈیو کی طرف نکل پڑا۔

اس رات خلاف معمول سٹوڈیو میں خاصی رونق تھی، کسی فلم کا مہورت تھا۔میں گاڑی پارک کر کے یونہی ہلکے قدموں سے ٹہلتا ہوا اندر کی جانب جانے لگا تو ایک درمیانے سے قد کے نوجوان سے لڑکے نے میرا راستہ روک لیا۔اس نے پرانی سی جین اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی، پہلی نظر میں وہ اس طبقے سے تعلق رکھنے والوں میں سے نظر آ رہا تھا جو درمیانے درجے کی اداکاراؤں کے سیکرٹری ہوتے ہیں۔ایسے لڑکے دوسری اداکاروں کے بارے میں معلومات دینے میں بڑے خود کفیل ہوتے ہیں اور جن کے وہ سیکرٹری ہوتے ہیں، انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے لیے اہم ہوں یا نہ ہوں لیکن صحافی طبقہ ان سے بھر پور فائدہ اٹھاتا ہے۔پہلے ہی دن گوندل نے مجھے یہ بات سمجھا دی تھی۔میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تو اس نے بڑے ادب سے، قدرے جھکتے ہوئے مصافحہ کے لیے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے۔میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے سلام کا جواب دیا تو وہ بڑے محتاط لہجے میں بولا۔

”سر، جی! کیا حال ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ پھر چند لمحے بعد سوچنے والے انداز میں کہا۔”میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔میرا خیال ہے، ہم پہلی بار مل رہے ہیں؟“

”جی، سر جی! بالکل فسٹ ٹائم، میں جی، میڈم زارا کا سیکرٹری ہوں“ اس نے مسکراتی آنکھوں سے اپنی بات کاری ایکشن میرے چہرے پر دیکھنے کی کوشش کی، کوئی تاثر نہ پا کر وہ پھر سے محتاط لہجے میں بولا۔

”میں بڑی دیر سے آپ کی راہ تک رہا تھا۔“

”کوئی خاص بات؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا کیونکہ مجھے قدرے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے کیوں اس انداز سے ملا تھا۔

”جی، وہ آپ سے میڈم زارا ملنا چاہتی ہیں۔“ اس نے کہا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی، وہ اس کے لیے زارا اور ... وقت ایک دوسرے کے مدمقابل تھیں اور ایک کا دشمن دوسری کا دوست تصور کیا جاتا تھا ... دونوں میں کسی حد تک یہی خیال کیا جاتا تھا، آئے دن ان کی چپقلش سے متعلق بیان بازیاں

کہتی رہتی تھیں۔

”بہت خوشی ہوگی مجھے ان سے مل کر۔۔۔کہاں ہیں وہ؟“میں نے پوچھا تو وہ کھل اٹھا، جلدی سے بولا۔

”وہ ابھی آئیں گی جی، مہورت پر، اس فلم کی وہی ہیروئن ہیں لیکن انہوں نے آپ سے ملنے کی خواہش کی ہے، ویسے آپ ان سے بات کرلیں۔“اس نے میرے سیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، پھر نمبر دہرانے لگا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور سیل پر نمبر پُش کر دیئے۔ جیسے ہی بیل گئی، میں نے فون اسے تھما دیا۔ وہ دوسری طرف غور سے سننے لگا۔ رابطہ ہوتے ہی میرے متعلق بتانے لگا، چند لمحوں بعد فون مجھے دے دیا۔

”جی بات کریں۔“میں نے فون کان سے لگا کر ”ہیلو“ کہا تو دوسری سمت سے انتہائی مخمور سی آواز میں زارا بولی۔

”زہے نصیب کہ ہم نے آپ کی آواز سنی۔ یہ جان کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ میں آپ سے ملنے کا شرف حاصل کروں گی۔“

”مجھے بھی خوشی ہوئی۔ آپ جب چاہیں اور جہاں چاہیں، ملاقات ہوسکتی ہے۔“

”میں ابھی کچھ دیر بعد سٹوڈیو آؤں گی، آپ سے ملوں گی لیکن حسرت کہ شاید کوئی تفصیل سے بات نہ ہو پائے۔ آپ مجھے حکم دیں۔ کوئی ڈنر، کوئی لنچ۔۔۔“

”ایسے اہتمام کی ضرورت نہیں۔ مجھے احساس ہے کہ آپ اس وقت مصروف ہوں گی، باقی باتیں پھر کسی وقت سہی۔“

”جی اوکے، میں خود ہی آپ کو کال کر دیا کروں گی۔“اس نے کہا تو میں نے فون لے کے اس نوجوان کو دیکھا جو میری طرف بڑے مسرور انداز سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کچھ کہے بغیر اس سے ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گیا۔ دراصل مجھے کچھ فاصلے پر گوندل نظر آ گیا تھا۔ وہ دوست تھا لیکن ہما کے ساتھ ہونے والی چپقلش کے بعد وہ مجھ سے متنفر ہو گیا تھا۔ ظاہری بات ہے، اس کی مجبوریاں رہی ہوں گی۔ وہ اپنے رویئے سے مجھے یہ باور کرا چکا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ اپنے پروفیشن سے مخلص ہے اور میں اس بات کو مانتا تھا کہ بندے کو اپنے پروفیشن سے مخلص ہونا چاہیے۔ وہ ایک رپورٹر سے باتیں کرنے میں مگن تھا کہ میں نے ان کے قریب جا کر اونچی آواز سے سلام کہہ دیا۔ گوندل نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر بڑے اچھے انداز سے ملا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کہتا، وہ بولا۔

”شجاع! نظر نہیں آ رہے ہو۔ ویسے میں نے تمہارا ایڈیشن دیکھا تھا، بہت

خوبصورت تھا۔''

''ہما کے بارے میں بھی پڑھا ہوگا۔ میں نے اس کے بارے میں ۔۔۔'' میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے اس رپورٹر سے معذرت چاہی اور مجھے لے کر ایک طرف بڑھ گیا۔

''میں مانتا ہوں کہ تم نے ہما کے بارے میں اچھا ہی لکھا ہے لیکن یہ جو افواہ گردش کر رہی ہے کہ تم پر قاتلانہ حملے ہو رہیں، ان کا تعلق ہما سے قطعاً نہیں ہے۔ وہ اس حد تک نہیں پہنچ سکتی۔''

''ہوسکتا ہے، نہ ہو مگر حالات تو یہی کہہ رہے ہیں۔''

''غلط فہمی ہے تمہاری۔ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب فلمی دنیا میں آئی بھی نہیں تھی۔''

''اور گوندل! یہ ضروری بھی نہیں کہ وہ سارے معاملات میں تمہاری رائے لے۔ یہ بات تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ یہ لوگ دوسروں کے ساتھ کیا، مخلص نہیں ہوتے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''میں تمہاری بات کی تردید نہیں کروں گا مگر ہما اور قاتلانہ حملہ، دو الگ الگ چیزیں ہیں۔''

''تم اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''اس لیے کہ میری اس سے ہی نہیں، دوسروں سے بھی بات ہوئی ہے۔'' پھر چند لمحے رک کر بولا۔ ''میرا مشورہ یہ ہے کہ محض اس ٹریک پر مت سوچو، دوسرے زاویئے سے بھی غور کرو۔ ہوسکتا ہے، کوئی اور ہو۔ اپنی نظر کو وسعت دو۔''

''دیکھو، گوندل! اگر یہ سب ہما ہی کی طرف سے بھی ہو تو میں نے کوئی جوابی کاروائی تو نہیں کی اور نہ ہی میں کروں گا، چھوڑو ان باتوں کو، کہنا میں یہ چاہ رہا تھا کہ یوں اجنبیت ٹھیک نہیں ہے، یارا! بس مصروفیات ہی ایسی ہیں۔'' اس نے خجالت سے کہا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ پھر یونہی ہم ایک طرف بڑھ گئے۔

فلم کی مہورت کی وجہ سے اس رات بہت سارے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ زارا کے آنے کے ساتھ ہی ماحول میں اک ہلچل سی پیدا ہوگئی تھی۔ روشنوں، رنگوں اور خوشبوؤں کے ساتھ چہرے تھے کہ امنڈے ہوئے تھے۔ قہقہے، دھیمی مسکراہٹیں، باتیں کرتی ہوئی آنکھیں، بے باکیاں، سرگوشیاں اور نجانے کیا کچھ وہ رات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھی۔ اک نئی دنیا

میرے سامنے آشکار ہوئی تھی اور میں اس سے ہر ممکن حد تک حظ اُٹھا رہا تھا۔ میں نے اپنے ذہن سے تمام تفکرات جھٹک دیئے تھے اس لیے ہلکا پھلکا ہو جانے کے باعث زیادہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔ نئے نئے لوگوں سے تعارف کے باعث ایک عجیب سا ماحول بن گیا تھا۔ میڈیم جہاں کے گانے سے اس رسم کی شروعات ہوئیں اور پھر وہی ہلا گلا رہا جو اس موقع کی مناسبت سے روائیت رہا ہے۔ میں شوبز رپورٹرز میں ہی ایک طرف کھڑا تھا کہ دو تین لوگ میری طرف بڑھے۔ وہ خاصے خوش پوش تھے، تینوں نے باری باری مجھ سے مصافحہ کیا اور اپنا تعارف کروایا۔ ان میں سے زیادہ خوش پوش اور صحت مند شخص نے اپنا نام صادق گجر بتاتے ہوئے کہا۔

''آصف چوہدری اپنا یار ہے، مجھے اس نے آج ہی فون کیا ہے۔ اب کم از کم یہاں پر کوئی چڑیا نہیں پھڑک سکتی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ، بہت شکریہ! میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجھے کوئی تحفظ دیا جائے بلکہ میں نے تو اس کے ذمے کچھ اور کام لگایا تھا۔''

''وہ بھی ہو جائے گا، بس ایک دو دنوں کی بات ہے۔'' اس نے باقاعدہ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، پھر کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ چل دیا۔ اس رات خاصی دیر تک گہما گہمی رہی مگر باوجود کوشش کے میری زارا سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ ایک دو بار ایسا موقعہ آیا بھی لیکن رش کے باعث بات صرف ''ہیلو، ہائے'' تک ہی محدود رہی تھی۔ پھر رات گئے میں لوٹ آیا۔

دو دن بڑے سکون سے گزر گئے۔ اس دوران عامر بشیر نے میرا فلیٹ خالی کروا کر میسن روڈ پر سامان شفٹ کروا دیا۔ میں اب اپنے دفتر سے اور زیادہ نزدیک ہو گیا تھا مگر سٹوڈیو کے لیے کافی وقت لگ جاتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ ہما مجھے اخبار کے فون نمبر پر کئی بار فون کر چکی تھی، شاید اسے میرے سیل نمبر بارے پتہ نہیں تھا یا پھر وہ جان بوجھ کر اخبار کے ہی دفتر کرتی تھی۔ مجھے اس کی یہ منطق سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ گوندل سے بھی میرا نمبر معلوم کر سکتی تھی۔ میں نے اس پر ذرا غور کیا، پھر میں نے سوچا ہی نہیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس نے جب بھی فون کیا، میں دفتر میں موجود نہیں تھا۔ ہر بار اس کا مجھے یہی پیغام ملتا کہ فون کر لیں لیکن میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے ذرا سکون ملا تو میں نے اپنے آفس کے اندرونی ماحول اور خصوصاً سلیم فارانی کے بارے میں بھرپور جائزہ لیا۔ حسن اور اس کے چند دوست رپورٹر ایک ایسا ماحول بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے جس میں سلیم فارانی کے بارے عدم تعاون کی فضا بن گئی تھی۔ اخباری دنیا میں رپورٹنگ سب سے اہم شعبہ ہوتا ہے اور یہی شعبہ کمزور پڑ گیا تو اخبار

پھیکا پڑنے لگا۔اس دوپہر ہم سب اسی موضوع پر بات کر رہے تھے اور یہ طے پا چکا تھا کہ جیسے ہی سلیم فارانی کی طرف سے کوئی معاملہ ہو، اس کا بھرپور جواب دیا جائے۔ایک بالکل نیا اخبار مارکیٹ میں آ رہا تھا جس کے لیے حسن سے بات ہو گئی تھی کہ وہ عملہ پورا کرے۔میری فکر اس معاملے میں بھی ختم ہو گئی تھی کیونکہ میں نے جو سوچا تھا اس کے لیے ابھی وقت پڑا تھا اس لیے میں مطمئن تھا۔انہی باتوں کے بعد ہمارے ہی ایک صحافی دوست نے مجھ سے سرسری سے انداز میں مجھ پر قاتلانہ حملے کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے اچانک کہا۔

''یار! جیسا تم بتا رہے ہو کہ وہ حملے یوں تھے جیسے دھمکی ہو، اس کے پیچھے سلیم فارانی کا ہی ہاتھ نہ ہو؟''

''ہو سکتا ہے لیکن اس کا کوئی جواز نہیں بنتا''

''یار! سامنے کی بات ہے۔اس نے تمہاری بیٹ بدلی ہی اس لیے تھی کہ تم اخبار چھوڑ جاؤ۔اسے تم نے چیلنج سمجھا تو اس نے بھی بھرپور جواب دینے کی کوشش کی ہے۔آخر وہ کرائم رپورٹر ہے، اس کا تعلق ضرور ان لوگوں کے ساتھ بھی ہے جو کرائم کرتے ہیں۔اس کے لیے یوں کسی کو دھمکانا کوئی بڑی بات نہیں۔''اس نے سادگی سے کہہ دیا تو گوندل کی بات میرے ذہن میں لپک گئی۔

''ویسے پہلے میں نے ایسا سوچا نہیں تھا۔''

''تو اب سوچ لو۔''اس نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے سنجیدگی سے اس نئے انداز پر غور کرنا شروع کر دیا۔یہ ممکن تھا، سلیم فارانی اپنی خباثت کے باعث ایسا کر سکتا تھا۔میں نے کچھ دیر سوچا اور اس پر کوئی حتمی رائے اس لیے قائم نہ کی کہ ہما کی طرف سے معاملہ صاف ہو جائے تو پھر میں اسے دیکھ لوں گا۔دوپہر کا کھانا کھا کر میں اور حسن دفتر آ گئے تو خلاف معمول رپورٹنگ روم میں خاصی رونق تھی یا شاید مجھے ہی محسوس ہوا تھا۔ماریہ بہت چہک رہی تھی اور مجھے دیکھ کر ہلکی ہلکی طنز آمیز گفتگو ہونے لگی تھی۔میں محض مسکرا کر رہ گیا۔حسن نے پیون کو چائے لانے کا کہا اور کاغذ قلم نکال کر مصروف ہو گیا۔تبھی میرے موبائل کی گھنٹی بج اُٹھی، دوسری طرف زارا تھی۔

''کیا کر رہے ہیں آپ۔۔۔؟''اس نے رسمی باتوں کے بعد پوچھا۔

''ابھی تک تو کچھ نہیں کر رہا۔''میں نے یونہی خوشگوار لہجے میں کہا۔

''میں آ رہی ہوں۔''اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''تو آ جائیں، میں انتظار کر رہا ہوں۔''میں نے بھی اسی شوخ انداز میں کہا تو اس

لے الوداعی کلمات کہہ کر فون بند کر دیا، پھر چند منٹ گزرے ہوں گے کہ زارا رپورٹنگ روم میں ان وارد ہوئی۔ اس کے ساتھ بڑے بے باک لباس میں ایک لڑکی تھی اور ایک بڑے ڈیل ڈول والا شخص۔ اس کے یوں اچانک آنے پر مجھے ہلکی سی حیرت تو ہوئی لیکن میں نے خود پر قابو پا لیا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''میں ادھر سے گزر رہی تھی۔ میں نے پہلے پتہ کروایا کہ آپ آفس میں ہیں تو آپ کو فون کر دیا تا کہ تھوڑا سا آپ کو حیران کر دوں'' اس کے اس طرح کہنے پر میں مسکرا کر رہ گیا۔ اتنے میں پیون نے کرسیاں لگا دیں تو وہ عین میرے سامنے بیٹھ گئی۔

''بہت اچھا کیا، آپ ملنے آ گئیں ورنہ میں تو آپ کو فون کرنے والا تھا۔'' میں نے اخلاقاً کہا۔

''میری بڑی زبردست خواہش تھی آپ سے ملنے کے لیے، سوچ رہی تھی کہ کب ملاقات ہو۔ ایسے میں ہی اتنے دن نکل گئے۔''

''چلیں، آج اتفاق سے آپ کا ادھر سے گزر ہوا تو آپ نے ملنے کی زحمت کر لی۔''

''نہیں، اتفاق سے نہیں۔ میں سوچ کر آئی ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا، وہ بڑی ادا سے بالوں کو جھٹک کر بولی۔ ''میں نے آپ کو دیکھا تھا لیکن ملاقات نہ ہو سکی، دل چاہ رہا تھا کہ آپ سے ایک طویل ملاقات ہو۔ ڈھیر ساری باتیں کروں میں آپ سے'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو بڑی معصومیت سے پٹپٹایا جو صریحاً اداکاری تھی۔ اس لیے میں نے ماریہ کی جانب دیکھا جو سرخ ہوتے ہوئے چہرے اور شعلہ بار آنکھوں کے ساتھ مجھے گھور رہی تھی۔ میں دھیرے سے مسکرا دیا، پھر میں نے زارا کی طرف دیکھا جو کہہ رہی تھی۔

''قدرت نے رات ہی ایک موقعہ دے دیا۔ ہمارا یونٹ شوٹنگ کے لیے آج جا رہا ہے، مری کے مضافات میں شوٹنگ ہے۔ ہم رات کی فلائٹ سے پنڈی جائیں گے، رات اسلام آباد رہیں گے اور پھر صبح ہی صبح وہاں سے نکلیں گے۔ میں نے رات ہی فیصلہ کر لیا کہ آپ بھی ساتھ چلیں۔ آپ کی سیٹ بک ہے۔ آپ ڈنر میرے ساتھ لیں گے، پھر وہیں سے ائیر پورٹ نکل جائیں گے''

''یہ آپ نے یکدم ـــــ'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''اسی لیے میں آئی ہوں۔ فون پر اس لیے نہیں کہا کہ اگر آپ بحث کریں گے تو میں آپ سے کچھ کہہ نہ سکوں گی، خود آئی ہوں تا کہ'' اس نے شاید جان بوجھ کر فقرہ ادھورا اس لیے چھوڑا تھا کہ باقی بات اس نے آنکھوں سے کہہ دی تھی۔ زارا کی یکدم آفر پر میں کچھ ڈسٹرب

ہو گیا تھا۔ میں نے کچھ لمحے سوچنے کے لیے زارا سے کہا۔

''اچھا، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آپ بتائیں، کیا پئیں گی۔ کوئی فریش جوس یا کافی؟''

''کچھ۔۔بھی۔۔تونہیں میں اس وقت جلدی میں ہوں۔'' اس نے اک ادا سے کہا۔

''پھر بھی، کچھ نہ کچھ؟'' میری بجائے حسن نے کہا۔

''نو، تھینکس'' اس نے حسن کی طرف دیکھ کر کہا، پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''تو پھر میں آپ کا انتظار کروں گی۔''

''دیکھیں، میں آپ کو کچھ دیر بعد بتاؤں گا، ویسے آپ کا ٹور ہے کتنے دنوں کا؟''

''اوہ میں بتانا بھول گئی۔ بس ایک دن کام ہے میرا۔۔۔ورنہ یونٹ تو ایک ماہ اور رہے گا۔''

''چلیں، میں آپ کو تھوڑی دیر بعد فون کرتا ہوں۔'' میں نے کوئی حتمی فیصلہ دیئے بغیر کہا۔

''نہیں، فون نہیں کرنا بس آپ آرہے ہیں، او کے!'' یہ کہہ کر وہ اٹھتے ہوئی بولی۔ ''میں انتظار کروں گی۔'' اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر مڑ گئی۔ لاشعوری طور پر میری نظر ماریہ پر پڑی، وہ شدید غصے کی حالت میں تھی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ اب ضرور طنزیہ گفتگو کرے گی، اس کے لیے میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار بھی کر لیا مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ چپ چاپ اٹھی اور رپورٹنگ روم سے نکل گئی۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اگر کچھ کہہ دیتی تو مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنا اس کے تیزی سے چلے جانے پر تھی۔ میرے ساتھ بیٹھا حسن ہنس دیا۔

''شہزادی نے کچھ کہا نہیں، جان جی؟''

''مجھے بھی حیرت ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا خیال ہے تمہارا، زارا شاید ہما کی مخالفت کی وجہ سے ہی تم پر مہربان دکھائی دے رہی ہے؟'' وہ بولا۔

''ہاں، ہے تو ایسا ہی۔۔'' میں نے لاپرواہی سے کہا۔

''چلے جاؤ، ایک دن تو ہے۔ دیکھیں، کیا کہتی ہے؟ پھر زارا جیسی خاتون کا ساتھ۔۔۔میں ہوتا تو فوراً ہاں کر دیتا۔ وہ تمہیں خود آفر کرنے آئی ہے۔'' حسن نے خوشگوار موڈ میں دوسروں کو سناتے ہوئے کہا اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، میرے سامنے پڑا فون بج

اٹھا۔ میں نے ریسور اٹھا کر ''ہیلو'' کہا تو دوسری طرف نہایت غصے میں ماریہ نے کہا۔
''دیکھو، کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں اور اگر تم گئے تو میں تمہیں بخشنے والی نہیں۔''
''تم صرف بکواس کر سکتی ہو، اور کچھ نہیں۔'' میں نے دھیرے سے نہایت سرد لہجے میں کہا۔

''میں نے جو کہہ دیا، وہ سن لیا ہے نا۔!'' اس نے مجھ سے بھی سرد لہجے میں کہا۔
''ضروری نہیں کہ میں تمہاری ہر بات کا جواب دوں۔ سمجھیں تم۔'' یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا، غصے کی لہر نے میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔
''خیریت۔کون تھی؟'' حسن نے چونک کر پوچھا۔
''ماریہ تھی، زارا کے ساتھ نہ جانے کا کہہ رہی ہے'' میں نے دھیرے سے کہا۔
''نہیں رہ سکی نا۔'' وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا، پھر چند لمحوں بعد بولا۔'' ویسے، شجاع! تو مان نہ مان، کوئی معاملہ ہے ضرور تیرے اور ماریہ کے درمیان۔ اب یہ تیری مرضی ہے کہ تو اپنے دوست کو نہ بتائے۔''
''چھوڑ دے یار، اس قصے کو، میں تنگ آ گیا ہوں اس عورت سے۔'' میں نے انتہائی الجھتے ہوئے کہا۔
''اچھا چھوڑ دیا اور باقی رہی اس سے تنگ آنے کی بات تو اس کا بہت آسان سا علاج میرے پاس ہے، پھر کبھی تنگ نہیں کرے گی۔''
''وہ کیا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔
''میں نے اس بات کا یقین کر لیا ہے کہ جب بھی کسی عورت یا کہیں کسی عورت کے ہونے کا امکان ہو، یہ تمہارے معاملے میں وہیں بھڑکتی ہے۔تم ہر روز اک نئی عورت کو یہاں بلوالیا کرو۔ یہ تنگ آ جائے گی، کہنا چھوڑ دے گی یا اخبار چھوڑ جائے گی۔''
''میں۔۔۔یعنی میں ہر روز یہاں عورت کو بلوالیا کروں؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''ہاں، ویری سمپل۔'' حسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''تا کہ یہ میرا سر پھاڑ دے تنگ آ کر'' یہ کہتے ہوئے میں اپنا قہقہہ نہ روک سکا۔
''اس نے تمہارا سر کیا پھاڑنا ہے، یار! ویسے اگر تم اس کے بارے میں کوئی نرم گوشہ رکھتے ہو تو الگ بات ہے، جان جی!'' اس نے مخمور لہجے میں کہا تو میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔
''مجھے اس سے شدید قسم کی نفرت ہے۔'' میں نے لفظ چبا کر کہے تو حسن نے حیرت

سے میری طرف دیکھا۔ کئی لمحے وہ اسی حالت میں رہا تب دھیرے سے بولا۔

''معاملہ لمبا ہی نظر آتا ہے۔۔خیر، تم جاؤ، یار! پکنک منا آؤ۔'' اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

اس رات خنکی قدرے زیادہ تھی۔ میں نے زارا کے پورچ میں گاڑی کھڑی کی تو وہ میرے استقبال کو آن موجود ہوئی۔ ''ٹھیک وقت پر آئے ہیں آپ۔'' اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے نہایت خوشگوار لہجے میں کہا۔

''کیا کریں، عادت ہے۔'' میں نے بھی شوخی سے کندھے اچکا کر کہا تو وہ میرے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

''چاہے سفر ایک دن کا ہی سہی لیکن ہے تو۔۔۔آپ نے۔۔'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے کہا۔

''میرا بیگ پچھلی سیٹ پر پڑا ہے۔''

''اوہ، ڈیٹس گڈ۔۔۔چلیں، آئیں'' وہ مجھے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ اس ڈرائنگ روم سے اس کی نفیس طبیعت کا اندازہ ہو رہا تھا کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ہم ڈنر کے لیے ایک دوسرے کے سامنے آ بیٹھے۔ اس نے خاصا اہتمام کیا ہوا تھا۔ پھر ہلکی پھلکی باتوں کے دوران ڈنر ختم کر کے جب میں اٹھا تو وہ بولی۔

''چائے ہم بیڈ روم میں پئیں گے۔''

''جیسے آپ کی مرضی، میڈم۔۔۔!'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر ہم دونوں ہی بیڈ روم میں ایک جہازی سائز کے بیڈ پر جا بیٹھے۔ وہ میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ہمارے درمیان خاموشی تھی، کتنا وقت یونہی بیت گیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے زارا بیڈ روم میں ہونے کے باوجود ذہنی طور پر وہاں نہ ہو۔ پھر وہ یکدم چونک گئی

''شجاع، جی! ایک بات کہوں۔۔۔'' وہ دھیرے سے مسکرا کر بولی۔

''بولیں۔'' میں نے تجسس سے کہا تو میری طرف دیکھ کر تیزی سے بولی۔

''ایک تو آپ یہ آپ جناب ختم کر دیں۔''

''چلیں ٹھیک ہے، اور۔۔۔؟''

''آپ نے یہ ضرور سوچا ہوگا کہ میں یکدم ہی آپ پر اتنی مہربان کیوں ہو گئی، یوں جیسے بہت پرانی دوستی ہو اور پھر آپ نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ میں آپ کی طرف یکدم اس لیے متوجہ ہوئی ہوں کہ آپ کے اور ہما کے درمیان جو معاملہ چل رہا ہے، اس کے باعث۔۔۔؟''

وہ چپ ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں خاموش رہا تو وہ بولی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

”اس کا مطلب ہے، آپ نے سوچا ضرور ہے، خیر، یہ انسانی فطرت ہے اور آپ کو سوچنا بھی چاہیے۔ دراصل میں یہ کہنے جا رہی تھی کہ میں آپ کی طرف متوجہ کیوں ہوئی؟ پہلی بات تو آپ یہ ذہن میں رکھیں کہ اس کا کوئی حوالہ شوبز سے نہیں ہے۔ میں نے اس دن آپ کو پہلی بار دیکھا تھا جب آپ کے بارے خبر شائع ہوئی تھی۔ اس رات میں نے دور سے ہی آپ کو دیکھا تھا اور پہلی ہی نظر میں ۔۔۔“ وہ جذبات کی رو میں بہتی چلی جا رہی تھی کہ یکدم رک گئی، پھر ہنس کر بولی۔ ”آپ شاید یہ توقع کر رہے کہ میں پہلی نظر میں گھائل ہو گئی ۔۔۔ او، نو ۔۔۔ گھائل تو میں پہلے کی ہوں۔ پہلی ہی نظر میں آپ نے مجھے ماضی کی ان اتھاہ گہرائیوں میں لا پھینکا جنھیں میں یاد نہیں کرنا چاہتی۔“

”لیکن اس میں میرا کیا قصور؟“

”قصور آپ کا نہیں ۔ آپ خوبصورت ہیں، پیارے ہیں، وجیہہ ہیں۔ یہ صفات اپنی جگہ لیکن میری زندگی میں ہلچل کیوں مچ گئی، وہی وجہ میں آپ کو بتانا چاہ رہی ہوں۔ یقیناً آپ بھی جاننا چاہیں گے اور اسی وجہ نے مجھے آپ کے قریب آنے پر مجبور کر دیا۔“

”اتنا تجسس تو نہ پھیلاؤ، سیدھے سیدھے بتا دو۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو اس نے سائیڈ ٹیبل پر الٹی پڑی تصویر والا فریم سیدھا کر دیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں چونک گیا۔ وہ تصویر میری نہیں تھی لیکن کوئی بھی اجنبی اس تصویر کو دیکھ کر یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ میری آٹھ دس سالہ پرانی تصویر ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، مجھ سے حد درجہ مشابہت رکھتا تھا۔ میں کتنے ہی لمحے اس حیرت میں رہا، پھر میں نے سرسراتے ہوئے کہا۔

”حیرت انگیز ۔۔۔ کون ہے یہ جو مجھ سے اتنی مشابہت رکھتا ہے۔؟“

”ہے کوئی، اب اس ملک میں نہیں بلکہ پتہ نہیں کہ ہے بھی یا نہیں، آخر بار سنا تھا کہ وہ لندن سدھار گیا ہے۔ بہت عرصہ ہوا، وہ مجھ سے نہیں ملا۔“

”پھر بھی، کون ہے یہ؟“

”جس کی یادوں کے سہارے میں جی رہی ہوں، جس کا مجھے آج بھی انتظار ہے اور شاید زندگی کی آخری سانس تک رہے گا۔ میری زندگی، میرا جیون، میرا سب کچھ ہے یہ۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ کتنی ہی دیر تک وہ گم صم سی رہی، پھر اچانک

ہنستے ہوئے بولی۔ ’’آپ گھبرائیے گامت، میں آپ پر قطعاً عاشق نہیں ہونے والی‘‘

’’اور میں بھی عاشق ہونے والا نہیں ہوں۔‘‘

’’میں جانتی ہوں۔ میں نے آپ کے بارے میں جو سنا ہے، وہ یہی ہے۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے، تم باقاعدہ تفتیش کرواتی رہی ہو؟‘‘

’’بالکل، اور ایسا میں نے اس لیے کیا کہ میرا من بے کل تھا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ میڈم نیلم کے ہاں پارٹی میں گئے تھے، میں نے ان سے ہی پوچھا تھا اور پھر مزید انہوں نے آپ کے بارے میں ۔۔۔ خیر چھوڑیں، میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے دوست بن جائیں۔‘‘

’’دوست ہوں تو تمہارے پاس تمہارے بیڈ پر بیٹھا ہوں۔‘‘

’’ایک درخواست اور کہ ہمارے درمیان ہمارا پروفیشن نہیں آئے گا۔ میں کبھی آپ سے نہیں کہوں گی کہ آپ مجھے پروجیکٹ کریں، میرے بارے میں خبر لگائیں یا میرا کوئی بیان یا تصویر چھاپیں۔ میں اس دوستی کو بالکل الگ، سب سے چھپا کر رکھنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’اوکے، یارا! تقریر بند کرو۔‘‘ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو وہ بھی ہنس دی۔ وہ تمہاری چائے نہیں آئی۔‘‘ مجھے اچانک یاد آیا۔

’’اوہ، میں بھول گئی۔ میں نے کہا تھا، میں خود بناؤں گی۔ میں ابھی بنا کے لائی۔‘‘ وہ یہ کہہ کر جلدی سے اُٹھ گئی اور میں اس تصویر کو غور سے دیکھنے لگا جس سے مشابہت کے باعث زارا میرے قریب ہوئی تھی۔ کیا یہ عجیب اتفاق نہیں ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے تصویر کو دیکھا۔ پہلی نظر میں واقعی وہ میری پرانی تصویر لگتی تھی لیکن غور کرنے پر معلوم ہوا کہ محض بالوں کے انداز، مونچھوں کے سٹائل اور آنکھوں کی مشابہت ہے، باقی وہ مجھ سے مختلف تھا۔ شاید وہ اپنے محبوب کا ذرا سا عکس پا کر ہی مچل گئی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ پتہ نہیں کیوں، میں نے یہاں آکر تھوڑا سکون محسوس کیا تھا۔ پھر چائے پینے کے کچھ ہی دیر بعد ہم ایئر پورٹ کے لیے نکل گئے۔

فلائٹ پر سیفٹی بیلٹ کھولنے کے بعد وہ ذرا سا گھوم کر بیٹھ گئی، اس سے ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہ رہی تھی۔ کچھ لمحے یونہی گزر گئے، تب پھر وہ بولی۔

’’آپ کہیں یہ تو خیال نہیں کر رہے کہ میرے ساتھ آکر کوئی غلطی کی ہے؟‘‘

’’تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’ایسا اس لیے کہ ہم شوبز کے لوگ اپنی شہرت میں کچھ اچھے نہیں ہوتے نا۔‘‘ اس

نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

''جیسی بھی ہو، تم نے کہا اور میں نے مان لیا۔ پھر زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ لوگ باتیں بنائیں گے تو بنانے دیں، ہمارا کیا لیتے ہیں۔'' میں نے لاپرواہی سے کہا۔

''وہ بھی ایسا ہی کہتا تھا۔'' وہ پھر سے ماضی میں کھوگئی۔ پھر بازگشت کی سی آواز کے ساتھ کہا۔ ''اتنی پیاری باتیں کرتا تھا، اتنا معصوم، بس یار! وہ میری قسمت میں نہیں تھا اور شاید میں ہی اس قابل نہیں تھی۔''

''تم اس کے بارے میں بتاؤ تو سہی۔'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، آپ کو بتانا ہی ہوگا۔ اب تو میں اس کی باتیں آپ ہی سے کر کے اپنا من ہلکا کرنے کی ایک کوشش کرسکتی ہوں۔'' وہ اسی طرح کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ پھر چند لمحے چپ رہنے کے بعد کہنے لگی۔ ''کوئی وقت تھا، ہم کوٹھے والیاں گانے بجانے کے علاوہ مردوں کو لبھانے کی تعلیم ہی حاصل کرتی تھیں اور یہی ہمارے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ پھر وقت اور حالات بدلتے چلے گئے۔ میری ماں کوٹھے سے اٹھ کر علامہ اقبال ٹاؤن آگئی لیکن باقاعدہ اپنے اڈے پر جاتی رہی۔ مجھے ڈانس کی تعلیم تو ملی مگر میں سکول سے نکلی تو کالج تک جا پہنچی۔ میری ماں کا خیال تھا کہ اس طرح وہ میرے دام زیادہ کھرے کرسکتی ہے۔ صفدر مجھے کالج میں ہی ملا تھا، وہ جھنگ سائیڈ کے کسی گاؤں کا تھا'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی جیسے اندر ہی اندر کسی ابلتے ہوئے لاوے کو روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں اس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ ''پھر یوں ہوا کہ اسے میری اصلیت کا پتہ چل گیا۔ وہ میرے ساتھ مخلص تھا، اسے صرف مجھ سے غرض تھی۔ وہ میری زندگی کے سنہرے دن تھے۔ میں صفدر کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھ رہی تھی لیکن میری ماں مجھے فلم ہیروئین بنانے کی ٹھان چکی تھی۔ میں ان دنوں کالج میں ہی تھی کہ صفدر گم ہوگیا۔ میں نے پاگلوں کی طرح اسے تلاش کیا لیکن وہ مجھے نہ مل سکا۔ وہ اپنے گاؤں بھی نہیں رہا تھا، بس یہی پتہ چلا کہ وہ مزید پڑھنے کے لیے لندن چلا گیا ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ لندن چلا گیا ہے؟''

''ایک دوست کو میں نے اس کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے مجبور کیا تو وہ اس کے آبائی گاؤں گیا تاکہ اس کے والدین سے صحیح معلومات لے آئے۔ وہ وہاں سے ایک خط لایا جو صفدر نے لندن سے اپنے والدین کو لکھا تھا۔''

''اس پر ایڈریس تو ہوگا اس کے لندن کا؟''

’’نہیں، اس کے والدین نے وہ پھاڑ لیا تھا۔‘‘ وہ تیزی سے بولی۔ پھر چند لمحے بعد دکھی لہجے میں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔’’ان کی مجبوری تھی۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ میری ماں نے میرے علم میں لائے بغیر اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا تھا۔ اچھا ہی ہوا، وہ منظر سے ہٹ گیا۔ ورنہ اس ٹکراؤ میں اس کا بہت نقصان ہو جاتا...... اللہ کرے، وہ ایک شاندار کیرئیر بنا چکا ہو۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، زارا بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے تھپتھپایا تو وہ آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرنے لگی۔ پھر کتنی دیر خاموشی کے بعد بولی۔’’میرے پاس سب کچھ ہے لیکن اس کی کمی مجھے آج شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے بلکہ گزرتے دنوں کے ساتھ مزید بڑھ گئی ہے۔‘‘

’’ریلیکس، زارا ‘‘میں نے اسے سہارا دیا مگر وہ اس حصار سے نہ نکل سکی۔ پھر جب تک ہم ائیر پورٹ نہیں پہنچ گئے، وہ اسی کی باتیں کرتی رہی اور میں سنتا رہا۔ فلم یونٹ کے کئی لوگ ہمیں لینے آئے ہوئے تھے، اس وقت زارا کچھ اور ہی تھی۔ مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ ایک کامیاب اداکارہ ہے۔ کچھ دیر پہلے کی زارا نجانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔ اسلام آباد میں وہ لوگ ایک بڑے سارے بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ باتیں کرتے اور کافی پیتے رات گہری ہو گئی، تب ہدایت کار نے جلدی سو جانے کو کہا تا کہ صبح جلد نکل سکیں۔

وہ دن بہت خوشگوار گزرا تھا۔ میں جب بیدار ہوا تو زارا میک اپ کر چکی تھی۔ وہ ایک پہاڑی لڑکی کے روپ میں تھی۔ زارا کو ایک ایسی پہاڑن لڑکی کا کردار ادا کرنا تھا جو بھیڑیں چراتی ہے۔ جب لوکیشن پر پہنچے تو معلوم ہوا، سین کیا ہے۔ زارا کو مختلف زاویوں سے بھیڑیں چراتے ہوئے دکھانا تھا۔ ہیرو اس کے پاس سے گزرتے ہوئے گاؤں کا راستہ پوچھتا ہے، یہی چند مکالمے تھے۔ دوپہر تک وہ اپنے سین فلما کر فارغ ہو چکی تھی۔ یونٹ نے ابھی وہیں رہنا تھا جبکہ ہم اسلام آباد واپس آ گئے۔ کچھ دیر وہاں آرام کرنے کے بعد لاہور کے لیے چل دیئے۔ اس وقت رات بھیگ چلی تھی جب میں زارا کے ساتھ اس کے گھر پہنچا۔ میری گاڑی اسی کے ہاں کھڑی تھی۔ میں اسی وقت اپنے گھر جانا چاہ رہا تھا کہ اس نے روک لیا۔

’’سونا ہی ہے نا، ادھر سو جائیں۔ صبح آپ کو قطعاً نہیں روکوں گی۔‘‘اس نے تھکے تھکے سے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ دیر خوشگوار موڈ میں باتیں کرتے رہنے کے بعد ہم سو گئے۔



میں اس وقت ناشتے سے فارغ ہو کر نکلنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ عامر بشیر کا فون

آ گیا۔

''کہاں ہو یار؟''

''لاہور میں ۔۔۔ تمہیں حسن نے نہیں بتایا؟'' میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''ہاں، بتایا تھا۔ کیا ابھی تک زارا کے ہاں ہی ہو؟'' اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

''بالکل وہیں ہوں اور اب یہاں سے نکل کر دفتر جاؤں گا، ویسے خیریت؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''نہیں، خیریت نہیں ہے۔ رات تمہارے گھر کو کسی نے آگ لگا دی ہے۔'' اس کا لہجہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

''اوہ۔!'' مجھے یکدم ایک جھٹکا سا لگا۔

''مجھے رات ہی پتہ چلا تھا، چوکیدار نے فون کر کے اطلاع دی تھی۔ ان لوگوں نے چوکیدار کو بے ہوش کر دیا تھا اور پھر جب اسے ہوش آیا تو آگ بھڑکی ہوئی تھی۔''

''چوکیدار کو تو کچھ نہیں ہوا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''نہیں، سر میں معمولی زخم ہے۔ وہاں اور لوگ بھی آ گئے تھے، فائر بریگیڈ بھی آ گیا تھا''

''آگ لگنے کی وجہ کیا تھی؟''

''میں سمجھ گیا ہوں، تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ وہ پولیس کو معلوم ہو چکی ہے، خیر، کوئی بات نہیں۔ دوپہر کو ملتے ہیں پریس کلب میں''

''نقصان کتنا ہوا ہے؟ میرا مطلب ۔۔۔''

''کچھ نہیں بچا، بس تم اسے بھول جاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔ تبھی زارا بولی۔

''خیریت، شجاع؟''

''میرے گھر کو آگ لگا دی گئی ہے، یہ واقعہ اس گزرنے والی رات ہی کا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ، آئی سی ۔۔۔'' یہ کہہ کر وہ کتنی ہی دیر تک گم صم رہی۔ تب میں نے جانے کے لیے اجازت چاہی تو وہ بولی۔

''مجھے یہ احساس تو ہے کہ شاید آپ میرے پاس رہنا گوارا نہ کریں لیکن ایک چھوٹی درخواست ہے کہ جب تک کوئی بندوبست نہ ہو جائے، آپ میرے پاس ۔۔۔''

''ڈونٹ وری، زارا ہو سکتا ہے، میں تمہارے پاس ہی رہوں۔ اس وقت تو میں

دفتر چلوں۔''

''میں انتظار کروں گی اور آپ کی راہ تکوں گی'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''او کے۔ مجھے تمہارے خلوص پر یقین ہے۔'' یہ کہہ کر میں اُٹھ کر باہر کی طرف چل دیا۔

میں وہاں اس لیے شفٹ ہوا تھا کہ یہاں زیادہ تحفظ ہے مگر چند دنوں میں ہی یہ نا خوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ انسان اپنے تحفظ کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن پھر بھی حادثہ ہو جاتا ہے، شاید اسی کو مقدر کہتے ہیں۔ ایسے حادثات میں نقصان کبھی نا قابل تلافی ہوتا ہے اور کبھی انسان صاف بچ نکلتا ہے۔ مجھے اپنے نقصان کا ملال نہیں تھا لیکن اس واقعہ نے مجھے یہ باور کرا دیا تھا کہ میرے دشمن اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رکھیں گے جب تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتے لیکن ان کا مقصد کیا تھا؟ میں ابھی تک نہیں جان پایا تھا اور اب جان لینا میرے لیے بہت ضروری ہو گیا تھا۔ ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ جس کا عوض محض میری زندگی کا خاتمہ ہے؟

میں دفتر پہنچا تو حسن میرے انتظار میں تھا۔ اسے سب معلوم ہو چکا تھا۔ میٹنگ کے بعد مجھے ذرا تنہائی ملی تو میں نے آصف کو فون کیا۔ میرے ہیلو کرتے ہی اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں شرمندہ ہوں، یارا! کہ تمہارا گھر جل گیا۔ یہ میرے آدمی کی غلطی تھی کہ تمہارے اسلام آباد جانے کے باعث وہ تمہارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکا۔''

''اوہ، تو تمہیں پتہ ہے؟''

''ہاں، پتہ ہے''

''لیکن میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون نہیں کیا بلکہ میں نے تو۔۔۔''

''مائی ڈیئر! ان میں سے کوئی ہاتھ لگ جاتا تو پتہ چل جانا تھا لیکن خیر، کوئی بات نہیں۔ اب لاہور اتنا بڑا بھی نہیں کہ میں سارے بدمعاش نہ کھنگال سکوں۔ پتہ چل جائے گا، وہ کون ہے؟''

''ٹھیک ہے۔''

''بہر حال تم اپنا خیال رکھنا۔ پاس کچھ رکھتے بھی ہو یا بھیجوں کوئی شے؟''

''نہیں، ہے میرے پاس'' میں نے جھوٹ بول دیا۔

''کہاں ہے، گھر تو تمہارا جل گیا، کہیں اسلحہ چلانا بھول تو نہیں گئے؟''

''ایسا نہیں ہے، یارا! میں بس بچتا ہوں اس سے۔'' میں نے صاف کہہ دیا۔

''خیر، ضرورت محسوس ہو تو بلا جھجک فون کر دینا۔ دس منٹ میں تم تک پہنچ جائے گا۔''

''اچھا، او کے، اللہ حافظ!''میں نے مزید بات سے بچنے کے لیے جلدی سے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ ریسیور رکھ کر میں نے کرسی سے ٹیک لگائی تو ماریہ کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ اس کے دہکتے ہوئے خوبصورت گال اور بڑی بڑی آنکھیں بڑی قاتل تھیں، پتلے پتلے ہونٹوں پر اگر مسکراہٹ ہو تو دل موہ لینے والے تھے مگر وہاں ایک ایسا تاثر تھا جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا۔ وہ مجھے اپنے آپ سے جدا لگ رہی تھی۔ وہ بظاہر میری ہی طرف دیکھ رہی تھی لیکن میرے دیکھنے کے باوجود اس کا تاثر نہیں بدلا تھا، جیسے بے جان مورتی ہو۔ میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ کتنے ہی لمحے یونہی بیت گئے۔ اچانک مجھے اسے چھیڑنے کا خیال سوجھا اس لیے اونچی آواز میں حسن کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''یار! عجیب جمالیاتی حسن سے عاری شخص ہو تم، کل کے ٹور کی روداد ہی نہیں سنی تم نے؟''

''میں ذرا یہ کام ختم کر لوں تو پھر ذرا چسکے سے سنوں گا نا، یار! آخر تم ایک ہیروئین کے ساتھ دو راتیں اور ایک دن گزار چکے ہو۔ مجھے سرخیاں نہیں، پوری خبر سننی ہے'' حسن سب کچھ سمجھتے ہوئے چور نظروں سے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''چلو ٹھیک، میرا دل تمہیں سنانے کو چاہ رہا ہے۔''

''اتنا رنگین وقت گزارا، جان جی؟''حسن نے مصنوعی حیرت سے کہا تو میں دل ہی دل میں اس کی حیرت پر مسکرا دیا۔ ماریہ غصے میں اُٹھی اور رپورٹنگ روم سے نکلتی چلی گئی، تبھی میرا قہقہہ نکل گیا۔

پریس کلب میں لنچ پر میں، عامر اور حسن تینوں تھے۔ اس دوران عامر نے بتایا کہ پولیس نے ابتدائی رپورٹ لکھ لی ہے اور یقیناً اپنی تفتیش شروع کر دیں گے، اس ضمن میں وہ مجھے بھی ملیں گے۔ میری طرح وہ لوگ بھی اندھیرے میں تھے۔ میں نے انہیں آصف چوہدری کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ آصف سے میرا تعلق پرانا تھا اور میری موجودہ زندگی میں جو لوگ میرے اردگرد تھے، ان میں تقریباً ایسے لوگ موجود تھے جو میرے ماضی کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ حسن اور عامر بھی میرے ایسے ہی دوستوں میں سے تھے۔ ظاہر ہے، آصف چوہدری کا نام آ جانے سے مجھے پھر بہت کچھ بتانا پڑتا۔ کافی دیر تک ہم یونہی ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے مگر ہمارے ہاتھ کوئی سرا نہ آیا۔ میری رہائش بارے عامر نے بندوبست کر دیا تھا۔ وہ فلیٹ ابھی خالی تھا، وہ چاہتا تھا کہ وہ فلیٹ فرنشڈ ہو جائے تو میں وہاں جاؤں اور اس دوران میں اس کے ہاں جا کے رہوں۔

''یار! میں بہت دیر سے آتا ہوں، آپ لوگ ڈسٹرب ہوگے۔'' میں نے اسے باور کرایا۔

''کچھ نہیں ہوتا، انیکسی خالی ہے۔ ایک بندہ تمہارے لیے موجود رہے گا، پھر چوکیدار ہے۔'' عامر نے لمحوں میں مسئلہ حل کر دیا۔ میں اس کے خلوص سے بے حد متاثر تھا۔ اس کی تمام تر باتوں سے میں یہی سمجھا کہ وہ فلیٹ میں آگ لگنے کا قصوروار خود کو سمجھ رہا ہے۔ میں نے اس کے اس احساس کو ختم کرنے کی کوشش کی، پھر کافی دیر تک باتیں کرتے رہنے کے بعد ہم اٹھ گئے۔

پہلی بار مجھے بے گھر ہونے کا احساس ہوا تھا۔ شام ڈھلے پرندے اپنے گھونسلوں کی جانب لوٹتے ہیں، کتنا اطمینان ہوتا ہے کہ میرے پاس رہنے کا ٹھکانا ہے۔ اس دن نہیں تھا تو عجیب بے چینی میرے اندر در آئی تھی۔ وہ کیسے لوگ ہوں گے جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا؟ اس سوچ نے یوں سلسلہ باندھا تو پتہ نہیں کہاں کہاں کے خیال اور کن کن لوگوں کا درد سمٹ آیا۔ میں نے ذہن کو جھٹکا اور اپنے آنے والے ایڈیشن کے بارے میں سوچنے لگا۔ کل مجھے اس کی ڈمی دینا تھی۔ میں انہی خیالوں میں تھا کہ میرا سیل بج اُٹھا۔ میں نے نمبر دیکھے تو وہ اجنبی سے تھے۔ میں نے فون آن کر کے ''ہیلو'' کہا تو دوسری طرف نسوانی آواز میں کہا گیا۔

''سیٹھ افراسیاب بات کریں گے۔ ہولڈ آن، پلیز'' چند لمحوں بعد سیٹھ افراسیاب کی بھاری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہاں جی، شجاع صاحب! کیسے ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں، اللہ کا شکر ہے۔'' میں نے محتاط انداز میں حتی الامکان اپنا لہجہ خوشگوار بنالیا۔

''بڑی بات ہے جو آپ میں اتنا حوصلہ ہے، بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو گھر جل جانے کے باوجود یوں نارمل ہوں۔'' اس نے سرسراتے ہوئے انداز میں کہا تو میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ سیٹھ افراسیاب کو معلوم ہوگیا ہے کہ میرا گھر جل گیا ہے، اس نے بات کی شروعات ہی میں یہ حوالہ دے کر کیا ثابت کرنا چاہا ہے؟ اچانک ہی میرے ذہن میں یہ سوال ابھر آئے۔ اسی لمحے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ سیٹھ افراسیاب نے مجھے کس مقصد کے لیے فون کیا ہے؟ ''کس سوچ میں کھو گئے؟'' اس نے کہا تو میں بڑے نارمل انداز میں بولا۔

''میں آپ کے مزید کچھ کہنے کا انتظار کر رہا تھا۔''

''او۔۔۔ اچھا، خیر، آج شام کیا کر رہے ہیں آپ؟''

''کچھ نہیں، وہی معمول کے مطابق سٹوڈیو جاؤں گا''

''پھر ایسا کیجیے کہ سٹوڈیو جانے سے قبل اگر آپ کے پاس وقت ہو تو مجھے مل لیں۔

آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں اور ہاں، یہ مت کہیے گا کہ فون پر ہی کہہ دوں‘‘

’’آپ مجھے بتائیں، کہاں اور کس وقت ملنا ہے۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔‘‘

’’میں اپنے کچھ دوستوں کو ڈنر دے رہا ہوں، آپ تشریف لے آئیں تو محفل کی رونق اور بڑھ جائے گی‘‘ سیٹھ کے اس طرح کہنے پر نجانے کیوں مجھے اس کے لہجے میں چھپا طنز محسوس ہو گیا اس لیے میں نے الجھتے ہوئے بظاہر خوشگوار لہجے میں ہی کہا۔

’’سوری، سیٹھ صاحب! میں ڈنر کسی اور کے ساتھ کروں گا۔ اس سے پہلے۔۔۔‘‘

’’اوہ، زارا اچھی لڑکی ہے۔ اس کے مقابلے میں میری کمپنی آپ کو کیا مزہ دے گی۔ خیر، آپ اگر چاہیں تو وہیں آ جائیں۔ ڈنر نہ لیں، ویسے ہی کچھ وقت مجھے دے دیں۔‘‘ اس کا انداز اور لہجہ وہی تھا جس سے مجھے بہر حال بے چینی ہونے لگی۔ کیا وہ میرے بارے میں اتنا جانتا ہے کہ اسے یہ تک معلوم ہے کہ میری زارا کے ساتھ کمپنی ہے؟ تب میں نے فوراً کہا۔

’’جی، میں حاضر ہو جاؤں گا۔‘‘ اس نے مجھے ریسٹورنٹ کا نام اور وقت بتایا، پھر الوداعی کلمات کے بعد فون بند کر دیا۔ اسی لمحے سے میرے دماغ میں یہ سوال ٹھوکریں مارنے لگا کہ سیٹھ افراسیاب میرے بارے میں معلومات کیوں رکھتا ہے اور وہ مجھ سے آخر کیوں ملنا چاہتا ہے؟ میں نے ہر پہلو پر سوچا مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آ سکی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سیٹھ افراسیاب سے میری ملاقات میڈم نیلم کے گھر پارٹی میں ہوئی تھی، وہاں اس نے بڑی مہمل سی گفتگو کی تھی۔ جس پر عامر بشیر نے مجھ سے پوچھا کہ ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئیں ہیں۔ میں خود اس کی مہمل باتیں نہیں سمجھ سکا تھا تو عامر کو کیا بتاتا؟ پھر اسی رات جب میں بیگم شہوانی کے ساتھ اس کے گھر جا رہا تھا، تب مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ حملے کا انداز دھمکی آمیز تھا۔ اس کے بعد ایک سلسلہ چل نکلا۔ سیٹھ افراسیاب کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے اس کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں، پھر وہ میرے بارے میں اتنی معلومات کیوں رکھتا ہے؟ ایسے ہی بے شمار سوال میرے ذہن میں آتے چلے گئے۔ میں نے اپنے ذہن کو مزید نہیں کھپایا بلکہ اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب مجھے اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا۔

میں وقت پر وہاں پہنچ گیا۔ ڈائننگ ہال کے ایک گوشے میں وہ دو تین لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور وہی نوخیز سی لڑکی جسے میں نے پہلے بھی اس کے ساتھ دیکھا تھا، اب بھی وہاں موجود تھی۔ وہ شاید میری ہی راہ تک رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑھ آئی۔ وہ دور سے ہی مسکراتی ہوئی آ رہی تھی، میرے قریب آ کر بولی۔

’’بہت خوب، آپ تو وقت کے بہت پابند ہیں‘‘ پھر ساتھ ہی ایک ادا سے کہا۔

''آیئے۔''اس نے ایک اور میز کی طرف اشارہ کیا تو میں ادھر بڑھ گیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔تب میں نے غور سے دیکھا، وہ خاصی ہیجان خیز تھی،اس پر اس کے بیٹھنے کا انداز قیامت ڈھا رہا تھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران اس نے میرے ساتھ سوفٹ ڈرنک ختم کی اور پھر اٹھ گئی۔ میں نے کئی بار سیٹھ افراسیاب کی طرف دیکھا۔اس کے ساتھ بیٹھے لوگ قطعاً کاروباری نہیں تھے، میں بہر حال کاروباری لوگوں کو جانتا تھا۔ہم نے سوفٹ ڈرنک ختم کیا ہی تھا کہ سیٹھ افراسیاب اٹھ کر میرے پاس آگیا۔اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ڈارلنگ! تم ذرا مہمانوں کو کمپنی دو، میں ان سے بات کرلوں۔''

ہم میں کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں چلتی رہیں۔ وہ میرے گھر جل جانے کے بارے میں پوچھتا رہا، پھر اس نے وہی مہمل باتیں شروع کر دیں۔

''نشیمن اجڑ جائے تو کوئی بات نہیں، نیا بسا لیا جاتا ہے مگر تنکے اکٹھے کرنے میں خاصا وقت لگتا ہے۔اگر آپ چاہیں تو میں ڈھیر سارے تنکے آپ کو دے سکتا ہوں۔''

''سیٹھ صاحب! جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آپ یہ تنکے مجھے یونہی نہیں دیں گے۔''

''ہاں ۔! آپ خاصے سمجھ دار ہو، آپ کی ذہانت کا تو میں پہلے ہی سے معترف ہوں۔آپ کی ڈھیر ساری باتیں مجھ تک پہلے بھی پہنچتی رہتی ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ آپ مجھ میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟''

''آپ کی معصومیت مجھے بہت اچھی لگ رہی ہے۔آج تو آپ کی شخصیت کے بہت سارے پہلو میرے سامنے آ رہے ہیں۔آپ با حوصلہ ہیں، پر اعتماد اور معصوم بھی ہیں، خیر، کہتے ہیں کہ شیر کی کچھار میں یا سانپ کے بل میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔''

''میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''نہ، ایسے نہیں۔آپ کو تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ جب کوئی شیر کی کچھار میں گھس جائے یا سانپ کے بل میں ہاتھ ڈال دے تو پھر کیا ہو سکتا ہے؟''اس نے پوری سنجیدگی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ اس کی سنجیدگی ہی تھی جو میں اس کی مہمل باتیں بھی بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ ضرور اشارے کنائے میں مجھے کوئی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔اب جبکہ میرے پاس اس کی کسی بات کا کوئی ریفرنس نہیں تھا تو میں اس کی بات کس طرح سمجھ جاتا؟ یقیناً کوئی بات تھی جو وہ مجھ سے کہنا چاہ رہا تھا لیکن کہہ نہیں پا رہا تھا۔ مجھے یہ چاہیے تھا کہ میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش کروں اس لیے میں نے کہا۔

''چلیں، میں یہی پوچھ رہا ہوں آپ سے؟''

''تو، میرے پیارے! اس کا جواب بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرح کرنے میں سوائے موت کے اور کچھ نہیں ملتا'' اس نے انتہائی سرد لہجے میں کہا تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ کہیں مجھ پر قاتلانہ حملے سیٹھ افراسیاب ہی تو نہیں کروا رہا؟ اس وقت شاید میں پھٹ پڑتا لیکن میں نے انتہائی ضبط سے کام لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو ٹھیک ہے، آپ صحیح کہہ رہے ہیں''

''بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شیر یا سانپ دوستی بھی کر لیتے ہیں۔ خیر، سوچ لو۔ پھر مجھے اس کا جواب دے دینا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی بات کا اثر میرے چہرے پر دیکھنے کی کوشش کی۔ میں تیزی سے کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ چند لمحے کوئی جواب نہ پا کر اٹھ کھڑا ہوا تو مجھے بھی اٹھنا پڑا، ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کہا۔

''اگر آپ ڈنر لیتے تو اچھا تھا خیر، اگلی ملاقات میں ہم ڈنر ضرور لیں گے، او کے!''

ایسا کہتے ہوئے اس کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔ میں نے کوئی بات نہیں کی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ سیٹھ افراسیاب کی باتوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا، ایک ہیجانی کیفیت میرے اندر طاری ہوگئی تھی۔ اگر یہی قاتلانہ حملے کروا رہا ہے تو کس مقصد کے لیے؟ یہی بات اندھیرے میں تھی اور میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں بے خیالی میں یہی سوچتا دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھا تو سیٹھ افراسیاب کی باتیں میرے دماغ میں مچلنے لگیں۔ وہ ایسا کیا چاہتا ہے کہ مجھے قتل کر دینے کی دھمکی تک دے بیٹھا ہے۔ مجھے یہ کافی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ یہ دھمکی آمیز قاتلانہ حملے سیٹھ افراسیاب ہی کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ لیکن کیوں؟ اس کی وجہ بھی تو سامنے آنی چاہیے۔ اس نے حملے کروا کر مجھے دھمکانے اور ڈرانے کی کوشش کی۔ پھر جب اس کا اثر نہ ہوتے دیکھا تو اب کھل کر سامنے آ گیا۔ مگر بات ہنوز وہیں تھی کہ کیوں، وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ وہ صاف بھی نہیں بتا رہا تھا۔ مجھے تو اسی وقت پتہ چلنا تھا جب وہ کھل کر مجھ سے بات کرتا۔ یہ بات کنفرم تھی کہ وہ مجھ سے کچھ چاہتا ہے۔ کیا چاہتا ہے، میں اس بابت کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس نے جس انداز سے میرے ساتھ بات کی تھی وہ بہر حال ذلت آمیز تھی۔ یہ احساس میرے اندر ٹھوکریں مار رہا تھا۔ وہ پوری طرح میرے سامنے نہیں کھلا تھا۔ میرے ضبط کر جانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ مجھ پر کھل جائے۔ پھر اس کے بعد سیٹھ افراسیاب کو یہ بتانا ضروری تھا کہ وہ مجھ پر حملے کروا کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر چکا ہے۔

میں اس وقت آہستہ روی سے گاڑی چلاتا ہوا مال سے گزر رہا تھا کہ میرا فون بج اٹھا، دوسری طرف زارا تھی۔ اس لمحے اس کی آواز میرا موڈ خوشگوار کر گئی۔

''کہاں ہیں آپ؟'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''سڑکوں پر آوارہ گردی کر رہا ہوں۔'' میں نے بھی شوخی سے کہا۔

''اوئے ہوئے، بڑا زبردست شوق فرما رہے ہیں۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ بولی۔ ''میں نے پوچھا ہے کہ آپ کہاں ہیں؟''

''خیریت؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں، خیریت ہے۔ آپ بتائیں نا، جلدی سے'' وہ ضدی سے لہجے میں بولی تو میں نے بتا دیا۔

''میں اس وقت گلبرگ مین مارکیٹ میں ہوں، آپ ادھر آ جائیں۔'' اس نے مجھے لوکیشن سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ مت پوچھئے گا کہ کیوں؟ بس آپ آ جائیں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے اپنا فون جیب میں رکھا اور اگلے یوٹرن سے گاڑی موڑ لی۔ تبھی میں نے سوچا کہ زارا کی دلچسپی مجھ میں ضرورت سے زیادہ ہی بڑھ رہی ہے۔ اس نے مجھے جو کہانی سنائی تھی، وہ بھی میرے حلق سے نہیں اتری تھی مگر ایک بات ایسی تھی جس کے باعث وہ مجھے اچھی لگتی تھی اور وہ یہ تھی کہ اس سے مل کر خوشگواریت کا ایک احساس رگ و پے میں سرایت کر جاتا تھا۔ وہ اجنبی ہونے کے باوجود اپنی سی لگتی تھی۔ میں نے سوچا کہ جس طرح کئی لوگ زندگی میں آنے کے بعد نکل جاتے ہیں، ان میں یہ بھی ایک سہی۔ اب پتہ نہیں، یہ فوراً ہی نکل جانے والی تھی یا پھر کچھ دیر بعد؟ اس وقت بھی زارا کا فون کچھ ایسا ہی تاثر دے گیا تھا۔ میں جو سیٹھ افراسیاب کے باعث سلگا ہوا تھا، ان سوچوں نے میرے ذہن پر اثر انداز ہونا چاہا تو زارا کی باتیں تپتے ہوئے صحرا میں بادل کا ٹکڑا ثابت ہوئیں۔ میں اس وقت خالی الذہن ہو چکا تھا۔ میں زارا کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچا تو اس کا ڈرائیور گاڑی کے قریب کھڑا تھا، مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑھا۔

''لائیں، صاحب جی! گاڑی مجھے دے دیں، میں پارک کر دیتا ہوں، میڈم وہ سامنے والی شاپ میں ہیں۔'' اس نے انگلی کے اشارے سے ایک شاپنگ سنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے چابی گاڑی میں ہی رہنے دی اور اس شاپنگ سنٹر کی طرف بڑھ گیا، جلد ہی وہ مجھے نظر آ گئی۔ اس نے مجھے خوشگوار حیرت سے دیکھا، پھر خوشی سے بولی۔

''آپ اتنی جلدی آ جائیں گے، مجھے توقع نہیں تھی۔''

''آ تو میں گیا ہوں لیکن بلایا کس لیے ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ ہنس دی، اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''مجھے آپ کے سائز میں الجھن ہو رہی تھی۔ میں نے آپ کے لیے کپڑے خریدنا تھے اور دوسری استعمال کی چیزیں''

''اوہ، تو تمہیں میرا اس قدر خیال ہے۔'' میں نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

''جی'' پھر آزردہ لہجے میں بولی۔ ''گھر جل جانے کے بعد اب آپ کو نئے سرے سے چیزیں تو خریدنا ہیں استعمال کی۔''

''وہ میں ۔۔۔ خیر چلو خریدو، جو خریدنا ہے۔'' میں نے اس کا دل رکھنے کو کہا۔ حقیقت یہی تھی کہ مجھے اب اپنے استعمال کی چیزیں نئے سرے سے تو خریدنا ہی تھیں۔ میرے لاشعور میں تھا کہ جیسے ہی نئی جگہ جاؤں گا تو سب لے لوں گا۔ اس کا احساس زارا نے کیا تو میرے دل میں اس کے لیے اک خاص قسم کا جذبہ ابھر آیا جسے میں کوئی نام نہیں دے پایا تھا۔ کافی دیر بعد ڈھیروں شاپنگ بیگ اٹھائے ہم وہاں سے نکلے۔ ڈرائیور زارا کی گاڑی لے آیا تو اس نے سب کچھ اس میں رکھ دیا، پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''آؤ، شجاع۔!''

''مگر ابھی تو مجھے سٹوڈیو جانا ہے۔''

''مجھے بھی جانا ہے لیکن گھر سے ہو کر چلتے ہیں۔'' پھر پلٹ کر ڈرائیور سے پوچھا۔ ''کوئی فون؟''

''جی، دو مرتبہ عسکری صاحب پوچھ چکے ہیں۔''

''اب تم ایسا کرو کہ صاحب کی گاڑی لے کر گھر آ جاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے گاڑی کا گیئر لگایا اور چل دی۔ سٹوڈیو پہنچنے سے ذرا پہلے میں نے زارا سے کہا۔

''مجھے یہیں اتار دو، میں پیدل آتا ہوں''

''اگر آپ کو میرے ساتھ دیکھ لیا گیا تو کیا قیامت آ جائے گی؟'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''سمجھا کرو'' یہ کہہ کر میں نے دوبارہ کہا۔ ''گاڑی روک دو۔'' اس نے گاڑی روک دی اور میں پیدل ہی سٹوڈیو چلا گیا۔ اس رات سٹوڈیو میں خاصی رونق تھی۔ اتنے دنوں میں اذیت ختم ہو چکی تھی۔ میں کئی سارے لوگوں سے ملتا ہوا ایک ایسے سیٹ پر جا پہنچا جہاں ہما کی شوٹنگ چل رہی تھی، شاید کوئی گانا فلمایا جا رہا تھا کیونکہ وہ ڈانس ڈائریکٹر کے ساتھ ڈانس کی ریہرسل کر رہی تھی وہیں اچانک میری نظر ندیم پر پڑی، وہ میری طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

''ارے تم کیسے ۔۔۔ تمہیں تو آرام کرنا چاہیے تھا، یہاں کیسے براجمان ہو......؟'' میں نے ہما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جو میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''آپ بے فکر ہو جائیں، اب یہ ہما میری ڈیوٹی میں ہے۔ اس خبیث کو اس قدر۔۔۔''

''ایسا نہیں کہتے اگر کوئی کمینہ پن دکھائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا جواب اسی طرح دیا جائے، اور بہت سارے طریقے ہوتے ہیں۔''

''بھائی! آپ اس دنیا کی زبان نہیں سمجھتے، یہاں کچھ اور طرح سے بات کی جاتی ہے۔''

''جگہ یا دنیا کوئی بھی ہو لیکن تم تو تم ہونا! تم برے کیوں بنتے ہو۔ بہت وقت پڑا ہے، تم خواہ مخواہ اپنا دماغ خراب نہ کرو آؤ، چلتے ہیں ذرا کھلی ہوا میں۔'' میں نے اسے ساتھ لیتے ہوئے کہا۔ ابھی ہم نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ایک شخص تیزی سے آیا اور بولا۔

''وہ، آپ کو ہما جی بلا رہی ہیں'' اس کے اس طرح کہنے پر میں رک گیا۔ میں نے مڑ کر ہما کی طرف دیکھا، وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ تبھی میں نے اس شخص سے کہا۔

''اسے کہو کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر کوئی بات کرنا ہے تو دفتر میں آجائے گیارہ بجے کے بعد۔'' یہ کہہ کر میں چل دیا۔ اس رات میں ڈھیر سارے لوگوں سے ملا۔ ان میں صادق گجر بھی تھا۔ وہاں خاصا وقت گزر گیا، رات جب گہری ہو چلی تو زارا نے مجھے فون کیا۔

''کہاں تشریف رکھتے ہیں؟''

''یہیں آپ کے انتظار میں آنکھیں فرش راہ کیے بیٹھا ہوں۔''

''تو، حضور! ہماری آمد ہے۔ پارکنگ کے قریب پہنچیے......'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

صبح ناشتے کے بعد میں چائے پیتے ہوئے اخبار دیکھ رہا تھا کہ عامر بشیر کا فون آ گیا، چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولا۔

''رات تم سیٹھ افراسیاب سے ملے تھے؟''

''ہاں، ملا تھا۔'' میں نے کہا اور پھر ایک خیال کے تحت فوراً ہی پوچھ لیا۔ ''لیکن تمہیں کیسے خبر۔۔ معلوم ہوتا ہے، میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی خبریں رکھنے لگے ہو؟''

''یار! بات یہ نہیں ہے۔ تم مجھے ملو لیکن تنہائی میں، تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں۔ میں تمہیں دوبارہ فون کروں گا، تم دفتر میں ہی رہنا'' اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں ادھر ہی رہوں گا اور کوئی خاص بات؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی نہیں، بس اپنا خیال رکھنا'' پھر ہلکے سے قہقہے کے ساتھ بولا۔ ''مگر زارا کے

معاملے میں نہیں، لگتا ہے، خاصی دوستی ہوگئی ہے؟''

''یہ تو ہے خیر، ملتے ہیں۔'' میں نے فون بند کر دیا اور گھڑی دیکھی تو دفتر کا وقت ہو چلا تھا۔ زارا ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے اس کا انتظار نہیں کیا اور دفتر کے لیے نکل گیا۔

میٹنگ کے بعد، میں نے سگریٹ سلگایا اور حسن سے کہا۔

''یار! چائے تو منگواؤ لیکن ہو ذرا ماریہ جیسی تلخ اور کڑوی۔'' میں نے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا تھا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی، میں نے پہلی بار اس سے یوں مذاق کیا تھا۔

''نہیں، جان جی! ایسی چائے یہاں نہیں ملتی۔'' حسن نے پوری سنجیدگی سے کہا جو مصنوعی تھی۔

''تو پھر کیسی ملتی ہے؟'' میں نے ماریہ کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

''زارا کی طرح میٹھی اور جاندار چائے مل سکتی ہے، جان جی!'' یہ جملہ کہتے ہوئے ان کی مسکراہٹ نہ رک سکی۔

''بہت خدمت کرنے والی عورت ہے، یار!'' یہ کہتے ہوئے میں نے پھر ماریہ کی جانب دیکھا۔

''خوش قسمت ہو، اتنی حسین لڑکی تمہاری خدمت کر رہی ہے۔'' حسن نے شوخی سے کہا۔

''اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔'' میں نے کہا

''ذرا بچ کے رہنا اس سے، کہیں اس کے عشق میں۔۔۔'' حسن کچھ اور بھی کہتا اس درمیان میں ماریہ بول اُٹھی۔

''عشق مرد کرتے ہیں۔ اس سے پوچھ لو، کیا یہ واقعی ہی مرد ہے؟'' اس کے لہجے میں آگ تھی اور جو لفظ اس نے کہے تھے، آگ لگا دینے والے تھے۔ اس وقت دو چار لوگ ہی اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں بھڑک اٹھتا لیکن میں نے نہایت تحمل سے کہا۔

''اور عورت عشق کرتی ہے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''عورت کی تو فطرت میں ہی وفا ہے اور جس طرح کا عشق عورت کر سکتی ہے، مرد اس تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔''

''غور کرو، تمہاری اپنی بات میں ہی تضاد ہے۔ باقی میں مرد ہوں یا نہیں، ماریہ! تم پھر کون جان سکتا ہے۔'' میں نے دھیرے سے کہا تو وہ چیخ گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا، اس نے کوئی بات نہیں کی۔ سر جھکائے وہ کاغذوں سے الجھتی رہی۔ کتنے ہی لمحے خاموشی

نے نگل لیے، تبھی حسن نے سرگوشی میں کہا۔
''آج شام کہیں نہیں جانا، نئے اخبار کے مالک کے ساتھ میٹنگ ہے''
''فارانی کا کیا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''معلوم یہ ہوا ہے کہ مالک اسے ہٹانے کی فکر میں ہیں مگر کوئی فائدہ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟''
''کہیں انہیں۔۔۔'' میں نے فکرمندی سے پوچھا۔
''نہیں، ابھی معلوم نہیں ہوا لیکن ہوسکتا ہے، آج رات انہیں معلوم ہو جائے۔''
حسن نے انتہائی سنجیدگی سے کہا، اسی لمحے میرے سامنے پڑا فون بج اُٹھا۔
''چلو ٹھیک ہے۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف ہما تھی۔
میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔
''ہیلو بولیں، بات کریں......؟''
''دیکھیں، میں آپ سے ملنا چاہ رہی ہوں۔ دفتر میں کیا ضروری ہے، آپ لنچ میرے ساتھ کیوں نہیں لیتے؟''
''بی بی! ملنا تو چاہ رہی ہے، مجھے ضرورت نہیں ہے جو میں نے کہا ہے، اس پر عمل کرو ورنہ میرا وقت ضائع مت کرو'' میں نے غصے میں کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔
''کون تھی، جان جی! اتنا غصہ؟'' حسن نے پوچھا تو میں نے روانی میں کہہ دیا۔
''ہما تھی، مجھ سے ملنا چاہ رہی ہے۔''
''مل لیا کرو نا، یار! ایک خوبصورت عورت تم سے ملنا چاہ رہی ہے تو اتنا غرور کس لیے، جان جی؟'' حسن نے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا لیکن اس وقت میں اسے چھیڑنے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے کوئی بات نہیں کی۔ مجھے اس وقت عامر بشیر کے فون کا انتظار تھا۔
اس کا فون تو نہ آیا لیکن کچھ دیر بعد وہ خود آ گیا، وہ بیٹھا نہیں بلکہ کھڑے ہی بولا۔
''اچھا ہوا حسن، تم یہیں ہو۔ آؤ، چلیں۔''
''کہاں؟'' حسن نے پوچھا۔
''شجاع کا نیا گھر دکھانے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ اس کا ساتھ نہیں دے دیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ وہ شدید قسم کے دباؤ میں ہے۔ میں نے کوئی بات نہیں کی اور ہم چل دیئے۔ ہم نے اپنی گاڑیاں وہیں رہنے دیں اور عامر کے ساتھ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد سمن آباد میں پہلے گول چکر کے نزدیک ایک طرف مڑ گئے اور ایک ذرا سے پرانے طرز کی لیکن تازہ

رنگ وروغن والی کوٹھی کے سامنے گاڑی جا رکی۔ راستے میں عامر نے بتادیا تھا کہ اس گھر کے دو پورشن ہیں۔ اوپر والے پورشن میں ایک ادھیڑ عمر عورت مسز خان رہتی ہیں۔ جن کا ایک بیٹا ہے اور بہو، ان کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ نیچے والا پورشن ان کی ضرورت سے زائد ہے، پہلے بھی کرائے پر تھا اور اس میں کوئی فیملی رہتی تھی۔ چونکہ یہ ان کے بہت قریبی لوگوں میں سے ہیں۔ اس لیے میرے رہنے پر رضا مند ہو گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد گیٹ کھول دیا گیا اور ہم گاڑی سمیت اندر چلے گئے۔ مجھے پہلی نظر میں وہ گھر اچھا لگا تھا۔ بالکل پرسکون، بڑا سا ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ مسز خان کا بیٹا ابرار بھی گھر پر تھا۔ ان سے تعارف کروا کے مکان کی پسندیدگی کے بارے میں بتایا پھر معاملہ طے پا گیا تو ابرار نے کہا۔

''عامر بھائی! میں چلتا ہوں، محض دو گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔''

''ہاں ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ ہم کچھ دیر یہاں بیٹھیں گے۔'' عامر نے کہا تو وہ چلا گیا۔

''اب یہاں کیا کام، جان جی؟'' حسن نے حیرت سے پوچھا۔

''ہے نا۔۔۔کام۔ میں نے بات کرنی ہے۔۔۔ آؤ، نیچے چلتے ہیں۔'' عامر نے بے چینی سے کہا تو میں نے سنجیدگی سے عامر کی حالت کے بارے میں سوچا۔ میں نے کبھی بھی اسے اس طرح مضطرب نہیں دیکھا تھا۔ نیچے ایک کمرے میں صوفہ اور کرسیاں پڑی تھیں۔ ہم ان پر جا بیٹھے تو میں نے عامر کی حالت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

''عامر! تمہارے من میں جو کچھ بھی ہے، کہہ دو۔ جتنی بڑی بات بھی ہے، بولو؟''

''یار! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے'' اس نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''موت سے ڈرتے ہو، گولی لگ جائے گی کیا؟'' میں نے تیزی سے کہا تو وہ بولا۔

''میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن مجھے کچھ اور ڈر ہیں۔ وعدہ کرو کہ بات جو بھی ہو، پہلے اس کی اچھی طرح تصدیق کر لینا۔ میری نیت پر شک مت کرنا۔''

''اوہ، تو یہ بات ہے۔ بولو، لیکن شرط یہی ہے کہ بالکل سچ کہنا۔''

''سچ ہی تو کہنے جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ جیسے بات کہنے کی ہمت کر رہا ہو، پھر دھیرے سے بولا۔ ''مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں بات کہاں سے شروع کروں لیکن خیر، تم لوگوں کو پتہ ہے کہ عورت اور وہ بھی خوبصورت عورت میری کمزوری ہے۔ میری زندگی میں جانے کتنی آئیں اور کتنی گئیں۔ جس طرح شراب پینے والے کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ کہاں سے ملے گی، اسی طرح مجھے بھی سمجھ آتی گئی کہ میرے مطلب کی لڑکیاں کہاں مل سکتی ہیں۔ ایسی ہی ایک اڈہ یہ فوزیہ گل نامی ایک عورت ہے۔ بظاہر وہ ایک بیوٹی پارلر چلاتی ہے لیکن اس کا دھندہ کچھ

اور ہے۔ اس کے پاس ایک ایسی لڑکی آئی جسے دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں اس کی بڑی سے بڑی قیمت دے دینا چاہتا تھا لیکن مجھ سے پہلے ہی وہ سیٹھ افراسیاب کے پہلو میں جا پہنچی۔ اس لڑکی سے وہیں فوزیہ کے گھر میری کئی ملاقاتیں ہوئیں تھیں۔ میں اس کی آنکھوں میں، اس کی باتوں اور اس کے رویئے سے اپنے لیے پسندیدگی دیکھ چکا تھا لیکن میری پیاس بجھنے سے پہلے ہی وہ سیٹھ کے پاس چلی گئی جس کا مجھے بہت دکھ ہوا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ہم میں سے کوئی نہ بولا تو وہ کہتا چلا گیا۔ "نجانے اس کے لیے میرے اندر ضد کیوں اتر آئی۔ میں نے اس سے بھی زیادہ پیسے کی آفر کی تھی فوزیہ کو لیکن وہ بھی مجبور تھی، وہ اسے سیٹھ کے پاس بھیج چکی تھی اور وہ مستقل طور پر اسے اپنے پاس رکھ چکا تھا۔ سیٹھ افراسیاب اپنے پاس نوخیز سی لڑکی رکھتا ہے اور اُس پر جی کھول کر خرچ کرتا ہے۔ فوزیہ کو یہ معلوم تھا کہ اسے جو کچھ سیٹھ سے مل سکتا ہے، وہ میں نہیں دے سکتا۔ وہ اپنا ایک بہت بڑا گاہک خراب نہیں کرنا چاہتی تھی اور پھر وہ سیٹھ کو پسند بھی آ گئی تھی۔ اس سلسلے میں فوزیہ نے میری کوئی مدد نہ کی تو مجھے چڑ سی ہو گئی اور میں نے اس لڑکی کو حاصل کرنے کی ٹھان لی۔" یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر بولا۔ "میں نے صرف دو ماہ میں اس لڑکی کو حاصل کر لیا۔ اب وہ میرے پاس ہے اور اس کی خبر نہ تو سیٹھ افراسیاب کو ہوئی اور نہ ہی فوزیہ کو۔۔۔ اب آپ لوگ سوچو گے کہ میں نے یہ ساری کہانی کیوں سنائی؟"

"ظاہر ہے، اس وقت تو یہی خیال آ رہا ہے، جان جی۔" حسن نے تجسس سے کہا۔

"میں نے اس لڑکی کو دو طرح سے حاصل کیا ہے۔ ایک طریقہ تو میں نے یہ اپنایا کہ میں نے انتہائی محتاط انداز میں لڑکی سے رابطہ کیا، اسے اپنی طرف مائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی جس کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک شاندار ماحول چھوڑ کر میرا دم بھر رہی ہے۔"

"بے وقوف ہے وہ۔۔۔" حسن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"خیر، یہ الگ بات ہے۔ دوسرا طریقہ میں نے یہ اپنایا کہ سیٹھ افراسیاب کے لوگوں میں سے انتہائی قریبی بندے کو توڑا۔ اسے میں نے اپنی برطانیہ برانچ کا منیجر بنانے کا لالچ دیا اور اس کے انتہائی اہم راز حاصل کر لیے جس سے میرے سامنے بہت ساری انکشافات ہوئے۔ ایسا میں نے صرف اس لیے کیا کہ اگر کسی وجہ سے میری اور اس کی ٹھن جائے تو میں ان رازوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکوں۔"

"وہ راز کیا تھے؟" میں نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے مزید جاننا چاہا۔

"اس کی کاروباری اور اس کی نجی زندگی کے بارے میں تھے۔ کاروبار میں جو اس

نے بے قاعدگیاں کی تھیں، حکومت کے ساتھ اور کچھ لوگوں کے ساتھ۔ اس کی نجی زندگی بڑی رنگین ہے۔ مجھے کچھ تصویریں ایسی ملی ہیں جن سے اس کی شخصیت مسخ کی جاسکتی ہے۔''

''او تو یہ بوڑھا۔'' حسن نے کہا

''اس معاملے میں بہت غلیظ ہے۔ اصل بات جو میں بتانا چاہ رہا تھا، وہ یہ ہے کہ تقریباً ایک ماہ پہلے اسے پتہ چل گیا کہ وہ لڑکی میرے پاس ہے۔ فوزیہ نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے صاف انکار کر دیا، تب وہ میری دشمن ہوگئی۔ اس نے سیٹھ افراسیاب کو اکسایا کہ لڑکی مجھ سے چھین لی جائے۔ اس نے مجھ سے اس معاملے میں ذرا سختی سے کہا تو میں نے رازوں کا حوالہ دے دیا، وہ پیش بندی میرے کام آگئی اور شجاع! میں نے تمہارے نام کی ڈھال سے اس پر بہت سارے وار کیے۔''

''یعنی ان رازوں سے متعلق تم نے میرا نام لیا؟''

''بالکل، میں نے اس سے یہی کہا کہ تم میرے دوست ہو۔ اس لیے یہ سارے راز اور ثبوت تمہارے پاس ہیں اور میرے کہنے پر اسے کسی بھی وقت استعمال کر سکتے ہو۔ اس طرح وہ براہ راست نہ تم سے کہہ سکتا تھا اور نہ مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا اس لیے خاموش ہوگیا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھ پر قاتلانہ حملے اس۔۔۔۔''

''نہیں، میں بتا رہا ہوں اس نے مجھ سے بات کی کہ میں تم سے بات کر کے منہ مانگی رقم کے عوض وہ ثبوت واپس کر دوں اور آئندہ کچھ بھی نہ کرنے کا وعدہ کرلوں تو وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ میں نے تم سے بات کرنے کا وعدہ کر لیا۔ میں اس معاملے ہی کو ختم کرنا چاہ رہا تھا۔ اس لیے سوچا کہ تم سے بات کرلوں اور تمہیں ساری صورت حال بتا کر اعتماد میں لے لوں۔ میری اس سے یہ بات ان دنوں ہوئی جب تم ہمدانی صاحب کے ساتھ تھے، واپس آئے تو یکدم ہی حالات تبدیل ہوگئے۔ میں بھی یہی سمجھا تھا کہ تم پر قاتلانہ حملے سیٹھ افراسیاب ہی کروا رہا ہے، اسی وجہ سے مجھے اس پر بہت غصہ آیا۔ ان حالات میں اگر میں تم سے بات کرتا تو تم جانے میرے بارے میں کیا خیال کرتے اور شاید میں بتا بھی دیتا لیکن ایک دن تم نے براہ راست مجھ پر شک کر لیا تھا کہ کہیں میں ہی تم پر حملے تو نہیں کروا رہا۔ ہوتا ہے ایسا، جب بندہ ذہنی الجھن کا شکار ہو تو کچھ بھی سوچ سکتا ہے۔ میں دہرے عذاب کا شکار ہوگیا۔ میں تم لوگوں کو نہیں کھونا چاہتا تھا اور سیٹھ افراسیاب کو بھی اس کے عمل پر منہ توڑ جواب دینا چاہتا تھا اور میں نے ایسا کیا۔''

''کیا کیا تم نے؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''میں نے اسے بہت بھاری نقصان پہنچایا اور اسے یہ باور کرا دیا کہ اگر اس نے تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو اس کی خیر نہیں۔ اب لڑائی اس کی اور میری تھی مگر تمہیں پتہ ہی نہیں تھا۔ پھر مجھے اپنے ذرائع سے پتہ چلا کہ سیٹھ افراسیاب نے تمہارے خلاف کچھ بھی نہیں کیا تھا بلکہ وہ خاموش ہو چکا تھا۔ میرے نقصان پہنچانے اور دھمکی دینے پر وہ بھڑک اٹھا اور رات تم سے اس نے بات کی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اب تک جو مجھ پر حملے ہوئے ہیں، وہ سیٹھ افراسیاب نے نہیں کروائے؟'' میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

''ہاں، شجاع! اس نے نہیں البتہ اب وہ بھڑک گیا ہے۔ اس لیے اس نے براہ راست تم سے بات کی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میری شروع کی ہوئی لڑائی مجھ تک ہی محدود رہے اور میں ہی اسے ختم کردوں اور ایسا ہو بھی گیا تھا لیکن میری غلط فہمی کے باعث اب یہ معاملہ بہت الجھ گیا ہے۔''

''ڈونٹ وری، عامر! میں سیٹھ کو دیکھ لوں گا۔ تم گھبراؤ مت۔ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا لیکن سوال ہنوز وہی ہے کہ مجھ پر حملے کروا کون رہا ہے؟''

''یہی تو بات سوچنے کی ہے۔'' عامر نے شدت سے کہا پھر ایک لمبا سانس لے کر میرے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔ ''شجاع، میرے دوست! میں نے جو کچھ تمہیں بتائے بغیر کیا ہے، تمہاری دوستی کے مان میں کیا ہے۔ پلیز، مجھے معاف کر دو۔'' اس نے کچھ طرح کہا کہ میرا دل بھر آیا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''اونو یار! ایسے مت سوچو۔ میں نے کوئی شکوہ تو نہیں کیا تم سے، اگر تم ویسے بھی مجھے کہہ دیتے تو میں تمہارے ساتھ تھا اور اب بھی ہوں۔ تم میرے دوست ہو، یار!''

''او چھوڑو، ان باتوں کو۔ اس پری چہرہ کا دیدار تو کرواؤ۔ جس کے لیے یہ سارا کھڑاک پھیلایا گیا ہے؟'' حسن نے کچھ اس طرح کہا کہ ماحول پر چھایا تکدر ختم ہو کر رہ گیا۔

''یار! مسز خان نے چائے پلوانا تھی ہمیں، وہ ابھی تک'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تو عامر جلدی سے بولا۔

''میں نے خود کہا تھا کہ ذرا دیر سے پئیں گے اور وہاں، ان کا پورشن بالکل الگ ہے۔ پچھلی طرف سے راستہ ہے۔ تمہیں یہاں کوئی پرابلم نہیں ہوگا۔ میں اپنے ہاں سے ایک ملازم بھجوا دوں گا، وہ سارے کام کر دیا کرے گا۔'' عامر نے یوں باتوں کا سلسلہ چھیڑا تو کافی دیر ہو گئی۔ اس دوران چائے بھی پی لی۔ عامر نے سیٹھ کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتا دیا۔

واپسی پر میں نے خاموش رہا۔ میرے ذہن میں سیٹھ سے نمٹنے کا منصوبہ طے پا گیا تھا۔ پھر جب ہم دفتر کے سامنے پہنچے تو میں نے عامر سے کہا۔

''وہ لڑکی کدھر ہے اب؟''

''میں نے ایک جگہ رکھا ہوا ہے اسے ''

''میں اگر فون کروں تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا تو عامر بولا۔

''آج ہی یا کسی اور دن۔۔۔؟''

''ممکن ہو تو آج ہی یا پھر۔۔۔''

''او کے، باس! میں اسے بتا دوں گا، وہ تیار رہے گی۔'' اس نے کہا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد حسن نے کہا۔

''کیا خیال ہے تمہارا، عامر ٹھیک کہہ رہا ہے۔؟''

''اگر ٹھیک نہیں بھی کہہ رہا تو کیا ہوا، ہم نے اسے دوست کہا ہے۔ وہ کچھ بھی کرے، ہم نے تو اپنی دوستی نبھانی ہے۔''

''او، شجاع! مجھے تم پر فخر ہے۔'' حسن نے انتہائی جذباتی انداز میں میرا ہاتھ پکڑ لیا تو میں نے تھپتھپاتے ہوئے دھیرے سے چھوڑ دیا۔ تب وہ شوخی سے بولا۔

''آؤ، اس خوشی میں تھڑے پر رکھے ہوئے بنچ پر بیٹھ کر لنچ کریں۔'' لنچ کے بعد حسن نکل گیا اور میں اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس وقت میرے علاوہ ایک اور خاتون رپورٹر تھی یا پھر پیون ایک کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں نے رپورٹنگ میں موجود ڈائریکٹ فون اٹھایا اور سیٹھ افراہاب کے نمبر ملا دیئے۔ وہ دفتر میں ہی موجود تھا۔

''جناب! کہیے، کیسے مزاج ہیں آپ کے؟'' میں نے لہجے کو انتہائی خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

''میں تو ٹھیک ہوں، آپ کے مزاج کا مجھے اندیشہ رہتا ہے۔''

''یہی سوچ کر میں نے آپ کو فون کیا ہے کہ آپ کو میرے متعلق کوئی اندیشہ نہ رہے میں تو آپ کے ساتھ رات ڈنر نہ لے سکا، آج میں آپ کو آفر کرتا ہوں۔'' میرے کہنے پر اس نے چند لمحے توقف کیا شاید سوچ رہا تھا پھر بولا۔

''کہاں؟''

''جہاں آپ پسند کریں۔''

''ٹھیک ہے، میں بتا دوں گا لیکن یہ طے رہا کہ ڈنر ضرور کریں گے۔''

''میں انتظار کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا، اب مجھے شام ڈھلنے کا انتظار تھا۔

اس وقت میں اپنی معمول کی خبریں فائل کر کے سکون سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا کہ عامر بشیر کا فون آ گیا۔

''وہ میں نے بندے بجھوا دیئے تھے۔ گھر کی صفائی کر کے سامان سیٹ کر دیا ہے، اب سکون سے جا کر ادھر ہی سو جانا۔''

''وہ تو میں سو جاؤں گا لیکن کیا تم نہیں چاہتے کہ میں زارا کی ''خدمات'' سے استعفادہ کروں؟'' میں نے شوخی سے کہا تو وہ ہنس دیا۔ پھر بڑے ہی موڈ میں بولا۔

''ہم تو کہتے ہیں کہ تم بھی وہ کچھ کرو جو ہم کرتے ہیں۔ قسم سے، تم نے پی ہی نہیں۔ تمہیں کیا پتہ اس کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ بوتلوں کے پاس رہنے سے نشہ تو نہیں ہوتا، نا۔۔۔!''

''مجھے ایسا نشہ نہیں چاہیے جو عقل پر پردے ڈال دے۔''

''اور کبھی کبھی عقل سے بھی پرے ہو جانے میں بڑا سرور ہے، پیارے! کبھی آزما دیکھو۔''

''دیکھیں گے، ابھی تو جو تھوڑی بہت عقل ہے، وہ چاہیے مجھے۔'' میں نے کہا تو وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''ارے ہاں، وہ میں نے نائلہ سے کہہ دیا ہے اور تمہارا فون بھی دے دیا ہے۔ اس کے پاس موبائل ہے۔ اسے جب بھی کال کرو گے اور جہاں بھی آنے کے لیے کہو گے، وہ پہنچ جائے گی''

''ہاں، اس کی ضرورت پڑے گی مجھے۔ شاید آج ہی۔''

''میں نے فون کر کے کہہ دیا ہے، جب چاہو وہ پہنچ جائے گی، باقی باتیں پھر ہوں گی۔ او کے، بائے۔'' اس نے جلدی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو حسن کے آنے کا وقت ہو گیا ہوا تھا۔ اب تک نجانے وہ کدھر تھا، بہر حال مجھے تو اس کا انتظار کرنا تھا۔ کافی وقت گزر جانے کی وجہ سے میری بوریت میں اضافہ ہو گیا تو میں مختلف لوگوں کو فون کرنے لگا۔ تبھی میرا سیل بج اٹھا، دوسری طرف حسن تھا۔

''بھئی کہاں ہو تم، میں یہاں انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے تیزی سے کہا تو وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

''او سنو تو سہی، جان جی! وہ میٹنگ کینسل ہو گئی ہے، میں نے خود کی ہے۔ ابھی میں

بھٹی صاحب کے پاس سے اٹھ کر آ رہا ہوں۔" اس نے اخبار کے مالک کا نام لیا جس میں ہم کام کر رہے تھے تو مجھے حیرت ہوئی۔ میں چپ رہا تو وہ بولا۔ "اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہم جا رہے ہیں۔ اس نے وجہ پوچھی تو میں نے بتا دی۔"

"پھر کیا کہا اس نے؟"

"یہی کہ ہم ان کو بندہ دے دیں، وہ اسے تبدیل کر دے گا۔"

"تم اسے بندہ نظر نہیں آتے؟"

"نہیں، میں نے ظفر تارڑ کا نام دیا ہے۔ کل تک اگر کچھ ہو گیا تو ٹھیک، ورنہ ہم اخبار بدل جائیں گے۔ میں نے حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔"

"او کے، جیسا تم چاہو۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا ہے۔ میرے ذہن پر چھائی الجھن دور ہو گئی تھی۔

اس وقت سورج ڈوب چکا تھا جب میں زارا کے ہاں پہنچا۔ وہ ڈرائنگ روم میں ایک شخص کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں کچھ دیر ان کے پاس ٹھہرا اور پھر اوپر چلا گیا۔ میں خوب نہایا، فریش ہو کے کپڑے بدلے اور نیچے آیا تو وہ شخص جا چکا تھا لیکن زارا وہیں بیٹھی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی چہک کر بولی۔

"یہ بال بنا کر اور کپڑے بدل کر کدھر قیامت ڈھانے کے ارادے ہیں؟"

"بس کر دی نا، عورتوں والی بات۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"عورت ہوں، بات بھی عورتوں والی ہی کروں گی۔" وہ بھی مسکرا دی، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "چائے نہیں پئیں گے آپ؟"

"ضرور پئیں گے۔ آؤ، لان میں بیٹھتے ہیں۔" میں نے کہا تو اس نے چائے کا کہا اور میرے ساتھ لان میں آ کر بیٹھ گئی۔ یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران سیٹھ الراسیاب کا فون آ گیا۔

"کہاں ڈنر دے رہے ہیں آپ؟" اس کا لہجہ طنزیہ تھا لیکن میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"یہی بتانے کے لیے تو آپ نے فون کرنا تھا۔"

"چلیں ٹھیک ہے پی سی میں آ جائیں۔"

"میں ایک گھنٹے میں پہنچ ر وں"

"میں انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ تبھی میں نے نائلہ کے نمبر ال کیے، دو چار بیل جانے کے بعد نسوانیت کی تمام تر خوبیوں سے مزین انتہائی خوبصورت

آواز میں ''ہیلو'' کہا گیا۔ وہ آواز یقیناً مجھے متاثر کر گئی تھی۔

''تم نائلہ ہو؟''

''جی اور آپ شجاع؟''

''ہاں، میں شجاع ہی ہوں، کتنی دیر میں پی سی پہنچ جاؤ گی؟''

''یہی کوئی آدھے گھنٹے میں۔''

''تو پھر وہیں پہنچو اور ہاں، تمہیں پہچانوں گا کیسے؟''

''میں خود آپ تک پہنچ جاؤں گی، میں نے آپ کو دیکھا ہوا ہے۔ آپ کو یاد نہیں، آپ سے ایک بار مل بھی چکی ہوں۔''

''او، ایسا، میں اب سے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد تمہارا لابی میں انتظار کروں گا۔ سی یو، بائے۔'' میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ تو زارا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میرا شک ٹھیک تھا، نا! یہ بن س کے، ویسے یہ نائلہ ہے کون؟''

''ایک ماڈل گرل ہے۔'' میں نے چائے کا آخری سپ لیتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا، تبھی زارا بولی۔

''او کے، وش یو گڈ لک۔۔۔''

میں لابی میں پہنچا تو ایک سبک سی لڑکی میری طرف بڑھ آئی میرے سامنے آ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں نائلہ ہوں'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں پھر مسکرا اٹھیں تھیں۔

''او، اچھا، تو تم نائلہ ہو؟'' میں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بلاشبہ وہ خوبصورت تھی۔ پورے چہرے پر اس کے ہونٹ سب سے زیادہ جاندار تھے، بھرے بھرے رسیلے سے۔ قدرے اوپر کو اٹھی ہوئی ناک اور سوئی سوئی، کاجل بھری نشیلی آنکھیں۔ سیاہ سوٹ میں اس کا سفید رنگ نکھر اُٹھا تھا۔ لانبی گردن میں سونے کی چین، اس کے سراپے میں اک ایسی بے نام سی کشش تھی کہ میں کافی دیر تک اس کے لیے کوئی تشبیہہ ڈھونڈ تا رہا۔

''کہاں کھو گئے آپ؟'' اس نے پھر سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بلاشبہ تم حسین ہو، تمہارے لیے کوئی بھی جنگ لڑی جا سکتی ہے۔'' میں نے شوخ سے انداز میں کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''آپ کا تعریف کرنے کا انداز پسند آیا، خیر آئیں، بیٹھتے ہیں۔'' پھر ہم دونوں ایک ایسی میز پر جا بیٹھے جہاں سے پورا ہال نظر آ رہا تھا۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد اس نے بڑی ادا

سے کہا۔ ”جی، کیسے یاد فرمایا آپ نے مجھے؟“

”ابھی کچھ دیر بعد یہاں سیٹھ افراسیاب آنے والا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ چونک گئی، یوں جیسے بوکھلا گئی ہو۔ تب میں نے کہا۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“

”وہ بہت ظالم ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”کوئی بات نہیں، میں اس سے بھی بڑا ظالم ہوں۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ میں اسے یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ تمہاری دوستی عامر کے ساتھ نہیں، میرے ساتھ ہے۔ بس یہ تمہارے ذہن میں رہے، باقی میں سنبھال لوں گا۔“

”میں نہیں سمجھی، آپ ایسا کیوں چاہ رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ اس کے ذہن سے عامر نکل جائے اور میں رہوں۔“ میں نے کہا تو شاید وہ کچھ اور کہتی لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ میں نے سیٹھ افراسیاب کے ساتھ اس نوخیز سی لڑکی کو آتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نظر ان تین بندوں پر بھی پڑ گئی جو اس کے پیچھے لی آئے تھے، میں سمجھ گیا کہ سیٹھ اپنی پوری حفاظت کے ساتھ آیا ہے۔ پھر جلد ہی اس کی نظر ہم پر پڑ گئی تو وہ بری طرح چونک اٹھا۔ وہ ایک ٹک نائلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس ادھیڑ عمر سیٹھ نے جلد ہی خود پر قابو پاتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سجالی، یقیناً وہ ایک گھاگ شخص تھا۔ ہیلو ائے کرنے اور ہاتھ ملانے کے بعد وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا جبکہ نائلہ اور نوخیز لڑکی آمنے سامنے تھیں۔ تبھی میں نے کہا۔

”آپ تو ٹھیک وقت پر پہنچے جبکہ میرا خیال تھا کہ آپ آنے میں تھوڑا وقت لیں گے۔“

”مطلب؟“ اس نے اپنی بھنویں اچکاتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب ہے کہ کہیں جانے سے پہلے تیاری تو کرنا ہی پڑتی ہے اور اس میں وقت لگ جاتا ہے، بڑی بات ہے کہ آپ مختصر وقت میں تیاری کے ساتھ آئے ہیں۔“ میں نے اسے ان بندوں کے بارے میں اشارہ دیا۔

”اوہ نہیں، ایسا نہیں۔ یہ تو معمول کی بات ہے۔“ سیٹھ نے کہا تو اسی لمحے بیرا مینیو لے کر چلا گیا۔ ہم میں ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ پھر آرڈر دینے کے بعد میں نے سیٹھ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری آپ سے پہلے دو دفعہ ملاقات ہو چکی ہے اور انہی دونوں ملاقاتوں میں آپ نے بڑی مہمل سی نا سمجھ میں آنے والی باتیں کی تھیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان باتوں کا مجھے سمجھاؤ مطلب کیا تھا؟“

''شجاع صاحب! میرا خیال ہے کہ ہمیں اب اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہیے۔ نائلہ کے یہاں ہونے سے آپ بھی اور میں بھی سب کچھ سمجھتے ہیں۔''

''دیکھیں، سیٹھ صاحب! آپ نے کچھ شیر اور سانپ وغیرہ کی مثالیں دی تھیں۔ میں آپ سے کہوں کہ میں موت سے نہیں ڈرتا، میں نے ہمیشہ دشمن کو پہل کرنے کا موقعہ دیا ہے اور وہ آپ کر چکے۔''

''نہیں، ابھی میں نے کچھ نہیں کیا اور اگر کرتا تو آپ یہاں میرے سامنے نہ بیٹھے ہوتے۔''

''میں آپ کو ہر طرح سے موقع دیتا ہوں، کہیں آپ کے دل میں حسرت نہ رہ جائے اور آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں نے ہمیشہ شیر ہی کا شکار کیا ہے۔''

''کرتے ہوں گے۔'' اس نے لاپرواہی سے کہا، پھر چند لمحے میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔ ''خیر، ہمیں کیا، اب معاملے کی بات نہیں کرنا چاہیے؟''

''وہ تو ہو چکی، آپ نے مجھے دھمکی دی جسے میں نے قبول کیا۔''

''شجاع صاحب! لگتا ہے، آپ خاصے غصے میں ہیں۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں نے آپ پر کوئی قاتلانہ حملہ نہیں کروایا۔ آپ کے پیغام عامر بشیر کے ذریعے مجھ تک پہنچتے رہے ہیں۔ میں انہیں کچھ دیر پہلے تک کچھ اور ہی سمجھتا رہا۔ میں نے آپ کو دھمکی دی، یہ اسی پرانی بات کی وجہ سے تھی۔ اب آپ جیسی بھی ڈیل چاہیں، کر سکتے ہیں۔ آپ میری چیزیں مجھے دے دیں اور اس کے عوض جو مانگیں، جتنا مانگیں، میں دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''مجھے آپ کی آفر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، ہاں، ایک بات پر ہم سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔''

''بولیں، مجھے آپ کی آفر سے دلچسپی ہوگی۔''

''اب تک جو ہو چکا ہے، ہم دونوں ہی اسے بھول جاتے ہیں اور میں اس وقت تک کچھ نہیں کروں گا جب تک آپ کی طرف سے کوئی فضول حرکت نہیں ہوتی۔ میرا مطلب نقصان کسی بھی قسم کا مجھے یا میرے دوستوں کو، یہ میرا وعدہ ہے۔''

''لیکن اگر؟'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''صرف اسی بات پر ڈن ہو سکتا ہے۔ سوچنا چاہیں تو سوچ لیں اور ساتھ میں یہ یقین بھی رکھیں کہ اگر اب مجھے یا میرے دوستوں کو نقصان پہنچا تو۔۔۔''

''ٹھیک ہے، ڈن، ہم ایک دوسرے کی راہ میں نہیں آئیں گے۔'' اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کھانا کھانے کے دوران بھی اس نے ہر ممکن

طرح سے مجھے یہ باور کرانے کی بھرپور کوشش کی کہ مجھ پر ہونے والے قاتلانہ حملے اس کی طرف سے نہیں ہوئے البتہ وہ عامر بشیر کو کریش کر دینے کے لیے بالکل تیار تھا۔ تب میں نے بھی اسے باور کرا دیا کہ وہ محض میرا پیغام رساں تھا، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ نائلہ کو اگر ٹریپ کیا ہے تو میں نے، اس کی تصدیق نائلہ نے بھی کر دی۔ جلد ہی سب نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

جس وقت میں نائلہ کے ساتھ ہوٹل سے نکلا، میرے ذہن پر اک بوجھ آن پڑا تھا۔ اگر حملے سیٹھ افراسیاب نے نہیں کروائے تو پھر کون ہے وہ؟ یہ سوال اک نئے سرے سے میرے سامنے آ گیا تھا اور اب میں اس سے اُکتا بھی چکا تھا۔ میری زندگی میں جو حالیہ ہنگامہ خیزی آئی تھی، اس نے مجھے اک پل بھی سکون نہیں لینے دیا تھا۔ پہلا شک ہما پر ہوا تھا، پھر میں نے عامر جیسے مخلص دوست کے بارے میں غلط سوچ لیا۔ بات سیٹھ افراسیاب تک جا پہنچی مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ میں ہنوز وہیں تھا جہاں سے چلا تھا اور اب تک میں اندھیرے میں تھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس ڈنر کے بعد میرے کشیدہ اعصاب کو تھوڑا اطمینان ہوتا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اب میرے سامنے صرف سلیم فارانی تھا جو میرے دشمنوں میں اس حد تک جا سکتا تھا۔ جانے میں اس وقت یہ کیوں خیال کرنے لگا کہ میرے ان الجھے ہوئے دنوں کی وجہ صرف اور صرف وہی ہے۔

''کہاں کھو گئے آپ؟'' نائلہ کی پرکشش آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''کہیں نہیں، یہیں ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو بڑی سنجیدگی سے بولی۔

''کیا سیٹھ اپنی بات پر قائم رہ سکے گا؟''

''اسے رہنا ہوگا۔'' میں نے سختی سے کہا تو وہ چپ ہو گئی نائلہ گلبرگ ٹو میں رہتی تھی، میں نے اسے گھر کے سامنے ڈراپ کیا تو وہ بڑے خمار آلود لہجے میں بولی۔

''ایک کپ کافی ہو جائے، پلیز؟'' اس نے اپنے رسیلے ہونٹوں اور آنکھوں سے یہ کچھ اس انداز سے کہے تھے کہ میں انکار نہیں کر سکا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی جب وہ اندر چلی گئی تو اچانک مجھے خیال آیا کہ آصف چودھری نے حملہ آوروں کو تلاش کرنے کی ذمہ داری لی تھی۔ ظاہر ہے، اگر وہ تلاش کر لیتا تو مجھے ضرور مطلع کرتا۔ اب تک جو اس نے مجھ سے بات نہیں کی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ وہ صرف ایک فون کال کے فاصلے پر تھا اور میں اس سے پوچھ سکتا تھا کہ اب تک اس نے کیا کوشش کی ہے لیکن باوجود خواہش کے میں نے کچھ نہیں پوچھا۔ نائلہ کے ساتھ کافی پیتے ہوئے ڈھیر ساری باتیں ہوئیں۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے اکتا چکی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ آزاد فضاؤں میں اڑے، کچھ

بھی کرے لیکن شام کو تھکی ہاری واپس لوٹے۔ میں اس کے حسن اور آواز کے سحر میں کھویا رہا۔ پھر اچانک ہی احساس ہو جانے پر میں اٹھا اور سٹوڈیو کی طرف نکل گیا۔

دو دن بڑے سکون سے گزرے۔

میں نئے گھر میں شفٹ ہو گیا تھا۔ پہلی بار مسز خان کے گھر والوں کے ساتھ ناشتہ کرتے ہوئے میں نے اپنے معمولات کے بارے میں بتانا چاہا تو مسز خان نے مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ سب جانتی ہیں، عامر بشیر نے سب باتوں سے آگاہ کر دیا ہے۔ میرے ساتھ کون آتا ہے، کون رہتا ہے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ وہ ایک سال کا ایڈوانس لے چکی تھیں اور انہوں نے میرے ہر ممکن سکون کا وعدہ بھی کیا تھا۔ یوں انتہائی خوشگوار ماحول میں ناشتہ ختم ہوا تھا۔ اس دن مجھے یوں لگا جیسے میں واقعتاً ایک گھر میں ہوں اور اب تک یونہی بھٹکتا رہا تھا۔ اس دن مجھے اپنا آبائی گھر بہت یاد آیا۔ میرا دل بھر آیا تھا، دل چاہ رہا تھا کہ چاہے ایک دو دن کے لیے ہی سہی مگر ضرور جاؤں۔ ایک جذباتی لمحے کے تحت میں نے اسی وقت جانے کا فیصلہ بھی کر لیا مگر یہاں کے معاملات اس قدر سنجیدہ نوعیت کے ہو چکے تھے کہ کسی بھی لمحے کچھ ہو سکتا تھا۔ میں تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھنے والا تھا کہ میرا سیل بج اٹھا۔

”جان جی! ایک خوشخبری ہے تمہارے لیے۔“ حسن کے لہجے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔

”بولو“

”سلیم فارانی استعفیٰ دے چکا ہے۔“

”گڈ اور اب اس کی جگہ؟“

”ظفر تارڑ، اب تم آؤ جلدی سے، وہ چارج لے چکا ہے۔“

”میں پہنچ رہا ہوں مگر سلیم فارانی اب ہے کہاں؟“

”پتہ نہیں، مگر میرے ذرائع یہی بتا رہے ہے کہ وہ نئے اخبار والوں کے ساتھ جا ملا ہے۔“

”ظاہر ہے، تم نے انہیں مایوس کیا ہے تو پھر ایسا تو ہونا ہی تھا۔“

”خیر، آؤ تم، باقی باتیں یہاں ہوں گی۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں دفتر پہنچا تو وہاں گہما گہمی ہی اور طرح کی تھی۔ میں بڑے سکون سے ظفر تارڑ کے پاس جا پہنچا جو اس وقت ایڈیٹر کی کرسی پر براجمان تھا، حسن کے علاوہ اور دوست بھی وہیں موجود تھے۔ یونہی باتوں کے دوران میں نے پوچھ لیا کہ اب سلیم فارانی ہے کہاں؟ وہیں پر کسی نے بتایا کہ فی الحال اس کی کوئی خبر نہیں۔ پھر کافی دیر تک باتیں چلتی رہیں۔ تبھی مجھ سے پوچھا

گیا کہ میں اب کیا کروں گا، شوبز ہی یا پھر اپنی پرانی بیٹ؟

''فی الحال تو میں چند دن آرام کروں گا۔'' میں نے ایک خیال کے تحت کہا۔ ''پھر دیکھوں گا کہ کیا کرنا ہے۔''

''کہیں عشق وشق تو نہیں لڑا رہے ہو۔ شوبز کی رنگینیاں تو۔۔۔'' دوستوں میں سے ہی ایک نے کہا۔

''ایسا نہیں ہے، یار! میں نے اگر ایسا کچھ کیا تو کھل کر کروں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے خوشدلی سے کہہ دیا۔

''مجھے تو کچھ اور ہی خبر ملی ہے؟'' وہی دوست ہنستے ہوئے بولا۔ ''سنا ہے کہ تم زارا سے شادی کر رہے ہو۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا تو میں ہنس دیا۔ پھر اسی انداز میں بولا۔

''اگر کر بھی لوں تو کسی کو کیا اعتراض؟''

''او، بابا! ہم تو کہتے ہیں کہ کرو سہی، چاہے کچھ کرو۔'' حسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ہی باتوں کا رخ بدل دیا۔ کافی دیر بعد ہم رپورٹنگ میں آئے تو ماریہ افسردہ سی بیٹھی ہوئی تھی، اس پر نگاہ پڑتے ہی حسن نے سرگوشی کی۔

''سلیم فارانی کا غم کر رہی ہے، بے چاری!'' پھر سیٹ پر بیٹھتے ہی اونچے سر میں بولا۔ ''اب تو یار، اپنی پرانی بیٹ کرو۔ تم چھوڑ دو شوبز، کیا رکھا ہے اس میں؟''

''نہیں، میں اب وہ نہیں چھوڑ سکتا۔''

''اب یہ ضروری تو نہیں کہ تم زارا سے شادی کر لو اور شوبز سے نکل ہی نہ سکو؟'' حسن نے یہ کہتے ہوئے مجھے ہلکے سے آنکھ مار دی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس بات کا ماریہ پر کیا ردعمل ہوگا۔ میں نے لاشعوری طور پر اس کی طرف دیکھا، وہ ہونقوں کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ تبھی اردگرد لوگوں میں پہلے ذرا سی بھنبھناہٹ ہوئی اور پھر کئی لوگوں نے اس کی تصدیق بھی کر ڈالی۔ میں چپ رہا لیکن حسن نے اپنی بات نبھانے کی خاطر کئی سارے جھوٹے بول دیئے۔

''یار! وہ تو مرتی ہے اس پر، پھر اس کا بھی جادو چل گیا ہے۔ شادی کے فوراً بعد یہ سوئٹزرلینڈ جائیں گے ہنی مون کے لیے۔''

''یہ سوئٹزرلینڈ پنجاب ہی میں ہے یا واقعی۔۔۔'' ایک خاتون رپورٹر نے یونہی مذاق میں کہہ دیا۔

''تم کیا سمجھتی ہو، اس نے تو اک کوٹھی ڈیفنس میں خرید کر اس کے نام بھی کر دی ہے۔ بس دیر اپنے شجاع کی طرف سے تھی۔ اب ہو جائے گا معاملہ، نہیں یقین آتا تو اپنے

ایڈیٹر سے پوچھ لو۔ ابھی شجاع نے کچھ دنوں کی چھٹی مانگی ہے، ابھی کر کے دیکھ لو فون؟'' حسن نے با قاعدہ ریسیور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بس بھی کرو، یار!'' میں سرگوشی میں بولا تو اس نے میری سنی اَن سنی کرتے ہوئے کئی سارے اور بیان داغ دیئے۔ اب میرے پاس سوائے خاموش رہنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں کبھی کبھی ماریہ کے چہرے کی طرف دیکھ لیتا جہاں مایوسی اپنا ڈیرا جما چکی تھی، ایسا دیکھ کر مجھے ذرا بھی ترس نہیں آیا۔

اس رات میں سٹوڈیو سے لوٹا تو بیڈ پر جاتے جاتے تین بج چکے تھے۔ مجھے بے تحاشا نیند آ رہی تھی اور اس وقت میری آنکھ بھی لگ گئی تھی کہ میرے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے نیند کے خمار میں ہی فون آن کر کے کان سے لگایا تو دوسری طرف بھرائی ہوئی آواز میں ماریہ بات کر رہی تھی، غصے کی لہر میرے اندر سرائیت کر گئی۔

''اتنی رات گئے تمہیں فون کرنے کی کیا سوجھی؟''

''کیا تم واقعی زارا سے شادی کر رہے ہو؟'' اس کی آواز رو دینے والی تھی۔

''یہی پوچھنے کے لیے تم نے اتنی رات گئے فون کیا ہے؟'' میں نے قدرے غصے میں کہا۔

''دیکھو، جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جاؤ۔ میں بھی سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ خدا کے لیے، تم۔۔۔''

''دیکھو، میرا دماغ خراب مت کرو اور سو جاؤ۔'' میرے لہجے سے بدستور غصہ جھلک رہا تھا۔

''میں نہیں سو سکتی، میرے دل پر کیا گزر رہی ہے، اس کا شاید تمہیں احساس نہیں۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''اچھا، صبح بات کریں گے۔'' میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

''شجاع! تم مجھے جہاں رکھو، میں رہنے کے لیے تیار ہوں۔ تم جو کہو گے، میں وہی کروں گی، پلیز، شجاع! میں مر جاؤں گی۔'' اس کے لہجے میں انتہائی درجے کی بے چارگی تھی۔

''تو مر جاؤ۔'' میں نے انتہائی نفرت سے کہا تو چیخ اُٹھی۔

''شجاع۔۔۔!'' وہ شاید کچھ اور کہتی لیکن میں نے فون بند کر دیا اور تمام خیالات کو ذہن سے نکال کر سو گیا۔

میں دفتر پہنچا تو ظفر تارڑ میرے انتظار میں تھا۔ میں اس کے پاس جا پہنچا تو مجھے

ا ملتے ہی بولا۔
''یار! تم کنفرم کرو، شوبز کرو گے یا بندہ رکھ لیں؟''
''کوئی ہے نظر میں؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ بھی مل جائے گا لیکن تم تو بتاؤ، ویسے میرے خیال میں تم میگزین سنبھال لو۔''
''چلو ٹھیک ہے لیکن شوبز کے لیے بندہ میں دوں گا۔''
''بولو، وہی رکھ لیتے ہیں، بندہ تو ٹھیک ہے نا؟''
''ایک دم ٹھیک۔ کل وہ ادھر جوائن کر لے گا، باقی کوئی مسئلہ تو نہیں؟''
''بالکل نہیں، سب ٹھیک ہے۔'' اس نے خوشدلی سے کہا اور پھر ہم باتوں میں لگ گئے۔ وہیں لنچ کر کے میں رپورٹنگ میں آگیا اور وہاں سے ندیم کو ڈھونڈنے کی کوشش شروع کردی۔ وہ مجھے کہیں بھی دستیاب نہیں ہوا۔ میں نے ہر جگہ اس کے لیے پیغام چھوڑ دیا۔ شام ا ملے تک ندیم کا کہیں سے بھی فون نہیں ملا۔ جہاں جہاں میں نے پیغام چھوڑے تھے، وہاں ے اسے پیغام مل جانا چاہیے تھا اور مجھے پوری توقع تھی کہ وہ مجھے کال کرے گا۔ مجھے سٹوڈیو ے کوئی خبر تو لینی نہیں تھی مگر ندیم کے لیے میں جانا چاہتا تھا۔ دفتر میں کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا ہ میں نے زارا کو فون کر دیا، وہ گھر پر ہی تھی میں نے اسے اپنی آمد کے بارے میں بتایا اور اس کی طرف چل دیا۔

میں زارا کے پاس پہنچا تو وہ ایک صوفے پر بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ اس وقت وہ ٹائٹس اور سلیولیس ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی، سر کے بالوں کو اکٹھا کر کے پونی بنائی ہوئی تھی اور سفید نکھرے ہوئے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ میں نے ستائشی نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی، پھر بڑی ادا سے بولی۔
''حضور کیسے راستہ بھول پڑے ادھر کا؟''
''یہ تم نے کوئی طنز کیا ہے یا گلہ ہے؟'' میں نے اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''کچھ بھی کہہ لیں، مطلب تو سمجھ رہے ہوں گے میری بات کا۔۔۔ خیر، کیا پئیں گے آپ؟''
''تھوڑا سا پانی، پھر اس کے بعد تمہاری باتوں کا رس اور پھر سکون سا، مزیدار سا ار۔۔۔ اپنا تو یہی پروگرام ہے۔'' میں نے جوتے اتار کر آلتی پالتی مارتے ہوئے کہا۔
''ماشاءاللہ، آج آپ بہت خوش دکھائی دے رہے ہیں۔''

''ہاں، بہت خوش ہوں۔شو بز چھوڑ دیا ہے میں نے۔۔۔''

''واقعی؟''اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے۔۔۔؟''

''مجھے اندازہ تو تھا کہ آپ بہت جلد یہ شعبہ چھوڑ دیں گے لیکن اتنی جلدی، ایسا گماں نہیں تھا۔''

''ہاں، اندازے ہوتے ہی غلط ہونے کے لیے ہیں۔۔۔خیر، یہ بتاؤ کہ تمہاری شوٹنگ ہے آج؟''

''بالکل ہے۔'' پھر ایک لمحہ رک کر بولی۔''چائے بنواؤں؟ ڈنر میں تو ابھی خاصا وقت ہے۔''

''بنوالو مگر ساتھ میں باتوں کا رس ضرور ہو''میں نے کہا تو وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔

''آپ خوش ہیں لیکن اتنے رومانٹک۔۔۔پہلی بار دیکھا ہے۔''

''بس یار، زارا! ہم نے بھی سوچا کہ تھوڑا رومانٹک ہو کر دیکھ لیں۔'' میں ہنستے ہوئے بولا۔

''جو پتھر ہوتے ہیں، وہ پتھر ہی ہوتے ہے پھول نہیں بنتے۔ بڑے آئے، رومانٹک۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے میگزین ایک طرف رکھا اور اپنے ملازم کو آوازیں دینے لگی۔ پھر اسے چائے کا کہہ کر میری طرف دیکھ کر بولی۔''اتنے دنوں میں آپ نے شوبز سے کیا تجربہ لیا، کیا دیکھا آپ نے اس میں؟''میرے لیے ایسا کوئی سوال غیر متوقع تھا اس لیے میں نے قدرے سوچ کر کہا۔

''جھوٹ اور فریب کی دنیا، پانی پر نقش کی مانند یا پھر اسے روشن اندھیرا کہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ یہ اس لیے کہ فلم اندھیرے میں بنتی ہے، اندھیرے میں ہی دیکھی جاتی ہے۔ایک طرف اگر سلور سکرین جگمگا رہی ہے تو دوسری جانب اتنا ہی گہرا اندھیرا ہوگا۔اس کا اثر فلم کی دنیا سے وابستہ لوگوں کی زندگی پر بھی میں نے دیکھا ہے۔ یہاں راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔ یہاں بہت زیادہ فریب ہے۔شاید لوگ اسی لیئے اسی طرف لپکتے ہیں۔ معاف کرنا، زارا! تم سے بھی زیادہ خوبصورت اور حسین اور تم سے بھی باصلاحیت لڑکیاں جنہیں ایکسٹرا کا نام دیا گیا ہے، انہی اندھیروں میں پڑی ہیں۔ایک طویل اور تھکا دینے والا انتظار ان کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ وہ اس روشن اندھیرے کے چنگل سے نہیں نکل سکتیں، پھر اسی اندھیرے کی چادر تانے جرم کے راستے پر نکل پڑتی ہیں۔'' یہ سب کہتے ہوئے میں ایک لمحہ کو چونکا، میں کس

قدر جذباتی ہو کر سوچ رہا تھا۔ تبھی میں ہنس دیا لیکن زارا کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ''تم کیوں فکر کرتی ہو۔ تم ایکسٹرا نہیں، ایک سٹار ہو۔''

''شجاع! ستارہ بھی تو اندھیرے میں روشن ہوتا ہے اور اندھیرا کتنا خوفناک ہے۔

''وہ پھیلی آنکھوں کے ساتھ خود کلامی کے انداز میں بولی تو میں ہنستے ہوئے بولا۔

''اُو، زارا! میں نے اتنا کڑوا رس پینے کو تو نہیں کہا تھا، بتاؤ، شمالی علاقے کی طرف کب جا رہی ہو؟'' میں نے بات کا رخ بدلا تو وہ آہستہ آہستہ معمول پر آتی چلی گئی۔ اتنے میں اس کا ملازم چائے لے آیا۔ وہ چائے بنانے لگی، کپ مجھے تھما کر اس نے اپنے کپ سے سپ لیا اور دھیرے سے بولی۔

''آپ نے کبھی محبت کی ہے؟''

''کبھی محبت کرنے سے کیا مراد، میرے ہونے کا ثبوت ہی محبت ہے۔''

''میں سمجھی نہیں، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے، کسی لڑکی سے محبت؟''

''کسی لڑکی سے محبت۔'' میں نے پرخیال لہجے میں کہا اور پھر حتمی لہجے میں بولا۔

''نہیں، میں نے کسی لڑکی سے محبت نہیں کی۔''

''ایسا کیوں؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''یہ دو اور دو چار والا فارمولا تو ہے نہیں۔ مجھے اب تک کسی سے محبت ہوئی ہی نہیں''

''اور کسی لڑکی کو آپ سے محبت ہوئی؟''

''یہ خاصا ٹیڑھا سوال ہے، میں کسی کے بارے میں کیا جانوں کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں؟''

''آپ کی ان باتوں سے تو لگتا ہے جیسے انتہائی خود غرض ہوں۔ کیا آپ میں اتنی بھی سمجھ نہیں ہے کہ دوسرے بندے کے جذبات سمجھ سکیں؟''

''دیکھو، زارا! سورج پورے خلوص سے روشن ہوتا ہے تو اندھیرے چھٹ جاتے ہیں، چاند چڑھتا ہے تو وہ بھی اپنی روشنی پھیلا دیتا ہے۔ انہیں اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ روشنی کسی محل پر پڑ رہی ہے یا جھونپڑی پر، ہرے بھرے باغ پر یا کسی بنجر زمین پر۔ محبت کوئی دوسارویہ نہیں ہے کہ یہ چھپ جائے یا ہم اسے خانوں میں بانٹ سکیں۔''

''یہ آپ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں؟''

''زارا اگر تم نے محبت کی ہوتی اور وہ بھی خالص محبت تو میری باتوں کو روح کی گہرائیوں سے سمجھ جاتیں۔ اصل میں جب تم نے شعوری طور پر آنکھ کھولی تو تم نے اپنے دامن

میں ایک ایسی محبت کو پایا جو انتہائی خود غرضی کے جذبات میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اسے تم نے بڑی احتیاط سے سنبھال لیا اور آج تک سنبھالے ہوئے ہو۔ تم سکون دے سکتی ہو، ہمدردی کر سکتی ہو لیکن کہو کہ خالص محبت۔۔۔ وہ تم نہیں کر سکتیں اور نہ سمجھ سکتی ہو۔''

''میرے نہ سمجھنے کی وجہ؟''

''ہو سکتا تم سمجھ جاؤ یا شاید نہیں یا شاید ہاں۔ وقت لگنے لگا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو، تمہاری چائے اچھی تھی۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، شاید شرم سے۔ پھر ہم میں اس کی فلموں کے بارے میں بات ہونے لگی جو پھیلتی چلی گئی۔

میں زارا کے ساتھ اس کی گاڑی میں سٹوڈیو کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے ندیم کا خیال آ گیا۔ نجانے کیوں میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی تھی، وہ مجھے پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا۔ وہ ایک معمولی سے اخبار میں شوبز رپورٹر تھا جس کی وجہ سے اس کی آمدنی بھی کم تھی۔ اس وقت اس کے لیے بہت اچھا موقع تھا۔ ایک بڑا اخبار اور معقول آمدنی تھی۔ مجھے تشویش ہو رہی تھی کہ اس نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ اس کے بارے میں جاننے کے لیے اب دو جگہیں ہی رہ گئیں تھیں۔ ایک اس کا گھر اور دوسرا سٹوڈیو۔ ایک انجانا خوف میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ کہیں اسے حادثہ نہ پیش آ گیا ہو، انسان کے ساتھ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ زارا خاموش تھی اور گاڑی میں ہلکی موسیقی تیر رہی تھی۔ سٹوڈیو کے دوسرے گیٹ پر گاڑی رکی تو ہم دونوں ہی باہر نکلے۔ ڈرائیور گاڑی پارکنگ میں لے گیا۔ ہم دونوں ایک ساتھ آگے بڑھے، تب میں نے کہا۔

''زارا! تم جاؤ، مجھے ایک بندے کو تلاش کرنا ہے۔''

''اوکے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک طرف بڑھ گئی۔ پھر کئی لوگوں نے اسے گھیرے میں لے لیا تھا اور وہ ان کے درمیان شان بے نیازی سے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو میں نے شوبز رپورٹرز کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی وہ مجھے مل گئے، انہی سے معلوم ہوا کہ وہ کل بھی سٹوڈیو نہیں آیا تھا اور آج بھی ابھی تک کہیں دکھائی نہیں دیا۔ تقریباً دو گھنٹے تک اس کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا تو میں نے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک سیٹ پر زارا کا ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا، میں نے اسے ساتھ لیا اور ندیم کے گھر کی جانب چل پڑا۔ لکڑی اور لوہے کی پتری سے بنے ہوئے اس گیٹ کو بجاتے ہوئے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ندیم سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا اور تعلق کو اتنے دن بھی نہیں ہوئے تھے لیکن پھر بھی اک انجانا خوف مجھ پر طاری تھا جیسا کسی اپنے کے لیے محسوس ہوتا ہے۔ دوسری دستک کے ساتھ ہی اس کا چھوٹا بھائی

باہر نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی حیرت سے چونک گیا۔

''آپ ---آیئے۔''

''ندیم کہاں ہے؟''

''گھر پر ہی ہے''

''خیریت تو ہے نا؟''

''پتہ نہیں، کل شام سے گھر میں ہی پڑا ہے، بہ ظاہر تو ٹھیک ٹھاک ہے، پوچھنے پر اس نے یہی بتایا ہے کہ طبیعت خراب ہے۔''

''اسے باہر بھیجو''

''آپ آجائیں اندر۔''

''نہیں، بس تم اسے بھیج دو۔''

''جی، ابھی بھجوائے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ندیم پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر لیے میرے سامنے تھا۔

''خیریت ہے، یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں، بھائی، آئیں، اندر بیٹھتے ہیں''

''نہیں، اتنا وقت نہیں ہے۔ میں نے سارا دن تمہیں تلاش کیا ہے، اب سٹوڈیو میں ملنے کے بعد یہاں آیا ہوں۔''

''خیریت، شجاع بھائی؟'' اس نے تشویش سے پوچھا تو میں نے اسے نئی جاب سے متعلق بتایا۔ اس نے یہ ساری بات بڑی بے دھیانی سے سنی تو مجھے معاملہ گھمبیر سا لگا۔

''اچھا ایسا کرو، گھر میں بتا آؤ کہ تم میرے ساتھ جا رہے ہو اور ایک آدھ صاف سوٹ بھی اٹھا لانا۔'' میرے کہنے پر وہ مڑ گیا اور میں گاڑی میں آبیٹھا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد وہ واپس آگیا تو ہم سٹوڈیو جا پہنچے، وہیں ایک پرسکون سے گوشے میں بیٹھ کر میں نے اس سے پوچھا۔

''ندیم! بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟'' وہ چند لمحے سر جھکائے رہا، پھر میری طرف دیکھ کر بڑے ہی غم زدہ لہجے میں بولا۔

''وہ سلمیٰ ہے نا، بہت غلط قسم کی لڑکی نکلی ہے۔'' اس نے کہا تو میری نگاہوں میں وہ لڑکی گھوم گئی۔ جو ندیم کی دوست تھی اور جب اسے حادثہ پیش آیا تھا تو وہ میرے ساتھ تھی۔ پھر وہ رات اور دن بھر میرے فلیٹ پر رہی تھی۔ ندیم کا اس کے ساتھ خاصا جذباتی تعلق تھا۔

''کیا غلط نکلی وہ؟''

''اس کے ذہن پہ دولت سوار تھی۔ وہ اس کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی رہی، سہارے ڈھونڈتی رہی مگر میں اس کے اندر کے لالچ سے بے خبر رہا۔''

''تم بے خبر رہے یا اس نے تمہیں بے خبر رکھا؟''

''جیسا بھی سمجھ لیں مگر مجھے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر گھٹیا ہو جائے گی۔''

''کیا ہوا، مجھے تفصیل سے بتاؤ۔''

''شجاع بھائی! اس نے مجھے اندھیرے میں رکھا۔ مجھے کچھ کہتی رہی اور خود۔۔۔''

میں کچھ نہ بولا بلکہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ کہتا چلا گیا۔''جن دنوں میں ہسپتال میں تھا، انہی دنوں اس کی ملاقات ایک کسٹم آفیسر سے ہوگئی۔ مجھے پتہ اس وقت چلا جب وہ راتوں کو بھی گھر سے باہر رہنے لگی۔ یہاں گلبرگ میں ایک بیوٹی پارلر ہے، وہ وہاں جاتی تھی۔ اس کا دھندہ چند مخصوص لوگوں تک ہے، وہیں سے اس کی ملاقات اس کسٹم آفیسر سے ہوئی اور اب وہ اس کی رکھیل بن چکی ہے۔' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں شدت کا دکھ تھا۔

''تمہیں اس ساری کہانی کا پتہ کیسے چلا؟''

''وہ راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگی تو اس کی ماں نے مجھ سے کہا۔ میں نے پتہ کیا تو وہ وہیں بیوٹی پارلر پر کام کرنے والی لڑکی نے مجھے ساری صورت حال بتائی۔ میں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا لیکن کل شام میں نے اس شخص کے ساتھ دیکھا ہے۔''

''تو اس میں اتنا غم کرنے کی کیا ضرورت ہے جو تم کل سے ہی گھر میں پڑے ہو۔'' میں نے ذرا سختی سے کہا۔

''شجاع بھائی! اس نے اتنا بڑا دھوکا دیا، بے وفائی کی ہے اس نے تو میں۔۔۔''

''اس نے کوئی دھوکا نہیں دیا، دھوکا تم کھا رہے ہو یہ سمجھ کر کہ تم اس سے محبت کرتے ہو اور اسی بدگمانی کی سزا یہ ہے کہ تم اب دکھ محسوس کر رہے ہو۔ تم اسے زنجیریں نہیں پہنا سکتے۔ اس نے جو اچھا سمجھا، وہ کیا۔ اس نے کوئی بے وفائی نہیں کی۔ ہر کوئی آگے بڑھنا چاہتا ہے، اک دوڑ لگی ہوئی ہے اور سلمیٰ نے اُس راستے کو بہتر جانا اور بڑھ گئی۔ کل تم اس کسٹم آفیسر سے بھی اچھے ہو جاؤ تو وہ پھر سے تمہارا دم بھرے گی۔ تو کیا اس صورت حال میں تم اس کو وفا کہو گے؟'' میں نے دھیرے دھیرے اسے سمجھاتے ہوئے سوال کر دیا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، کتنی ہی دیر تک ہونقوں کی طرح میرے چہرے کو گھورتا رہا۔ تب میں بولا۔''ایک

لمحے کو میں مان لیتا ہوں کہ عورت وفا کی دیوی ہے، اس کی سرشت میں وفا شامل ہے تو ٹھیک ہے، اس نے وفا کی اپنے مقصد کے ساتھ۔ وہ جو چاہتی ہے، اس کے ساتھ اس نے وفا کی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ وفادار نہیں تھی سو تمہیں اس قابل بھی نہیں سمجھا اور ندیم! سچ یہ ہے کہ تم اس قابل ہو بھی نہیں۔''

''کیا مطلب، میرے جذبے اس کے لیے۔۔''

''جذبات کو کون پوچھتا ہے۔ تمہارے جذبے اس کی سوچوں کا نعم البدل نہیں ہو سکتے، نہ تمہارے جذبے نوٹوں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اگر تمہارے پاس مقناطیس ہے تو ہی تم لوہے کو کھینچ سکتے ہو۔''

''میں کیا کروں، بھائی! وہ میرے دل میں اتر چکی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم ایک انتہائی کمزور شخص ہو، بزدل اور احمق ہو جو محض ایک عام سی عورت کے سامنے ٹوٹ گئے ہو۔''

''میں ٹوٹا نہیں ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''تو یہ سب کیا ہے؟ ایک جھٹکے سے نکال باہر پھینکو اسے اور اتنی محنت کرو کہ جب بھی وہ تمہارے سامنے آئے تو اسے اتنی شرم آئے کہ وہ اپنے لفظ بھلا بیٹھے۔''

''میں اب بھی اسے اپنے سامنے جھکا سکتا ہوں۔''

''انتقام لوگے اور وہ بھی عورت سے؟ نہیں، ندیم! یہ مردانگی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، شجاع بھائی! جیسے آپ کہو۔''

''مجھ پر احسان مت کرو، میرے کہنے پر نہیں، اپنے اندر کے شخص سے بات کرو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ جیسے نیند سے جاگا ہو۔ کتنی دیر تک وہ گم صم بیٹھا رہا، پھر دھیرے سے ہنس دیا۔ تب میں نے کہا۔

''آؤ چلیں، جا کر آرام کرتے ہیں، صبح تم نے اک نئی زندگی کی شروعات کرنی ہیں۔''

''چلیں'' اس نے کہا تو میں نے زارا کے نمبر ملائے۔ فون اس کے ڈرائیور کے پاس تھا، میں نے اسے اپنے گھر جانے کے بارے میں بتایا اور ٹیکسی لے کر سمن آباد جا پہنچا۔

اگلی صبح میں اور ندیم اکٹھے دفتر پہنچے۔ ظفر تارڑ اپنے کمرے میں ہی تھا۔ میں نے ندیم کو اس سے ملوایا۔ وہ دونوں شناسا تھے۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد ہم میٹنگ میں آ بیٹھے، تبھی حسن نے مسکراتے ہوئے ایک اخبار میرے سامنے رکھا دیا۔ پھر ایک چھوٹی سی خبر جس پر دائرہ لگا ہوا تھا، اس پر انگلی رکھتے ہوئے بولا کہ اسے پڑھو۔ میں نے اسے دیکھا تو چونک گیا،

بڑی تیز سرخی تھی۔

''فلم سٹار زارا ایک صحافی کے عشق میں گرفتار، جلد ہی شادی متوقع ہے۔'' دو کالمی خبر میں جو تفصیلات تھیں، وہ کچھ تو حسن کا گھڑا ہوا جھوٹ تھا اور کچھ میرے اس کے ساتھ اسلام آباد جانے اور اس کے گھر میں رہنے کا ذکر تھا۔ براہ راست میرا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں نے خبر کا ذریعہ دیکھا تو وہ ایک دوسرے درجے کی نیوز ایجنسی تھی۔ میں مسکرا دیا، ندیم نے وہ خبر دیکھی تو پوری سنجیدگی سے بولا۔

''میں اس کا جواب دیتا ہوں۔''

''نہیں، بچے! اس کو نظر انداز کر دو۔ اسے جتنی اہمیت دیں گے، بات اتنی ہی بڑھے گی۔ یہ جان لو کہ نظر انداز کر دینا سب سے بڑا انتقام ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اخبار پرے پھینک دیا۔ ماریہ اس دن بھی نہیں آئی تھی میٹنگ ختم ہوگئی تو میں میگزین میں جا بیٹھا۔ پھر ان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دوپہر ڈھل گئی۔ اس وقت میں حسن کے ساتھ پریس کلب جانے کی سوچ رہا تھا کہ آصف چودھری کا فون آگیا، اس نے مجھے فوراً پہنچنے کو کہا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں اس کے پاس تھا۔ وہ جیسے میرے انتظار میں تھا، مجھے دیکھتے ہی اٹھا اور مجھ سے گلے ملنے کے بعد بولا کہ آؤ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ایک تہہ خانے میں اتر گیا جہاں ایک مدقوق سے بلب کی روشنی کانپ رہی تھی۔ سیلن زدہ ہونے کی باعث ایک خاص قسم کی بُو نے ناگواری پیدا کر دی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہیں پختہ فرش پر ایک شخص اوندھے منہ پڑا تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھایا۔ میرے لیے وہ اجنبی چہرہ تھا۔ میری طرف دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا، پھر اضطراری انداز میں اٹھ بیٹھا۔ آصف نے جاتے ہی ایک ٹھوکر ماری اور کہا۔

''بولو، تم اس شخص پر قاتلانہ حملے کیوں کیے؟''

''وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ مجھے ملک منیر نے انہیں محض دھمکانے کے لیے بہت بڑی رقم دی تھی۔''

''ملک منیر کون ہے اور اس نے کیوں ایسا کیا؟''

''مین بتا چکا ہوں جی، کہ وہ بزنس مین ہے اور ایسا اس نے اپنی منگیتر کے کہنے پر کیا ہے۔ میں اسے ہی جواب دہ تھا۔ وہ مجھے فون پر ہدایت دیتی تھی اور جو کرتا تھا، اسے بتا دیتا تھا۔''

''تم نے اسے دیکھا نہیں، جانتے نہیں ہو اس کے بارے میں؟''

''میں ملک منیر کے پاس ہی ایک دفعہ ملا تھا اس لڑکی سے، ویسے میں اس کے

بارے میں جانتا ہوں۔"

"کون ہے وہ؟" آصف نے پوچھا تو میرا دل دھڑک اٹھا۔

"وہ جی، انہی کے اخبار میں کام کرتی ہے۔ ماریہ نام ہے اس کا۔"

"ماریہ۔۔۔!" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔ میں ششدر رہ گیا کہ ماریہ ایسی حرکت کر سکتی ہے، وہ اتنا آگے بڑھ جائے گی؟ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے اس کا تو مجھے پتہ تھا لیکن اتنا کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کروا دے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر رہ گیا۔ تبھی آصف نے کسی کو زور سے پکارا تو میں چونکا۔ لمحوں میں ایک گرانڈیل شخص وہاں آن موجود ہوا، آصف نے اس لیٹے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے لے جاؤ اور۔۔۔" یقیناً اس نے اس شخص کو ختم کر دینے کا حکم دے دیا تھا۔ تبھی میں بولا۔

"نہیں، آصف! ابھی ٹھہر، اسے ایک دو دن رکھو۔"

"کیا کرنا ہے رکھ کے، یہاں سڑاند مارے گا۔ اب اس کی جگہ ملک منیر کو بھی تو آنا ہے اور پھر وہ ماریہ۔۔۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تو میں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"آصف! میں نے کہا نا، ذرا رکو، مجھے سوچنے دو۔ ابھی تم کچھ نہیں کرو گے۔"

"اوکے، آؤ، اوپر چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مڑا تو وہ زمین پر پڑا شخص چیخ اُٹھا۔

"مجھے معاف کر دو، چودھری! مجھے نہیں پتہ تھا کہ یہ آپ کا بندہ ہے۔"

"بندہ نہیں، بھائی ہے میرا۔۔۔" آصف نے انتہائی درشت لہجے میں کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ خود ملک منیر کو۔۔۔"

"بکواس نہیں کرو۔ آؤ، شجاع!" اس نے کہا اور ہم اوپر آ گئے۔ میں کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ میں انتہائی شاک میں تھا۔ میرے سامنے کھانا بھی رکھا گیا مگر مجھ سے کھایا ہی نہیں گیا۔ میں سگریٹ سلگائے ماریہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اس نے مجھے موجودہ معاملات کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا۔

"ابھی مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ایسا کیوں ہوا یا ہمیں کیا کرنا ہے، یہ میں تمہیں کل بتاؤں گا۔"

"کوئی بات نہیں، ابھی تم جاؤ اور ہاں، خود کو سنبھالو۔" اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ ملایا تو میرے ذہن سے کافی حد تک بوجھ اترتا ہوا محسوس ہوا۔

میں ذہنی طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔ میں خود کو سکون دے کر ہی سوچنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا اس وقت زارا ہی ہے جو مجھے پرسکون کر سکتی ہے۔ اس لئے میں نے اسے فون کیا۔ وہ گھر پر تھی۔ جلد ہی میں زارا کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا اور گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس سے پہلے کہ گیٹ کھلتا، اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے دائیں طرف دیکھا، ایک موٹر سائیکل پر دونو جوان سوار تھے۔ پھر میں نے پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے کو گن سیدھی کرتے ہوئے دیکھا۔ لاشعوری طور میں نے اپنا سر نیچے جھکا لیا، تبھی فائرنگ سے ماحول تڑخ گیا۔ فائرنگ کی آواز بھی ہوا میں تحلیل نہیں ہوئی تھی کہ مجھے اپنے کاندھے میں جلن کا شدید احساس ہوا، لمحوں میں اس جلن نے میرے بدن میں آگ لگا دی۔ مجھے یوں لگا جیسے آگ میرے جسم میں سرائیت کر گئی ہے۔ اس جلن کی اذیت اس قدر تھی کہ مجھے اپنا دماغ ماؤف ہوتا ہوا محسوس ہوا، ایک تاریکی تھی جو میرے دماغ پر چھاتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی مگر میرے ہر طرف اندھیرا پھیل گیا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا، سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

مجھے ہوش آیا تو سب سے پہلے میرا دماغ بیدار ہوا۔ لچھے کی طرح کی سوچوں کے باعث مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے میرے شعور نے ان سوچوں کو تحلیل کر دیا اور واضح خیالوں نے مجھے سب کچھ یاد دلا دیا۔ میرے اردگرد سناٹا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ جس طرح حملہ آور ہوئے تھے، اس سے یہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ مجھے زندہ چھوڑنے والے نہیں تھے۔ ہو سکتا ہے، وہ مجھے اپنی طرف سے ختم کر کے ہی گئے ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں بچ گیا ہوں مگر میں ہوں کہاں؟ سوچ کی اس تیز لہر نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو خود کو بیڈ پر پڑے ہوئے پایا، جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں ہسپتال میں ہوں۔ تبھی مجھے اپنی زندگی بچ جانے کا احساس ہوا تو میرا سر اللہ کے حضور جھک گیا، وہی زندگی دینے والا ہے اور موت بھی اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں پھر سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ شاید دوائیوں کی وجہ سے مجھے تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا، تاہم اوپری دھڑ پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی طرف سے مجھے مار کر پھینک گئے تھے لیکن زندگی تھی کہ میں بچ گیا۔ کیا یہ حملہ بھی ماریہ نے ہی کروایا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی میں بے چین ہو گیا۔ میں آصف چوہدری کو سمجھتا تھا، اسے اگر اس واقعہ کی خبر ہو جاتی تو اب تک جو بھی اس کے ہتھے چڑھتا، پہلی فرصت میں اسے ختم کر کے ہی اسے چین ملتا تھا۔ اس کا یہ ردعمل میری وجہ سے ہی ہونا تھا۔ اس سے یہ امید بھی نہیں کی جا سکتی

تھی کہ وہ کسی کو معاف کر دے اور یہ ناممکن تھا کہ مجھ پر قاتلانہ حملے کی اطلاع اس تک نہ پہنچی۔ جب میرا گھر جلا تھا اس وقت اس کے لہجے میں جو ناکامی جھلک رہی تھی، مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت ہی خطرناک تھی۔ اب جبکہ میں ہسپتال میں پڑا تھا۔ اسے جیسے ہی اطلاع ملتی تو وہ اسے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھی۔ پتہ نہیں، وہ کیا کرے گا؟ ماریہ ایک عورت تھی اور میں کسی بھی عورت سے انتقام لینے کو مردانگی خیال نہیں کرتا تھا جبکہ آصف چوہدری۔! میں اس کا ہاتھ کسی طور بھی نہیں روک سکتا تھا۔ اس وقت یہی خیال میرے دماغ میں پھیلتے چلے گئے، انہی خیالوں نے مجھے بے چین کر کے رکھ دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اسی وقت آصف چوہدری کو فون کرنا چاہتا تھا۔ میری بے چینی حد سے بڑھی تو میں پکار اٹھا۔

"کوئی ہے؟" میری آواز کی بازگشت میں سفید براق لباس میں ملبوس نرس مجھ پر آن جھکی، اس نے نہایت ملائمت سے کہا۔

"کیا بات ہے، بولیں؟"

"مجھے فوری طور پر ایک فون کرنا ہے کسی کو بھی بلاؤ، کچھ بھی کرو لیکن فوری۔۔۔"

"دیکھیں! آپ تقریباً چھ گھنٹے بے ہوش رہے ہیں اور ابھی آپ ہوش میں آئے ہیں، آپ آرام کریں۔"

"میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے فون کرنا ہے۔ جاؤ، تم ڈاکٹر کو بھیجو ورنہ مجھے خود بیڈ سے اٹھنا پڑے گا۔" میرے لہجے میں انتہائی سختی تھی جسے سن کر نرس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری ہو گئی، اس نے زبردستی اپنے چہرے کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

"آپ۔۔۔ آپ سکون سے لیٹے رہیے، میں ابھی ڈاکٹر کو بلا کے لاتی ہوں۔"

"جلدی جاؤ۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

پتہ نہیں وہ کون سا ہسپتال تھا۔ میرے یہاں ہونے کے بارے میں کسی کو پتہ بھی لہ نہیں، پھر مجھے یہاں کون لایا ہوگا؟ میں تو زارا کے پاس گیا تھا اور ابھی اس کے دروازے لھا کہ یہ حادثہ ہوگیا۔ نرس نے کہا تھا کہ میں چھ گھنٹے بے ہوش رہا ہوں، اس کا مطلب ہے کہ رات کا پہلا پہر ختم ہو جانے والا ہوگا۔ میں نے یہ سب ذہن پر زور دے کر سوچا تو مجھے ات محسوس ہونے لگی۔ مجھے لگا جیسے دماغ بے قابو ہو رہا ہے۔ میں نے ڈوبتی ہوئی نظروں ایلھا، سفید اوورآل میں ملبوس ڈاکٹر کے ساتھ حسن کھڑا تھا، اس کے پیچھے زارا اور پھر نرس ۔ ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی زندگی بچ گئی، اب آپ خطرے سے نکل آئے ہیں۔ اس

وقت آپ کو سکون کی ضرورت ہے، آپ آرام کیجیے۔"

"ڈاکٹر! مجھے ایک فون کرنا ہے، وہ بھی فوری، پلیز!"

"کروا دیں گے فون، آپ اپنے ذہن پر زور نہ دیں۔"

"ڈاکٹر! میں پاگل ہو جاؤں گا، اگر مجھے فون نہ ملا تو۔۔۔" میں نے اضطراری انداز میں اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو حسن جلدی سے آگے بڑھ کر بولا۔

"کیا کرتے ہو، جان جی! لیٹے رہو، میں دیتا ہوں تمہیں فون۔۔۔" حسن نے مجھے بہلا وا دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ میں اس وقت دہرے عذاب میں مبتلا تھا۔ نرس انجکشن تیار کر کے کھڑی تھی، وہ مجھے بہلا وا دے کر نیند کا انجکشن دینے والے تھے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کہا۔

"ڈاکٹر! آپ کو نہیں پتہ کہ میں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ پلیز، میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں احمق نہیں ہوں کہ آپ کی بات نہ مانوں۔" میں نے انجکشن کی طرف دیکھ کر ڈاکٹر سے کہا۔ تبھی حسن نے ڈاکٹر کے کاندھے پر ہاتھ رکھا، اس نے نرس کو اشارہ کیا تو وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد مجھے فون دیا گیا۔ میں نے آصف چوہدری کے نمبر ملائے تو کچھ لمحوں بعد اس کی آواز ابھر آئی۔

"میں شجاع بات کر رہا ہوں۔"

"او، شجاع! تمہیں ہوش آ گیا، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہاں سے، کیسے فون کر رہے ہو؟" اس نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے لہجے میں تیزی سے پوچھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں اسے پتہ چل چکا ہے ایک خوف میرے اندر سرائیت کر گیا، تبھی اس نے کہا۔ "بولو، شجاع؟"

"آصف! تمہیں میرے بارے میں کیسے پتہ چلا؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اس وقت جب وہ لڑکے تم پر گولی چلا کر بھاگ رہے تھے، میرے آدمیوں نے انہیں پکڑ لیا اور اب تک ان کی لاشیں بھی ٹھکانے لگ چکی ہوں گی۔" وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"تم پر کوئی گولی چلائے اور مجھے معلوم ہو جائے، میں کیسے اسے برداشت کر لوں؟ وہ جسے تم نے تہہ خانے میں دیکھا تھا، وہ بھی انہی کے ساتھ گیا تھا۔ بس ملک منیر کی تلاش جاری ہے، جلد ہی وہ بھی مل جائے گا۔"

''نہیں، آصف! خون نہیں بہاؤ، چھوڑ دو ملک کو۔۔۔ میں۔۔۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

''بکواس نہیں کرو، تمہارا کام صرف یہی ہے کہ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔'' وہ بولا۔

''دیکھو، تم جو کچھ بھی کرو، میں تمہارا ہاتھ نہیں روک سکتا لیکن تم نے ماریہ کو کچھ نہیں کہنا، وعدہ کرو مجھ سے۔۔۔'' میں نے نرم سے انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم، وہی اس سارے فساد کی جڑ ہے اور اسے چھوڑ دوں؟'' اس نے سختی سے کہا۔

''ہاں، اسے تم کچھ نہیں کہو گے۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''مگر کیوں، شجاع؟'' اس کے لہجے میں غصہ ملی حیرت تھی۔

''وہ میرا شکار ہے، میں ہی اسے خود اپنے ہاتھوں سے، میری بات سمجھ رہے ہو، نا؟'' میں نے آصف کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے ایک دوسرے طریقے سے اسے روکنا چاہا۔

''ٹھیک ہے، لیکن ملک منیر؟'' گویا اس نے وضاحت چاہی۔

''وہ تمہارا اختیار ہے۔'' میں نے کہہ دیا تو وہ مجھے اپنا خیال رکھنے اور جلد از جلد تندرست ہو جانے کے بارے میں کہتا رہا۔ مجھے شدید نقاہت محسوس ہونے لگی تھی سو میں نے فون بند کر دیا، جلد ہی نرس نے مجھے انجکشن لگا دیا اور پھر میں نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔ فطری طور پر اس وقت چاہیے مجھے یہ تھا کہ میں پوچھتا، ہسپتال تک مجھے کون لایا ہے اور میں کس حالت میں تھا۔ مجھے کتنی گولیاں لگیں، میرا خون کتنا بہا اور گاڑی کو کس قدر نقصان پہنچا لیکن اس وقت اصل چوہدری کو فون کرنے کی دھن اس قدر سوار ہوئی تھی کہ جس نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھا۔ میری بے چینی صرف اور صرف اس لیے تھی کہ میں ان لوگوں کو بچا لوں جو آصف چوہدری کے ہتھے چڑھ چکے تھے مگر اس نے جلد بازی کی۔ وہ لوگ اس قدر قصوروار نہیں تھے، انہیں کوئی بھی استعمال کر سکتا تھا۔ اصل قصوروار تو ماریہ تھی جس کے ایماء پر ملک منیر نے مجھ پر قاتلانہ حملے کروانا شروع کر دیئے تھے۔ ماریہ سے میرا تعلق میرے ماضی کا وہ حصہ تھا جسے سوچتے ہوئے یاد دہراتے ہوئے مجھے کوفت محسوس ہوتی تھی۔

دوسری بار جب مجھے ہوش آیا تو کمرے میں خاصی روشنی تھی۔ میں نے روشنی کے منبع کی جانب دیکھا تو کھڑکی سے پردہ ہٹا ہوا تھا اور اس کے پاس زارا اخبار پڑھ رہی تھی۔ میں کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے جلدی سے اخبار سمیٹا اور میری طرف بڑھ کر اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا۔ پھر بڑے نرم لہجے میں بولی۔

''کیسی طبیعت ہے؟''

''ٹھیک ہوں اور تمہارے سامنے ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دی۔ پھر چہک کر بولی۔

''میں ذرا نرس کو انفارم کر دوں، ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے نکل گئی اور میں آنکھیں بند کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد شگفتہ سے چہرے والی نرس آن موجود ہوئی۔ اس نے میرا ٹمپریچر لیا، بی پی دیکھا، دو چار باتیں کیں اور واپس لوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی زارا آ گئی، آتے ہی بولی۔

''آپ ذرا سا اٹھ کر بیٹھ جائیں تو میں آپ کو کھانے پینے کے لیے دوں۔ پھر اس کے بعد آپ نے دوائی لینی ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا، اس کے لہجے میں انتہائی خلوص اور سادگی تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو درد کی ایک لہر سے میرا جسم جھنجھنا اٹھا۔ میں بے بس سا ہو کر پڑا رہا، تب اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں خیال آیا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ لیکن یہ سوال میں زبان پر نہیں لایا۔ وہ اپنے ساتھ کچھ چیزیں بنا کر لائی ہوئی تھی۔ میں وہ کھا رہا تھا کہ ڈاکٹر دو نرسوں کے ساتھ آ گیا، رسمی سی باتوں کے بعد اس نے مجھے دوائی دی اور چلا گیا۔ جب میں اور زارا تنہا رہ گئے تو میں نے اس سے پوچھا۔

''تم، میرے مطلب ہے، دوسرے لوگ بھی تھے۔''

''میں سمجھ گئی، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ فی الحال تو میں ہوں، میں نے ہی سب کو کہا ہے کہ وہ بعد میں آ جائیں۔''

''اوہ، میں ہسپتال کیسے پہنچا؟'' تاخیر سے ہی سہی، ایک ضروری سوال میرے لب پر آ گیا۔

''میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں گیٹ کی طرف آ گئی تاکہ چوکیدار کو بتا دوں۔ ابھی چوکیدار نے گیٹ کا بولٹ کھولا ہی تھا کہ فائرنگ کی آواز گونج اٹھی۔ میں حواس باختہ ہو گئی، مجھے سمجھ نہ آیا کہ میں کیا کروں؟ آپ کو گولی لگ چکی تھی۔ میں پتھر کا بت بنی رہی۔ تبھی نجانے دو آدمی کہاں سے نکل آئے، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میرے گھر میں گاڑی ہے؟ اس وقت مجھے ہوش آیا۔ میں نے انتہائی تیزی سے گاڑی نکالی۔ وہ لوگ آپ کو گاڑی سے نکال چکے تھے۔ اتنے میں وہاں کئی لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ان دو آدمیوں نے آپ کو گاڑی میں ڈالا۔ میں گاڑی سے باہر آ چکی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا اور آپ کو لے کر ہسپتال چلے گئے۔ پھر بعد میں جب وہ گاڑی چھوڑنے آئے تو میں نے ہسپتال کے بارے میں

پوچھا۔اس وقت تک پولیس آپ کی گاڑی لے جا چکی تھی۔''
''کتنی گولیاں لگی ہیں مجھے۔؟''میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''ایک، وہ بھی کندھے میں گھس کر نکل گئی اور دوسری مس کرتی ہوئی گزری ہے۔''
وہ کہتے کہتے رک گی، پھر چونک کر میری طرف دیکھا اور کہا۔''یہ مجھے ڈاکٹر سے پتہ چلا ہے، اب آپ کی حالت قطعاً خطرے سے باہر ہے۔''
''خیر، یہ ہونا تھا، وہ ہوگیا لیکن میرے بارے میں ۔۔۔''میں نے کہنا چاہا تو ہسپتال کے عملے کے لوگ آگئے انہیں شاید پٹیاں تبدیل کرنا تھیں۔
میں چار دن ہسپتال میں سوتا جاگتا رہا جس کا باعث نیند کے انجکشن تھے، دوائیں تھیں۔ میں جب اٹھتا، کوئی نہ کوئی دوست میرے پاس ضرور ہوتا۔ حسن، ندیم، عامر، زارا اور ایک دن نائلہ۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہما بھی آئی تھی لیکن اس وقت میں نیند میں تھا۔ انہی چار دنوں میں ایک دن پولیس انسپکٹر بھی آیا، وہ اپنے تفتیشی انداز میں مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ وہ مجھ سے پوچھنا یہ چاہ رہا تھا کہ مجھ پر حملہ کس نے کیا اور میں اپنی بات پر قائم رہا کہ مجھے نہیں پتہ۔ یوں ذہنی اور جسمانی کوفت کے چار دن گزرنے کے بعد میں ہسپتال سے گھر چلا آیا۔ نجانے کیوں میں نے گھر پہنچ کر سکون محسوس کیا۔ ہسپتال میں میری نگہداشت اچھے طریقے سے ہوسکتی تھی، یہ محض میری سوچ تھی جیسے ہی میں گھر آیا تو میری دیکھ بھال کرنے والے کئی سارے تھے۔ جب بھی جسے فرصت ملتی، وہ سیدھا میرے گھر آجاتا۔ اس سارے دورانیئے میں عامر نے سب سے زیادہ وقت دیا۔ میرے دوستوں میں اتنی سمجھ تھی کہ میرے آبائی گھر تک اس واقعہ کی اطلاع نہیں پہنچنے دی تھی۔ نائلہ تو میرے ہاں ہی اٹھ آئی تھی۔ اس وقت بھی وہ میرے پاس تھی اور اس نے سوال کیا تھا کہ حملہ آور کون تھے۔ میں ٹال گیا تو کافی بنانے چلے گئی۔
میں اسے غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن سچائی بھی کسی کو نہیں بتا سکتا تھا، یہاں تک کہ حسن اور عامر جیسے پرخلوص دوستوں پر بھی یہ راز آشکار نہیں کرسکتا تھا۔ میں کیا کروں؟ کتنے ہی لمحے اسی خیال کے تحت گزر گئے۔ پھر میں نے خاموش رہنے کا ہی فیصلہ کرلیا۔ اس وقت نائلہ کافی لے کر آگئی اور وہ مجھے مگ دے کر سامنے والے صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھ گئی۔
''بہت مزیدار کافی ہے۔''میں نے تعریف کی تو نائلہ شوخی سے بولی۔
''ایک یہی چیز تو سیکھی ہے میں نے کیونکہ یہ میری فیورٹ ہے۔''
''لگتا ہے، تمہارے وجود کی خوبصورتی کا راز بھی یہی ہے۔''میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر ایسی ہی ہلکی پھلکی باتوں میں کافی پی لی تو نائلہ بولی۔

"آپ آرام کرو، میں ذرا کھانا بنوالوں۔"

"ارے واہ، آج کوئی خاص اہتمام ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"جی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آج حسن کا آف ہے اور عامر جی بھی یہیں لنچ کریں گے۔ وہ لڑکا دلدار تو اتنا ماہر نہیں ہے، میں نے مسز خان سے درخواست کی ہے اور سب کچھ اوپر مسز خان کے ہاں بن رہا ہے۔"

"اب یہ دن بھی آ گئے ہیں کہ تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا پڑے گا۔" میں نے معصومیت سے کہا تو ہم دونوں ہی ہنس دیئے۔

"نہ بابا! میں تو اپنے پکائے ہوئے کھانے کا خود رسک نہیں لیتی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کافی کے خالی مگ اٹھائے اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ اک سکون سا چھا گیا۔ میں سو گیا اور اس وقت جاگا جب۔ حسن اور عامر بھی آ گئے تو نائلہ نے کھانا لگوا دیا۔

میرے زخم بھرنے میں تقریباً تین ہفتے لگے۔ اس دوران میرے گھر میں دوستوں کا یوں میلہ لگا رہا کہ مجھے تنہائی کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔ نائلہ مستقل میرے پاس رہی، شام ہوتے ہی ڈاکٹر پٹی بدل جاتا، مقامی تھانے کا انچارج بھی دو تین بار ملنے آیا۔ اسے حملہ آوروں کی تلاش تھی جبکہ وہ تو کب کے ٹھکانے لگ چکے تھے۔ میں نے جو ہسپتال میں بیان دیا تھا، وہی رہا کہ مجھے نہیں معلوم، وہ کون لوگ تھے۔ ندیم کا معمول تھا کہ وہ شام ڈھلے روزانہ آتا۔ آصف چوہدری کا میرے ساتھ فون پر ہی رابطہ رہا۔ میرے دوستوں کی وجہ سے میرے آبائی گھر کے کسی فرد کو پتہ نہیں چلا تھا۔ سوائے میرے دوست حیدر شیخ کے، مگر وہ میرے آبائی شہر میں نہیں بلکہ دوبئی میں تھا۔ اسے میرے بارے معلوم ہوا تو میں نے اسے سختی سے منع کر دیا کہ وہ میرے گھر والوں کو نہ بتائے۔

"تو پھر تیرے پاس ہے کون؟ تیری دیکھ بھال کون کرتا ہے۔"

"تیرا کا مطلب ہے میں یہاں جنگل میں ہوں۔ میرے گھر میں تو دوستوں کا یوں میلہ لگا رہتا ہے۔ وہ سب میری دیکھ بھال بہت اچھی طرح کر رہے ہیں۔"

"دیکھو اگر ایسی بات ہے تو بتاؤ، میں آ جاتا ہوں۔"

"ویسے اگر تمہارا دل چاہ رہا ہے تو آ جاؤ، لیکن صرف میرے لیئے نہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اُسے یہاں کی صورت حال کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ پھر وہ گاہے بگاہے فون کرتا رہا۔

اُس دن میں تین ہفتوں کے بعد آفس گیا تھا۔ میری غیر حاضری میں ظفر تارڑ نے

خاصی تبدیلی کی تھی۔ ماریہ پھر دفتر نہیں آتی تھی اور نہ ہی کوئی اطلاع تھی کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟ ایک عجیب جمود سا طاری ہو کر رہ گیا تھا، یوں جیسے طوفان کے بعد ماحول شانت ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ہر چیز نکھری ہوئی اور واضح تھی مگر کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پورے دن میں نے دفتر میں کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا، بس لوگوں سے ملتا رہا اور گپ شپ چلتی رہی۔ اس وقت میں میگزین سیکشن میں نوید درانی سے باتیں کر رہا تھا کہ ندیم آ گیا۔ اگرچہ اس نے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بال بھی سنوارے ہوئے تھے، جوتا بھی قیمتی پہنا ہوا تھا لیکن وہ فریش نہیں لگ رہا تھا، صاف ستھرا ہونے کے باوجود سست اور بجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کا جائزہ لیا اور نوید درانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا۔ پھر جتنی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے، وہ خاموش رہا۔ نوید کے چلنے جانے کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے ندیم سے پوچھا۔

"کیا بات ہے، میری جان! اتنے اداس کیوں ہو؟" میرے اس طرح کہنے پر وہ میرے سے مسکرا دیا لیکن اس کی آنکھوں میں وہی ویرانی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ آہستہ سے بولا۔

"بس یونہی، شجاع بھائی! کام زیادہ ہے نا، آج کل اور پھر بڑا اخبار مل گیا ہے تو محنت زیادہ کر رہا ہوں۔"

"مگر تم ویل ڈریسڈ ہونے کے باوجود بڑے تھکے تھکے سے لگ رہے ہو؟"

"میں نے کہا نا، آرام کے لیے وقت تھوڑا ملتا ہے۔" اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کھوکھلے سے لہجے میں کہا تو میں نے اسے مزید چھیڑنا مناسب خیال نہیں کیا، بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

"آج کل کام کیسا چل رہا ہے؟"

"بالکل ٹھیک، ہاں، آپ کو زارا بہت یاد کر رہی تھی۔ رات اس سے خاصی گپ شپ ہوئی تھی۔" اس نے اسی لہجہ میں عام سے انداز میں کہا۔

"وہ آ گئی ہے شمالی علاقے سے؟"

"وہاں شوٹنگ ہو گئی ہے، کہہ رہی تھی کہ آپ چاہیں تو فون کر لیں۔"

"وہ خود فون کر لیتی؟" میں حیران ہوتے ہوئے پوچھا

"میں نے بھی کہا تھا مگر وہ آپ کی طبیعت کی وجہ سے کہہ رہی تھی کہ جب آپ فریش ہو جائیں۔"

"چلو ٹھیک ہے، مل لیں گے اس سے، آؤ، ذرا تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلیں۔" میں

نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا اور اٹھ گیا۔ میں واقعتاً اس وقت کھلے ماحول کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت سورج ڈوب رہا تھا جب ہم باغ جناح میں ایک سنگی بینچ پر جا بیٹھے، پھر یونہی باتوں کے دوران اچانک ندیم نے کہا۔

''آپ کچھ دنوں کے لیے اپنے آبائی قصبہ کیوں نہیں چلے جاتے؟''

''یہ کیا بات کہی تم نے؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''یونہی، دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی آپ کے ساتھ کچھ دنوں لاہور سے باہر رہوں۔ یہاں دل بہت تنگ ہے۔''

''اوہ، میں سمجھا۔'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا پھر بولا۔ ''ندیم! اگر کوئی بات ہے تو بولو۔۔۔'' میں نے پوچھا تو زخمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''بس، شجاع بھائی! ہارنے کا دکھ مجھے بے چین کیے ہوئے ہے، اور کوئی بات نہیں۔''

''مجھے تفصیل سے بتاؤ گے؟'' میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو تو پتہ ہے، وہی سلمٰی۔۔۔'' اس نے اشارہ میں اپنی پوری بات کہہ دی۔

''تم اس کا روگ کیوں پال رہے ہو۔ کہیں عشق۔۔۔''

''نہیں۔۔۔'' اس نے سختی سے تردید کرتے ہوئے کہا، پھر دھیرے سے بولا۔ ''میں نے پہلے بھی آپ سے کہا ہے کہ میں اس سے کوئی عش وشق نہیں کرتا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ وہ مجھے ایک ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر گئی۔ میں اور آپ کس قدر خلوص سے اس کے مستقبل کے بارے میں اچھا سوچ رہے تھے لیکن وہ اس قدر اپنا رنگ بدل جائے، میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں نے اس کے لیے اتنا اچھا کیوں سوچا تھا؟ میں قطعاً غلط نہیں تھا۔ پھر...... پھر کہاں ایسی بات......'' یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

''دیکھو، پیارے! تم ایسا کیوں سوچتے ہو اور تمہیں کون کہتا ہے کہ تم ہارے ہو۔ تم تو جیتے ہو۔ تم نے اس کے لیے اچھا سوچا، اس کی مدد کی۔ اس میں کہیں بھی مطلب یا غرض نہیں تھی۔ تم نے ایک اچھا انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ وہ کم ظرف تھی جو ایک اچھے انسان کو نہ سمجھ سکی اور انسانیت کے معیار سے نیچے گر گئی۔ میرے پیارے! بارش جب ہوتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کہاں پڑ رہی ہے۔ وہ عبادت گاہ کے صحن میں بھی پڑتی ہے اور کوڑے کے ڈھیر پر بھی۔ تم نے نیکی کی کس سے کی، اسے بھول جاؤ۔ کیا تم اپنے اچھے سوچنے یا اس کے ساتھ نیکی کرنے کا ریٹرن لینا چاہتے ہو؟''

''نہیں، میں نے تو اس وقت بھی کسی مقصد کے تحت۔۔۔''

''یہی ہے نا! وہ تمہاری زندگی میں آئی اور چلی گئی۔ تم نے اچھا سلوک کیا، یہ تمہارا ظرف ہے۔ اب اس میں ہارنے جیتنے کا سوال کیا؟ رہی بات کہ اس نے تمہیں ٹشو پیپر کی طرح استعمال کیا۔ تو یہ تمہاری سوچ کا فرق ہے۔ وہ جو خود ردی کاغذ کی طرح ہواؤں کے دوش پر ہو۔ وہ بھلا کسی کو کیا استعمال کر سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، شجاع بھائی! وہ اب کبھی میری سوچ پر غالب نہیں آئے گی۔'' ندیم نے عزم سے کہا۔

''ہونا بھی ایسے ہی چاہیے، تمہیں بہت آگے جانا ہے۔ تمہیں ترقی کرنا ہے، اپنے لیے، اپنے گھر والوں کے لیے، سلمٰی جیسی لڑکیاں ہوا کی طرح آتی ہیں اور پتے ہلا کر چلی جاتی ہیں۔ تمہیں ایک تناور درخت بننا ہے، جو طوفانوں میں بھی ایستادہ رہے۔''

''شجاع بھائی! میں اب خود کو بہتر کرنے کی کوشش کروں گا۔'' اس نے شرمندگی سے کہا تو میں ہنس دیا۔ وہ قریبی کینٹین سے سوڈا لانے کے لیے اُٹھ گیا۔ پھر کتنی ہی دیر تک باتیں کرتے رہنے کے بعد ہم وہاں سے اٹھے تو میں نے زارا کی طرف جانے کا ارادہ کرلیا۔

''آپ مجھے دفتر ڈراپ کر دیں۔'' ندیم نے کہا تو میں نے گاڑی کا رخ دفتر کی جانب موڑ لیا۔

زارا میرے انتظار میں ہی تھی۔ میں نے راستے سے فون کر دیا تھا، بہت دنوں بعد میں اس کے ہاں جا رہا تھا۔ میں نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی تو س کی ملازمہ نے بتایا کہ وہ بیڈ روم میں ہے، آپ وہیں چلے جائیں۔ وہ بیڈ سے ٹیک لگائے، پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ہلکے سے مسکرائی اور وہیں بیٹھے بیٹھے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور پاس دھری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''خیریت تو ہے، زارا! یوں عجیب سے انداز میں بیٹھی ہو۔''

''بس ایسے ہی تھکن ہو رہی ہے اور پھر آج کوئی شوٹنگ بھی نہیں ہے، اس لیے کسلمندی سے پڑی ہوں۔''

''او، میں نے سوچا کہ شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ میں تو ندامت محسوس کر رہی ہوں۔ میری اگر کمٹمنٹ نہ ہوتی تو میں خود آپ کی خدمت کرتی۔''

''شکریہ، زارا! ویسے مجھے ذرا بھی تنہائی کا احساس نہیں ہوا۔ خیر چھوڑو، بتاؤ کیسی گزر رہی ہے آج کل؟'' میں نے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے پوچھا۔

''اپنی کیا گزرنی ہے، سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ بس ایک پرابلم ہے۔۔۔''

''کیسی پرابلم؟'' میں نے پوچھا تو وہ چند لمحے بے خیالی سے انداز میں مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''کبھی فلمی پنڈتوں کے بارے میں سنا ہے؟''

''ہاں! سنا ہے، کیوں، کیا ہوا؟''

''آپ کو تو پتہ ہے کہ یہاں بھی چند قبضہ گروپ موجود ہیں، بظاہر وہ کسی نہ کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حقیقت ان کی بھی دلال کی سی ہوتی ہے، وہ بھی جسموں کا کاروبار کرتے ہیں لیکن ذرا اونچے درجے پر۔'' اس نے انتہائی تلخی سے کہتے ہوئے میری طرف دیکھا، پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''ایسے دلال قسم کے فلمی پنڈت نئے نئے جسموں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک جسم پر توجہ سے انویسٹمنٹ کرتے ہیں، پھر اس کی نمائش میں پورا زور لگا دیتے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں کیا پرابلم ہے؟'' میں نے اکتاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ایسے ہی ایک فلمی پنڈت سے میری اَن بن ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے، اس کی پوری لابی فلم انڈسٹری میں ہے اور وہ میرے خلاف متحرک ہو جائے گی۔''

''اور تمہاری لابی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا سامنا کریں گے لیکن مجھے پتہ ہے، میرے لوگ بہت کمزور ہیں۔ کم از کم اس فلمی پنڈت کے مقابلے میں خاصے کمزور ہیں۔''

''کون ہے وہ؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''تنویر کاظمی۔! وہ مجھ سے ایک فلم چھین کر ایک ایسے نئے چہرے کو دینا چاہتا ہے جس کے سر پر اس نے ہاتھ رکھ دیا ہے جبکہ وہ فلم میرے کیرئیر کے لیے بڑی اہم ہے۔''

''تم نے کیا سوچا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ کوشش تو کروں گی کہ وہ ہاتھ سے جانے نہ پائے۔''

''ڈونٹ وری، زارا! میں اس کے لیے کچھ کروں گا۔''

''نہیں، آپ کچھ نہیں کریں گے۔ میری آپ سے کمٹمنٹ یہی ہے کہ میں اپنے فلمی معاملات میں آپ کو کبھی۔۔۔''

''او، چھوڑو۔ تم نہ سہی، میں تو تمہارے کسی کام آنا چاہوں گا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ اور آزردہ ہوگئی۔ پھر بڑے دھیمے لہجے میں بولی۔

''شجاع! قسمت سے ہم ایک دوسرے سے آن ملے ہیں۔ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی اور نہ ہی چاہتی ہوں کہ آپ میری وجہ سے کسی ٹینشن کا شکار ہوں۔''

''اچھا، ایسی ہی باتیں کرتی رہو گی یا پھر کچھ کھانے وانے کا بندوبست بھی کرو گی؟''میں نے ایک دم سے ماحول کو بدلنے کے لیے خوشگوار لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دی۔ پھر وہ بھی ایک دم ہی بدل گئی اور بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جناب! بے چارہ باورچی آپ کے فون آنے کے بعد سے ہی کچن میں مصروف ہے۔'' پھر رات گئے تک ہم یونہی باتیں کرتے رہے۔ اگلی صبح بڑے خوشگوار انداز میں ناشتہ ختم کر کے میں دفتر جانے والا تھا کہ آصف چوہدری کا فون آ گیا، اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''صاحب! کیا کر رہے ہیں؟''

''ناشتے سے فراغت کے بعد دفتر جانے کی سوچ رہا ہوں۔ خیریت، آپ اتنی صبح جاگ رہے ہیں؟'' میں نے اسی کے انداز میں شوخی سے کہا حالانکہ اس وقت کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔

''تمہارا ایک مہمان رات ہی میرے ہاں پہنچا ہے، میں چاہتا تھا کہ تمہیں اس سے ملوا دوں۔''

''مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ ہے کہ تم اِدھر میرے ہاں ہی آ جاؤ، تمہارا مہمان تم سے ملنے کے لیے بڑا بے تاب ہو رہا ہے۔'' اس نے پھر بات گول سی کی تو میں سمجھ گیا کہ وہ واضح طور پر کچھ نہیں بتائے گا۔

''ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔'' میرے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔ میرے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے۔ میرا کون سا ایسا مہمان ہے جو اس کے ہاں آن ٹھہرا تھا؟ یقیناً وہ ماریہ سے ہی متعلق کوئی شخص ہو گا۔ وہ خود یا پھر ملک منیر، ان دونوں میں سے ایک ضرور تھا۔ یہ سوچتے ہی میرے خون میں تیزی آ گئی۔ میں فوراً اس کے پاس کے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ سڑک پر ٹریفک زیادہ ہوتی ہے۔

آصف چوہدری اپنے مخصوص کمرے میں صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی والہانہ میری طرف بڑھا، بڑی گرمجوشی سے گلے ملا اور پھر میرے ساتھ صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

''بڑی جلدی پہنچ گئے۔''

''بتاؤ، مہمان کون ہے؟''

''ملک منیر۔۔۔'' اس نے کہا تو میرے بدن میں اطمینان پھیل گیا۔'' کیوں، تم کیا سوچ رہے تھے؟''

''میں سمجھا، کہیں تم ماریہ کو۔۔۔''

''تم نے خود ہی کہا تھا کہ وہ تمہارا شکار ہے اس لیے میں نے اس کو چھیڑا بھی نہیں۔ وہ اس کے ساتھ ہی تھی جب رات گئے اسے میرے بندوں نے گھیرا تھا۔''

''اب وہ کہاں ہے؟''

''بے ہوش کر کے گاڑی میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت ہو سکتا ہے، کہیں واویلا کر رہی ہو؟'' اس نے بڑے اطمینان سے کہا اور چند لمحے توقف کے بعد آصف بولا۔

''تم جانتے ہو، یہ ملک منیرم ہے کون؟''

''بس نام سنا ہے اس کا اور اتنا پتہ ہے کہ وہ ماریہ کا دور پار کا کزن ہے۔'' میں نے کہا

''تبھی تم اسے اتنی اہمیت نہیں دے رہے ہو۔ میں بتاتا ہوں تمہیں'۔۔۔' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔'' یہ وہ ملک منیر ہے جسے ہم ٹونی برگنزا کے نام سے پکارتے تھے۔'' اس نے کہا تو میں چونک جانا یقینی تھا۔ کالج دور میں وہ ہماری مخالف سیاسی پارٹی کا بہت اہم رکن تھا۔ ان دنوں اس کے پاس ٹریل موٹر سائیکل ہوتی تھی۔ چونکہ وہ ایک امیر کبیر فیملی سے تعلق رکھتا تھا اس لیے بے تحاشا پیسہ خرچ کرتا تھا۔ اس وقت لڑنا بھرنا اس کا محبوب مشغلہ ہوتا تھا۔ ایک لمبے پھل والا خنجر ہمیشہ اس کے پاس رہتا۔ سرخ وسفید رنگ اور لمبے بالوں کی وجہ سے ہم اسے ٹونی برگنزا کہتے تھے، پھر یہی نام زبان پر چڑھ گیا۔ میرے ذہن کے کسی خانے میں بھی نہیں تھا کہ وہ یہی ہو سکتا ہے۔ ہماری اس کے ساتھ ہمیشہ اَن بن رہی تھی اور ایک بار وہ آصف چوہدری کے خنجر گھونپ چکا تھا۔'' دیکھو، قدرت کس طرح دوبارہ ملاتی ہے۔'' آصف نے میری حالت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک محفوظ جگہ پر، میں بھی اس سے نہیں ملا ہوں۔ میں نے سوچا، اکٹھے ہی ملیں گے۔''

''تو چلو پھر، دیر کس بات کی ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گیا ہم تقریباً قافلے کی صورت میں نکلے۔ میری گاڑی اس کا کوئی بندہ ڈرائیو کر رہا تھا اور میں اس کے ساتھ لینڈ کروزر میں تھا۔ ہم بند روڈ پر جا چڑھے، پھر جلد ہی ایک ایسی کوٹھی کے سامنے ٹھہرے جو خوبصورت بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ہمارے ساتھ آنے والے لوگ اِدھر اُدھر

ہو گئے اور کوٹھی میں موجود سمارٹ سے نوجوان نے ہمارا استقبال کیا۔

''ہمارا مہمان کیسا ہے، تنگ تو نہیں کیا اس نے؟'' آصف نے پوچھا۔

''اس بے چارے نے کیا تنگ کرنا ہے، بس جگالی بہت کر رہا ہے۔'' نوجوان ہنستے ہوئے بولا۔

''اُسکی۔۔۔'' آصف نے غصے میں ایک غلیظ گالی دی اور پھر بغیر وقت ضائع کیے اس نوجوان کے ساتھ تہہ خانے میں اتر گیا۔ بڑے عرصے بعد میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ بالکل بدلا ہوا تھا، کوئی بھی اس کے ماضی کے حوالے سے ''ٹونی برگنزا'' کے طور پر نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ اس وقت بہت ہی سوبر قسم کا بزنس مین لگ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ننگے فرش سے اٹھ بیٹھا۔ میں نے واضح طور پر اس کی آنکھوں میں اجنبیت دیکھی، شاید اس نے ہمیں نہیں پہچانا تھا۔ تبھی آصف نے کہا۔

''ہاں بھئی، ملک! نیند تو سکون سے آئی یہاں پر؟''

''کون ہو تم؟'' اس نے سرسراتے ہوئے پوچھا

''تمہاری موت۔'' آصف نے سرد سے انداز میں کہا۔

''کیوں، میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟''

''میں نے کبھی کسی بے گناہ اور مظلوم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ تم نے بگاڑا ہے اس لیے یہاں پڑے ہو۔ بولو، تم نے شجاع پر قاتلانہ حملے کیوں کروائے۔ اسے کیوں مروانا چاہا۔''

''اُوہ۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''وہ میری منگیتر کو بلیک میل کر رہا تھا۔'' اس نے کہا تو مجھے احساس ہو گیا کہ وہ مجھے شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔

''کس سلسلے میں؟'' آصف نے پوچھا اور تیزی سے بولا۔ ''وہ اگر بلیک میل کر رہا تھا تو تم اسے قتل کرنے چل پڑے؟''

''جب بات عزت پر آن پڑے تو پھر دشمن کو ختم کرنا پڑتا ہے۔'' اس کا اعتماد بحال ہو گیا تھا اس لیے بڑے مضبوط لہجے میں اس نے کہا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' آصف نے کہا۔

''نہیں، میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں اپنی منگیتر سے بہت پیار کرتا ہوں مگر اس نے میرے ساتھ شادی سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے جب اس سے پوچھا کہ اس کی وجہ کیا ہے، تب بہت عرصہ اصرار کے بعد اس نے بتایا کہ اس کی کچھ تصویریں شجاع کے پاس ہیں۔ ان

کے بل بوتے پر وہ اس کی عزت سے کھیل چکا ہے اور آئندہ بھی وہ یہی چاہتا ہے، تب مجھ سے نہیں رہا گیا۔''

''اور تم اسے قتل کرنے چل پڑے، یہ تصدیق کیے بغیر کے ایسا ہوا بھی ہے یا نہیں؟ ''میں نے تلخی سے کہا تو اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو، تبھی میں نے مزید کہا۔''ملک منیر! تمہیں اس عورت نے بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔''

''اب تم لوگ کیا چاہتے ہو؟'' اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری موت'' آصف نے پھر سفا کی سے کہہ دیا تو اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

''دیکھو، ہم ڈیل کر لیتے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔ اس کے عوض آپ جو چاہیں۔''

''میں نے پوچھنا تم سے صرف یہی تھا کہ شجاع سے تمہاری کیا دشمنی ہے، وہ تم نے بتا دی۔ اس کے علاوہ اور کچھ؟''

''دیکھیں، میں ۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا لیکن آصف نے مڑتے ہوئے کہا۔

''آؤ، چلیں '' تہہ خانے سے اوپر آ کر وہ بیٹھا نہیں بلکہ اس نوجوان کی طرف ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بہت خوب، بڑی صفائی سے کام کیا ہے...... خیر، جو ملتا ہے، لے کر اسے ''

''جو حکم ۔!'' اس نوجوان نے خوشی سے کہا تو آصف اس سے ہاتھ ملاتا ہوا واپس چل دیا۔ واپسی پر میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ اس نے نہ تمہیں پہچانا نہ مجھے۔۔۔'' مجھے کافی حیرت ہو رہی تھی

''بہت عرصہ ہو گیا ہے نا، وہ شکل سے نہیں نام سے پہچانتا ہے۔''

''تم نے اُسے بتایا کیوں نہیں ۔۔۔؟'' میری حیرت دور نہیں ہوئی تھی۔

''کیا ضرورت ہے یار، اگر کھیل خراب بھی ہو جائے تو اسے پتہ ہی نہیں ہوگا کہ کس نے اغواء کیا تھا۔ کان بندے تھے۔''

''کیا تم نے ملک منیر کے بارے میں کوئی فیصلہ کر دیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، اغوا برائے تاوان کی صورت ہوگی۔ مرنا بہر حال اسے ہے'' پھر میری طرف

دیکھ کر شوخی سے بولا۔ ’’جیسے اس دنیا کے ہر شخص کو مرنا ہے۔‘‘

آصف نے کچھ اس طرح سے کہا کہ میرے اندر ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ پتہ نہیں، وقت کے ساتھ میں بدل گیا تھا یا پھر وقت نے مجھے بدل دیا تھا۔ مصلحت پسند، بزدل یا پھر کچھ اور۔۔۔ مجھے اپنے بارے میں سمجھ نہ آسکی۔ میں نے دفتر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مجھے آصف سے مزید باتیں بھی کرنا تھیں۔ اس لیے میں نے وہ دن بھی چھٹی کے طور پر گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد ہم آصف چوہدری کے گھر میں تھے۔ اس کے لیے یہ سارے کھیل معمول کے مطابق تھے جبکہ میرے ذہن پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ مجھے یہ پوری طرح احساس تھا کہ ماریہ مجھے ملک منیر کے اغوا کے معاملے میں ضرور گھسیٹنے کی کوشش کرے گی۔ اگرچہ میں اس سے گھبراتا نہیں تھا لیکن اس معاملے کے کھل جانے پر بہت ساری باتیں منظر عام پر آ جانے والی تھیں۔ ایک باب جو میں بند کر چکا تھا، دوبارہ اسے کھولنا نہیں چاہتا تھا۔

’’یار! تم اتنے چپ چپ کیوں ہو؟‘‘ آصف نے چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’بس یونہی۔!‘‘ میں نے بے خیالی میں کہہ دیا پھر فوراً ہی اپنے ہی ایک خیال کے تحت کہا۔ ’’سوچ رہا تھا کہ میں نے تم سے جو بات کہنی ہے، وہ کہاں سے شروع کروں؟‘‘

’’کہیں سے بھی کر دو، میرے پاس سننے کے لیے بڑا وقت ہے۔‘‘ آصف مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر اس موضوع پر کافی دیر تک ہمارے درمیان باتیں چلتی رہیں۔ تبھی لنچ کے بعد میں اس کے ہاں سے اُٹھ کر دفتر چلا گیا۔

اسی شام جب میں آفس سے نکلنا چاہ رہا تھا کہ عامر کا فون آ گیا۔ اس نے آواری میں اپنے چند ایسے کاروباری دوستوں کو ڈنر دینا تھا جنہوں نے حال ہی میں ایک نیا پراجیکٹ شروع کیا تھا، وہ چاہتا تھا کہ میں اور حسن بھی اس ڈنر میں شامل ہو جائیں۔

’’میں کیا کروں گا وہاں پہ آ کر؟‘‘ میں نے اس کی بات سن کر کہا۔ ’’تمہارے دوست ہیں، تم ان کے ساتھ انجوائے کرو۔‘‘

’’وہ تمہارے بھی شناسا ہیں، اجنبیت والی کوئی بات نہیں بلکہ نائلہ کو بھی ساتھ لیتے آنا۔‘‘ عامر نے تیزی سے کہا۔

’’چلو ٹھیک ہے مگر اس کے لیے مجھے اب گھر جانا ہوگا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ہاں، یار! اس کا آنا ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی اب کاروباری دنیا میں آئے۔‘‘

"کوئی خاص بات؟" میں نے پوچھا۔

"صحیح پوچھو تو میں نے یہ پراجیکٹ لیا ہی اسی کے لیے ہے۔ وہ بہت سمجھ دار لڑکی ہے، یونہی وہ گھر میں پڑے بور ہو رہی ہے۔" اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، اسے ان ہو جانا چاہیے۔" میں نے خوشی سے کہا۔

"ٹھیک ہے، پھر اسے لے کر وقت پر پہنچ جانا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے عامر کا نائلہ کے لیے اس طرح سوچنا اچھا لگا تھا۔ گو ان کے درمیان جو بھی تعلق تھا اور عامر نے نائلہ کے حصول کے لیے سیٹھ افراسیاب کے ساتھ ایک طویل کشمکش جاری رکھی تھی۔ نائلہ ایک حساس لڑکی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ خود کچھ نہ کچھ کرے، اس کا اظہار اس نے مجھ سے بھی کیا تھا۔ میں نے اس کے لیے سوچا تھا مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا تھا، عامر اور نائلہ کے درمیان کوئی معاملہ طے پا گیا ہو۔ یہی سوچتا ہوا میں اٹھ گیا۔ میرے پاس ڈنر تک کے لیے خاصا وقت تھا سو میں گھر کی جانب چل پڑا تا کہ خود بھی تیار ہو کر آواری جا سکوں۔

میں گھر میں صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ نائلہ تیار ہو رہی تھی، دلدار میرے لیے چائے رکھ کر گیا تھا کہ کال بیل بجی۔ چند لمحوں بعد دلدار نے آ کر بتایا کہ کوئی خاتون مجھ سے ملنا چاہتی ہے اور اس خاتون کا نام ماریہ ہے۔ میں چونک گیا، وہ یہاں کیسے؟

"اس کے ساتھ کوئی ہے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں، وہ اکیلی ہے۔" دلدار نے سوچنے والے انداز میں دھیرے سے کہا۔

"بلاؤ اسے" میں نے کہا تو وہ انہی قدموں پر لوٹ گیا۔ پھر اس کے پیچھے ماریہ دروازے کی چوکھٹ میں نمودار ہوئی۔ وہ بڑی بے باکی سے تیز نظروں کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔ دلدار چلا گیا تو میں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔

"کیسے آئی ہو اور تمہیں میرے گھر کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟"

"تم جب سے یہاں شفٹ ہوئے ہو، میں تب سے جانتی ہوں اور باقی رہا سوال کہ میں کیوں آئی ہوں، یہ۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر بڑے غصے میں بولی۔ "ملک م
کہاں ہے.....؟"

مجھے لاشعوری طور پر احساس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے یہی سوال کرنے والی ہے، اس لیے مجھے اس کے سوال پر قطعاً حیرت نہیں ہوئی۔ میں حیران اس بات پر تھا کہ وہ مجھ تک ک

''چپ کیوں ہو، جواب کیوں نہیں دیتے؟'' اس نے غصے میں تیزی سے کہا۔

''دیکھو، ماریہ! اگر مجھے ملک منیر کے بارے میں پتہ ہوتا تو میں تب بھی تمہیں نہ بتاتا بلکہ خود اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کرنے کی کوشش کرتا۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہ چیختے ہوئے بولی۔

''چلو مان لیا، میں جھوٹ بول رہا ہوں پھر؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، شجاع! اگر اسے کچھ ہو گیا تو۔۔۔'' اس نے کہا چاہا تو مجھے یکدم ہی غصہ آ گیا۔

''میں نہیں ڈرتا، تمہیں یاد ہوگا، تم نے کتنی بار مجھ پر حملے کروائے ہیں اور میں آئندہ بھی انتظار کروں گا۔ تم اپنی کمینگی دکھا چکی ہو اور میں آئندہ بھی تمہاری کمینگی دیکھنا چاہوں گا۔''

''شجاع۔!'' وہ چیخ اٹھی۔

''چیخو مت، مجھے پتہ ہے اور اس بات کا احساس مجھے تم نے ہی دلایا ہے کہ تمہاری رگوں میں گندا خون گردش کر رہا ہے جس نے تمہارے ذہن میں بھی غلاظت بھر دی ہے۔ تم کیا ہو، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں تم سے یہی کہوں گا کہ تم اپنے نیچ پن اور گندے خون کا احساس مجھے دلاتی رہو تاکہ میں نے جو تمہیں دھتکارا ہے اپنے اس فیصلے پر مجھے کوئی شرمندگی نہ ہو۔''

''شجاع۔!'' وہ رونے والے انداز میں سسک اٹھی۔

''جاؤ، میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ تم میرے لیے محض نفرت کی علامت بن کر رہ گئی ہو۔ میں انتظار کروں گا تاکہ تم مجھے اپنے گندے خون کا کچھ اور ثبوت دے سکو، گٹ اسٹ۔''

''دیکھو، شجاع! میں مانتی ہوں کہ سارا قصور میرا ہے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ اب تک میں نے جو کچھ کیا، تمہیں حاصل کرنے کے لیے کیا مگر اب میں یہ وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔ میں التجا کرتی ہوں کہ ملک کو چھوڑ دو، میں سب کچھ بھول جاؤں گی۔''

''مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، میرے مقدر میں تمہاری نفرت ہی سہی لیکن میں تم سے ملک کی زندگی کی بھیک مانگتی ہوں۔ اس نے جو کچھ بھی کیا، میری وجہ سے کیا۔''

''میں نے کہا نا، ماریہ! ملک میری دسترس میں نہیں اور نہ ہی میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا مجاز ہوں، وہ میرے پاس نہیں۔ تم اسے تلاش کرو اور تمہارے ملک کا پورا گینگ ہے، کیا وہ اسے تلاش نہیں کرسکتا؟''

''اس وقت ہم بے بس ہیں، فون کال پر ایک بڑی رقم مانگی گئی ہے۔ ہم وہ دینے کے لیے تیار ہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ رقم لینے کے بعد بھی۔۔۔'' ماریہ یکدم ہی رو دی۔

''میں کچھ نہیں جانتا کہ تمہارا ملک کہاں ہے اور کس نے رقم مانگی ہے، میرا دماغ مت خراب کرو۔''

''شجاع! وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ میں اسے محض تمہارے لیے ٹھکراتی رہی، وہ نہ رہا تو میں زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ میرا ضمیر۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''اُو، تو تمہارے پاس ضمیر نام کی بھی کوئی چیز ہے؟'' میں نے انتہائی طنز سے کہا۔

''دیکھو، مجھے ذلیل مت کرو۔ میں تمہارے بارے میں سوچوں گی بھی نہیں تم جو چاہو، وہی ہوگا۔ میں اس کی زندگی کے لیے تم سے بھیک مانگتی ہوں۔ جتنی چاہے رقم لے لو مگر۔۔۔''

''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں نے اسے رقم۔۔۔ تم جاؤ، ماریہ! گٹ لاسٹ'' میں نے انتہائی نفرت سے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، آنکھوں آئے ہوئے آنسو پونچھے اور چند لمحے میری طرف بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر تیزی سے اٹھی اور تقریباً بھاگنے والے انداز میں کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میرے خون کی حرارت بڑھ چکی تھی جسے میں آنکھیں بند کر کے کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نائلہ کی آواز پر چونک گیا۔

''کون تھی؟'' وہ تولئے سے گیلے بالوں کو خشک کرتی ہوئی مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ میں محض اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ وہ میرے کسی جواب کا انتظار کرتی رہی مگر کوئی جواب نہ پا کر واپس پلٹ گئی۔ میں اسے یاد بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس کے خیال کو ذہن سے ہٹا کر کچھ دیر بعد میں نارمل ہو گیا لیکن ایک عجیب ناخوش گوار کیفیت مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

عامر کے دوستوں میں خواتین بھی تھیں۔ وہ سب گارمنٹس کے ایک بڑے پراجیکٹ پر کام کرنا چاہ رہے تھے، ساری تفصیلات ان کے درمیان طے پا چکی تھیں۔ عامر نے اپنی طرف سے نائلہ کو ان کے ساتھ شامل کر دیا تھا۔ وہ کاروباری باتیں کرتے رہے۔ جبکہ میں اور حسن محض ان کی سنتے رہے۔ رات گئے وہاں سے پلٹے تو نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اسی خمار میں گھر تک پہنچے اور پھر بیڈ پر لیٹتے ہی مجھے ہوش نہ رہا۔

اگلی صبح نائلہ خوش تھی، وہ ناشتے کی میز پر بیٹھی چہک رہی تھی۔ اسے نیا دفتر دیکھنے کے لیے جانا تھا اس لیے وہ تیار ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ فریش فریش سی، نکھری ہوئی بڑی جاذب نظر لگ رہی تھی۔ اس نے ناشتے پر بھی خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ میں ساری کیفیت اور سوچوں کو ایک طرف ڈال کر اس کی خوشی میں خوش ہو گیا۔ وہ بڑی پر جوش تھی۔ پھر ناشتے کے بعد میں نے اسے ڈراپ کیا اور اپنے دفتر چلا گیا۔ اس دن میں نے باقاعدہ طور پر میگزین سیکشن سنبھال لیا۔ معمول کی میٹنگ کے بعد میں نے میگزین کے لوگوں کی ایک میٹنگ کی اور ایک نئے سرے سے کام کرنے کی ٹھانی۔ میں چاہتا تھا کہ اب پوری توجہ اپنے کام کی طرف دوں۔ دوپہر سے ذرا پہلے میں پوری طرح مطمئن ہو چکا تھا۔ تبھی میرے سیل کی گھنٹی بج گئی، میں نے نمبر پر ایک نظر ڈالی تو وہ آصف چوہدری کا تھا۔

"جی، حضور! بندہ حاضر ہے۔" میں نے انتہائی خوشگوار لہجے میں کہا۔

"شکر ہے، آج تم پریشان نہیں ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"جناب! یہ پریشانیاں تو مر کے بھی بازگشت کی طرح انسان کا پیچھا کرتی ہیں، اب ان سے فرار ممکن نہیں۔" میں نے کہا

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ خیر، تمہارے مہمان کی ساری پریشانیاں ختم ہو گئی ہیں۔ وہ لائی کر گیا ہے۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا تو میں چونک گیا۔

"کب؟" مجھے اپنے لہجے میں دکھ اترتا ہوا محسوس ہوا۔

"یہ آج صبح کی بات ہے، تم نے وہ کہاوت سنی ہے، زندہ ہاتھی لاکھ کا اور مرا ہوا سوا لاکھ کا؟"

"تو کیا"

"ہاں، جاتے جاتے ان لوگوں کے لیے بہت کچھ کر گیا ہے جنہوں نے اس کے لیے محنت کی تھی، میں نے اپنا تعارف کرا دیا تھا، یار اس وقت دیکھنے والا تھا وہ۔ چلو۔! تم خوش رہو اور بے فکری سے اپنا کام کرو، فرصت ہو تو ملیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" مجھے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تبھی میرے سامنے ماریہ کا آنسوؤں بھرا چہرا ابھر آیا، وہ ٹھیک سوچ رہی تھی۔ انہی لمحوں میں ماریہ سے باوجود نفرت کے میرا دل بھر آیا۔ کتنے ہی لمحے یونہی گزر گئے، تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے فون کان سے لگایا ہوا ہے اور دوسری طرف سے لائن کٹ چکی ہے۔ میں نے فون آف کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ مجھے بہر حال دکھ ہوا تھا حالانکہ یہ وہی ملک منیر تھا جو ماریہ کے ایماء پر میری جان

کا دشمن ہو رہا تھا۔ میں نے اس دکھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایسا سب کچھ سوچا۔ کتنی ہی دیر میں وہاں بیٹھا رہا، پھر اس احساس سے جان چھڑانے کی خاطر میں پریس کلب چلا گیا۔

شام ڈھلے میں گھر جانے کی سوچ رہا تھا کہ نائلہ کا فون آ گیا۔

''کب تک پہنچ رہے ہیں گھر؟''

''بس تھوڑی دیر بعد تک ، کیوں، خیریت؟''

''ایسے ہی دل چاہ رہا تھا کہ آج کہیں باہر نکلیں، دلدار ابھی آیا ہے، کھانا بھی نہیں بنا۔'' وہ گھریلو عورتوں کی طرح بولی

''ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں جب گھر پہنچا تو دن ڈھل چکا تھا، وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

''پہلے آپ تازہ دم ہو جائیں، پھر آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔''

میں فریش ہو کر آیا تو بھاپ اڑاتا چائے کا کپ میرے سامنے تھا۔ تب میں نے کہا

''حسن اور عامر کو بلا لیں؟''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کمپنی رہے گی۔''

''ٹھیک ہے میں فون کرتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ میں چائے پی کر فون کرتا میرا فون بج اٹھا۔ میں نے نمبر دیکھ کر فون کان سے لگایا تو دوسری طرف حسن تھا۔ اس نے گھبراتے ہوئے انداز میں کہا۔

''نئی خبر سنی تو نے، جان جی؟''

''نہیں، مجھے ابھی تک تم نے سنائی ہی نہیں۔'' میں نے یونہی عام سے انداز میں کہہ دیا۔

''ماریہ نے خودکشی کر لی ہے، مجھے ابھی پتہ چلا ہے''

''کیا؟''

''میں دفتر سے بات کر رہا ہوں۔ ابھی یہاں خبر پہنچی ہے، اس نے زہر کھا لیا ہے رپورٹر گیا ہے اس کے گھر۔'' حسن پتہ نہیں کیا کہتا چلا گیا لیکن کچھ سمجھ نہ آئی۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں تھا کہ اسے ابھی مرنا نہیں چاہیے تھا۔

ماریہ سے شدید نفرت ہو جانے کے باوجود، میں نے کبھی یہ خواہش نہیں کی تھی کہ وہ مر جائے یا اس طرح خودکشی کر لے۔ وہ جو میری دشمن جان بنی ہوئی تھی، یوں اس کے خودکشی کر لینے پر مجھے انتہائی دکھ اور افسوس ہوا تھا۔ مجھے اپنے اس رویے پر حیرت ہوئی تھی۔ لمحوں میں سوچوں نے نجانے کتنی یادوں بھری تصویریں میرے سامنے کر دیں۔ حسن کے فون بند کرنے

پر مجھے ہوش آیا کہ بات تو ادھوری رہ گئی تھی۔ میں نے دوبارہ اس کے نمبر ڈائل کیے، ذرا سی دیر میں رابطہ ہو گیا۔

''جان جی! کیا بات ہے؟'' حسن کا لہجہ افسردہ تھا۔

''وہ۔۔۔کہنا میں یہ چاہ رہا تھا کہ جیسے ہی تفصیل سے خبر آئے، مجھے ضرور بتانا۔'' میں نے حد درجہ اپنے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے، ویسے میں تو نکل رہا تھا، میں رپورٹر کے آنے تک یہیں انتظار کرتا ہوں۔ دفتر میں یہ خبر بڑی حیرت سے سنی جا رہی ہے۔'' حسن نے افسردگی بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں، ایسا تو ہونا ہی تھا۔ یوں اچانک۔۔۔ میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔ ''میں نے تیزی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ نائلہ شاید میرے فون بند کرنے کے انتظار میں تھی، اس نے پوچھا۔

''خیریت تو ہے نا، کوئی ایسی ویسی اطلاع تو نہیں؟'' اس کے پوچھنے پر میں اپنے خیالوں سے واپس آ گیا۔

''ہاں، ایک بری خبر ہے۔ ہماری ایک کولیگ تھی، ماریہ! اس نے خودکشی کر لی ہے۔''

''یہ وہی ماریہ تو نہیں جو یہاں آئی تھی۔۔۔''

''ہاں، وہی، نجانے اس نے کیوں زہر کھا لیا؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں ابھی تک اس خبر کے حصار سے نہیں نکل پایا ہوں۔

''کوئی وجہ تو رہی ہوگی ورنہ کون اپنی جان گنواتا ہے؟'' اس نے عام سے انداز میں کہا میں نے ایک لمحہ کو اسے دیکھا۔ کبھی کبھی لاعلمی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے جبکہ میرے اندر اس خبر نے کتنی ہلچل مچا دی تھی کیونکہ میں اس کے پس منظر میں دور تک دیکھ رہا تھا۔ ماحول انتہائی بوجھل ہو گیا تھا۔ اس وقت شدت سے مجھے تنہائی کی طلب ہوئی۔ میں الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ صوفے پر ڈھیر ہو گیا، وہ میری طرف بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

''خیریت، آپ نے اس خبر کو بہت زیادہ محسوس کیا ہے۔''

''وہ جیسی بھی تھی ہماری کولیگ تھی۔'' میں نے افسردہ لہجے میں کہا پھر چند لمحوں بعد بولا ''سوری، نائلہ! ہم کھانا کھانے باہر نہیں جائیں گے تم دلدار سے منگوا لو۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے، لیکن آپ کی طبیعت بوجھل ہو رہی ہے، آپ کا لہجہ۔۔۔''

نائلہ نے تشویش سے کہا تو میں چونک گیا۔ کیا ماریہ کے مر جانے کی خبر نے مجھ پر اتنا اثر کیا ہے کہ دوسرے مجھ میں واضح تبدیلی محسوس کر رہے ہیں؟ اس سوال کے اُبھرتے ہی

میں نے فوری طور پر خود کو سنبھال لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''تھک گیا ہوں نا، یار! ابھی کل ہی تو بیڈ سے اٹھا ہوں، تم جلدی سے کھانا منگوالو، پھر کھاتے ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس وقت کھانا کھا کر ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا تھا کہ حسن کا فون آ گیا۔

''ہاں تو، جان جی! ماریہ نے زہر ہی پیا تھا۔ وہ اپنے میں کمرے میں بند تھی، کافی دیر بعد اس کے گھر والوں کو معلوم ہوا۔ اس وقت نزع کی حالت میں تھی۔ اسے فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے انتہائی کوشش کی لیکن وہ زندگی ہار گئی۔ خودکشی کی وجہ اس کے گھر والوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ گمان یہ ہے کہ وہ اپنے منگیتر ملک منیر کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکی۔''

''اس نے کوئی خط وغیرہ نہیں چھوڑا، میرا مطلب ہے کہ وہ فلمی سا انداز ۔۔۔'' میں نے انتہائی کوشش کر کے اپنے لہجہ کو مضحکہ خیز بنا کر کہا۔

''نہیں، فی الحال تو ایسا کچھ دستیاب نہیں ہوا اور اگر اس نے کوئی خط چھوڑا بھی ہوگا تو اس کا ابھی کوئی ذکر نہیں آیا۔ انہوں نے معاملہ خود تک ہی محدود رکھا ہے، جواز وہی منگیتر کا غم ۔۔۔ صبح اس کا جنازہ ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، حقیقت یہی ہے؟'' میں نے مزید کرید لگائی۔

''دل اور ذہن اس کا جواب نفی میں ہی دے رہے ہیں۔ اب حقیقت کیا ہو سکتی ہے، میں نہیں جانتا۔ خیر اس پہ بحث کسی اور وقت اٹھا رکھو، ابھی مجھے گھر جانا ہے۔ سی یو، بائے!'' اس نے تیزی سے کہہ کر مزید کوئی میری بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔

ماریہ کی خودکشی سے متعلق اس کے گھر والوں نے جو بھی جواز بتایا تھا، میں بھی اسے نہیں مان سکتا تھا مگر میں وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا جو میرے خیال میں حقیقت ہو سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح جلد بازی کر گئی، اس نے موت کو بھی جلدی سے گلے لگ لیا۔ کہنے کو تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس کی قسمت میں یونہی مر جانا لکھا ہوا تھا، لیکن وہ بھرپور جوانی کے دور میں تھی۔ یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ اگر وہ یوں نہ کرتی تو اس دنیا سے خوشیاں حاصل کر سکتی تھی۔

''اب تو میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' ائلہ نے افسردگی والے انداز میں کہا تو میں خیالوں سے باہر آ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چائے کی پیالیاں تھامی ہوئی تھیں اور وہ میرے سامنے کھڑی سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کے آنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ سو اپنی غائب دماغی پر شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ وہ

مرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مزید بولی۔

''خاصے تھک گئے ہوں گے آپ؟''

''مجھے چھوڑو، اپنی سناؤ، تم اپنا دفتر دیکھنے گئی تھیں؟'' میں نے موضوع بدلتے ہوئے سوال کر دیا تو وہ چہک کر بولی۔

''اجی کیا بات ہے دفتر کی، ایک دم فائن، ہوسکتا ہے کہ اس سے بھی اچھے دفتر ہوں لیکن میں نے جیسا سوچا تھا، میرا دفتر ویسا ہی ہے۔''

''دفتر تو جم گیا مگر یہ تو بتاؤ کہ تم وہاں پر کرو گی کیا؟''

''میں۔۔۔!'' اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے کہا۔ ''بس دیکھئے گا، میں کیا کرتی ہوں۔ اگرچہ مجھے کوئی مہارت تو نہیں ہے لیکن میرے پاس حوصلہ ہے، کام کرنے کی لگن ہے۔'' کہتے ہوئے وہ یک دم خاموش ہوگئی، پھر میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''شجاع! ہمارے سماجی سیٹ اپ میں عورت کی اہمیت کتنی ہے، یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔ میرا عامر کے ساتھ کیا تعلق ہے، اس سے بھی آپ بخوبی واقف ہیں۔ یہ کوئی قابل فخر ناتا نہیں ہے۔ میرا رنگ روپ کب تک میرا ساتھ دے گا اور پھر عامر بھی یہ تعلق کب تک نبھائے گا؟ کوٹھے پر بیٹھنے والی طوائف کو تو پھر بھی آسرا ہوتا ہے۔ نائیکہ ہوتی ہے، دلال ہوتے ہیں۔ انہیں تحفظ حاصل ہوتا ہے لیکن میں تو کال گرل ہوں، ایک خزاں رسیدہ پتہ جسے۔۔۔ جسے۔۔۔'' اس سے آگے وہ کوئی لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ اس کا گلا رندھ گیا اور آنسو پلکوں سے ڈھلک گئے۔ کس قدر سچائی تھی اس کے لفظوں میں، ایک تلخ حقیقت اور کس بری طرح اس نے اپنے زخموں کو کرید ڈالا تھا۔ مجھے اس پر بے حد ترس آیا۔ میں چاہتا تو اسے دلاسا دے سکتا تھا مگر میں نے اسے رونے دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بہتے ہوئے آنسوؤں میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''عامر تو میرے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔ آج میں کچھ کر سکنے کی طاقت رکھتی ہوں، کل اگر یہ میرے پاس نہ ہوئی تو میں کیا کروں گی؟''

''نائلہ! میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں لیکن اتنا مایوس بھی نہیں ہوتے، تم تہی دست نہیں ہو، تمہارے ساتھ تمہارے دوست ہیں۔''

''اسی بات نے تو مجھے کچھ کرنے کی طاقت بخشی ہے۔ ورنہ آپ سے ملاقات ہونے سے قبل میں خود کو اپنے مستقبل میں ایک کال گرل ہی کی حیثیت سے دیکھ کر خوف زدہ ہوتی رہی تھی اور کچھ مجھے نظر ہی نہیں آتا تھا۔''

''نہیں، نائلہ! تم بہت اچھی لڑکی ہو، بہت مزے دار چائے بناتی ہو اور تم میں سب

سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دوستوں کے کہنے پر بغیر کچھ سوچے، آرام سے جا کر سو جاتی ہو۔‘‘ میرے یوں کہنے پر وہ بے اختیار مسکرا دی، دھوپ چھاؤں کا یہ منظر مجھے بہت اچھا لگا۔ تب وہ دھیرے سے بولی۔

’’مگر میں اپنا غبار نکالنے کے لیے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’تو کرونا، باتیں۔ روکا کس نے ہے؟‘‘ میں نے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہے۔ وہ اپنے ماضی کو کریدتی رہی کہ وہ کس طرح دنیا میں رہتی تھی اور اب کہاں پر ہے۔ وہ ایک نئی طرح کی زندگی میں داخل ہو رہی تھی. مستقبل میں کیا ہوگا، اس بارے وہ بڑی پر جوش تھی۔ نجانے کتنے وسوسے، خواہشیں، اندیشے اور امیدیں اس نے مجھ سے کہہ ڈالیں۔ میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس وقت ہم اٹھ گئے جب نیند سے میری آنکھیں بوجھل ہو کر بند ہونا شروع ہو گئیں۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو فریش تھا۔ رات نائلہ سے باتیں کرتے رہنے کی وجہ سے سوتے وقت ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا، شاید اسی لیے مجھے اچھی اور بھرپور نیند آئی تھی۔ ماریہ کی خودکشی کے باعث جو میرا دماغ پراگندہ ہو گیا تھا، اس کا اثر اب تک میرے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کوئی بڑی اہم شے گم ہو گئی ہو۔ کھو دینے کا احساس مجھے دکھی کر رہا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں بیڈ سے اُٹھ گیا۔ اس وقت ہم تیار ہو کر ناشتہ کر رہے تھے کہ عامر اور حسن ٹپک آگئے۔

’’بڑے انٹر کانٹی نینٹل مارکہ ناشتے چل رہا ہے ہیں۔‘‘ حسن میرے سامنے نائلہ کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا تو وہ ہنس دی۔

’’ہمارا رب بڑا پالن ہار ہے، وہ دے رہا ہے اور ہم کھا رہے۔ آپ بتائیں، آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟‘‘

’’بس چائے پلا دو، بیگم نے تو بھاری پراٹھوں سے ناشتہ کروایا ہے۔‘‘ حسن نے انڈا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

’’چائے تو مل جائے گی مگر تم دونوں اتنی صبح کیسے آگئے ہو؟‘‘ میں نے دھیرے سے پوچھا تو عامر نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے حیرت سے کہا۔

’’ماریہ کے جنازہ میں شرکت کرنے کے لیے، ہم نے سوچا، تمہیں بھی لیتے چلیں۔ ‘‘یہی وہ لمحات تھے جن سے میں کترا کر گزر جانا چاہتا تھا۔ مجھے اس کا جنازہ پڑھنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ وہاں ملک منیر گینگ کے لوگ ضرور ہوں گے اور ہم

بعید نہیں تھا کہ وہ میری راہ تک رہے ہوں۔ وہاں جتنا یہ امکان تھا کہ کچھ نہیں ہوگا، اتنا جواز یہ بھی تھا کہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں ان دونوں کو اس صورت حال کے بارے بتا نہیں سکتا تھا۔ وہ محض دنیا دکھاوے کے لیے جا رہے تھے۔ انہیں کوئی مجبوری نہیں تھی۔ حسن تو ماریہ کا کولیگ تھا، اس کا جنازے میں شرکت کرنا بنتا تھا۔ اس کے پاس جواز تھا مگر عامر! اس کا مقصد کیا ہوسکتا ہے، وہ کیوں جا رہا ہے؟ فوری طور پر مجھے سمجھ نہیں آئی کہ ان دونوں سے کیا کہوں۔

''کیا سوچنے لگے ہو؟''حسن نے پوری توجہ سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا تو میں چونک گیا۔ میں خاموش رہا تو اس نے مزید کہا۔'' شجاع! یہ نفرت اور عداوت بندے کے جیتے جی ہوتی ہے اور میرا خیال ہے کہ جو بندہ اس دنیا سے چلا جائے تو اس۔۔۔''

''بات یہ نہیں ہے، یار۔!''میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔''اصل میں ہم محض دنیا دکھاوے کے لیے جائیں گے اور یہ مجھ سے نہیں ہو پائے گا۔ تم لوگ اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ، ویسے بھی مجھے نائلہ کو اس کے دفتر چھوڑنا ہے۔''میں نے مزید بحث سے بچنے کے لیے یونہی بے مقصد سی دلیل کا بے جا سہارا لیا۔ میرا لہجہ انہیں بہت کچھ سمجھا گیا اس لیے انہوں نے مزید بات نہیں کی۔ اتنی دیر میں نائلہ نے دو کپ چائے بنا کر ان کے سامنے رکھ دی۔ چائے پی لینے تک ہم میں انجانی خاموشی چھائی رہی جیسے ہمارے پاس بات کرنے کے لیے کوئی موضوع نہ رہا ہو۔ میں نے کپ رکھا اور اٹھ گیا، وہ بھی میرے ساتھ اٹھ کر چل دیئے۔ دلدار برتن سمیٹنے لگا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ جانے تک ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی، ان کی خاموشی میرے لیے حیران کن تھی۔ وہ دونوں بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ نائلہ جب میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے لگی تو عامر نے کہا۔

''نائلہ! میں اور حسن رات کو کھانا ادھر ہی کھائیں گے، تھوڑا اہتمام کر لینا۔''یہ کہہ کر اس نے کار بڑھا لی۔ عامر کے یوں کہنے پر میں قدرے چونکا، کوئی بات تھی ضرور، ہوسکتا ہے کہ انہیں میرے اور آصف چوہدری کے تعلق بارے معلوم ہو گیا ہو اور اس باعث سب کچھ جان گئے ہوں۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر ذہن سے جھٹک دیا کہ جو بات بھی ہوگی دیکھا جائے گا۔ میں کافی دیر تک نائلہ کے دفتر میں بیٹھ کر وقت ضائع کرتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ دفتر کے لوگ ماریہ کے جنازے میں شرکت کے بعد ہی آئیں گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے یہ سوال کرے کہ میں اس کے جنازے میں شامل کیوں نہیں ہوا؟ خواہ مخواہ نظروں میں آنے والی بات تھی۔

میں آفس پہنچا تو بہت سارے لوگ آ چکے تھے اور ماحول پر عجیب طرح کا سناٹا طاری تھا۔ میں ہر طرف سے توجہ ہٹا کر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ دوپہر ہونے تک ماحول قدرے معمول پر آ گیا تھا، لوگ ماریہ کی خودکشی اور جنازے کے بارے میں باتیں کر کے تھک چکے تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور حسن کو ڈھونڈنے کی سوچنے لگا تا کہ پریس کلب میں جائیں۔ تبھی پیؤن نے معمول کی ڈاک میرے سامنے لا رکھی۔ ان میں سے کسی کوریئر سروس سے بھیجا گیا ایک لفافہ میری نظروں میں آیا جس پر ''خاص ذاتی'' لکھا ہوا تھا۔ انداز تحریر مانوس تھا، میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ لفافہ کھولا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میرے سامنے ماریہ کی تحریر تھی۔ تین صفحات پر مشتمل وہ خط تیزی سے لکھا گیا تھا۔ میں نے جلدی سے خط کے آخر میں نام دیکھا تو وہاں ''بدنصیب، ماریہ'' لکھا ہوا تھا۔ تب میں نے تپتے ہوئے دماغ کے ساتھ وہ خط پڑھا۔

''میرے نہ بننے والے، ظالم شخص! میں تمہیں کوئی دعا نہیں دوں گی اور نہ ہی تمہیں کوئی بددعا دے سکتی ہوں۔ میں کہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور اور بے بس عورت، میرا یہ خط تمہیں میری خودکشی کے بعد ملے گا۔ دنیا کے لبوں پر یہ سوال ہوگا کہ میں نے خودکشی کیوں کی لیکن تم جانتے ہو کہ میں خودکشی کرنے پر کیوں مجبور ہوگئی ہوں؟ تم، صرف تم نے مجبور کیا ہے مجھے، میرے لیے جینے کا کوئی جواز نہیں چھوڑا تم نے اور تم خود بتاؤ کہ میرے لیے مر جانے کے سوا کوئی اور آپشن تھا؟ میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے تم پر قاتلانہ حملے کروائے۔ ہاں، وہ سب میری وجہ سے ہوئے۔ میں نے اپنی دانست میں ملک منیر کو استعمال کرنا چاہا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے معاملے میں اس قدر جذباتی ہے۔ وہ میرا طلب گار تھا، نجانے کب سے اور میں تمہاری طرف سے کبھی بھی مایوس نہیں ہوئی۔ تم چاہے نہ مانو لیکن میں جانتی ہوں کہ میری محبت تمہارے دل میں موجود ہے۔ یہ محض میرا گمان نہیں، پورا یقین ہے۔ اسی یقین کے سہارے میں تمہاری راہ میں بار بار تمہارے سامنے آتی رہی۔ مگر تم نے ایک بار بھی مجھے اس قابل نہ سمجھا کہ ٹھیک طرح سے بات بھی کر لو۔ تم نے مجھے ہمیشہ دھتکارا مگر میں بے وقوف، اپنے ہی بنائے ہوئے کھوکھلے یقین کے سہارے تمہاری توجہ کی طلب گار رہی۔ کاش! تم میرا ہاتھ تھام لیتے اور صورت حال یوں خون آلود نہ ہوتی۔ تم پر قاتلانہ حملوں میں میرا کتنا ہاتھ تھا؟ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔ میں اپنی صفائیاں نہیں دوں گی کیونکہ جس وقت میرا یہ خط تم تک پہنچے گا، اس وقت تک میں تمہاری دنیا میں موجود نہیں ہوں گی۔ اس لیے میں تمہیں سچائی بتا دینا چاہتی ہوں۔ تمہارے اور میرے تعلق کی بابت ملک منیر کو بہت پہلے سے علم تھا، اس وقت سے

جب ہم میں خوشگوار تعلق تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا جذبات رکھتا ہے، نہ ہی اس کے بارے میں سوچا تھا۔ وہ اپنے دل کی بات مجھ سے نہ کہہ سکا، پھر تم نے مجھے دھتکار دیا۔ مجھے تم سے زیادہ اپنے آپ پر غصہ تھا۔ ان دنوں میری ذہنی حالت کیا تھی، اس کا شاید ہی تمہیں اندازہ ہو۔ مجھے سہارے کی ضرورت تھی۔ میں زخم زخم تھی، میں کرب کی اس حالت میں تھی جہاں میرے غم کا مداوا کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ملک منیر میرے لیے مرہم بن گیا، اس نے مجھے سنبھالا دیا لیکن تمہارے متعلق ہم میں کوئی بات نہ ہوتی۔ مجھے امید تھی کہ تم میری دنیا میں لوٹ آؤ گے۔ مگر میری یہ امید، میرے لیے حسرت بن گئی۔ ملک مجھ پر نوازشات کی بارش کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ مجھے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ بڑی آسانی سے میرا ہاتھ میرے والدین سے مانگ سکتا تھا۔ مگر وہ مجھے میری رضا سے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا تھا اور میں جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس کی خواہش سے نظریں چرا رہی تھی۔ مجھے تمہاری چاہ تھی۔ آخر ایک دن ملک کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، اس نے مجھ سے صاف اظہار کر دیا اور مجھ سے جواب مانگ لیا۔ میرے پاس نہ تو کوئی جواز تھا اور نہ ہی فرار کی کوئی راہ، اس نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر شجاع نے تمہیں دھتکار دیا ہے تو پھر بھی تم کیوں اس کی راہ تک رہی ہو؟ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں خاموش رہی، میری خاموشی کا اس نے بہت غلط مطلب لیا۔ اس نے اپنے طور پر مجھ سے بہت کچھ کہا اور خود ہی طے کرتا چلا گیا۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے اور میرے گھر والوں کے درمیان یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کر چکے ہیں، یہی غلط فہمی ہماری منگنی کا باعث بن گئی۔ اب میرا سب کچھ ملک منیر ہی تھا، میری زندگی اس کے ساتھ باندھ دی گئی اور وہ اپنے تحفظات کی خاطر نہ جانے کیا کچھ کرنے لگا۔ میں چکی کے دو پاٹوں میں پسنے لگی۔ میرا دل تمہارے لیے دھڑک رہا تھا اور ذہن ملک منیر کو قبول کر چکا تھا۔ میں پاگل کر دینے والی کشمکش میں آ پھنسی۔ پھر ایک دن اس نے تم پر حملہ کروایا، اس نے ایسا اس لیے کیا کہ تم خوف زدہ ہو کر شہر چھوڑ جاؤ۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم کیا ہو، یہ میں سمجھتی تھی۔ میں نے اسے باز رکھنا چاہا، اسے سمجھایا کہ ایسا نہ کرو مگر اس نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ وہ کسی بھی ایسے شخص کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتا جو کل ہم پر انگلی اٹھائے یا ہمیں بلیک میل کرتا پھرے۔ وہ ڈر کر شہر چھوڑ جاتا ہے تو اس کی قسمت ورنہ موت اس کا مقدر ہے۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں تمہیں صاف لفظوں میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی تھی اور میری شدت سے یہ خواہش تھی کہ چاہے تھوڑے عرصے کے لیے ہی سہی، تم منظر سے غائب ہو جاؤ۔ میں نے تم سے بڑا غلط رویہ اپنائے رکھا مجھے یقین تھا کہ تم مجھ سے اس بابت ضرور پوچھو گے۔ کوئی گلہ،

کوئی شکوہ، کوئی شکایت کرتے تو میں تمہیں بتا دیتی۔ مگر میرے گمان نے مجھے دھوکا دیا، وہ نہ ہو سکا جو میں چاہ رہی تھی۔ میں نے چاہا تھا کہ تمہارے منظر سے ہٹ جانے کے باعث ملک کو تھوڑا بہت پرسکون ہو جاتا، میں اس سے شادی کر لیتی۔ پھر میں اسے سمجھا سکتی تھی مگر میں فقط ایسا سوچ ہی سکی۔ میں نے کہا نا، کہ میرا ذہن ملک منیر کی طرف اور دل تمہاری جانب تھا۔ میں لاشعوری طور پر کسی معجزے کے انتظار میں رہی۔ تا کہ تم پگھل جاؤ مگر تم پتھر بنے رہے اور میں ہارتی چلی گئی۔ مجھے نہ ملک پر دسترس رہی، نہ تم پر۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حالات یوں بھی ہو جائیں گے۔ تم کیا سمجھتے ہو، جب تم پر قاتلانہ حملے ہوتے تھے تب میں اس کا درد محسوس نہیں کیا کرتی تھی؟ یقین جانو، جو گولی تم پر لگی تھی تو اس کا درد میں نے اپنے دل پر محسوس کیا تھا مگر میں بدنصیب تمہارے زخموں پر مرہم بھی نہ رکھ سکی، یہ اعزاز کوئی اور لے گیا۔ مجھ سا بدنصیب بھی کوئی ہوگا کہ جس نے جسے چاہا، اسی کی وجہ سے اس پر گولی چل گئی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور باوجود اس کے کہ تم میری روح تک میں سما گئے ہو، میں تمہارے لیے کچھ بھی نہ کر سکی۔ میں تڑپتی رہی مگر میری یہ تڑپ کسی کام نہ آسکی۔ میں نے ملک کو بہت سمجھایا تھا کہ چھوڑ دو اس قصے کو لیکن وہ ایسا ضدی تھا کہ میری ایک بھی بات نہ مانی اور تم نے بھی کون سا میری کوئی بات مانی۔ میں بدنصیب نہیں تو اور کیا ہوں۔ تم بھی مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگے۔ میں ملک کو لے کر دور دیس چلے جانے کو تیار تھی، تمہاری پوجا بھی کرنا چاہتی تھی مگر کچھ بھی تو نہ کر سکی۔ جس دن ملک غائب ہوا تھا، میں اسی دن سمجھ گئی تھی کہ اس کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ میں کیسی عورت ہوں جو کسی کو بھی نہ پا سکی۔ میں اس کی زندگی کے لیے بھیک مانگنے تمہارے پاس گئی۔ کاش! تم مجھے کچھ کہے بنا ہی واپس لوٹا دیتے مگر تم نے جو خنجر میرے دل کے آر پار کیے، وہ میری روح تک کو گھائل کر گئے ہیں۔ ایک ایک لفظ تیز کی مانند میرے ذہن میں اٹکا رہا۔ تمہارا کوئی دوش نہیں، میں خود ہی بے اہمیت ہو کر رہ گئی ہوں۔ میں تمہیں ذرا بھی قصور وار نہیں سمجھتی، نہ ہی سمجھ سکتی ہوں اور شاید میں نے یوں مرنے کا نہ سوچا ہوتا اگر تم مجھے طعنہ نہ دیتے۔ تم نے مجھے طعنہ ہی ایسا دے دیا تھا کہ میں خود سے سمجھوتہ نہیں کر پائی۔ شجاع! یقین کرو کہ میرا خون گندہ نہیں ہے۔ میں ساری زندگی تمہاری نفرت برداشت کر لیتی مگر اب میری موت تمہیں یقین دلا دے گی کہ میرا خون گندہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے، تم یہ جاننے کی کوشش کرو کہ میں نے خودکشی کا فیصلہ کیوں کیا۔ سنو، صرف اور صرف تمہارے اس طعنے کی وجہ سے۔ تم پریشان مت ہونا۔ تم سے متعلق میں نے ہر شے ضائع کر دی ہے۔ اس خط کے پوسٹ کر دینے کے بعد میرا اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ زہر پی لوں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں مر جاؤں گی، میں مر رہی ہوں اور پھر

مجھے مر ہی جانا چاہے ورنہ میں پوری زندگی لحہ لحہ مرتی رہوں گی ۔ شجاع! خدا کے لیے مجھے معاف کر دینا، مر جانے والوں کو معاف کر دینا چاہیے اور ہو سکے تو کبھی کبھی میری قبر پر آ جایا کرنا۔ شاید میری روح کو سکون مل جائے ۔ پلیز، مجھے معاف کر دینا۔''

''فقط، بدنصیب ماریہ''

''کس کا خط ہے۔؟ ''حسن کی آواز پر میں چونک گیا، یوں جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہوں ۔ پتہ نہیں وہ کب آ کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور یقیناً میں اس وقت اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پایا تھا۔ میرے چہرے کی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ میں کچھ بھی چھپا نہیں پایا تھا۔ میں نے حسن کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ انتہائی سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں کتنے ہی لمحوں تک اپنے حواسوں میں نہیں آسکا۔ جب مجھے صورت حال کا احساس ہوا تو میں نے کچھ کہے بغیر وہ خط حسن کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے غور سے میری طرف اور پھر خط کی طرف دیکھا۔ چند لمحے اسی جامد کیفیت میں گزر گئے ۔ پھر وہ خط پکڑتے ہوئے بولا۔

''میں نے پوچھا ہے، جان جی! یہ خط کس کا ہے؟''

''خود پڑھ لو۔'' مجھے اپنی آواز کہیں کنویں میں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی ۔حسن خط پڑھنے لگا اور میں سگریٹ سلگا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر بدلتے ہوئے رنگوں سے میں سمجھ گیا کہ اس خط میں حسن کے لیے کئی ایک انکشافات تھے، اس کے دماغ میں کیسے کیسے بھونچال آ چکے ہوں گے ۔ خط پڑھ لینے کے بعد اس نے وہ اوراق لفافے میں رکھ دیئے۔ اس کے چہرے پر سکون بھری کیفیت تھی بالکل طوفان آ جانے کے بعد خاموشی کی طرح ۔ہم میں کتنے ہی لمحوں تک خاموشی جامد رہی۔ تجسس بھی ایک غبارے کی مانند ہوتا ہے، آگہی کی سوئی جب اس میں لگ جائے تو ساری ہوا نکل جاتی ہے۔

''مجھے شک تھا کہ تم میں اور ماریہ میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ کیا ہے اور کس نوعیت کا، یہ تو میں نہیں جانتا تھا۔ اس خط سے تو اس تعلق کی شدت بھی سمجھ میں آ گئی ہے، تفصیل شام کے وقت سہی۔ حسن نے لفافہ میری جانب اچھالتے ہوئے کہا۔ ''صبح میں اور عامر جان بوجھ کر تمہاری طرف گئے تھے، ہم تمہارا ردعمل دیکھنا چاہ رہے تھے مگر اب تمہیں خود ہی ساری کہانی سنا دینی چاہیے......''

''حسن! یہ ایک لمبی کہانی ہے اور اس میں اتنا دلچسپ پہلو بھی نہیں، میں سب کچھ کہہ دوں گا تا کہ ماریہ سے متعلق باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ میں اسے یاد بھی نہیں

کرنا چاہتا۔"

"میری جان! آج رات تمہارے نام، اس وقت تو اٹھو۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو میں نے ماریہ کا خط سنبھالا، باقی خطوط دراز میں دھرے اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسلسل کر اٹھ گیا۔

شام ڈھلے میں گھر پہنچا تو نائلہ کچن میں مصروف تھی۔ مسز خان کفگیر سے پتیلے کے ساتھ نبرد آزما تھیں۔ میں مختلف کھانوں کی خوشبو سے خوشگوار احساس کے ساتھ کچن کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟" نائلہ نے حیرت بھری مسکراہٹ سے کہا۔

"انقلاب زمانہ دیکھ رہا ہوں۔" میں نے بھی مصنوعی حیرت سے کہا تو مسز خان بولیں۔

"بیٹا! تمہارے لیے تو یہ حیرانگی والی بات ہی ہوگی مگر یہ مجھ سے بہت ساری ڈشیز بنانا سیکھ گئی ہے اور وہ بھی چپکے چپکے، میرا تو خیال ہے، یہ بڑا پیارا انقلاب ہے۔" ان کے لہجہ میں چاہت بھری ہوئی تھی۔

"بالکل، مسز خان! مجھے بہت خوشی ہوئی۔" میں نے متاثر ہوتے ہوئے کہا تو جھٹ سے نائلہ بولی۔

"آپ چلیں، میں دلدار کے ہاتھوں چائے بھجوا دیتی ہوں، ایویں نظر نہ لگا دیں۔"

"ٹھیک ہے، جناب۔۔۔" میں سعادت مندی سے کہتے ہوئے مڑ گیا تو پشت سے ان دونوں کا قہقہہ سنائی دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ خوشیاں کہیں سے لائی نہیں جاتیں، خود اپنے آپ پیدا کی جاسکتی ہیں اور شرط محض خلوص کی ہے۔ صرف خونی رشتے ہی تو زندگی میں خوشگواریت بھرنے کا باعث نہیں بنتے۔ کچھ خلوص بھرے تعلق ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے زندگی کی خوبصورتیاں پاؤں میں آپڑتی ہیں اور میں کتنا خوش قسمت تھا کہ ایسے تعلق مجھے میسر تھے۔

نائلہ نے ڈنر پر خاصا اہتمام کرلیا تھا، مسز خان فیملی بھی ہمارے ہاں مدعو تھی۔ نائلہ یہ شلوار سوٹ میں بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی شہابی رنگت مومی شمعوں کی جلتی ہوئی روشنی میں بڑی خوابناک لگ رہی تھی۔ عامر نظروں ہی نظروں میں اس پر فدا ہو رہا تھا مگر حسن خلاف توقع خاموش تھا۔ بڑے خوشگوار ماحول میں کھانا ختم ہوا تو مسز خان فیملی چلے گئی۔ ہم ڈرائنگ روم میں آبیٹھے تو عامر نے کہا۔

"نائلہ! تم آج بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔"

''میری جان! وہ خوبصورت ہے، اس لیے خوبصورت لگ رہی ہے۔ اب اگر تم تعریف کر کے اسے خوش کرنا چاہتے ہو تو الگ بات ہے۔'' حسن نے ہنستے ہوئے کہا تو عام سی باتوں سے ہوتی ہوئی بات اچانک اس جگہ آ پہنچی جس کے لیے وہ لوگ اہتمام سے آئے ہوئے تھے۔ تب میں نے دھیرے سے کہا۔

''آپ میرے دوست ہو، مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب باتیں اپنے تک ہی رکھیں۔ صورت حال ایسی نہ ہوتی جیسی اب ہے تو شاید میں اسے کبھی نہ کہتا۔'' میں یہ کہہ کر سانس لینے کے لیے رکا۔ وہ سب میری طرف متوجہ تھے، وہ خاموش رہے تو میں نے کہا۔ ''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں یونیورسٹی نہیں گیا تھا۔ بی اے کا امتحان دے کر فراغت تھی۔ میرے سونے، پڑھنے اور آوارہ گردی کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ میں ان دنوں فکشن پڑھا کرتا تھا چاہے وہ انگریزی زبان میں مل جاتا یا اردو میں۔ ایسے ہی ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں بھی کوئی کہانی لکھ سکتا ہوں۔ اس خیال نے جان نہ چھوڑی تو میں نے کوشش کی اور ایک کہانی لکھ لی۔ لکھنے کا یہ تجربہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ اس سے جو لذت مجھے ملی، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں اپنے اس نئے تجربہ سے دوسروں کو متعارف کرانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے دوستوں کو وہ کہانی دکھائی، انھوں نے پسند کی اور مشورہ بھی دیا کہ میں اسے کہیں شائع کراؤں۔ فیصلہ ایک ڈائجسٹ رسالے کے حق میں ہوا، کہانی بھجوا دی گئی اور وہ شائع بھی ہوگئی۔ ایک فتح مندی کا احساس میرے اندر در آیا۔ یہ ایک نئی طرح کی لذت تھی جس سے میں آشنا ہوا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔''
یہ کہہ کر میں ذرا ٹھہرا تو حسن بولا۔

''میرا خیال ہے، تم نے تعلیم یہیں لاہور ہی کے ایک کالج سے حاصل کی تھی؟''

''ہاں، یہیں لاہور ہی میں پڑھا تھا لیکن کہانی، میں نے تب لکھی تھی جب میں اپنے آبائی قصبے میں فراغت کے دن گزار رہا تھا''

''اچھا، پھر؟'' عامر بولا۔

''نئی سے نئی کہانی کی تلاش میں لوگوں سے ملنا میرا مشغلہ بن گیا۔ میں یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے لاہور آنا گیا۔ انہیں میری لاہور کی سرگرمیوں کے بارے میں بھنک مل گئی تھی۔ بہر حال نئی دوستیاں، نیا ماحول تھا۔ میرا جی تو نہیں لگتا تھا۔ میں چونکہ کہانی لکھنے کے باعث ایک نئی دنیا سے متعارف ہو چکا تھا اس لیے تنہائی کی لذت بھی مجھ پر آشکار ہوگئی اس لیے میں اپنی ذات میں ہی کھو گیا''

''اس میں ماریہ کہاں ہے؟'' حسن نے بے صبرے پن سے کہا۔

''وہ بھی آئے گی لیکن تھوڑا صبر۔۔۔بات اگر پورے پس منظر میں سُنی ہے تو مجھے کہنے دو ورنہ چند فقروں میں بھی بات ختم ہو سکتی ہے۔''

''تم کہو، یار!''

''یونیورسٹی دور میں ہی لوگ مجھے اکثر دو حوالوں سے ملتے تھے۔ ایک وہ جن سے مجھے کہانی ملتی تھی اور دوسرے وہ جو میری کہانیاں پڑھتے تھے۔''

''خود کو ہیرو محسوس کرتے ہوں گے آپ؟'' نائلہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہیرو تو خیر نہیں، ایک انفرادیت کا احساس ضرور ہوتا تھا، میں فائنل پیپرز دے کر اپنے آبائی قصبے میں آ گیا۔ انہی دنوں مجھے ایک فون ملا۔ وہ لڑکی میری کہانیاں پڑھتی تھی۔ میں بتاؤں کہ میرا قصبہ اتنا بڑا نہیں ہے، لوگ زیادہ تر ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس لڑکی کا میرے متعلق معلوم کر لینا مشکل نہیں تھا۔ اس نے مجھے میری ہی کہانیوں پر بات کر کے حیران کر دیا، ایسی باتیں جن کا ادراک مجھے بھی نہیں تھا۔ پہلی بار میرے دل میں خواہش ابھری کہ وہ باتیں کرتی رہے اور میں سنتا رہوں پھر جب بھی اسے وقت ملتا، مجھے فون کر لیتی۔ بات کہانیوں کے دائرے سے نکل کر زندگی کے مختلف حوالوں تک پہنچی۔ میں حیران تھا کہ وہ کیسی لڑکی ہے جو میرے قصبے میں موجود ہے اور لٹریچر کے بارے میں اتنی رسائی رکھتی ہے؟ وہ محض بی ایس سی ہی کر پائی تھی، مزید وہ اپنے طور پر گھر میں ہی تیاری کر رہی تھی۔ وہ ایک روایت پسند مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا باپ تاجر تھا اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی، آمنہ اس کا نام تھا۔ میری اس سے دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ میں نے اسے دیکھا تک نہیں تھا لیکن بات روزانہ ہو جانے کے باعث میں اس کی سانسیں تک پہچاننے لگا۔ ہمارے درمیان دوستی کا مقدس رشتہ استوار ہو گیا۔ میں نے کبھی بھی اس سے دو بدو ملاقات کے لیے نہیں کہا اور نہ کبھی اس نے خواہش کی۔''

''جان جی! اس میں ماریہ کدھر ہے؟'' حسن نے اکتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بس تھوڑا سا صبر اور، آ گے آ رہی ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کب؟'' وہ چڑ چڑے انداز میں بولا۔

''سنتے رہو۔'' میں نے اسی کے انداز میں کہا اور بات شروع کر دی۔ ''آمنہ سے میرا تعلق بہت الگ نوعیت کا تھا۔ ایسے ہی ایک دن اس نے مجھ سے اگلے دن کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا تو مجھے احساس ہوا جیسے وہ میرے گھر آنا چاہتی ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ مصروفیت نہیں ہے۔ تو اس نے مجھے سارا دن گھر پر رہنے کو کہا۔ اگلے دن سہ پہر کے

وقت اس نے فون کر کے تصدیق کی کہ میں گھر پر ہوں اور پھر اگلے چند منٹ میں وہ میرے سامنے تھی۔ وہ میرے ہی محلے میں اپنی ایک سہیلی کے گھر آئی، وہاں آ کر اس نے فون کیا۔ وہ میرے لیے بڑا سارا کیک اور تحفہ لائی تو مجھے یاد آیا کہ اس دن میری سالگرہ تھی۔ اس نے مجھے حیران کر دیا۔ نجانے کب اس نے مجھ سے میری تاریخ پیدائش پوچھ لی تھی۔ وہ دو تین گھنٹے بیٹھ کر چلی گئی۔ اس کی شخصیت میں اتنا اعتماد تھا کہ میرے گھر والوں کو وہ بہت اچھی لگی۔ اس کی باتیں، اس کا انداز اور اس کی شخصیت سب مل کر اسے متاثر کن شخصیت بنا گئے تھے۔ اس رات اس نے فون پر باتیں کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ مجھے ملنے کی خواہش پوری کرتے ہوئے اس نے ان لمحوں کو یادگار بنا کر مجھے سرپرائز دیا۔''

''وہ خوبصورت تھی۔ میرا مطلب ہے، وہ کیسی تھی؟'' عامر نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں، اسے اس کے مطلب کی چیز بتاؤ۔'' حسن جھٹ بولا۔

''نہیں، وہ ایسی خوبصورت نہیں تھی کہ اسے اپسرا یا ایسی ہی کسی تشبیہ سے نوازا جائے۔ وہ پتلی سی، سانولی سی اور قبول صورت لڑکی تھی مگر اس کا من خوبصورت تھا۔ جس نے مجھے متاثر کیا۔ میرے گھر والوں سے تو وہ متعارف تھی مگر ہمارے تعلق کے بارے میں اس کے گھر والے لاعلم تھے۔ وہ شاید بتا دیتی لیکن ایک تو اس کا گھرانہ روایت پسند تھا، ان کے ہاں برادری ازم کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ شروع ہی سے لاشعوری طور پر ہم میں یہ طے پا گیا تھا کہ ہم کچھ بھی کر لیں، اپنی عزت اور اہمیت کو نہیں گھٹائیں گے چاہے ہمیں ایک دوسرے سے اجنبی ہی کیوں نا ہونا پڑے اور شادی کا بندھن تو بہت دور کی بات تھی۔ ہم دونوں اسی میں خوش تھے اور ہمارے درمیان ایک مقدس جذبہ پروان چڑھتا گیا۔ پھر میں لاہور آ گیا۔ یہاں آتے ہی مجھے ایک اخبار میں جاب مل گئی، یوں میں عملی زندگی میں آ گیا۔ اخباری مصروفیات کے ساتھ کہانیاں بھی چلتی رہیں۔ میں جب بھی اپنے آبائی گاؤں جاتا تو آمنہ سے ملاقات ہو جاتی یا فون پر ایک لمبی گفتگو ہوتی اور حسن! اب ماریہ آ رہی ہے۔''

''شکر ہے، جان جی!'' اس نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''میں ایک معروف ڈائجسٹ میں لکھتا تھا، اسی میں ماریہ بھی کہانیاں لکھتی تھی۔ ایک دوسرے کا نام جاننے کے سوا ہم میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہماری ملاقات ڈائجسٹ کے صفحات پر بکھرے ہوئے لفظوں ہی سے ہوتی رہی، جیسے سب قارئین کی ہوتی ہے۔ ماریہ یہیں لاہور کی رہنے والی تھی۔ وہ مجھے میرے قصبے کے حوالے ہی سے جانتی تھی۔ میں نے کسی کو بتایا ہی نہیں تھا کہ میں لاہور میں ہوں اور ایک اخبار میں جاب کرتا ہوں۔ پھر ایک بار ہوا یوں کہ اس نے

میری کہانی پر تنقید کر ڈالی۔ وہ سراسر بے جا اور فضول تنقید تھی جس میں نہ کوئی منطق تھی اور نہ ہی دلیل ، مجھے فطری طور پر برا لگا۔ جائز تبصرہ تو حوصلہ افزائی کا باعث بنتا ہے مگر تضحیک آمیز تنقید برداشت سے باہر تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں اس کی احمقانہ حرکت پر جواب ہی نہ دیتا، نظر انداز کر جاتا مگر میں نے ڈائجسٹ والوں کی وساطت سے ایک ذاتی نوعیت کا خط لکھا جس میں بہت مناسب اور معقول لفظوں میں اسے احساس دلایا۔ اس نے فوراً ہی جواب میں معذرت کی اور ہم میں خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلا۔ بہت عرصے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس کی بے جا تنقید کا مقصد ہی یہی تھا کہ مجھ سے رابطہ ہو جائے۔''

''وہ یہاں لاہور ہی کے ایڈریس پر تمہیں خط لکھتی تھی؟'' عامر نے پوچھا۔

''نہیں، اپنے قارئین یا ماریہ سے جو رابطہ بھی تھا، وہ میرے آبائی قصبے کے ایڈریس سے ہی ہوتا تھا۔ میں گھر جاتا تو ڈاک دیکھ لیتا۔ یہاں لاہور میں میرا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں تھا ۔ بہر حال، اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا اور تقریباً ایک سال بیت گیا۔ لکھنے لکھانے کا اسے شوق تھا اس لیے یونیورسٹی میں آتے ہی اس نے ایک انگریزی اخبار جوائن کر لیا جو ہفت روزہ تھا۔''

''آپ دونوں یا محض آپ کے دل میں ماریہ سے ملنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی؟'' نائلہ نے پوچھا۔

''اس نے نجانے مجھے کتنی بار لاہور آنے کے بارے میں لکھا، ایک بار تو اس نے ہوٹل میں میری رزرویشن بھی کروا دی تھی۔ میرے بھی دل میں اس سے ملنے کی خواہش تھی لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا؟'' عامر نے پوچھا۔

''میں نے اس سے متعلق معلومات لے لیں تھیں۔ اس کا باپ اچھا خاصا بزنس مین تھا، دولت کی ریل پیل تھی اور ان کے رہنے سہنے کا انداز بہت مختلف تھا۔ اس میں اگرچہ یہ آسانی تھی کہ میں بلا روک ٹوک اس سے مل سکتا تھا، ان کے تعلقات استعمال کر سکتا تھا۔ ماریہ جیسی لڑکی کی وساطت سے بڑے فائدے حاصل کر سکتا تھا۔ بلاشبہ وہ خاصی دولت مند لڑکی تھی لیکن اپنی انا پسند طبیعت کو یہ گوارا ہی نہیں تھا۔ میں نے اسے دیکھا بھی تھا۔ آپ نے بھی دیکھا تھا اسے، وہ خوبصورت اور پرکشش تھی۔''

''بات سمجھ میں یہ نہیں آئی کہ تم اس سے ملنے سے کیوں کتراتے رہے؟'' حسن نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''وہ جو ایک معیار ہوتا ہے ذہن میں ایک عورت کے بارے میں یا کسی لڑکی کے

بارے میں، ماریہ میرے اس معیار پر پوری نہیں اتری تھی۔ خط و کتابت کی حد تک یا ڈائجسٹ کے صفحات کی نسبت سے کوئی نہ کوئی ناتا افورڈ کیا جاسکتا تھا لیکن اس سے آگے کا تعلق نہ تو میں افورڈ کرنے کی سوچ رکھتا تھا اور نہ ہی عقل اس بات کی اجازت دے رہی تھی سو میں نے اسے خط و کتابت تک محدود رکھا اور اس کا علم ہم دونوں کے سوا کسی کو نہیں تھا۔'' میں سانس لینے کو رکا تو نائلہ نے دلدار سے کافی لانے کے لیے کہا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''پھر ایک دن روٹری کلب والوں کی آواری میں گٹ ٹو گیدر تھی، میں وہاں رپورٹنگ کے لیے گیا تو ماریہ بھی اپنے اخبار کی طرف سے آئی ہوئی تھی۔ اسے چہرہ شناسی نہیں تھی سو ہم دو اڑھائی گھنٹے قریب رہ کر گزارنے کے باوجود اجنبی رہے۔ اس دوران میں نے اس کا رویہ دیکھا، انتہائی آزاد خیال اور الٹرا ماڈرن لڑکی تھی۔ وہ اپنے طور پر ٹھیک تھی لیکن میرے جیسے پینڈو بندے کے معیار پر پوری نہ اتری۔ وہ اپنے ماحول میں نارمل تھی لیکن میں نے کہا نا، کہ ایک معیار ہوتا ہے ذہن میں اور ماریہ اس سے بالکل مختلف تھی۔ آواری میں اس کا کوئی خوشگوار تاثر مجھ پر نہیں پڑا۔ اس اجنبی ملاقات کے بعد میں نے بھی اپنا رویہ بدلیا، خط و کتابت کم کر دی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ آخر کار سلسلہ ختم ہو جائے گا یک دم خط بند کیے تو بہانے تراشنے پڑیں گے۔ میری سرد مہری بڑھتی گئی مگر اس کا اثر الٹ ہوا۔ اس کے خطوں میں تیزی آتی گئی اور ساتھ میں وہ سرد مہری کی وجہ بھی پوچھتی رہی۔ پھر میں نے اسے لکھ دیا کہ میں اسے لڑکی سمجھ کر دوستی نبھائے جا رہا ہوں، ہوسکتا ہے کہ کل کوئی لڑکا مجھ سے آن ملے اور بڑے شوق اور چاؤ سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہے کہ مجھ سے ملیں، میں ہوں ماریہ! پھر میرے پاس سوائے ندامت اور افسوس کے کچھ نہیں ہوگا۔ اس خط کا جواب بہت خوفناک قسم کا آیا۔ اس نے لکھا کہ میں نے اس کی نسوانیت کی توہین کی ہے اس ضمن میں ایک لمبا چوڑا لیکچر تھا جس میں میری مردانگی کو للکارتے ہوئے تضحیک کی گئی تھی۔ وہ خط پڑھ کر مجھے بہت غصہ آیا، تاہم میں نے اس لیے برداشت کر لیا کہ اس بہانے جان چھوٹی۔ میرے خط نہ لکھنے پر کچھ عرصہ تعطل رہا۔ پھر اس کی طرف سے خطوط کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔''

''یہ سلسلہ کب تک رہا؟'' حسن نے دھیرے سے پوچھا۔

''یہی کوئی دو سال، اس دوران اس کی یہ خواہش بڑھ گئی کہ میں اس سے ملوں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی، مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ میں اس سے کتراتا رہا۔ پھر اس نے مجھے لکھا کہ وہ ہمارا اخبار جوائن کرنے جا رہی ہے سو میرے پاس کترانے کا کوئی جواز نہ بچا، جلد یا بدیر معلوم ہو جانا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ سو میں نے اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم ایک جائنٹ

ریسٹورنٹ میں ملے۔ وہ اپنی گاڑی میں آئی تھی جبکہ میں ان دنوں بائیک پر تھا۔ ہمارا آمنا سامنا ہوا۔ مجھے یہ پورا ادراک ہے کہ مجھ پر نظر پڑتے ہی خواتین کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا تاثر ابھرتا ہے، ان کی آنکھ کے تاثر ہی سے مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح کی خواتین ہیں۔ ماریہ کی آنکھ میں بھی وہی تاثر واضح طور پر میں نے دیکھا اور کھانے کا تو بہانہ تھا۔ کافی دیر تک گپ شپ ہوئی۔ پھر ہم میں اک سلسلہ چل نکلا۔ طویل ملاقاتیں، لمبی بحثیں، تحائف، سیر سپاٹے اور فون کالیں، کوشش کر کے وہ میرے اخبار میں ہی آ گئی، تب ہر وقت کا ساتھ بن گیا۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں ہوا، کب اس کے دل میں میرے ساتھ شادی کرنے کا ارمان اٹھا تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ ایک دوست اور کولیگ کی حیثیت سے ٹریٹ کیا مگر اس کا انداز نظر بدل چکا تھا۔ اس نے مجھے ایک شوہر کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا۔''

''شاید یہ سلسلہ دراز رہتا مگر ایک بار اس نے میرا آبائی گھر دیکھنے کی خواہش کی۔ وہ مجھے اپنے گھر والوں سے متعارف کرا چکی تھی اور مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن مجھے یہی فکر تھی کہ اس کے گھر والے کیا سوچیں گے جب وہ دو چار دن میرے ساتھ رہے گی؟''

''کیا آپ کے گھر والوں کے نزدیک یوں ٹھیک تھا؟'' نائلہ بولی۔

''میرے لیے بھی اعتراض کی گنجائش تھی مگر میرے گھر والوں کو میری ذات پر اعتماد تھا، خصوصاً میرے ابو کو اور پھر میں اسے اپنے گھر لے کر جا رہا تھا، کسی پکنک سپاٹ پر نہیں۔''

''شجاع! ذرا ٹھہرو'' عامر نے مزید کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ سمجھاؤ تمہیں یہ کیسے احساس ہوا کہ اس کے دل میں تمہارے ساتھ شادی کرنے کی خواہش موجود تھی؟'' اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''اس کی باتوں سے، اس کے سٹائل سے، مستقبل کی پلاننگ کا جب وہ اظہار کرتی اور عامر! کچھ باتیں محسوس کرنے کی بھی تو ہوتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا، وہ تمہارے آبائی قصبہ گئی تو پھر؟'' حسن نے سوچتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اس کی آمد پر میرے گھر والوں نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا، یوں جیسے عام سی بات ہو، تاہم اسے اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ایک دن اور ایک رات وہ بہت خوش رہی۔ اب ایسا تو ممکن نہیں تھا کہ میں قصبے جاؤں اور اپنے دوستوں سے بھی نہ ملوں۔ اگلے دن میں اپنے دوستوں سے ملنے چلا گیا، رات گئے لوٹا تو وہ انتہائی بوریت محسوس کر رہی تھی۔ مطلب یہ کہ میرے گھر والوں کے ساتھ اس کی کوئی ذہنی مطابقت نہیں تھی۔ اگلے دن ابھی میں سویا ہوا

تھا کہ آمنہ کا فون آ گیا۔ وہ بہت خوش ہو رہی تھی کہ میرے ساتھ کوئی ساتھی کولیگ بھی آئی ہے۔ وہ مذاق کرتے ہوئے پوچھنے لگی کہ کہیں شادی کا ارادہ تو نہیں؟ یوں کافی دیر تک باتیں چلتی رہی، پھر اسی سہ پہر وہ آ گئی۔ اس ملاقات کے نتیجے میں ماریہ نے اسی رات واپس جانے کا پروگرام بنالیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ماریہ بہت زیادہ آمنہ سے حاسد ہو گئی ہے۔ لاہور واپسی پر میں نے پوری شدت سے محسوس کیا کہ کاش! میں اسے آبائی گھر نہ لے جاتا اور اگر چلی بھی گئی تھی تو آمنہ سے ملاقات نہ ہوتی۔ ماریہ نے مجھے راجہ اندر کا خطاب دے ڈال، اس کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔''

''مثلاً کیا؟'' نائلہ نے پوچھا۔

''وہ میرے کردار کے مثبت پہلو کو محض ڈرامہ اور ملمع کہنے لگی۔ خواہ مخواہ میری ذات پر کیچڑ اچھالتی، آمنہ کو برا بھلا کہتی۔ میرے گھر والوں کے رویئے میں کیڑے نکالتی۔ اصل میں وہ شدید حسد کے باعث اپنے طور پر ہی اوٹ پٹانگ سوچتی، اپنے طور پر نتیجہ اخذ کرتی اور پھر اسی نتیجے کے حق میں جھوٹ سچ قسم کے دلائل دینا شروع کر دیتی۔ اس نے مجھے ذہنی طور پر زچ کر کے رکھ دیا۔ وہ جیسا آمنہ کے بارے میں سوچتی، مجھے اس کی گھٹیا سوچ بہت بری لگتی۔ میں ماریہ سے کہیں بہتر آمنہ کی ذات سے واقف تھا، اسے سمجھتا تھا۔ وہ اس کی ذات پر گندے الزامات لگا کر وہ باتیں بھی کہہ جاتی جو کبھی سوچی بھی نہیں جا سکتی تھیں جس سے مجھے غصہ آ جاتا۔ کبھی کبھی وہ سب کچھ معاف کر کے میرے ساتھ شادی کی منصوبہ بندی کرنے لگی، آمنہ سے میرے تعلق کو بھول جانے کی بابت کہتی۔ میں حیران تھا کہ وہ آمنہ ہی کو اتنی اہمیت کیوں دیتی ہے؟ وہ میری ایک اچھی دوست تھی مگر ماریہ اس تعلق کو سمجھنا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔ قصہ کوتاہ، میں نے ماریہ سے قطع تعلق کا فیصلہ کر لیا اور تب اس کا جو روپ میرے سامنے آیا وہ انتہائی بھیانک اور کریہہ تھا۔''

''ایسا کیا کر دیا اس نے؟'' عامر نے حیرت سے پوچھا۔

''تم پہلے اس کی اور آمنہ کی ذہنیت کا فرق سمجھ لو۔ وہ جب مل بیٹھی تھیں، تب باتوں کے دوران آمنہ کی کزن نے سوال کر دیا کہ عورت کی زندگی میں شادی کے بعد کیا انقلاب آتا ہے؟ اس پر آمنہ نے کہا کہ شادی کے بعد عورت کے پاؤں تلے جنت آ جاتی ہے اور ماریہ کا کہنا یہ تھا کہ عورت کی زندگی بکھر جاتی ہے۔''

''اوہو، کس قدر بوگس تھی یہ، ماریہ۔'' نائلہ نے تڑپ کر کہا تو میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"ماریہ جاتے ہوئے آمنہ کا فون نمبر لے گئی اور اسے فون کرنے لگی، میرے اور آمنہ کے متعلق بارے بے ہودہ بکواس کرتی رہی۔ اگرچہ اس کے والدین سمجھ دار تھے مگر گھر کے سارے افراد تو برداشت نہیں کرتے۔ آمنہ پر عتاب نازل ہوگیا۔ وہی آمنہ جوان کے لیے لاڈلی اور پیاری تھی، ایک دم ہی اچھوت کی حیثیت اختیار کر گئی۔ انہی کے خاندان کا ایک لڑکا جعفر، پرلے درجے کا لوفر اور آوارہ گرد آمنہ کے پلے باندھ دیا گیا۔ وہ آمنہ جس کی ذات کی قسم میں دے سکتا تھا۔ جو اتنی پیاری تھی کہ جسے سنبھال کر رکھا جاتا۔ وہ سسکتی رہی، تڑپتی رہی مگر اف تک نہیں کی۔ وہ ماریہ کی گندی سوچ کی بھینٹ چڑھ گئی۔"

"او، میرے خدا" نائلہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پھر دھیرے سے افسوس زدہ لہجے میں بولی۔ "اب کیا حال ہے آمنہ کا؟" اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا دلدار کافی لے آیا۔ میں نے سپ لیتے ہوئے کہا۔

"میں اس کے حال سے بے خبر تو نہیں رہ سکتا تھا۔ جیسے خوشبو اپنا آپ منوا لیتی ہے، آمنہ نے اپنی اچھی سوچ کے ساتھ جعفر کو بدل کر رکھ دیا۔ پہلے اس نے جعفر کے ظلم سہے۔ اا کماتا کچھ نہیں تھا، بس ماں باپ کے ٹکڑوں پر تھا۔ یہ آمنہ کی خوبصورت اور اچھی ذہنیت کا کمال تھا کہ جعفر برطانیہ چلا گیا اور آمنہ نے سکول کھول لیا۔ میں لاہور میں تھا لیکن میرے آبائی قصبے میں بچپن کا دوست حیدر شیخ در پردہ اس کی مدد کرتا رہا۔ اس نے کیا کچھ اور کیسے کیا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ بہر حال حیدر کا مجھ پر احسان ہے وہ پھر دوبئی چلا گیا۔ مجھے آمنہ کی خیریت معلوم ہوتی رہتی۔ تقریباً چھ ماہ پہلے وہ بھی برطانیہ چلی گئی ہے۔ ماریہ کی بے ہودہ بکواس نے اس کی زندگی کے قیمتی سال زہر آلود کر دیئے اس لیے مجھے اس سے شدید نفرت ہوئی اور میں نے اسے دھتکار دیا۔"

"دھتکارنے کے باوجود بھی وہ کیوں تمہارے لیے سر پٹختی رہی؟" عامر نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے بہت کوشش کی کہ میں اس کے ساتھ شادی کر لوں۔ اس کے لیے لڑکوں کی کمی تو نہیں تھی۔ امیر گھر کی تھی، جاب محض شوقیہ کر رہی تھی۔ مجھے بزنس کا لالچ دیا۔ میری چھوٹی بڑی خواہش پر قربان ہونے کے لیے تیار رہتی مگر میں نے اسے قریب اس لیے نہیں آنے دیا کہ میں اس کی ذہنیت سمجھ گیا تھا اور وہ اس کو اپنی ہار محسوس کر رہی تھی۔ اس کے دل میں میرے لیے محبت نہیں تھی بلکہ مجھے جیت لینے کی خواہش تھی۔ وہ مجھے جیت کر اپنی انا کی تسکین چاہتی تھی۔ پھر جو کچھ بھی ہوا، وہ آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ وہ اپنے اندر کے زہر سے خود

ختم ہوگئی۔"

"تو یہ تھی ماریہ کی کہانی، ویسے مجھے افسوس ہوا۔" عامر نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"اور میں اب ماریہ کا ذکر سننا بھی پسند نہیں کروں گا۔" میں نے کہا تو حسن گھڑی دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔

"او کے، باس! ہم تو چلے۔ اب جا کر بیگم رانی کی ڈانٹ سنیں، عامر صاحب تو شاید یہاں رکیں گے۔" اس نے گاڑی کی چابی جیب سے نکالی اور چل دیا۔

میں اس شام ایک سیاستدان کا انٹرویو، کاغذ پر منتقل کر رہا تھا کہ ندیم آکر بڑے اطمینان سے میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میری توجہ بٹ گئی، میں نے اس سے پوچھا۔

"خیریت، میری جان! یوں تہہ در تہہ میرے سامنے بیٹھ رہے ہو؟"

"بس ایسے ہی، آپ کے پاس بیٹھے ہوئے کافی دن ہوگئے، دل چاہ رہا تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا ہو رہا ہے آج کل؟" میں نے یونہی بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔

"خاصے رنگین دن گزر رہے ہیں، بس آپ کی مہربانی ہے ورنہ ہم کیا اور ہماری بساط کیا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر بولا۔ "آپ کبھی زارا کو فون ہی کر لیا کریں۔"

"مطلب، کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟"

"وہ بڑی پریشان ہے، شکوہ کر رہی تھی کہ آپ۔۔۔"

"پریشان کس لیے ہے وہ؟"

"وہ، تنویر کاظمی اس کا پتہ صاف کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اس سے فلم چھن گئی ہے، اس کی جگہ نئی لڑکی فرح کو سائن کر لیا گیا ہے۔ پھر ایک طائفہ جا رہا تھا برطانیہ، سب ٹھیک تھا لیکن عین وقت پر اس کے پروڈیوسر نے اس کا نام نکال دیا ہے اور یہ سب وہی تنویر کاظمی کر رہا ہے۔"

"تمہیں پورا یقین ہے کہ یہ سب وہی کر رہا ہے؟"

"بالکل، آف دی سکرین بہت ساری وجوہ ہیں، آپ زارا کو فون کر لیں، وہ آپ کو بہتر انداز میں بتا سکے گی۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اگر اسے میری مدد چاہیئے تو وہ خود مجھے کم از کم فون کر سکتی تھی۔" میں نے ندیم کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، وہ فون کر لے گی۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ زارا سے میری اس

معاملے میں یونہی سرسری سی بات ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں تمہارے لیے کچھ کرتا ہوں لیکن اس نے انتہائی جذباتی انداز میں مجھے منع کر دیا تھا۔ تب میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے معاملات بہتر طور پر حل کر سکتی ہے اور اب معاملہ سنجیدہ ہو جانے پر بھی اس نے فون نہیں کیا تھا۔ میں نے زارا کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

''تم زیادہ ہی غائب نہیں رہنے لگ گئے ہو؟''

''کہانا، آپ ہی کی مہربانی سے بے حد مصروفیت ہوگئی ہے۔'' اس نے شوخ انداز میں کہا۔ ''آج مجھے تھوڑی فرصت تھی، اس لیے آگیا۔ کوئی خدمت ہو تو حکم کریں، ویسے ایک بات ہے۔''

''کیا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''تنویر کاظمی کی کامیابی بہر حال مجھے اچھی نہیں لگ رہی۔'' اس کا لہجہ انتہائی سنجیدہ تھا۔ میں ایک لحہ کو چونکا اور اسے غور سے دیکھا۔ ندیم پوری طرح شوبز میں خود کو مصروف کر چکا تھا اور اب اندر کے معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگا تھا۔ اس کے معاملے میں میرا خیال تھا کہ اگر اسے ذرا سا سہارا دے دیا جائے تو وہ تیزی سے ترقی کر سکتا ہے، میرا خیال ٹھیک نکلا تھا۔ اب اس کے لہجے میں وہ احتجاجی انداز بھی نہیں رہا تھا۔ جو محض اندر ہی اندر سلگتے رہنے سے اس کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ بڑے بڑے باصلاحیت لوگ صرف اسی وجہ سے رُل جاتے ہیں کہ انہیں انگلی پکڑ کر چلانے والا کوئی نہیں ملتا یا پھر ان کے لیے ترقی کے دروازے بند ہو جائیں تو ان کے لیے لڑنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ندیم اب کامیاب صحافی کے طور پر نہ صرف محنت کر رہا تھا بلکہ آگے بڑھنے کا بھرپور جذبہ رکھتا تھا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''اصل میں اس کا طریقہ واردات غلط ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شوبز کی دنیا میں کہاں کہاں گہرائیاں اور اندھیرے ہیں۔ تنویر کاظمی ایسے فلمی پنڈت یونہی اپنی من مانی نہیں کر سکتے۔ یہ یقیناً ایسی طاقت میں ہوتے ہیں جس سے وہ فلمی دنیا پر حکمرانی کر سکنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ صرف دو چیزیں ہی اس دنیا میں حکمرانی کا باعث بن سکتی ہیں، دولت یا پھر طاقت۔ تنویر کاظمی جیسے لوگ اگر چہ دولت ہی سے حکمرانی کرتے ہیں، وہ دولت جو بذات خود ایک نشہ ہے لیکن طاقت کا حصول اور اس کا استعمال اس سے بھی بڑھ کر نشہ ہے۔ ایسے لوگوں کی اصل طاقت کیا ہے، یہ اگر آپ جان جائیں تو کبھی کچھ سمجھ میں نہ آجائے۔''

''تم ایک چیز کو بھول رہے ہو، وہ ہے ذہانت۔''

''یہی میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ دولت اور طاقت میرے پاس نہیں ہے اور ذہانت کا مجھے نہیں پتہ مگر آپ سے مشورہ کر کے میں کوئی راہ نکالنا چاہتا ہوں۔''

''تمہارا کام ہو جائے گا مگر اس معاملے میں میرا نام نہیں آنا چاہیے۔ اگر تم کوئی کریڈیٹ لینا بھی چاہو تو اپنے تک ہی محدود رکھنا۔''

''ٹھیک ہے، میں اب مطمئن ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پرسکون ہو گیا اور میں انٹرویو لکھنے لگا۔ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھا رہا، پھر خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے وہ انٹرویو مکمل کیا اور پھر مطمئن ہو کر صادق گجر کو فون کیا۔ اس کا نمبر میرے پاس محفوظ تھا۔ وہ مجھے میری آواز سے نہیں بلکہ میرے نام سے پہچان گیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے دوبارہ معذرت کی۔

''سوری جی، میں آپ کو فوراً نہیں پہچان سکا، آپ حکم کیجیے؟''

''یار! یہ بتاؤ، تنویر کاظمی کیسا بندہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایسا ہی جیسے اس قسم کے بھڑوے ہوتے ہیں۔'' جواب میں وہ بولا۔

''وہ آج کل جس لڑکی کو پرموٹ کر رہا ہے، وہ۔۔۔؟''

''او، سر جی! اصل کام بتائیں۔ ایسی کئی آتی جاتی رہتی ہیں۔''

''میرے بات سمجھنے کی کوشش کرو، میرے دوست! وہ لڑکی جس فلم میں کام کر رہی ہے، میں اس کے فلم ساز سے ملنا چاہتا ہوں۔ کون ہے وہ؟''

''اپنا ہی بندہ ہے، کیوں، خیریت؟''

''بالکل خیریت ہے، بس ایک چھوٹا سا کام ہے۔''

''آپ حکم دیں، کام ہو جائے گا۔''

''وہ تو مجھے یقین ہے کہ کام ہو جائے گا لیکن میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، کیوں ملنا چاہتا ہوں، یہ ملاقات پر تفصیل سے معلوم ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں اس سے رابطہ کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔''

''او کے، ملتے ہیں پھر۔'' یہ کہہ کر الوداعی باتوں کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

اگلی شام میگزین کے آخری صفحات پریس میں چھپ رہے تھے اور میری مصروفیت ختم ہو چکی تھی۔ اس وقت میں میگزین سرسری نظر سے دیکھ رہا تھا کہ صادق گجر کا فون آ گیا۔ اس نے فلم ساز سے ملاقات کا اہتمام کر دیا تھا، اب یہ مجھ پر منحصر تھا کہ کہاں مل بیٹھیں؟ میں سٹوڈیو

قطعاً نہیں جانا چاہتا تھا سو میں نے انہیں آواری میں ڈنر پر بلا لیا، پھر وقت طے کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں معمول کے مطابق گھر پہنچا تو نائلہ آچکی تھی اور تھکی تھکی سی صوفے پر ڈھیر ہوئی بیٹھی تھی۔

''بہت تھک گئی ہو؟'' میں نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، تھک تو گئی ہوں لیکن یہ تھکن بڑی سکون بخش ہے۔ ایسی ہی تھکن کے لیے میں ہمیشہ خواہش مند رہی ہوں۔' اس نے مسکراتے ہوئے کہا، تھکے ہوئے چہرے پر خوشگوار مسکان لیے نائلہ اس لمحہ مجھے بہت پیاری لگی۔

''بہت خوب، ایسے ہی محنت کرنے والے لوگ ترقی کرتے ہیں۔''

''شجاع! اب میں کوئی مادی ترقی نہیں چاہتی۔ بس میری روح کو چین آجائے، میرا ضمیر مطمئن ہو جائے یہی کافی ہے۔'' وہ اداسی کے حصار میں کہتی چلی گئی۔

''ہاں۔! انسان دولت کے پیچھے بھاگتا ہے، مادی وسائل کی جوڑ جمع میں وہ اپنے آپ سے بچھڑ جاتا ہے۔ ان تلخ حقیقتوں کو ایک طرف رکھو۔ اگر خود میں ہمت باقی ہو تو فوراً تیار ہو جاؤ۔ ڈنر کے لیے چلیں گے۔''

''ارے، شجاع صاحب! خیریت، ایسی زبردست آفر کس خوشی میں؟'' وہ یہ کہتے ہوئے اس نے یکدم ہی اداسی کے حصار کو توڑ دیا۔

''آج ویک اینڈ ہے اور صبح میری آف ہے، اسی خوشی میں۔'' میں نے کہا تو وہ ہنس دی۔

''چلیں جی، ٹھیک ہے۔ کب تک تیار ہو جاؤں؟'' اس نے شوخی سے پوچھا۔

''کیا مطلب، تمہارے تیار ہونے میں ایک گھنٹہ چاہیے؟'' میرے اس طرح کہنے پر اس نے جاندار قہقہہ لگایا اور اٹھ گئی۔

ہم ٹھیک وقت پر آواری پہنچ گئے، لابی ہی سے ڈائننگ ہال میں بیٹھا صادق گجر مجھے آگیا۔ وہ اپنے سامنے بیٹھے ایک لحیم شحیم سے بندے کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ وہ دونوں بڑے تپاک سے ملے، عمومی باتوں کے دوران کھانے کا کہہ دیا اور پھر خوشگوار ماحول میں فلم ساز نے پوچھا۔

''بڑی خوشی کی بات ہے جی کہ آپ سے ملاقات ہوئی، حکم کریں؟'' اس نے مسکراتی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے وہ پہلی نظر میں ہی گھاگ لگا تھا اور ایسے لوگوں کو محض اپنے مفاد سے غرض ہوتی ہے، وہ اپنے غرض کی زبان سمجھتے ہیں اور اسی میں

بات کرتے ہیں۔

''میں تمہید وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتا، سیدھے سیدھے وہ وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں جس کے باعث آپ نے زارا کو اپنی فلم سے الگ کر دیا حالانکہ وہ شہرت یافتہ تھی اور اس کے مقابلے میں بالکل نئی لڑکی۔۔۔

'' یہ آپ اپنے لیے پوچھنا چاہ رہے ہیں یا زارا نے آپ سے کہا،؟'' اس کے لہجہ میں تجسس تھا۔

''آپ دونوں باتیں ہی سمجھ لیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ محتاط انداز میں بولا۔

''بات یوں ہے کہ فلم کے حساب سے ہدایت کار کی ڈیمانڈ کے مطابق تو زارا ہی موزوں ہے، میں بھی یہی چاہتا ہوں کیونکہ میں تو فلم کی کامیابی چاہوں گا لیکن درمیان میں بہت سارے معاملات ایسے آگئے ہیں۔ جن کی وجہ سے میں مجبور ہوگیا ہوں۔ اس میں زارا کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' اس کا جواب گول مول سا تھا۔

''میں درمیان والی وجہ ہی تو معلوم کرنا چاہ رہا ہوں۔'' میں نے سیدھے ہی بات کہہ دی۔

''دیکھیں، بہت سارے معاملات ہوتے ہیں کہ جن کے بارے میں بندہ مجبور ہو جاتا ہے۔'' وہ اب بھی گریز کر رہا تھا کہ صادق گجر نے کہا۔

''آپ کہہ دیں، وہ کیا مجبوریاں ہے۔ شجاع صاحب بڑے سمجھ دار اور گل بات والے بندے ہیں۔'' صادق گجر کے یوں کہنے پر وہ چند لمحے سوچتا رہا اور پھر اس نے ایک ایسے سیاست دان کا نام بتایا جو اس وقت حکومت میں تھا۔ فرحان علی ایک ایسا ادھیڑ عمر سیاست دان تھا جس کی عوام میں خاصی مقبولیت تھی۔ اس کا تعلق ایک روایتی جاگیر دار خاندان سے تھا۔ میں اس سے کبھی نہیں ملا تھا لیکن خبروں کے حوالے سے اس کے بارے میں میرا ذاتی تاثر کسی بھی طرح خصوصی نوعیت کا نہیں تھا۔ چونکہ اس کی جاگیر میں قومی اسمبلی کا پورا ایک حلقہ سما جاتا تھا اس لیے ہر الیکشن میں اس کا رکن اسمبلی ہونا لازمی تھا۔ اس وقت وہ حکمران پارٹی میں وزارت بھی رکھتا تھا، یہ سب کچھ میں نے لمحوں میں سوچا اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

''جناب! اگر یہ مجبوری درمیان سے ہٹ جائے تو؟''

''مجھے زارا کو فلم دینے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن میرا مطلب، یوں اگر کسی غلط طرح براہ راست انہیں معلوم ہو جائے کہ بات کھل گئی ہے تو خاصی مشکلات پیدا ہو جائیں گی میرے لیے۔ آپ سمجھیں، میرا مطلب تنویر کاظمی۔۔۔'' فلم ساز اچھی خاصی پریشانی میں بے

ربط سی بات کہتے کہتے خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔

’’دیکھیں، آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں۔ میں خودنہیں چاہتا کہ میرا نام سامنے آئے تو میں آپ کی ذات پر کوئی حرف کیسے آنے دوں گا؟ اصل میں مجھے ان فلمی پنڈتوں پر اعتراض اس لیے ہے کہ وہ غلط طریقے سے جگہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے اس چھین جھپٹ پر اعتراض ہے۔‘‘ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

’’جی، بالکل، انہی کی وجہ سے میں بہت ڈسٹرب ہو گیا ہوں، میرا نقصان ہو گیا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ نئی لڑکی کے باعث فلم کامیاب نہیں ہوگی تو وہ کیا بزنس کرے گی؟‘‘ وہ پریشانی میں پھٹ پڑا۔

’’ان کی بات نہ ماننے پر آخر کیا ہو جائے گا، کیوں مجبور ہیں آپ؟‘‘ میں نے تلخی سے کہا۔

’’سو طرح کی باتیں ہیں جی، میرا صرف فلم بنانا ہی تو بزنس نہیں ہے۔ میرے دوسرے کاروبار متاثر ہو سکتے ہیں۔ کسی بھی حکومتی شعبہ کو میرے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے، صرف ایک ٹیکس والے ہی پیچھے پڑ جائیں تو سارا کام ہی ٹھپ ہو کر رہ جائے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟‘‘ اس نے کچھ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہنے کی کوشش کی۔ میں سمجھتا تھا کہ محض فلم سازی کے لیے خالصتاً سرمایہ کاری نہیں ہو رہی تھی بلکہ بہت سارا کالا روپیہ، سفید کرنے کی غرض سے فلم بنائی جا رہی تھی۔ چونکہ یہ لوگ بھی خود چور تھے اس لیے اپنی ہی کمزوریوں کے باعث طاقت ور لوگوں کے ہاتھوں بلیک میل ہو گئے تھے۔

’’فرحان علی اتنا مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ آپ اطمینان رکھیں، معاملہ افہام و تفہیم ہی سے حل ہو جائے گا اور آپ کا نام کہیں بھی نہیں آئے گا۔ جن تحفظات کی آپ کو فکر ہے، میں انہیں سمجھتا ہوں اور ان کا خیال رکھوں گا۔‘‘

’’بہت شکریہ، میرا بھرپور تعاون آپ کے ساتھ ہے۔‘‘ اس نے مشروط سے لہجے میں کہا تو صادق گجر نے نائلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’آپ نے ان کا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے فلم ساز سے ہونے والی بات گویا ختم کر دی تھی۔ مجھے صادق گجر کی ذہانت کا معترف ہونا پڑا، تب میں مسکراتے ہوئے کہا۔

’’ آپ نائلہ ہیں، بزنس وومن ہیں اور حال ہی میں انہوں نے امپورٹ ایکسپورٹ کا نیا پراجیکٹ شروع کیا ہے۔ میرے بہترین دوستوں میں سے ایک ہیں۔‘‘ میرے

کہنے پر وہ قدرے حیرت سے بولا۔

''اجی واہ، میں تو سمجھا تھا کہ ان کا تعلق شوبز سے ہے اور یقین جانیں، اگر یہ شوبز میں جائیں تو۔۔۔''

''تو انتہائی کامیاب رہوں گی، یہی کہنا چاہ رہے تھے نا، آپ؟'' نائلہ نے مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

''یقیناً، آپ کی تو آواز بھی بہت شاندار ہے۔'' اور لوگوں کی طرح وہ بھی اس کی آواز کا معترف ہو گیا تھا۔

''جی، ایسا ہی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میری آواز، میرا چہرہ شوبز کے لیے موزوں ہے مگر کیا کروں، یہ شوبز اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمیں تو اپنا بزنس ہی ٹھیک ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میں اپنے شعبے میں ٹھیک ہوں۔'' نائلہ نے بڑے اعتماد سے کہا، اس کے انداز سے اس کی بدلی ہوئی سوچ واضح ہو رہی تھی۔ پھر کھانا آ جانے تک بزنس، سیاست اور شوبز سے متعلق باتیں چلتی رہیں۔ خوشگوار ماحول میں کھانا ختم ہوا تو چلتے ہوئے فلم ساز نے مجھے ایک بار پھر سے یاد دلا دیا کہ میں اس کے تحفظات کا خیال رکھوں۔ میں نے اسے پھر سے مطمئن کر دیا۔ میں نے فلم ساز سے تو کہہ دیا تھا کہ فرحان علی مشکل ثابت نہیں ہوگا لیکن میرے لیے وہ انتہائی مشکل ثابت ہونے والا تھا۔ میرا ایک مجبوری تو یہ تھی کہ میں سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ دوسرا اس قصے میں مرکزی حیثیت ایک ایسی عورت کی تھی جو صرف عیاشی کا سامان بنتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مردوں کے اس معاشرے میں عورت مجبور محض ہے لیکن عورت نے بھی اپنا آپ منوانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ نسوانی حقوق کی کوئی آواز بلند ہوئی بھی ہے تو وہ عورتیں مغربی سوچوں سے اپنے ذہن آلودہ کیے ہوئے ہیں۔ وہی مغربی سوچ جس نے مغربی عورت کی زندگی سے لے کر معاشرے تک میں بے حسی، بے غیرتی اور گھٹیا رویئے جیسا زہر بھر دیا ہے۔ عورت کا تقدس کہاں ہے؟ اسی تقدس کی کھوج ہی عورت کو مقدس بنا دیتی ہے۔ فرحان علی اس تعلق کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ یہاں تک کہ تنویر کاظمی جیسے لوگوں سے تعلق پر لاعلمی کا اظہار کر دینا اس کی مجبوری تھا۔ پھر صحافی لوگوں کے سامنے ایسے تعلق کا اظہار گویا اپنی ظاہری نیک نامی گروی رکھ دینے والی بات تھی۔ میرے نزدیک اس کے فقط دو حل تھے۔ کسی تیسرے شخص سے کام نکالا جائے اور دوسرا سیدھے سیدھے لڑائی۔ شروعات الزام تراشی سے ہو کر انجام وقت اور حالات پر منحصر تھا۔ پہلی صورت میں بہر حال فلم ساز کے تحفظات بھی محل نظر تھے۔ حسن ہی فرحان علی کی پارٹی کے بارے میں رپورٹنگ کرتا تھا، وہ بڑی آسانی اور سہولت سے بات کر سکتا

تھا اور پھر جس طرح میں سوچ رہا تھا، اسی طرح وہ میرے بڑے کام آسکتا تھا۔

اگلی دوپہر میں نے حسن سے پوری تفصیل سے بات کی۔ سارا معاملہ سن لینے کے بعد اس نے چند لمحے سوچا اور پھر بولا۔

''یہ کام اتنا مشکل نہیں ہے۔ وہ لاہور بہت کم آتا ہے، اس کے لاہور آنے کا انتظار کیا جائے یا پھر اسلام آباد جا کر بات کرلیں لیکن تم فکر نہ کرو۔ یہ بہر حال ہو جائے گا۔''

''ایک بات اور ہے، حسن!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کہو۔'' وہ پوری توجہ سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیوں نہ پہلے کسی غیر صحافی کے ذریعے یہ بات اس تک پہنچا دی جائے؟''

''مطلب، ذرا کھل کر کہو؟''

''مطلب، لاہور میں بھی اس کے ایسے قریبی تعلق دار ضرور ہوں گے جن سے ہمارا بھی بڑا اچھا تعلق ہو سکتا ہے۔ پہلے اس کے ذریعے بات کرتے ہیں۔ مان گیا تو ٹھیک، دوسری صورت میں ہم اس سے براہ راست بات کرلیں گے ورنہ۔۔۔'' میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''لگتا ہے، تم نے اسے انا کا مسئلہ بنا لیا ہے؟''

''بات انا کے مسئلہ کی نہیں، اپنے یار کی ہے۔ ندیم اپنا یار ہے۔ وہ جو صحیح سمجھتا ہے، وہی ٹھیک ہے۔ مجھے زارا سے کوئی غرض نہیں، ہمیں ندیم کا خیال رکھنا ہے۔''

''اچھا، بابا کل شام تک کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔'' حسن نے اطمینان دلایا تو مجھے پورا یقین ہو گیا کہ اس مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔

اس رات میں اور نائلہ کھانا کھا چکے تھے۔ دلدار ہمیں چائے دے کر کچن میں مصروف تھا۔ ہم ٹی وی ڈرامے میں محو تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے بے خیالی میں فون پش کر کے کان سے لگا۔

''حیدر شیخ بات کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے مخصوص لہجے میں کہا گیا۔

''اوئے تم، خیریت سے ہو؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''بالکل خیریت سے ہوں۔ میں نے ابھی دفتر فون کیا تو پتہ چلا کہ صاحب گھر پر ہیں۔ لگتا ہے، خاصی ترقیاں ہو گئی ہیں۔''

''ہے تو ایسا ہی، تم سناؤ، کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے یونہی بات بڑھانے کے لئے پوچھا۔

''میں کل آرہا ہوں پاکستان، پہلے تمہارے پاس لاہور ہی آؤں گا۔ میں یہاں سے

چھ بجے کے قریب نکلوں گا۔ میرا مطلب، دبئی کے چھ بجے۔" اس نے فلائٹ کا نمبر اور وقت بتاتے ہوئے کہا۔ "یہ رات تمہارے پاس رہ کر اگلی صبح گھر جاؤں گا۔ اب تم آ جانا ائیر پورٹ، میں تمہاری راہ ہی نہ دیکھتا رہوں۔"

"پہنچ جاؤں گا، یار! وقت پر ائیر پورٹ پہنچوں گا۔"

"تو ٹھیک ہے، پھر کل ان شا اللہ ملاقات ہوگی، اللہ حافظ!" اس نے فون بند کر دیا تو میں نے بھی فون ایک طرف رکھ دیا، تبھی نائلہ نے تجسس سے پوچھا۔

"کون تھے اور ائیر پورٹ؟"

"میرا دوست، میرا لنگوٹیا حیدر شیخ کل آ رہا ہے دبئی سے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے خود محسوس کیا کہ میرے لہجے میں پیار سمٹ آیا ہے، شاید نائلہ نے بھی محسوس کیا تبھی بولی۔

"لگتا ہے، بہت گہری دوستی ہے۔"

"ہاں، بہت اور پھر آمنہ کے معاملے میں اس کا احسان مند بھی تو ہوں۔"

"وہ سیدھے آپ کے پاس آئیں گے تو رہیں گے بھی چند دن۔۔۔؟"

"وہ ہمیشہ پہلے میرے پاس آتا ہے، پھر اگلے دن قصبے جاتا ہے، کل آفس سے جلدی آ جاؤں گا۔ اکٹھے ہی چلیں گے۔"

"ظاہر ہے، کھانے پر بھی تھوڑا اہتمام کرنا ہوگا۔"

"تھوڑا نہیں، بہت زیادہ، دوستوں سے بھی کہہ دینا۔" میں نے خوشی سے کہا تو نائلہ ہنستے ہوئے بولی۔

"او کے، سر! ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئی اور میں حیدر شیخ کے بارے میں سوچتا ہوا آمنہ کے خیالوں میں کھو گیا۔

اگلی دوپہر میں دفتر میں اپنے کولیگ سے گپ شپ کر رہا تھا کہ حسن آ گیا۔ وہ میرے پاس بیٹھا تو کولیگ اٹھ گیا، تب اس نے کہا۔

"فرحان علی کے تعلق داروں میں چند نام سامنے آئے ہیں۔"

"کون کون ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"کئی نام ہیں اور ان میں چند ایک سے اپنا بھی یارانہ ہے لیکن ایک نام ایسا ہے جسے سن کر تم بھی چونک اٹھو گے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"کون سا نام ایسا ہے؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"بیگم شہوانی۔" حسن انکشافانہ انداز میں بولا۔

''فرحان علی سے اس کا تعلق یا نوعیت کا پتہ چلا؟'' میں نے کریدا۔
''نوعیت کا مجھے نہیں پتہ لیکن بڑا پرانا تعلق ہے، وہ اس سے کھل کر بات بھی کر سکتی ہے۔'' حسن نے کہا تو میں نے جیب سے فون نکالتے ہوئے کہا۔
''میں ابھی اس سے وقت طے کر لیتا ہوں، پھر ملاقات پر تفصیل سے بات ہو جائے گی۔''
''جیسے تمہاری مرضی۔'' حسن نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ میں نے نمبر ملائے اور چند لمحوں میں رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف بیگم شہوانی ٹھٹھری ہوئی ''ہیلو'' سنائی دی۔
''میں شجاع بات کر رہا ہوں۔''
''ارے تم، میرے چاکلیٹ صحافی! بڑے عرصے بعد فون کیا؟''
''آپ کو بھی پتہ ہے، ہمارا کام کیسا ہے۔ مصروفیت در مصروفیت، اب جبکہ میں آپ سے آج شام ہی ملنا چاہتا تھا لیکن ایسی مجبوری آن پڑی کہ کل ہی آپ سے مل پاؤں گا۔''
''خیریت، شجاع؟''
''بالکل خیریت ہے، بس ایک چھوٹی سی سفارش کرانا تھی۔ وہ میں آپ کو ملاقات پر ہی بتاؤں گا۔''
''چلو، ٹھیک ہے لیکن آنے سے پہلے فون ضرور کر لینا۔''
''بالکل، تو پھر کل۔۔۔''
''اوکے، میں انتظار کروں گی۔'' اس نے کہا! پھر فون بند کر دیا۔ حسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے، جان جی! اب رات کھانے پر ہی ملاقات ہو گی۔''
''نائلہ نے بتا دیا تمہیں؟''
''ابھی کچھ دیر پہلے فون کیا تھا اس نے۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔
اس شام میں ذرا وقت سے پہلے ہی دفتر سے نکل آیا مجھے حیدر شیخ کو ائیر پورٹ سے لینا تھا۔ میں نائلہ کو لے کر گھر جانے کی بجائے سیدھا ائیر پورٹ کی طرف چل دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ گاڑی کھڑی کر کے ہم عمارت کے اندر چلے گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ نائلہ ضرورت سے زیادہ خاموش ہے۔ میں نے یونہی پوچھ لیا۔
''اتنی خاموش کیوں ہو؟''
''سوچ رہی ہوں کہ کسی قدر منافقت میں لتھڑا ہوا لہجہ ہوتا ہے لوگوں کا، شجاع! زندگی

میں آنے والوں لوگ بڑے عجیب عجیب ہوتے ہیں۔‘‘
’’تم اتنے وثوق سے لوگوں کا تجزیہ کیسے کرسکتی ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’مجھے نہیں معلوم، کیوں ایسا لگا ہے مگر میرا وجدان مجھے دھوکہ نہیں دیتا۔ آپ کا مجھے نہیں پتہ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ اب آپ کو ہر معاملے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔‘‘
’’وہ تو ٹھیک ہے، نائلہ! مگر ہمیں انہی لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے زندگی گذارنی ہے۔‘‘ میں نے اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ چپ رہی، شاید کچھ سوچ رہی تھی۔ تب میں نے پوچھا، ’’ویسے تم آج اتنی ڈسٹرب کیوں ہو؟‘‘ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، میں سامنے سے آنے والے ایک شناسا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ وہیں ایئر پورٹ پر ایوی ایشن میں آفیسر تھا، گرم جوشی سے ملنے کے بعد وہ ہمیں اپنے آفس لے گیا پھر گپ شپ میں احساس ہی نہ ہوا کہ کب فلائٹ آئی اور مسافر آنا شروع ہوگئے۔ ہم جلدی میں اس کے آفس سے نکلے تو حیدر ریئخ متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچ کر بغل گیر ہوگیا، علیک سلیک کے بعد وہ بولا۔
’’پہلے سے کہیں زیادہ سوبر، سوبر نہیں ہوگئے ہو تم؟‘‘ لہجے میں شرارت تھی۔
’’اور تم موٹے ہونے کے ساتھ بدمعاش ہوگئے ہو۔‘‘ میں نے کہا اور پھر نائلہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ’’نائلہ، میری بہت اچھی دوست۔‘‘
’’فقط اچھی ہی نہیں، بہت پیاری دوست ہیں۔ خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔‘‘ اس نے سر کو ہلکے سے خم دیتے ہوئے کہا تو اس نے بھی رسمی جملوں کا تبادلہ کیا اور گاڑی لانے کا کہہ کر چل دی۔

’’کہاں ہے تمہارا سامان؟‘‘
’’یہ ایک بیگ اور یہ ایک ہلکا سا سوٹ کیس، میں کون سا مہینوں رہنے آیا ہوں، زیادہ سے زیادہ تین ہفتے اور اس میں پورا ایک ہفتہ تمہارے پاس رہوں گا واپسی پر۔‘‘ اس نے خوش دلی سے کہا۔
’’خوش قسمتی ہے ہماری۔‘‘ میں نے کہا اور پھر باتوں میں مشغول ہوگئے۔ نائلہ گاڑی لے آئی تو ہم نے سامان رکھا اور گھر آگئے۔ ہمارے گھر پہنچنے تک مسز خان کچن میں مصروف تھیں اور دلدار ان کی مدد کے لیے موجود تھا۔ عامر کا فون آیا تھا کہ وہ حسن کے ساتھ آرہا ہے۔ انہیں ابھی تک ندیم دستیاب نہیں ہوسکا تھا۔ دلدار نے سامان میرے کمرے میں رکھا اور حیدر فریش ہونے چل دیا۔ اس شام میں خوش تھا کہ میرے اردگرد میرے ڈھیر سارے دوست

موجود ہیں۔ کافی دیر بعد جب عامر اور حسن آئے تو ندیم کے ساتھ زارا بھی تھی۔

''یہ ندیم کہاں گم تھا۔؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''میں زارا کے ساتھ تھا اس کے گھر میں، کچھ دیر پہلے میں نے دفتر فون کیا تو پتہ چلا۔'' پھر خوشگوار سے انداز میں بولا۔ ''دیکھیں، ہمارے ساتھ رنگینی بھی کھنچتی ہوئی آ گئی ہے زارا کی صورت میں۔''

''افرا تفری میں اسے کال کرنے کا یاد ہی نہیں رہا۔'' میں نے زارا کا دل رکھتے ہوئے کہا۔

''چلیں، جناب! کسی بہانے سے ہماری آپ سے ملاقات تو ہو گئی۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

''اچھی خاصی رونق ہے، جان جی؟'' حسن نے اِدھر اُدھر دیکھا تو حیدر شیخ میرے کمرے سے باہر آیا۔ پھر تعارف کا مرحلہ طے ہوتا چلا گیا۔ ہم اس وقت تک باتیں کرتے رہے جب تک نائلہ نے کھانا میز پر نہیں لگوا دیا جبکہ زارا ہمارے درمیان ہی بیٹھی رہی۔ انتہائی خوشگوار فضا میں ڈنر ختم ہوا تو ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ماحول میں بے تکلفی در آئی تھی۔ کچھ دیر بعد دلدار چائے دینے آیا تو اس کے پیچھے نائلہ تھی۔ چائے پیتے ہوئے حیدر شیخ نے کہا۔

''مجھے آپ سب سے مل کر دلی خوشی ہوئی ہے اور خدارا، اسے محض رسمی جملہ مت سمجھیے گا۔ شجاع سے میری دوستی اس وقت سے ہے جب ہم سکول میں پڑھتے تھے۔ یہ مجھے اچھی طرح سمجھتا ہے اور میں اسے، اس ناتے آپ بھی میرے دوست ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے خالی کپ رکھا اور سگریٹ سلگا لیا، پھر ایک لمبا کش لے کر بولا۔ ''میں نے چاہا تھا کہ میں اس بار پاکستان آنے کا مقصد شجاع سے اکیلے میں کہوں گا لیکن اس کے لیے آپ سب کا خلوص اور دوستی دیکھ کر میرا جی چاہ رہا ہے کہ وہ سب کچھ ابھی سے کہہ دوں۔''

''کیا یہ اتنا ہی اہم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، بہت ہی اہم، دوسری بات یہ ہے کہ آپ میری بہت زیادہ مدد کر سکیں گے۔''

''جان جی! پہیلیاں ہی ڈالتے رہو گے یا بات بھی کرو گے؟'' حسن نے بے تکلفی سے کہا تو سبھی ہنس دیئے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، میری بات پہیلی ہی کی مانند لگے گی آپ کو۔ ایسا اس لیے ہے کہ جب تک میں اس کا پس منظر نہ کہہ دوں، آپ سمجھ نہ سکیں گے۔'' حیدر نے یہ کہہ کر کش لیا تو عامر بولا۔

''شجاع اور آپ میں ایک بات مشترک ہے کہ پس منظر بڑا بیان کرتے ہیں۔''
''اچھی بات ہے نا، تاکہ بات پوری طرح سمجھ میں آجائے۔'' میں جلدی سے بولا۔
''چلیں جی، حیدر صاحب! آپ کہیں۔'' عامر نے گویا اجازت دے دی۔ دلدار برتن اٹھا کر لے گیا تو وہ بولا۔
''میں چار سال قبل دوبئی گیا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی سمجھئے کہ میرا کفیل بہت اچھا آدمی ہے۔ میں نے وہاں سیلز مین کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ میں نے بھرپور محنت کی یا میں ماحول کو جلدی سمجھ گیا، بہر حال میں ٹھیک ٹھاک کمانے لگا۔ مجھے اپنا پیسہ پاکستان بھجوانے کی مجبوری نہیں تھی، الحمد اللہ سب کھاتے کماتے ہیں۔ میرا اپنے کفیل کے ساتھ اچھا تعلق بڑھتا گیا۔ میں نے وہاں اپنا بزنس بھی شروع کر لیا۔ اب پچھلے تین ماہ سے میرے کفیل نے ایک نیا کاروبار تقریباً شروع کر ہی دیا ہے۔ اس کا اپنا ہوٹل ہے درمیانے درجے کا، اس نئے کاروبار میں مجھے برابر کا حصہ دار بننے کی آفر دی ہے۔''
''کام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''وہی بتا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ پھر بولا۔
''وہاں پر ہوٹلوں میں، مختلف ہالز میں تفریح کے نام پر بہت کچھ ہوتا ہے۔ ہر قوم کے لوگوں کی اپنی اپنی ترجیح ہے۔ پاکستان سے عموماً اور بھارت سے خصوصاً آئے دن طائفے جاتے رہتے ہیں اور خوب کماتے ہیں۔ یہ سارے انتظامات وہاں پر موجود پروموٹر کرتے ہیں۔ میرے کفیل نے مجھے ایسا ہی ایک پروموٹر بننے کی آفر کی ہے۔ ساری سرمایہ کاری اسی کی ہوگی، کام میں نے کرنا ہے۔''
''کیسا لگا تمہیں یہ کام؟'' میں نے پوچھا
''دیکھو، شجاع! قطع نظر اس سے کہ اس کے اخلاقی تقاضے کیا ہیں، میری نظر میں یہ ایک نہایت منافع بخش کام ہے۔ سرمایہ کی پرواہ نہیں، محض انتظامات کرنے ہیں۔ میں نہیں کروں گا تو کوئی اور کرلے گا لیکن میں اس نئے کام کے لیے اپنا پرانا بزنس قطعاً نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ میری اصل وہی ہے، میری ساکھ بن چکی ہے اور اسی میں تجربہ رکھتا ہوں۔ میں رسک لینے کے لیے قطعی طور پر تیار نہیں ہوں۔''
''آپ اگر نہیں چاہتے تو پھر کسی دوسرے کو کرنے دیں یا کام۔'' عامر نے کہا۔
''میں اپنے کفیل کی بات ٹال نہیں سکتا، اس لیے نہیں کہ وہاں مجھے کوئی قانونی مجبوری ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، بس ہمارا تعلق ہی ایسا ہے۔ وہ اس کام کے لیے پوری طرح

سنجیدہ ہو رہا ہے۔ مجھے پچھلے دنوں پتہ چلا تھا کہ شجاع شوبز میں آ گیا ہے۔ مجھے اس تبدیلی کا تفصیلی پتہ نہیں لیکن میں نے تب سوچ لیا تھا کہ میں اس سے مشورہ کروں گا، اس طرح چند اور دوست بھی وہاں جا کر اچھا کما سکتے ہیں۔ اب آپ اس بارے میں بتائیں، کیا کہتے ہیں؟'' یہ کہہ کر اس نے پیکٹ میں سے نیا سگریٹ نکالا اور سلگانے لگا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ کوئی دوسرا کیوں کمائے۔ آپ کے دوستوں کو کمانا چاہئے۔'' عامر نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

''وہاں صورت حال یہ ہے میں نے چند بندے ایڈجسٹ کر دیئے ہیں۔ ایک پورا سیٹ اپ تیار ہے، بس اسے چلانا ہے اور میں یہ ذمہ داری شجاع کو دینا چاہتا ہوں۔''

''میں؟'' میں نے حیرت سے کہا تو جلدی سے بولا۔

''ابھی کوئی بھی حتمی فیصلہ مت کرنا۔ مجھے تمہارا ہر فیصلہ منظور ہوگا مگر کسی حتمی فیصلے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو، دوستوں سے مشورہ کر لو۔'' اس کے یوں کہنے پر زارا نے پوچھا۔

''آپ نے وہاں پر سیٹ اپ کس طرح کا بنایا ہے؟''

''میں نے کہا ہے نا، کہ میرے کفیل کا اپنا ہوٹل ہے لیکن دفتر اور رہائش کے لیے الگ فلیٹ لے لیے ہیں۔ بھارت کے لیے ایک بندہ ستیش مہتہ اور ایک لڑکی کلدیپ کور ہمارے پاس کام کر رہے ہیں۔ پاکستان کے لیے شجاع کے مشورے ہی سے کسی بندے کا انتخاب ہوگا۔ یہ فنکاروں کو طائفے کی صورت میں دوبئی لے جائے گا۔ ایک آرگنائزر ہوگا۔ وہ جس طرح چاہے، کام کو چلائے گا۔''

''آپ دونوں میں کیا بات ہوتی ہے، اس سے ہٹ کر ایک بات پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کی نظر انتخاب شجاع پر ہی کیوں پڑی؟'' حسن نے پرخیال لہجے میں پوچھا۔

''شجاع پر میں اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں جتنا خود پر، میں چاہتا ہوں کہ یہ میرے قریب رہے۔ کاروبار ایک الگ بات ہے لیکن دکھ سکھ تو کسی اپنے سے ہی شیئر کیا جا سکتا ہے۔ اتنا حوصلہ تھوڑا ہے کہ اجنبیوں کے درمیان میرا اپنا بھی کوئی ہے۔'' حیدر شیخ نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو ماحول پر سوگواریت سی طاری ہوگئی۔ تب میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں جو بھی فیصلہ کروں، وہ ایک الگ بات ہے لیکن تمہارے مطلب کا بندہ ہمارے پاس ہے۔ وہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ایسا ہے کوئی بندہ؟'' حیدر نے پوچھا تو میں نے سامنے بیٹھے ہوئے ندیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ جو بیٹھا ہے، یہ کرے گا کام۔''

''اچھی بات ہے۔'' اس نے کہا اور پھر ایک لمحہ کو خاموش رہ کر دوبارہ بولا۔ ''آپ سب دوست یہاں موجود ہیں، آپ سوچیں اور مشورہ دیں کہ شجاع کو دوبئی چلے جانا چاہئے یا نہیں؟ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں۔ مجھے اس کا مستقبل زیادہ عزیز ہے۔''

''ٹھیک ہے، حیدر! میں تمہاری آفر پر غور کروں گا۔'' میں نے کہا تو اس کا چہرہ کھل گیا۔ مجھے یہ پورا یقین تھا کہ اس نے میرے بارے میں پورے خلوص اور محبت ہی سے سوچا تھا، میں بھی چاہتا تھا کہ اسے فوری طور پر کوئی جواب نہ دوں۔ اس نے ندیم سے پوچھا۔

''پاسپورٹ ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں، مجھے ضرورت ہی نہیں پڑی۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''صبح ہی سے کوشش کرو اور جتنی جلدی ممکن ہو، بنوالو۔ میں صبح اپنے آبائی قصبے کے لیے نکل جاؤں گا اور تقریباً دو ہفتے بعد لوٹوں گا پھر چند دن یہاں رہوں گا، باقی باتیں آنے پر۔'' یہ کہہ کر اس نے بات بدل دی پھر بزنس پر ہی باتیں ہوتی رہی جس میں خاص طور پر نائلہ نے اپنے گارمنٹس کے بزنس کے بارے میں بہت ساری معلومات لیں۔ عامر اس کے کاروباری انداز پر مسکراتا رہا پھر ایک ایک کر کے سارے اٹھتے چلے گئے اور جب نائلہ اپنے کمرے میں گئی تو سناٹا چھا گیا۔ پھر میں نے اور حیدر نے بھی جی بھر کے باتیں کر ڈالیں۔

اگلے دن نائلہ نے ناشتہ پر خاصا اہتمام کیا ہوا تھا۔ ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے اور وہ توسٹ پر مکھن لگا کر ہمیں دیتی چلی جا رہی تھی، تبھی حیدر نے کہا۔

''شجاع! میری باتوں پر ذرا عقل استعمال کر کے غور کرنا۔ مجھے تم پر اعتماد ہے، یہ بات اپنی جگہ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم آگے بڑھو، خوب ترقی کرو بلاشبہ تم کامیاب ہو گے۔ وہاں تمہیں بزنس کا چانس ملے گا اور۔۔۔ اور بہت کچھ ہے، یار!''

''حیدر! تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہیں کسی طرح بھی انکار نہیں کر سکتا مگر موجودہ حالات میں، یوں یکدم ابھی ایسا ممکن نہیں ہے۔''

''تم اپنا ذہن بنالو، اتنے میں حالات بھی درست کر لو۔ وہ لڑکا ندیم دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک لگتا ہے، تم اسے ٹھیک سمجھتے ہو تو اس کا پاسپورٹ اپلائی کر دو۔ اور ہاں تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟''

''ادھر ہی ہے۔'' میں نے کہا

وہ بھی اس کے ساتھ دے دینا، میں واپس آ کر سمجھا دوں گا کہ کیا کرنا ہے؟''

"اوکے، باس! اب کاروباری باتیں ختم کرو اور ناشتے کی طرف دھیان دو" میں نے کہا تو وہ خجل سا ہو کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر ہلکی پھلکی گپ شپ میں ناشتہ ختم کر کے میں نے اور نائلہ نے آبائی قصبہ کی طرف جانے والی بس کے سٹاپ پر چھوڑا، وہ روانہ ہوا تو ہم اپنے آفس چلے گئے۔

میرے لیے حیدر شیخ کا خلوص کسی دعا کی طرح تھا۔ وہ میرے جس قدر کام آیا تھا، وہ سب ایک طرف مگر آمنہ کے سلسلہ میں جو اس نے میری مدد کی تھی، میں اس کا احسان ہی نہیں اتار سکتا تھا۔ اسے مجھ پر مان تھا۔ دوبئی جانا یا نہ جانا، یہ میرے فیصلے پر منحصر تھا۔ یہ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ میں وہاں زیادہ کما پاؤں گا۔ یہاں پر رہتے ہوئے میں بہ مشکل اپنے خرچ پورے کر رہا تھا جو شاہانہ تھے۔ ان خوش آئند باتوں کے باوجود، اس طرح یکدم دوبئی چلے جانا میرے لیے انتہائی الجھن کا باعث بن رہا تھا اگر مجھے یہ خوشی تھی کہ ندیم جیسا بندہ غربت کے جال سے نکل کر خوشحالی میں آجائے گا تو دوسری جانب میری وجہ سے ہی نائلہ نئی زندگی کی شروعات کر رہی تھی، میں یہاں نہ رہتا تو وہ پھر سے خزاں رسیدہ پتے کی طرح بے یارو مددگار ہو جاتی۔ اب وہ ایک تحفظ لے کر نئی شخصیت کے ساتھ متعارف ہو رہی تھی پھر اس کے علاوہ کئی دھندلی اور موہوم سی دلیلیں تھیں۔ دفتر پہنچتے ہی میٹنگ کے بعد میں نے بیگم شہوانی کو فون کیا، وہ گھر پر تھی اور میرے انتظار ہی میں تھی۔ میں جب اس کے ہاں پہنچا تو وہ دالان میں نرم سی پھیلی ہوئی دھوپ میں اکیلی بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اخبار ایک طرف رکھا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر خیریت دریافت کرنے لگی۔ میں اس کے سامنے دھری کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی گپ کے بعد میں زارا کے بارے میں ساری بات تفصیل سے کہہ دی۔ اس دوران ملازم چائے کے ساتھ اچھے خاصے لوازمات رکھ گیا۔ میں سارا معاملہ کہہ چکا تو وہ چائے کا کپ مجھے تھماتے ہوئی بولی۔

"دو چار دنوں میں وہ لاہور آنے والا ہے اگر کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں اسے فون پر ہی کہہ دیتی مگر یہ ذرا مختلف نوعیت کا کام ہے مگر ایسا نہیں کہ ہو نہ سکے گا۔ زارا کو وہ فلم بھی مل جائے گی اور وہ خود کو اپنے ٹور کے لیے بھی تیار رکھے۔" پھر خود اپنا کپ اٹھاتے ہوئے بولی۔
"ویسے ان معاملات میں انا کا مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ بندہ۔۔۔ کیا نام بتایا تھا۔۔۔ ہاں، تنویر کاظمی! وہ پیسوں کے لیے۔۔۔ خیر چھوڑو، دنیا میں اور بہت کچھ ہے۔"

"بیگم صاحبہ! مسئلہ یہ نہیں کہ وہ اس لڑکی کو پروموٹ نہ کرے۔ کسی کی پسند یا ناپسند پر بھی اعتراض نہیں ہے مگر کسی کو رگید کر آگے بڑھنا، یہ بہر حال غلط ہے۔"

"یہ دنیا ہے نا، پیارے! ایسا تو ہوتا ہے۔ صرف زن، زر اور زمین کے لیے ہی تو نہیں لڑا جاتا، اپنی شناخت کے لیے بھی لڑنا پڑتا ہے۔ یہاں تو محسن کشی ایک رواج بن چکی ہے۔ ویسے شجاع! میں ایک مشورہ دوں تمہیں؟" وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"وہ کیا، بیگم صاحبہ؟" میں نے پوری سنجیدگی سے کہا تو وہ پرخیال انداز میں بولی۔

"شجاع! اگر تم میں اڑنے کی طاقت ہے تو پھر تم اکیلے اُڑو، اپنے پیروں کے ساتھ کوئی ایسا وزن مت باندھو جو تمہاری اڑان میں مزاحمت بن جائے۔"

"یہ تو خود غرضی ہے۔" میں نے کھردرے لہجے میں کہا۔

"نہیں، یہ خود غرضی نہیں بلکہ صریحاً حقیقت پسندی ہے۔ تم اونچی اُڑان پر جا کر ہی نیچے زمین پر رہنے والوں کو اچھی طرح دیکھ سکو گے، پھر ان کے لیے کچھ کر پاؤ گے جن کے لیے تم کچھ کرنا چاہتے ہو۔"

"میں سمجھا نہیں، آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"مجھے نہیں پتہ، زارا سے تمہارا تعلق کس طرح کا ہے۔ وہ اپنی متعین کردہ حدود میں کامیاب ہے مگر اب عروج حاصل کرنے کے بعد اس کا سفر زوال کی سمت ہے۔ کب تک وہ اپنی حیثیت برقرار رکھنے کی جدوجہد کرتی رہے گی؟ ایسے وقت میں تم اس کی حیثیت بحال رکھنے کے لیے جتنی بھی کوشش کرو، اس کا حاصل کچھ نہیں ہوگا کیونکہ وہ منطقی طور پر زوال کی جانب محو سفر ہے۔ تم اس کی مدد کر کے اپنی انرجی ضائع کرو گے۔"

"ایک دوست، دوسرے کی اسی وقت مدد کرتا ہے جب اس کی ضرورت ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میرا خیال ہے، تم میری بات نہیں سمجھے، وہ تو اپنی بقا کے لیے بہت کچھ کرے گی مگر تمہارا اپنا راستہ ہے۔ پہلے تم اپنے آپ پر غور کرو تم کیا ہو، کتنی قوت رکھتے ہو، تم میں اگر قوت ہوتی تو میرے سامنے نہ بیٹھے ہوتے بلکہ اپنا شکار مار چکے ہوتے، میرے پیارے۔! ابھی تمہیں انتہائی کامیاب ہونا ہے۔ اپنی ساری انرجی خود پر لگاؤ، ضائع مت کرو۔"

"شکریہ، بیگم صاحبہ! آپ نے میرے لیے اچھا محسوس کیا۔" میں نے ممنونیت سے کہا

"تم ہو ہی اتنے پیارے کہ تمہارے لیے اچھا ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔" وہ ہونٹوں میں ہنستے ہوئے بولی تو میں مسکرا دیا۔ تب اس نے کہا۔ "زارا کے معاملے میں پریشان مت ہونا، میں تمہیں خود ہی بتا دوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ ملازم جب برتن اٹھانے آیا تو میں نے اجازت چاہی مگر اس نے مجھے لنچ تک کے لیے روک لیا۔ پھر ہم

میں طویل باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ جو میرے ہی مستقبل کے بارے میں ہی تھیں۔
بیگم شہوانی سے ملاقات کے بعد میں ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا یہ فقرہ کہ اپنی انرجی ضائع مت کرو، میرے دماغ میں مختلف قسم کی سوچیں سر اٹھانے کا باعث بن رہا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر میرے ذہن میں ایسی سوچیں جمع ہوتی رہی تھیں جو ذرا سی شہہ پا کر اپنا آپ منوانے پر تل گئی تھیں۔ میری ہر سوچ کا منطقی انجام اس خیال پر ہوتا کہ میں واقعی اپنی انرجی ضائع کرتا چلا جا رہا ہوں مگر اس کے ساتھ یہ سوال بھی شدت سے سر ابھارتا گیا کہ ایسا میں جان بوجھ کے کر رہا ہوں یا حالات کا بہاؤ مجھے اپنے ساتھ بہائے لے جا رہا ہے؟۔ میں نے بے دردی سے اپنا تجزیہ کر ڈالا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں کامرس رپورٹر ہونے کے باوجود شوبز کی دنیا میں آ جاؤں گا جہاں جتنی تیز روشنی ہوتی ہے، اس کے پیچھے اتنا ہی گھور اندھیرا ہوتا ہے۔ میں اچانک ہی ان روشن اندھیروں میں آن پڑا تھا۔ گھور اندھیروں میں سمت کا یقین نہیں ہو پاتا۔ کوئی ستارہ، کوئی ہلکی سی کرن ہی پھوٹے تبھی راستوں کا پتہ چلتا ہے۔ میں ان ہواؤں میں سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ ماریہ کی طرف سے اٹھائی گئی افتاد کے بھ میں پھنس کر رہ گیا، یہی حالات مجھے اک نئی دنیا سے متعارف کرا گئے۔ میں ہندسوں اور لفظوں کی زبان جانتا تھا، لتھڑے ہوئے میک اپ زدہ چہروں کے علاوہ حسد کی ماری عورت کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر رہ گیا۔ پھر یہ حالات ہی ایسے تھے کہ جتنی افتاد مجھ پر پڑی، قدرت کی طرف سے رہائی کے راستے بھی خود بخود میسر آتے چلے گئے۔ اس وقت میں جس مقام پر کھڑا تھا، وہاں سے کئی انجانے راستے میرے سامنے تھے اور میرا اپنا راستہ حالات کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا تھا۔ میں واپسی پلٹ جانے کی سعی لاحاصل میں حیران و ششدر کھڑا تھا۔ میری اپنی سوچیں منجمد تھیں جنہیں پگھلانے کے لیے کسی بھی مقصد کا کوئی سورج ابھی تک طلوع نہیں ہوا تھا۔ میں شاہراہ بے مقصد پر نجانے کہاں تک چلتا ہوا آ گیا تھا۔ کیا یہ انجانے حالات مجھے کسی خاص سمت کی طرف بڑھائے لے جا رہے ہیں، کہیں کوئی مقصد میرا انتظار کر رہا ہے یا پھر میں بلا مقصد حالات کی ہواؤں میں خزاں رسیدہ پتے کی مانند اڑتا چلا جا رہا ہوں؟ یہی سوال میری سوچوں کو پگھلا رہے تھے اور میں بے بسی سے کسی فیصلے کے انتظار میں ذہنی وادیوں میں پڑا ہانپ رہا تھا۔ ماریہ والا باب اگرچہ ٹھپ ہو چکا تھا لیکن ملک منیر کے لوگ کسی بھی وقت مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قتل میں ملوث ہو چکا تھا۔ یہ ضروری تو نہیں کہ میرے بارے میں ملک منیر نے اپنے کسی ساتھی کو کوئی بات بھی نہ بتائی ہو، ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کا کوئی بھی خاص بندہ کسی بھی موقع کے لیے انتظار میں خاموش بیٹھ سکتا تھا۔ آصف

چوہدری جیسے لوگ کب تک میرا سہارا بنے رہیں گے؟ اگر ملک منیر کے لوگوں کو اس کے قتل کا سرا مجھ تک پہنچا دیتا ہے تو پھر مجھے ایک نئی راہ پر چلنا ہی نہیں بلکہ دوڑنا ہوگا، ایسے میں مجھے اپنے بقا کی جنگ لڑنا تھی اور کسی بھی وقت طبل جنگ بج سکتا تھا۔ تب ایک نئی راہ میرے انتظار میں تھی۔ میں خود میں پر اعتماد تھا مگر میں جانتا تھا کہ یہ چومکھی لڑائی مجھے جرم کی دلدل میں پھینکے گی۔ انہی حالات میں زارا سے ہمدردی ایک نئی سمت کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ فلمی دنیا کے باسی، اپنی چمک دمک کے باعث نجانے کن لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کیے ہوئے تھے اور ان لوگوں کی رسائیاں نجانے کہاں تک تھیں۔ اس دنیا میں ایک معمولی سے دلال سے لے کر فلمی پنڈتوں تک کے چہروں کے پیچھے کیا اور کون موجود تھا، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کس بل میں سانپ ہے اور کہاں پر بچھو؟۔

لاہور میں جو میرے خوابوں کا شہر تھا، اس شہر میں ایسے خوابوں کی تعبیر تو میں نے نہیں چاہی تھی۔ کیا میں آنے والے حالات میں موجود طوفانوں پر قابو پا سکوں گا؟ میں جس قدر بھی سوچتا میرا جواب منطقی طور پر نفی میں تھا لیکن انہی خستہ حالات میں مجھے سکھائی ہوئی ایک بات میرے لیے مشعل راہ ہی نہیں، مجھے حوصلہ بھی بخش رہی تھی کہ ناساز حالات میں بھی خود پر مایوسی طاری نہیں ہونے دینا، کامیابی کی جانب پہلا قدم ہے اور میں مایوس نہیں ہوا تھا۔

اس وقت رات گہری تھی، میں نائلہ کے ساتھ گلبرک کے ایک اوپن ایئر ریستوران میں کھانا کھا رہا تھا کہ حیدر کا فون آ گیا۔ وہ آبائی قصبے سے فون کر رہا تھا۔

”ہاں بھئی، کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے بڑے شوخ انداز میں پوچھا۔

”کھانا کھا رہا ہوں۔“

”لگتا ہے، کہیں باہر بیٹھے ہو۔ بڑی عجیب سی آوازیں آ رہی ہیں۔“

”ہاں، ایک ریستوران میں ہوں۔ تم سناؤ کتنے دنوں تک بھابی کے چرنوں میں پڑے رہو گے؟“

”او، جناب! کل صبح پہنچ رہا ہوں، تیاری کر کے بیٹھا ہوں، میں نے کہا کہ فون کر کے مطلع کر دوں۔“

”بھابی کیسی ہیں، گھر میں سب خیریت ہے نا؟“

”سب ٹھیک ہیں، اللہ کا بڑا احسان ہے، ارے ہاں، میں گیا تھا ادھر تمہارے گھر۔ تمہارے ”باپو“ سے ملاقات ہوئی، بہت مزہ آیا ان سے مل کر۔ وہ تو ویسے ہی خوش مزاج، زندہ دل اور ماشاءاللہ صحت مند ہیں۔ میں نے ان سے تمہارے دوبئی جانے کی بات کی تھی۔ پتہ ہے،

وہ کیا کہنے لگا؟''

''کہنے لگے کہ وہ تو پہلے ہی سے ''اُڑارو'' ہے۔ ہماری طرف سے لاہور میں رہے یا دوبئی پر جہاں رہے، خوش رہے۔''

''باپو ہے نا، میرا یار! بس جلدی گھر کا چکر لگاؤں گا، چل ٹھیک ہے۔ تو صبح آ رہا ہے نا پھر؟''

''بالکل۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔ نائلہ کو میری باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ فون کس کا ہے پھر اسی کے بارے میں باتوں کے دوران کھانا ختم ہوا اور ہم رات گئے آوارہ گردی کرتے رہنے کے بعد گھر آ کر سو رہے۔

اگلی صبح حیدر آ گیا، اس وقت سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ نائلہ بھی جاگ گئی اور ہمارے پاس آ بیٹھی۔ میں نے جب دلدار کو ناشتہ بنانے کے لیے کہا تو وہ کچن میں چلی گئی۔ میں اور حیدر اپنی باتوں میں کھو گئے۔ ہم تینوں کے ناشتہ کر لینے پر دلدار نے برتن اٹھا لیے تو حیدر سونے کے لیے چلا گیا۔ نائلہ نے اخبار اٹھایا اور پڑھنے لگی۔ میں کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا، وہ اخبار میں گم تھی۔

''کوئی خاص خبر ہے؟'' میرے کہنے پر اس نے جلدی سے اخبار ہٹایا اور پھر احساس کرتے ہوئے بولی۔

''بس وہی معمول کی خبریں ہیں۔'' اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا تو میں اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نائلہ! تم اتنی اداس کیوں رہتی ہو۔ کوئی پریشانی، کوئی خوف مسلط ہے تم پر؟''

''نہیں تو۔'' اس نے یوں کہا جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''بس یونہی ڈیپریشن سا طاری ہے''

''مجھے بتاؤ، ڈیپریشن کیسے ختم ہو گا؟'' میں نے انتہائی نرمی سے پوچھا۔

''خود بخود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''نائلہ! کوئی بھی فضول قسم کا خیال دل میں نہ رکھا کرو، بس خوش رہا کرو۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں خوش تو ہوں۔'' وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں سمجھتا ہوں، نائلہ! تمہارا مسئلہ الجھا ہوا ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ حل نہ ہو سکے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ڈیپریشن طاری کرو۔ کوئی بات دل میں ہے تو مجھے بتاؤ۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی مسئلے کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''تو پھر پریشان کیوں رہتی ہو؟''میں نے پوچھا تو وہ کتنی دیر تک چپ رہی، پھر بولی۔

''میں آپ سے جھوٹ نہیں کہوں گی۔میں پریشان ہوں،لیکن پلیز!ابھی آپ مجھ سے کچھ مت پوچھیے گا۔میں آپ سے سب کچھ کہہ دوں گی مگر چند دن کے بعد۔''اس پر میں نے اس کی طرف دیکھا۔اس کے چہرے پر بے بسی کی کیفیت طاری تھی۔تب میں نے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے مگر ایک شرط پر کہ تم پریشان دکھائی نہیں دو گی۔''میں نے کہا تو دھیرے سے مسکرا دی۔تب مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ شاید جو اندیشے اور وسوسے مجھے پریشان کر رہے ہیں، وہ نہ ہوں۔میں نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور اخبار اٹھا لیا۔دوپہر کے وقت حیدر بیدار ہوا۔پروگرام یہی تھا کہ کھانے کے بعد نائلہ کے آفس جائیں، پھر سہ پہر سے ذرا پہلے ہم اس کے دفتر جا پہنچے۔وہاں ایک لمبی گپ شپ ہوئی۔حیدر نے انہیں اپنے کاروباری تجربا تجائے، پھر انہیں ایک خاص قسم کی شرٹ کا آرڈر بھی دے دیا۔ندیم بھی واپس آ گیا،اس نے دو ہفتوں میں پاسپورٹ حاصل کر لیا تھا۔

یوں اگلا پورا ہفتہ وہ ندیم کو ساتھ لیے پھرتا رہا۔میں اسے پوری طرح وقت نہیں دے پا رہا تھا۔ان دونوں کے بارے میں پتہ چلتا کہ کسی سے ملنے گئے ہیں کسی بیوٹیشن سے، کسی فیشن ڈیزائنر سے۔عامر نے انہیں گاڑی دے دی تھی۔مجھے ان کے معاملات سے قطعاً دلچسپی نہیں تھی اس لیے بس ان کی روداد سننے پر ہی اکتفا کرتا۔ان کی باتوں سے پتہ چلتا کہ وہ نائلہ سے بھی کاروباری معاملات طے کر رہے ہیں،میرے دوستوں سے بھی ملتے ہیں اور زارا سے تو حیدر کی دوستی خاصی زیادہ ہو گئی ہے۔ان کے تعلق کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب زارا نے فون پر چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہا۔

''کیا آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں گے کہ آپ کے دوست حیدر شیخ کے اعزاز میں ایک ڈنر پارٹی دے دی جائے؟''

''اگر تم میرے دوست کو اس قابل سمجھتی ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔پھر باتوں میں اجازت کا تکلف میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''کل شام پھر ہمیں وقت دیں۔''

''ضرور، کیوں نہیں۔میں آ جاؤں گا۔''اس کے بعد چند الوداعی باتیں ہوئی اور اس

نے فون بند کر دیا۔ میں سمجھتا تھا کہ زارا جو اہمیت حیدر کو دے رہی ہے، اس میں تعلق سے زیادہ مفاد تھا ورنہ اس سے زارا کو کیا غرض؟ میں کچھ دیر انہی خیالات میں کھویا رہا، پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

اگلی شام میں گھر آیا تو نائلہ تیار بیٹھی تھی، مجھے صوفے پر پھیلتے ہوئے دیکھ کر نائلہ بولی۔

''میں نے عامر کو فون کر دیا تھا، وہ ہمیں پک کرے گا آپ بس تیار ہو جائیں۔''

''اتنی بھی جلدی کا ہے کی ہے، چلے جائیں گے۔''

''ندیم نے فون کیا ہے نا، وہ اِدھر ہی پہنچ جائیں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے، اتنے میں عامر بھی آ جائے گا۔'' میں نے کہا تو نائلہ میرے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہم کافی دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ میں اس سے حیدر کے ساتھ کاروباری ڈیل کے بارے میں پوچھتا رہا پھر عامر کے آ جانے پر میں تیار ہوا اور ہم زارا کے ہاں جا پہنچے۔ زارا کے ہاں رونق عروج پر تھی۔ کتنی ہی ماڈل لڑکیاں، بھڑکیلے لباس میں سجی سیں، ہنستی اٹھلاتی، باتیں کرتی دکھائی دیں۔ مردوں میں ایک دو لوگ تھے جنہیں میں نہیں جانتا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی زارا ہماری طرف بڑھی۔

''ویلکم۔!'' دھیمے سروں میں پھیلی موسیقی کے باعث وہ قدرے اونچا بول رہی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا وہ خاصی نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر وہ نائلہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ حسن آ چکا تھا سو میں دوسرے لوگوں سے ملتے ہوئے ایک طرف پڑے صوفے پر حسن کے ساتھ آ بیٹھا۔

''لگتا ہے، زارا نے اچھا خاصا حسن اکٹھا کر لیا ہے، نمائش کا اہتمام ہے۔'' حسن نے اگرچہ یہ تبصرہ یونہی کر دیا تھا لیکن میرے خیال کو تقویت دے گیا۔ زارا محض حیدر کی توجہ چاہ رہی تھی، اردگرد چہرے صرف یہ باور کرانے کے لیے تھے کہ یہ سب اس کی دسترس میں ہیں۔ اچانک مجھے بیگم شہوانی کی باتیں یاد آ گئیں کہ زارا منطقی طور پر زوال کی جانب محوِ سفر ہے، اسے کچھ نیا کرنا چاہیے۔ شاید زارا سمجھ گئی تھی کہ وہ اپنا موجودہ معیار برقرار نہیں رکھ پائے گی اور کسی نئے راستے کی تلاش میں تھی۔ میں نے غور سے دیکھا کہ زارا، حیدر کی بازو میں اپنی بانہیں ڈال کر مختلف لڑکیوں سے ملوا رہی تھی ہم سب سے قطعاً بے نیاز اور نہ چاہتے ہوئے بھی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ دونوں ہی اپنے کاروباری معاملات میں مصروف تھے، تبھی حسن بولا۔

''یار! عامر کے حصے میں تو نائلہ آ گئی۔ وہ دیکھو، راز و نیاز جاری ہیں، کچھ دیر بعد کوئی

یہاں تمہارے پہلو میں آجائے گی۔ ہمیں بتاؤ، ہم کہاں جائیں؟''

''بھابھی کو بلوا لیتا ہوں۔'' میں نے مصنوعی سنجیدگی سے فون نکالتے ہوئے کہا۔ تو وہ جلدی سے بولا۔

''ویسے کہو میں چلا جاتا ہوں۔ بونس میں ذلیل تو نہ کرواؤ۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر بڑے راز دارانہ انداز میں کہا۔ ''موصوفہ نے پینے پلانے کا بھی اہتمام کر رکھا ہے، چاہیں تو اس سے بھی آپ مستفید ہو سکتے ہیں۔''

''ارے، یار! ہم تو ٹھہرے اناڑی ان کی اتنی مدارتوں کے باوجود۔ ہاں، اگر آپ کا جی چاہتا ہے تو ضرور شوق فرمائیں، روکا کس نے ہے؟''

''کاش! ہم یہ شوق کر سکتے مگر پھر ہمیں سنبھالے گا کون؟ ادھر تو رنگ ہی رنگ بکھرا پڑا ہے، ترنگ میں آ کر ہم ہولی ہی نہ کھیلنے لگ جائیں۔'' میں اور حسن باتیں کرتے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد زارا نے موسیقی بند کروائی اور پھر قدرے اونچی آواز میں کہا۔

''میرے دوستو! آج کی اس محدود مگر بھرپور اور رنگین شام کے ساتھ میں آپ سب کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ یہ شام ہمارے دوست حیدر شیخ کے نام ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ آج ہمارے ساتھ چند ایسی فنکارائیں بھی موجود ہیں جو اپنے فن سے نہ صرف ماحول کو بلکہ دلوں کو بھی گرما دیتی ہیں۔ لہٰذا کیوں نہ ان کے فن سے لطف اندوز ہوا جائے۔'' زارا کہہ رہی تھی اور اس نے کچھ مزید بھی کہا لیکن اسی وقت حسن بولا۔

''مطلب، یہ حیدر کو دکھانا چاہتی ہے کہ کون لڑکی کیسا ناچ سکتی ہے، خیر ہم بھی اسی بہانے مفت میں نظارا کر لیں۔''

اس نے کہا تو میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ موسیقی دوبارہ شروع ہو گئی اور ایک لڑکی نے تھرکنا شروع کر دیا۔ جہاں لڑکی ناچ رہی تھی، وہیں تیز روشنی رہ گئی اور باقی سب مدہم کر دی گئیں۔ زارا نے ایک ہال روم کا سماں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ماحول پر عجیب قسم کا سحر طاری ہو گیا تھا۔ اسی وقت چند لڑکیاں ٹرے میں گلاس رکھے آن وارد ہوئیں اور سب لوگوں میں پھیل گئیں۔ ایک لڑکی نے بڑے دلربا انداز میں ٹرے ہمارے سامنے کر دی۔ میں نے منع کر دیا۔ حسن پوری طرح اس لڑکی کے ناچ میں محو تھا، میں نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔ مجھ سے قدرے فاصلے پر زارا اور حیدر گلاس تھامے بیٹھے تھے، ایک طرف ندیم دو تین لڑکیوں میں گھرا ہوا تھا۔ ماحول واقعتاً گرم ہو چکا تھا۔ ایک کے بعد ایک لڑکی آتی، جسم کی نمائش کے ساتھ اپنے رنگ دکھاتی اور چلی جاتی۔ شراب کے نشے کا اپنا ایک الگ سے رنگ تھا، فضا میں بے تکلفی اور

بے باکی در آئی تھی۔ زارا نے بلاشبہ وہ ماحول اپنے گھر میں لا دکھایا تھا جسے یا تو انڈین فلموں میں دیکھا جا سکتا تھا یا پھر کسی میگزین میں فقط پڑھا جا سکتا تھا۔ بعض اوقات انسان اپنی خواہشوں کے اظہار میں کس طرح پر آ گرتا ہے، اسے خود معلوم نہیں ہوتا...... حسن میرے پاس سے اٹھ کر جا چکا تھا، اس وقت نائلہ میرے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خاصی مضطرب ہے۔ کچھ دیر اس کا اضطراب محسوس کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔

''نائلہ! کیا بات ہے؟''

''مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔'' شاید اس کے اندر کوئی ہلچل تھی جسے وہ چھپائے بیٹھی تھی۔

''کیوں؟''

''پتہ نہیں، کیوں، بلکہ شاید۔۔۔ مجھے نہیں پتہ۔'' وہ ٹوٹے لفظوں میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''چلو باہر لان میں چلتے ہیں، کھلی فضا میں شاید سکون مل جائے۔'' میں نے کہا تو وہ یکدم اٹھ گئی۔ ہم دونوں لان میں آ گئے۔ جی کے ابتدائی دنوں کی ٹھنڈک ہم نے اپنے چہروں پر محسوس کی۔ باہر سکون تھا یا شاید بہت زیادہ شور میں سے نکلنے پر میں نے محسوس کیا۔ لان ہی کے ایک طرف ویٹر کھانے کی میزیں سجا رہے تھے۔ چند لمحے خاموشی کے بعد نائلہ نے کہا۔

''آپ میرے ڈیپریشن کی وجہ جاننا چاہ رہے تھے نا؟''

''ہوں۔'' میں نے ہنکارا بھرا۔

''بات یوں ہے، شجاع! کہ جس دن سے میں آپ لوگوں کے قریب' آئی ہوں اسی دن سے میں اپنے مستقبل کے بارے میں بہت مایوس ہو گئی ہوں، میں سوچتی ہوں میرا کیا بنے گا، میں تو ایک کٹی پتنگ کی مانند ہوں، عامر میرا کہاں تک ساتھ دے پائے گا وہ تو خود۔۔۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر بڑے سکون سے وجہ بیان کی۔

''بس اسی وجہ سے پریشان ہو؟'' میں نے اس کی پریشانی کی اہمیت کم کرنے کی خاطر کہا۔

''کیا آپ اسے معمولی بات سمجھتے ہیں؟

''مگر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں نا! مجھ پر اعتماد کرو۔'' میں نے کہا تو وہ کسی حد تک نارمل دکھائی دینے لگی، پھر خوشگواریت سے بولی۔

''مجھے آپ پر اعتماد ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ کا کوئی نقصان ہو۔ پہلے بھی تو

گولی۔۔۔"

"میرے نقصان کو چھوڑو، بس بھروسہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بھروسہ ہی نہیں، یقین بھی ہے۔ اب میری جان بھی چلی جائے تو کوئی بات نہیں۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

پھر ہم اسی موضوع پر کچھ دیر باتیں کرتے رہے کافی دیر بعد ہم اندر چلے گئے۔ وہاں ماحول خاصا نشیلا ہو چکا تھا۔ حسن بغیر پیئے ہی ایک کرسی پر اونگھ رہا تھا۔ میں نے اس کا شانہ دبایا تو چونک اٹھا، پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ بے ہودگی کب ختم ہوگئی، یار؟"

"چلنے دو، تمہارا کیا لیتی ہے؟"

"میں انتہائی بور ہو رہا ہوں۔ تم دونوں بھی تو راز و نیاز کے لیے باہر چلے گئے تھے۔" اس نے چڑتے ہوئے کہا تو میں پھر سے فون نکالتے ہوئے بولا۔

"میں بھابی کو بلا لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر نمبر دبانے لگا تو اس نے فون پکڑ لیا۔

"میں سمجھا تھا، تم میرے دوست ہو لیکن آج پتہ چلا کہ تم جیسے لوگ مار آستین ہوتے ہیں۔ بنی بنائی عزت خاک میں ملا رہے ہو۔ تمہیں شاید احساس نہیں وہ مجھے کس قدر متقی اور پرہیز گار سمجھتی ہے۔"

"لیکن آپ ہیں نہیں۔۔۔"

نائلہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو حسن بھی ہنس دیا۔ مدہم روشنیوں میں ہم تینوں نے اپنی ہی محفل سجا لی کافی دیر بعد ماحول تیز روشنیوں مین بدل گیا، سبھی کھانا کھانے کے لیے اٹھ گئے۔ کھانے ہی کے دوران مجھے عامر نظر آیا مدہوش تھا۔ میں سوچتا رہا کہ وہی نارمل لوگ جن سے میں روز ملتا ہوں، اک ذرا سا ماحول بدلنے پر کس طرح اجنبی ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اندر دبی ہوئی خواہشوں کو پالنے کے بعد کس قدر بدل جاتے ہیں، ان میں کتنی تبدیلی آ جاتی ہے۔ زارا جو کبھی میرے ہونے پر مجھ سے الگ نہ ہوتی تھی۔ ایک لمحے کو بھی حیدر سے الگ نہ ہوئی تھی۔ ایسے ہی کئی سوال تن کر میرے سامنے آ گئے مگر احساس ہونے پر میں نے ب جھٹک دیئے۔ آخر میں کیوں ایس قنوطی انداز میں سوچ رہا ہوں۔ کوئی کیسا ہے، کیوں ہے اور کس طرح رہنا چاہتا ہے؟ مجھے اس سے کیا سروکار؟ وہ اپنی زندگی جس طرح چاہیں، جئیں۔ انہوں نے مجھے تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ کھانے کے بعد واپس ہونا شروع ہوئے۔ حسن اور عامر دونوں نے پاس گاڑی تھی۔ عامر ڈرائیونگ نہیں کر پا رہا تھا سو میں نے اس کی گاڑی سنبھال

لی۔ میں نے حیدر سے قطعاً نہیں پوچھا کہ وہ میرے ساتھ جائے گا یا نہیں؟ مجھے معلوم تھا کہ وہ رات وہیں رہے گا۔ پھر رات گئے ہم گھر آ گئے، حسن چلا گیا مگر عامر میرے ہاں ہی سویا۔

اگلے دن دوپہر سے ذرا بعد حیدر اور ندیم میرے پاس دفتر میں آ گئے۔ حیدر کے چہرے پر ذرا بھی تاسف نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد ندیم اپنے کام سے اٹھ گیا تو حیدر نے رات والی پارٹی کا ذکر چھیڑ دیا۔ کافی دیر کی باتوں کے بعد اچانک اس نے کہا۔

''شجاع! باتیں تو ہوتی رہیں لیکن تمہیں ایک بات سمجھا دوں۔ آئندہ زارا سے بچ کر رہنا، بڑی ہی خطرناک عورت ہے۔ اس کے جال میں پھنسا ہوا بندہ نکل نہیں سکتا۔'' لفظ اس کے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلے تھے، میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اگرچہ اس نے یہ بات سرسری سے انداز میں کہی تھی لیکن اس کا لہجہ مجھے چونکا گیا تھا۔ وہ زارا سے متعلق ایسی بات کر رہا تھا حالانکہ زارا سے اس کا تعلق چند دنوں پر محیط تھا، زیادہ سے دو یا تین دن، میں نے اس کے چہرے پر اس بات کی سنجیدگی کو ٹٹولا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔

''ایسی بھی کیا بات ہوگئی، یار! جو تم مجھے اس سے محتاط ہونے کا مشورہ دے رہے ہو؟''

''دیکھو، شجاع! دشمن سے محتاط رہنا ایک فطری عمل ہے مگر وہ لوگ جو اپنے بن کر وار کر جائیں، ان کے زخم بڑے کاری ہوتے ہیں اور کبھی مندمل نہیں ہوتے۔'' یہ کہہ کر اس نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا، پھر سکون سے سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''تمہارے اگر اس کے ساتھ کوئی خصوصی قسم کے تعلقات ہوتے تو مجھے ذرا سی بھی ضرورت نہیں تھی کہ یوں تمہیں محتاط ہو جانے کا مشورہ دیتا اور پھر زارا بھی اگر عورت رہتی، طوائف نہ بنتی تو میرے لیے ذرا بھی تشویش نہ تھی۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''تم نے مجھ سے اپنے دوست ملوائے، زارا کے سوا مجھے سب ٹھیک لگے۔ وہ پہلی نظر میں ہی مجھے پسند نہیں آئی تھی، وہ تمہاری دوست ہرگز نہیں ہو سکتی۔ میرے ان خیالات کی تصدیق اس گزرنے والی رات اس نے خود کر دی۔''

''میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھ سکا؟'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''طوائف دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو باقاعدہ تربیت لے کر میدان میں اترتی ہے۔ اسے مردوں کو لبھانے کے سارا گر ازبر کروائے جاتے ہیں، وہ اپنی پوری زندگی ان ہتھکنڈوں کو آزماتے ہوئے خود استاد بن جاتی ہے۔ اس کا اپنا ایک پورا نظام ہوتا ہے جہاں اسے ہر طرح کا تحفظ دینے والے موجود ہوتے ہیں اور وہ پورے اعتماد سے اپنی تربیت کا حق ادا

کر دیتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک طویل کش کھینچا، راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ کر بولا۔
''دوسری قسم کی طوائف حادثاتی طور پر جنم لیتی ہے۔کوئی خاص تربیت یا رہنمائی نہ ہونے کے باعث وہ پہلے لٹتی رہتی ہے اور جب اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ لٹ رہی ہے تو یہی وہ ظالم لمحہ ہوتا ہے جب اس کے رویئے میں انتقام شامل ہو جاتا ہے۔ وہ پھر کسی کو معاف نہیں کر سکتی۔ ان دونوں قسم کی طوائفوں میں قدر مشترک یہی ہے کہ وہ مکڑی کی مانند ہوتی ہیں جسے صرف اپنی بھوک پوری کرنا ہو تبھی اسے قریب آنے دیتی ہے۔''

''شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں ان طوائفوں کے چنگل میں پھنس گیا ہوں۔ یہ میرا پیسہ، میری صحت اور میرا کیریئر تباہ کر دیں گی؟ نہیں، میرے دوست! ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مردانگی کیا ہوتی ہے۔ ان طوائفوں کے پاس ان کا جسم ہی سب سے بڑا ہتھیار ہے اور تمہیں پتہ ہے، یہ ہتھیار مجھ پر کارگر نہیں۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، وہ اسی ہتھیار پر اکتفا کرتی ہیں؟ میرے پیارے! وہ جذبات سے کھیلتی ہیں۔ زارا بھی تمہاری جذباتی طور پر استعمال کرتی چلی جا رہی ہے اور اس کا تمہیں ذرا بھی احساس نہیں۔ وہ فنکار ہی کیا، جس کی فنکاری کا دوسرے کو پتہ چل جائے۔ اب یہ مت پوچھنا کہ مثلاً۔۔۔''

''چلو، میں نہیں پوچھتا مگر اتنے سے وقت میں وہ تمہارے اتنے نزدیک آ گئی کہ میرے بارے میں سب کچھ کہہ دیا حالانکہ یہ اسے بھی پتہ ہے کہ تم میرے دوست ہو؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی لفظ میری زبان سے نکل گئے۔ وہ دھیرے سے مسکرایا اور عام سے لہجے میں بولا۔

''یاد رکھو کہ کسی بھی لالچی شخص کو لوٹ لینا انتہائی آسان ہوتا۔ جو جتنا لالچی ہوتا ہے، وہ اتنی جلدی لٹتا ہے۔ بس جھوٹ بولنے کا فن آنا چاہئے۔ زارا کی سب سے بڑی کمزوری دولت ہے، وہ مجھے کسی عربی شیخ کے ہم پلہ دولت مند سمجھ رہی ہے کیونکہ میں نے اسے خواب ہی اتنے سنہرے دکھائے ہیں۔ وہ اب ایک ایسے ریشمی جال میں آن پھنسی ہے، جس سے وہ چاہتے ہوئے بھی فرار نہیں لے سکتی، اور پھر شجاع! اب سانپوں سے کھیلنے کی عادت ہو گئی ہے، وقت نے سکھا دیا ہے مجھے'' اس نے سرد لہجے میں کہا تو وہ مجھے بہت زیادہ بدلا ہوا لگا۔ میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ وہ بولا '' وہ تمہاری دوست نہیں ہے۔ میں حتمی طور پر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ رات اس نے اپنے ذہن کا سارا گند میرے سامنے انڈیل دیا۔ اس کی بدبودار سوچوں سے میرا دماغ تو خراب ہوا لیکن اچھا ہوا کہ میں تمہیں وقت سے پہلے خبردار کر رہا ہوں۔''

''تم مجھے وہ گند بتانا پسند کرو گے؟''

''بالکل نہیں، مجھے پتہ ہے، یارا! تم کردار کے معاملے میں کیا ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم کیوں اتنے عرصے سے ان جنگلوں میں بھٹک رہے ہو۔ دوستوں کے جھرمٹ میں اپنی تنہائی دُور کر رہے ہو۔ تمہارے ڈھیروں دوست بھی ہوگے، دشمنیاں بھی پالی ہیں تم نے مگر یاد رکھو، پیارے! وہ شخص کبھی بھی تمہارا دوست نہیں ہو سکتا جو تمہیں کسی بھی طرح کی ذہنی اذیت میں مبتلا کر دے۔''

''حیدر! تم بالکل غلط سمجھ رہے ہو، نہ تو۔۔۔''

''خود فریبی ہے تمہاری۔ جویریہ کی بے وفائی تم بھول سکتے ہو؟''

''بس حیدر! بس، کیوں میرے زخموں پر نشتر چلا رہے ہو؟''

''تم جانتے ہو، میں تمہیں کتنا اور کس قدر جانتا ہوں۔ میرے سامنے جھوٹ بولو گے تو مجھے دکھ ہوگا۔ تمہاری سب سے بڑی خوبی کو ان دنیا والوں نے سب سے بڑی کمزوری بنا لیا ہے۔ اور لاشعوری طور پر تم کمزور ہوتے چلے جا رہے ہو۔ میں نہیں کہتا کہ تم منافق بن جاؤ لیکن مصلحت پسندی، پیارے! مصلحت پسندی یہ جو تم سب کچھ کرتے چلے جا رہے ہو، یہ کام تمہارے کرنے کے نہیں ہیں۔ دنیا الجھا رہی ہے اور تم الجھتے جا رہے ہو۔ اتنی ساری زنجیریں تم نے اپنے پیروں میں خود ہی باندھ لی ہیں۔ ایسا کیوں ہے، کیا ایسا کر کے تم کوئی کفارہ ادا کر رہے ہو؟ مجھے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں چاہئے لیکن تمہیں ضرور سوچنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے اضطراری انداز میں نیا سگریٹ سلگایا۔ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا، جویریہ کے ذکر نے ہی مجھے گنگ کر کے رکھ دیا تھا۔ کتنی ہی دیر تک خاموشی ہمارے درمیان معلق رہی۔ حیدر جو کچھ مجھ سے کہنا چاہا رہا تھا، میں اسے بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ فقط زارا ہی کو میرے لیے مضر نہیں سمجھ رہا تھا بلکہ میرے اردگرد دیواروں کی طرح کھڑے حالات اور میرے اطراف میں موجود لوگوں کے بارے میں پریشان تھا۔ نجانے وہ میرے بارے میں کتنی سنجیدگی سے سوچتا رہا تھا، کتنے دوستوں سے کتنی گفتگو کی ہوگی۔ ہو سکتا ہے، کسی نے کوئی بھیانک حالات اس کے سامنے رکھ دیئے ہوں۔ کچھ تھا ضرور جس سے وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ ماحول قدرے بوجھل ہو گیا تھا اور میں کوئی تفصیل بیان کر کے ماحول مزید کھردرا نہیں بنانا چاہتا تھا سو میں نے کہا۔

''آؤ، باہر کہیں کھلی فضا میں چلتے ہیں۔''

''نہیں۔ مجھے ندیم کے ساتھ کہیں جانا ہے۔'' اس نے نرم سے لہجے میں کہا۔ ''اور ہاں، زارا کی طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے تو میں سنبھال لوں گا۔ تم بس اتنا غور کرنا کہ میں نے جو تمہارے خلاف اس سے باتیں کی ہیں، وہ تمہیں بتاتی ہے کہ نہیں۔''

کہہ کر وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ اس وقت میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے ذہن و دل پر سے غبار صاف کر چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں پیون کو چائے لانے کے لیے کہتا، ندیم آن وارد ہوا۔ حیدر نے کچھ کہے بغیر ہاتھ ملایا اور اس کے ساتھ چل دیا۔

میں حیدر سے باتیں کر کے میں اعصابی طور پر تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے تو ایک طرح سے اپنا بوجھ اتار پھینکا تھا جس سے کسی بھی طرح حالات پہلے کی مانند، اک بہاؤ کی صورت میں رہنے والے نہیں تھے، یا تو بالکل خاموشی چھا جاتی یا پھر طوفان اٹھتا۔ وہ تو وقت اور حالات پر منحصر تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ حیدر نے مجھے میرا ماضی یاد دلا کر اور جویریہ کا نام لے کر میرے زخموں کو پھر چھیڑ دیا تھا۔ میں وہ تمام تر یادیں اپنے اندر دفن کر چکا تھا لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ وہ اب بھی میرے دل میں اسی طرح بسی ہوئی تھی اور اس کی تصویر میرے ذہن پر چسپاں تھیں۔ انہی یادوں سے بچنے کے لیے میں دفتر سے گھر آ گیا تا کہ نائلہ کے ساتھ خوش گپیوں میں جویریہ کی زور پکڑتی یادیں بھول جاؤں مگر گھر میں سناٹا تھا۔ دلدار ڈرائنگ روم میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی اٹھ گیا تو میں نے پوچھا۔

''کہاں گئے؟''

''نائلہ بی بی شاپنگ کے لیے گئی ہیں، مراد خان بھی انہی کی ساتھ ہے۔'' دلدار نے جلدی سے کہا۔ مراد خان کو آصف چوہدری نے بھیجا تھا اور وہ یہاں سیکورٹی گارڈ کے طور پر رہتا تھا۔

''کب سے گئی ہیں وہ؟''

''کافی دیر ہو گئی، دو گھنٹے تو ہو گئے ہوں گے۔''

''چلو، ٹھیک ہے'' میں نے کہا اور صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

''چائے بناؤں آپ کے لیے؟'' دلدار نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو کچن کی طرف چلا گیا۔ ماحول اور حالات کچھ اس قسم کے ہو رہے تھے کہ جن میں حد درجہ محتاط رہنا ہی ضروری تھا۔ کچھ بھی ممکن تھا۔ میں جتنا اس بارے سوچتا چلا جا رہا تھا، میری پریشانی بڑھتی چلی گئی۔ میرے اعصاب پہلے ہی تنے ہوئے تھے، گھر آتے ہی مزید بوجھ محسوس کرنے لگا۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں جس قدر حالات اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اتنا ہی وہ میرے ہاتھ سے پھسلتے چلے جا رہے تھے۔ ماریہ والا معاملہ ختم ہونے کے باوجود ایک خطرہ میرے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار کی طرح مسلط تھا۔ کبھی نہ کبھی میرا تعلق ماریہ سے ہونا ثابت ہو جائے گا اور پھر ایک نئی طرح کی ذہنی اذیت شروع ہو جانے والی تھی۔ دلدار کے چائے لانے پر میں خیالوں کے حصار سے نکلا۔ چائے پینے کے دوران میں دلدار سے

باتیں کر کے اپنی پریشانی کا احساس کم کرنے لگا۔ اسی دوران فون بج اٹھا، دوسری جانب بیگم شہوانی تھیں۔ کچھ لمحے یونہی باتیں کرتے رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔

’’وہ تمہاری دوست زارا کے بارے میں بات ہوگئی ہے۔ اب اسے فلم بھی مل جائے گی اور وہ برطانیہ جانے والے طائفے میں بھی شامل ہوگی۔‘‘

’’بہت شکریہ، ویسے آپ کو زیادہ الجھن تو نہیں ہوئی؟‘‘

’’نہیں، میرا اپنا طریقہ ہے کہ میں ایسے معاملات کیسے ڈیل کرتی ہوں۔ بہرحال، یہ یقین رکھو کہ تمہارا نام دور دور تک کہیں نہیں ہے اور ہاں، دوستوں میں شکریہ نہیں ہوتا۔‘‘

’’یہ آپ کا بڑا پن ہے، بیگم صاحبہ! کہ آپ مجھے اپنا دوست سمجھتی ہیں۔ میں اس قابل کہاں؟‘‘

’’مجھے پتہ ہے، تم کس قابل ہو۔‘‘

’’میرے لائق خدمت ہو تو ضرور حکم کیجیے گا۔‘‘

’’ویسے تو ڈھیروں خدمات ہیں، پیارے! کبھی وقت دو تو میں تمہیں بتاؤں۔ لیکن اہم بات ہے ہے کہ تم اپنا خیال رکھا کرو۔‘‘

’’ضرور، کیوں نہیں، آپ جب بھی حکم دیں، میں حاضر ہو جاؤں گا۔‘‘

’’ارے اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ جب بھی پرسکون لمحے میسر آجائیں، مجھے آپ لوگوں کی مصروفیات کا احساس ہے۔‘‘ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا اور تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ بیگم شہوانی کی ’’خدمات‘‘ کیا ہوسکتی ہیں؟ اس خیال کے ساتھ ہی سوچ کو راستہ ملا تو میں اس میں بہتا چلا گیا مگر یہ ساری سوچیں لاحاصل تھیں، اس کا احساس کرتے ہی میں نے ساری سوچیں جھٹک دیں اور زارا کا نمبر ڈائل کر دیا۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنائیت چھلکاتے لہجے میں کہا۔

’’ہماری یاد کیسے آگئی آپ جیسے مصروف بندے کو؟‘‘

’’تم بھولتی کب ہو جو تمہیں یاد کیا جائے۔‘‘ میں نے شوخی سے کہا۔

’’یہ تو ہماری خوش قسمتی ہوئی نا!‘‘ وہ اٹھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

’’خیر، بتانا میں نے تمہیں یہ تھا کہ اب تمہاری چھینی ہوئی فلم مل جائے گی اور تم برطانیہ بھی چلی جاؤ گی۔‘‘

’’او، گڈ، ویسے فلم والوں کی طرف سے بھی فون آیا تھا، کہہ رہے تھے کہ کوئی بات کرنی ہے۔ میں تذبذب میں تھی نجانے وہ کیا بات کریں گے؟‘‘

''یہی بات کرنا چاہتے ہوں گے۔''

''تھینک یو، شجاع!'' لہجے میں اپنائیت کے ساتھ اب ممنونیت بھی در آئی تھی۔ تبھی میں نے بات بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مصروفیات ہیں آج کل؟''

''بہت مصروف ہوں، فلم والوں سے بات کرتی ہے، شوٹنگ ہے۔ نجانے واپسی کب ہو۔ ویسے، شجاع! کوئی خاص بات ہے؟''

''بس یونہی سوچا کہ اگر تم مصروف نہیں ہو تو ڈنر اکٹھے لیتے۔''

''سوری، شجاع! میں دو دن تک انتہائی مصروف ہوں۔ جونہی فراغت ملتی ہے، میں خود آپ کو انوائیٹ کروں گی۔ ویری سوری، شجاع!'' اس نے انتہائی دکھے لہجے میں کہا تو میں نے چند الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا اور صوفے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ کتنے ہی سارے لمحے یونہی بیت گئے۔ میں خالی الذہن ہو گیا جیسے خلاؤں میں تیر رہا ہوں۔ پھر میری آنکھ لگ گئی اور میں اس وقت بیدار ہوا جب وہ نائلہ آ گئی۔ ان کے چہرے پر بشاشت تھی اور ہاتھوں میں کئی سارے بیگ پکڑے ہوئے تھے، میرے آنکھیں کھول دینے پر نائلہ نے جلدی سے کہا۔

''دیکھیں، میں آپ کے لیے کیا لائی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے چند شاپنگ بیگ میری طرف بڑھا دیئے۔ ان میں کپڑے تھے ایک جوتوں کا مہنگا جوڑا اور شیونگ وغیرہ کا سامان تھا۔

''اس شاپنگ کا مقصد......؟'' میں نے نائلہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''مجھے کچھ اپنی چیزیں خریدنا تھیں، خریداری میں آپ کے لیے بھی چند چیزیں لے لیں۔ اس کا کوئی بھی خاص مقصد نہیں، یونہی معمول کی شاپنگ ہے۔'' نائلہ نے بڑے اطمینان سے لفظ چباتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ پھر وہ شاپنگ کی روداد سناتی چلی گئی۔ وہ کہہ چکی تو میں بولا۔

''صرف باتوں سے پیٹ نہیں بھرتا، اس کے لیے کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے۔''

''ایسی بھی کیا مایوسی، حضور! میں کھانا بازار ہی سے لے آئی ہوں۔ دلدار صاحب دوبارہ سے گرم کر کے لا رہے ہیں، آپ منہ ہاتھ دھو کر تشریف لے آئیں۔'' نائلہ نے چہکتے ہوئے کہا تو میں اٹھ گیا، پھر کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے ہم کافی دیر تک یونہی باتیں کرتے رہے۔

......❁......

اس شام میں گھر آیا تو حیدر اور ندیم ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے سامنے کافی سارے کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی حیدر مسکرا دیا اور سارے کاغذات سمیٹ کر بریف کیس میں رکھنے لگا۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کہیے، صاحب! کیا حال ہیں آپ کے؟'' یہ کہتے ہوئے وہ رازدارانہ انداز میں ہنس دیا۔

''میں تو ٹھیک ہوں، آپ لوگ سناؤ، کہاں غائب ہو دونوں؟''

''آپ کی دوست زارا کو شرف مہمانی بخش رہے تھے۔ اس نے میرے قرب کی خاطر اپنے سارے پروگرام تج دیئے، یہاں تک کہ اپنے قریبی دوستوں سے بھی جھوٹ بولتی رہی۔''

''حضور! کھل کر فرمائیں، مدعا کیا ہے؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بتانا صرف یہ ہے کہ تم نے جب اس سے فون پر اس کی مصروفیات پوچھی تھیں، تب اس نے صرف میرے لیے بہانہ بنا دیا تھا۔ یہ اس لیے کہا ہے کہ تم ذہن میں رکھو۔''

''یار! کس کی بات کرتے ہو، ایسا کرنا ان کے پیشے کا تقاضا ہے، تم خواہ مخواہ اسے اہمیت دے رہے ہو۔ اور سنو۔! میں اسے اب تک اہمیت کیوں دے رہا ہوں۔ اس کا میں احسان مند ہوں۔''

''کیسا احسان۔۔۔؟'' اس نے پوچھا تو ندیم بھی میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔

''میں جب زخمی ہوا تھا تو اس نے نہ صرف مجھے ہسپتال پہنچایا بلکہ دو دن تک میری تیمارداری بھی کی۔ یہ سب جانتے ہیں۔'' میں بہت سکون سے کہا

''میں ۔۔۔'' اس نے جلدی سے کچھ کہنا چاہا پھر لمبی سانس لے کر دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔ ''یہ وقت ہی بتائے گا، یار! آج ڈنر دے رہا ہوں، کل شام میری فلائیٹ ہے۔''

''ڈنر کا اہتمام کہاں کیا ہے؟''

''زارا نے ایک چائنیز میں بندوبست کیا ہے، میں نے سب دوستوں کو بتا دیا ہے۔ خیر، وہ چھوڑو۔ یہ لو تمہارا پاسپورٹ۔'' اس نے بریف کیس سے پاسپورٹ نکالتے ہوئے کہا۔

''حیدر! تم مجھے دوبئی لے جانے کے لیے واقعی سنجیدہ ہو؟'' میں نے جذباتی انداز میں پوچھا۔

''میں کچھ نہیں کہتا، اپنے دل سے پوچھو۔'' اس نے سوالیہ نشان مجھ پر چسپاں کر دیا تھا۔ میں کچھ نہ بولا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ حیدر نے مجھے پھر سے جذباتی کر دیا تھا۔ مجھے کمرے میں لیٹے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ نائلہ کافی لے کر آ گئی۔ میرے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ پریشان ہو گئی، سائیڈ ٹیبل پر مگ رکھتے ہوئے بولی۔

''خیریت، شجاع! بڑے پریشان لگ رہے ہیں آپ؟''

''پریشان نہیں، جذباتی ۔۔۔'' میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

''اچھا، تو آپ بھی جذباتی ہو جاتے ہیں، کس نے کر دیا؟'' وہ مسکراتی ہوئی بولی

''حیدر نے، خیر، تم فکر نہ کرو میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ واپس مڑ گئی۔ تبھی حسن کی آواز ڈرائینگ روم سے آئی تو میں نے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔

چائنیز رستوران پہنچے تو ڈائینگ ہال میں زارا ہمارے استقبال کے لیے موجود تھی۔ مجھے اس کے وہاں ہونے کی پہلے ہی سے توقع تھی۔ اس کے پہلو میں ایک نوخیز لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جس کی آنکھوں میں اتری ہوئی حیرت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ زارا کی دنیا میں بالکل نئی ہے کیونکہ دعوت نظارہ دیتا ہوا لباس پوری کہانی کہہ رہا تھا کہ وہ کس قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ زارا سراپا خلوص بنی ہوئی تھی۔ تبھی حسن نے دھیرے سے کہا

''اپنا حیدر، زارا کی رنگینیوں میں کھو کر رہ گیا ہے۔ گمان بھی نہیں تھا کہ اس جیسا جہاندیدہ بندہ ایک عورت کے جال میں پھنس جائے گا اور وہ ندیم صاحب......''

''بدگمان نہیں ہوتے...... حیدر نے کل شام چلے جانا ہے لہٰذا وقت کم ہے اور اس کا بھرپور فائدہ اٹھا لینا چاہتا ہے۔ تمہیں اس کے نئے کاروبار سے متعلق پتہ تو ہے۔'' میں نے حسن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی باتوں میں کھو گئے۔ یوں خوشگوار ماحول میں رات گئے وہاں سے واپسی ہوئی۔ اس رات مجھے احساس ہوا کہ حیدر نے کس حد تک زارا کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت ہم سبھی دوست ایک قافلہ کی صورت میں ائیر پورٹ پہنچے، بالکل آخری لمحوں میں حیدر نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے ہولے سے کہا۔

''شجاع! کسی بھی متوقع بدگمانی کو دل میں مت رکھنا، بس مجھ پر یقین رکھنا، ندیم میرے ساتھ جا رہا ہے، تم بھی جلد آ جاؤ۔ میں تمہارے حالات سے غافل نہیں ہوں، میری تمہارے دوستوں سے ڈھیروں باتیں ہوئی ہیں۔''

''میں کوشش کروں گا، بہت جلد آ جاؤں''

''آ جانا، چاہے سیر کے لیے ہی سہی۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' لفظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ ندیم میرے گلے لگ کے رونے لگا، میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''اوے، یہ کیا پاگل پن ہے؟''

''میں آپ کا احسان مند ہوں'' اس نے کہا تو مجھے غصہ آ گیا، میں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''بے وقوف آدمی! چلو، جاؤ۔'' میرے اس طرح کہنے پر وہ دوبارہ مجھ سے چمٹ گیا اور کافی دیر تک میرے ساتھ لگا رہا۔ میں نے دیکھا، اس کے گھر والے ممنونیت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ پھر ان کی فلائیٹ کا اعلان ہوا۔ وہ سب سے ملنے کے بعد ڈیپارچر لاونج چلے گئے۔ اسی رات حیدر نے دوبئی سے فون کر کے اپنی خیریت سے جانے کی اطلاع دی۔

اگلے دن میں حسن کے ساتھ پریس کلب جانے کے لیے تیار کھڑا تھا، وہ ایک ضروری کال سننے میں منہمک تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے نمبر دیکھے تو اجنبی تھے۔ میں نے ''ہیلو'' کہا۔

''میں ودود شاہ بات کر رہا ہوں اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی اور اس نے بغیر کسی تمہید کے اپنا مدعا بیان کر دیا، تب میں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

''خیریت، کون ہو آپ؟'' میں نے پوچھا

''خیریت ہی ہے، آپ سے ایک پرانا اُدھار ہے، ملیں گے تو لے لوں گا۔'' اس اجنبی نے کچھ اس طرح کہا کہ میں چونک گیا۔

''کونسا پرانا اُدھار ہے میں بھی تو جانوں؟''

''میں چونکہ آپ کا تھوڑا وقت لوں گا، اس لیے سوچا آپ کو فون کر لوں ...... آپ

معروف تو نہیں؟" اس کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔

"کیا آپ اپنا تعارف نہیں کروائیں گے؟"

"ہاں یہ بہت ضروری ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "سمجھ لو کہ میں منیر ملک ہوں۔"

"اوہ۔۔۔" میرے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلا تو اس نے غراتے ہوئے کہا

"تم نے اپنا جو بندوبست کرنا ہے کرلو، پھر نہیں کہنا دھوکے میں مار دیا، میں تجھے اب چھوڑنے والا نہیں ہوں۔" اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کروں گا۔" میں اعتماد سے کہا

"تو کرو، کسی بھی وقت کسی بھی جگہ۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ حسن میری طرف دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔ تو میں نے اسے بتا دیا۔

"وددود شاہ، وہ کون۔۔۔؟" اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں کیا جانوں، ہو گا کوئی؟" میں نے لاپرواہی سے کہا اور قدم باہر کی طرف بڑھا دیئے، تب اس نے حیرت سے کہا۔

"تم اتنی آسانی سے لے رہے ہو؟"

"تو کیا کروں ابھی یہاں بیٹھ کر رونے لگ جاؤں؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو میری بات سمجھتے ہوئے چل دیا۔ پریس کلب جا کر بھی اس نے بات کی۔

"کیا تمہیں اس کی کہانی پر یقین ہے؟"

"بالکل ہے، سرے سے اس کی کسی بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"پھر تم۔۔۔؟"

"سب کچھ سامنے آ جائے گا، دیکھو، وقت کیا رنگ دکھاتا ہے؟"

"ہاں، وقت تو رنگ دکھاتا ہے اور یہاں بندے بھی اپنا رنگ بدل جاتے ہیں۔"

"تمہاری اس بات کا مطلب؟"

"کس پر کیا بھروسہ کریں۔ اس نے تو۔۔۔ اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟" حسن نے کہا تو میں نے کہا

"کچھ بھی نہیں، انتظار کرنا ہوگا۔"

"اس قدر واضح۔۔۔" حسن نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر بات ختم کر دی اور مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ رکھتے ہوئے اس سے چائے یا کافی کا پوچھ لیا۔

اس رات میں نے اور آصف چوہدری نے بڑی دیر تک اس معاملے پر ہی باتیں کیں۔ وہ کوئی بھی تھا سامنے آنے سے پہلے ذہنی چور پر ختم کر دینا چاہتا تھا۔ ہم ہوا میں تو تیر نہیں چلا سکتے تھے سو آگے کیا کرنا ہے، ہم نے طے کرلیا۔ ایک لمحہ کو مجھے یوں لگا جیسے ہم پھر سے کالج کے دور میں آگئے ہیں، فرق صرف یہی تھا کہ ان دنوں لاابالی پن میں پلاننگ کرتے تھے اور اس رات ہم نے پوری سنجیدگی سے سوچا۔ میں لاشعوری طور پر محتاط ہو گیا تھا۔

میں اس رات دیر تک اس معاملے پر سوچتا رہا۔ میرے خیال اس معاملہ کے بارے عامر کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی، حسن نے اسے خود ہی بتا دینا تھا۔ اگلے دن کی دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ دباؤ مزید بڑھ گیا ہے۔ میرے سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا جسے میں نے رات جگے ہی کاری ایکشن سمجھا اور آرام کے لئے گھر آگیا۔ میں نے ڈرائینگ روم میں بیٹھا کر ایک سگریٹ سلگائی اور سوچنے لگا کہ اس وودو شاہ تک کیسے پہنچ سکتا ہوں، دوبارہ اس نے رابطہ بھی تو نہیں کیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا چلا جارہا تھا، میرے سر میں دباؤ کے باعث درد بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ میں نے دلدار سے منگوا کر درد کشگولیاں کھالی تھیں لیکن درد ہنوز ویسے ہی تھا۔ تین بج چکے تھے اور میری بے چینی عروج پر تھی۔ مجھے نیند آنے لگی تو میں سو گیا۔ یوں اگلا دن اسی انتظار میں گزر گیا مگر کوئی بندہ سامنے نہیں آیا۔

اگلی رات نائلہ نے کھانے پر خاصا اہتمام کیا۔ حسن اور عامر بھی آگئے۔ اس سارے ہنگامے میں رات کا پہلا پہر گزر گیا تھا۔ کھانے پینے کے بعد اچانک حسن نے کہا۔

''شجاع! آؤ چلیں۔۔۔''

''کدھر جانا ہے؟'' میں نے پوچھا

''ہم تھوڑا فریش ہو کر آتے ہیں'' وہ بولا مجھے اس پر بڑا پیار آیا۔ میں اس وقت واقعی تازہ دم ہونا چاہتا تھا، حسن کو میرا کس قدر احساس تھا۔ تبھی عامر نے کہا۔

''نائلہ کو ساتھ لے لیں؟''

''لے لو، یار! ہم کون ہوتے ہیں روکنے والے، تمہاری شے ہے۔'' حسن نے مسکراتے ہوئے کہا تو عامر بولا۔

''اسے کہتے ہیں حسد اور جلن۔''

''اچھا چھوڑو، چلو۔۔'' حسن نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا

گاڑی عامر ڈرائیو کر رہا تھا، اس کے ساتھ نائلہ تھی۔ میں اور حسن پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ کار سڑک پر تیرتی چلی جارہی تھی۔ تبھی میرا سیل بج اٹھا۔

''تمہاری مہلت ختم ہو چکی ہے۔''

''اوہ تم ودود شاہ، ارے کہاں ہو، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں، بولو کہاں آؤں یا تمہیں بل سے نکالنے کے لیئے مجھے کچھ کرنا ہوگا؟'' میں نے انتہائی طنز سے کہا۔

''تمہیں تو کچھ نہیں کرنا، جو کرنا ہے، میں نے ہی کرنا ہے۔'' وہ بھڑکتے ہوئے بولا۔

''بکواس کر رہے ہو تم۔۔۔اگر ہمت ہے تو آ جاؤ سامنے دیکھیں، کون کیا کرتا ہے۔ اب تم اپنی فکر کرو'' میں نے کہا

''تم اپنی زندگی کی خیر مناؤ'' وہ بولا

''میری زندگی میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کہاں ہوں اگر تم۔۔۔'' اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا، حسن نے فون میرے ہاتھ سے لے کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تم آرام سے بیٹھ جاؤ تو اچھی بات ہے۔ میں جانتا ہوں، تمہاری رسائیاں کہاں تک ہیں لیکن تم نہیں جانتے کہ ہماری پہنچ کتنی ہے۔ اگر تم پھر بھی نہیں سمجھتے تو تم سے جو کچھ ہوتا ہے، کر لو۔ عورتوں کی طرح محض دھمکیاں ہی نہ دیتے رہو؟''

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ہمارے درمیان خاموشی تھی۔ میں تیزی سے ودود شاہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کس رخ سے ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کار رکنے پر میں اپنے خیالات سے چونکا۔ میں نے باہر دیکھا، ہم ایئر پورٹ کی پارکنگ میں تھے۔

''چلو، نکلو'' حسن نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

''یہاں کیسے؟''

''باہر تو نکلو۔۔۔'' حسن نے کہا۔ پھر نائلہ اور عامر نے ایک سوٹ کیس اور بیگ عامر نے، نائلہ نے کار لاک کی اور کچھ لمحوں بعد ہم ایئر پورٹ کی عمارت کے اندر تھے۔

''یار! تم لوگ بتاتے کیوں نہیں، ہم یہاں کیسے آئے ہیں؟'' میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا تو حسن دھیرے سے بولا۔

''تم حیدر کے پاس دوبئی جا رہے ہو۔''

''میں۔۔۔کیوں۔۔۔نہیں۔۔۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

''ہم سب یہ چاہ رہے ہیں کہ تم وہاں جاؤ۔'' حسن نے سختی سے کہا اور گھڑی پر نگاہ ڈال کر نائلہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے اپنے پرس میں سے میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

''ابھی کچھ دیر بعد فلائٹ ہے اور یہ سوٹ کیس اور بیگ تمہارے ساتھ جائے گا۔

اب تم فوراً اندر چلے جاؤ۔" نائلہ نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا تو میں اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا جو سرخ ہو رہا تھا۔

مجھے وہ صورت حال بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ نائلہ کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور وہ پاسپورٹ سمیت ٹکٹ میری طرف بڑھائے کھڑی تھی۔ میں نائلہ کے من میں اٹھنے والے جذبات کو سمجھ رہا تھا، وہ بڑے ضبط سے کام لے رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا تو وہ نگاہیں چرا گئی۔ میں نے عامر کی جانب دیکھا۔ وہ ہم سے قدرے دور کھیلتے ہوئے بچوں کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا اور یوں پوز کر رہا تھا جیسے ہماری باتوں پر اس کی ذرا سی بھی توجہ نہیں ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر میں اس سے کچھ پوچھتا بھی تو وہ مجھے کوئی معقول جواب دینے والا نہیں تھا۔ حسن میرے سامنے اپنے چہرے پر سختی جمائے میرے جانب مسلسل گھور رہا تھا۔ چند لمحے اسی گومگو کے عالم میں گزر گئے تو وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم یقیناً ہم سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہے ہو گے مگر یہ وقت نہیں ہے۔ تمہیں جو کچھ بھی پوچھنا ہے وہ سب تمہیں حیدر بتا دے گا" یہ لفظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے اور جواباً میں بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ فاروق اصغر تیز قدموں سے ہماری طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ یہاں ایوی ایشن میں ایک ذمہ دار عہدے پر تھا اور ہمارا دوست تھا۔ اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

"اب چل بھی دو، یار! پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔" اس نے کہا تو عامر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے میرے سینے سے لگ گیا، میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "حوصلہ رکھنا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں کی فکر مت کرنا، ہم ہیں اِدھر۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے الگ ہو گیا

"بس دیر ہو گئی، جان جی!" حسن نے اس کی طرف دیکھا اور بیگ اٹھا کر مجھے تھما دیا۔ میں نے ایک بار پھر نائلہ کی جانب دیکھ اور آہستگی سے نائلہ کے ہاتھ سے ٹکٹ اور پاسپورٹ تھام لیا، تبھی نائلہ نے ایک کی پرس مجھے دیا اور بولی۔

"یہ بیگ اور سوٹ کیس کی چابیاں ہیں، سنبھال لینا۔"

تو نائلہ سے ضبط نہ ہو سکا، ایک ہلکی سی ہچکی کے ساتھ وہ میرے گلے لگ گئی۔ چند لمحوں بعد میں نے اسے خود سے الگ کیا تو وہ کرب سے بولی۔

"آپ بہت یاد آئیں گے، بہت ۔۔۔"

"آجاؤ بھئی ۔۔۔" ریلنگ کے ساتھ کھڑے حسن نے اونچی آواز میں کہا جو میرے سوٹ کیس سمیت وہاں پہنچ چکا تھا۔ میں نے نائلہ کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ تھپتھپاتے

ہوئے کہا۔

''تم میرے لیے دعائیں کرتی رہنا۔ ہم بہت جلد ملیں گے۔ ہم سب دوبارہ ایسے ہی ماحول میں، خوش وخرم ہوں گے۔ بس تم دعائیں کرنا۔'' میں نے ٹوٹے ہوئے لفظوں میں کہا اور تیزی سے حسن کے پیچھے چل دیا۔ اس نے مجھے گلے لگایا اور بڑے بھائیوں کی طرح مجھے رخصت کر دیا۔ فاروق میرے ساتھ تھا۔ بورڈنگ کارڈ اور دیگر مراحل سے نکلے اور پھر وہ میرے ساتھ لاؤنج تک آیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں عمارت کے باہر کھڑی بس تک جا پہنچا۔ میں یقیناً آخری مسافر تھا۔ میرے بیٹھتے ہی بس چل دی۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا اور تیزی سے حیدر شیخ کا نمبر پش کر دیا۔ دوسری بیل پر اس نے کال ریسو کر لی، اس کے ہیلو کہنے کے بعد میں نے پوچھا۔

''یہ سب مجھے تمہاری طرف دوبئی کیوں دھکیل رہے ہیں؟''

''اس وقت تم کہاں ہو؟'' میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے اس نے سوال کر دیا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور موجودہ صورت حال بتا دی تو وہ بولا۔ ''تو پھر تمہیں اتنی پریشانی کا ہے کی ہے۔ سکون سے آؤ، میں تمہیں ایئر پورٹ پر لینے آؤں گا۔ یہاں تم ایک گھر میں اطمینان سے رہو گے اور میرا خیال ہے، یہاں سکون سے باتیں بھی ہو جائیں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گالی بھی ساتھ نتھی کر دی۔ میں نے اگلی بات نہیں کہی اور فون بند کر دیا۔ تبھی مجھے آصف چوہدری کا خیال آیا، میں نے اس کے نمبر پش کیے پھر میں نے انتہائی اختصار سے اپنے بارے میں بتایا تو اس نے کسی تاثر کے بغیر کہا۔

''میرے خیال میں تمہارے لیے یہی بہتر ہے، اس وقت تمہارا منظر سے ہٹ جانا انتہائی ضروری ہے۔''

''مطلب؟''

''مطلب وطلب کچھ نہیں، تم اطمینان سے جاؤ۔''

''مگر میرے نہ ہونے سے یہ ساری صورت حال بگڑ بھی تو سکتی ہے۔''

''کچھ نہیں ہوگا، تم حوصلہ رکھو۔''

''یار! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم بھی یہ چاہ رہے ہو کہ میں یہاں سے دفعان ہو جاؤں؟''

''ریلیکس، ڈیئر! تمہیں صورت حال کا اندازہ نہیں۔ خیر تم جاؤ، موج میلہ مناؤ، رابطہ رہے گا۔''

''ہاں، رابطہ تو رکھنا ہوگا تمہیں۔''

''وہ میں رکھوں گا۔تم اطمینان سے جاؤ۔'' یہ کہہ کر چند الوداعی باتیں کیں اور میں نے فون بند کر دیا۔اگلے ہی چند لمحوں میں بس رک گئی۔

وہ دوبئی کے لیے براہ راست پرواز تھی۔ میں نے سیٹ بیلٹ کھول کر اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔میرے ساتھ دائیں طرف ایک ادھیڑ عمر شخص تھا، مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے روایتی انداز میں بات شروع کر دی۔ اتنے میں فضائی میزبان آگئیں۔اس نے اپنی گفتگو کا آغاز انہی سے کیا اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔وہ شخص خاصا باتونی تھا۔وہ کہتا رہا اور میں سنتا رہا۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں جو لاہور ائیر پورٹ تک ذہنی دباؤ میں تھا، وہ بہت حد تک ختم ہوگیا۔پھر جلد ہی اس سے اکتا گیا۔میں نے اپنے لہجے کو انتہائی نرم رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

''میں دو دنوں سے جاگ رہا ہوں، نیند سے میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ پلیز، کوئی ائیر ہوسٹس بھی آئے تو اسے ڈسٹرب نہ کرنے دیجئے گا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔آپ سو جاؤ۔''اس نے ہمدردی سے کہا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔

اس وقت مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا جب کاونٹر کے دوسری جانب کھڑے ایک انتہائی کم عمر آفیسر کو میں پاسپورٹ دے چکا۔وہ بڑے دھیان سے میرا پاسپورٹ چیک کر رہا تھا۔میں اپنی اس کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ میں دوبئی آنے کے لیے ذہنی طور پر قطعاً تیار نہیں تھا اور مجھے اچانک ہی یہ سفر کرنا پڑا تھا۔پھر اس نے مجھ سے کچھ پوچھا تو میں اپنی اس کیفیت سے باہر نکل آیا۔اس کا سوال میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔تو قدرے اونچی آواز میں اس نے انگریزی میں پوچھا۔چند سوالوں کے بعد وہاں سے آگے بڑھنے کا اذن دے دیا گیا۔ مجھے اس وقت سگریٹ کی شدید طلب ہو رہی تھی مگر میری جیب میں سگریٹ نہیں تھے۔میں نے اس طلب کو نظر انداز کیا اور اپنا سامان لے کر ائیر پورٹ سے باہر آگیا۔فطری طور پر میں نے حیدر شیخ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا، وہ دائیں طرف کھڑا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔پھر وہ آگے بڑھا اور میرے قریب آکر والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا۔وہ شاید کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن شدت جذبات سے کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا۔اس کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے نے مجھے سب بتا دیا۔ہم کچھ دیر وہیں کھڑے حال احوال شیئر کرتے رہے۔تبھی ایک پٹھان ہمارے پاس آن کھڑا ہوا تو حیدر نے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''گل شیر! سامان رکھو۔''

پھر کچھ دیر بعد ہی سامان رکھ کر گل شیر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ وہ نئے ماڈل کی ہنڈا اکارڈ تھی، جلدی ہم ائیر پورٹ کی حدود سے نکل آئے۔ کار کے اندر خاموشی تھی۔ میرے ذہن میں کئی سوال امنڈتے چلے آرہے تھے اور میں ان کے جواب کے لیے بے تاب تھا۔ حیدر میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر خاموش بیٹھا ہوا تھا سو میں نے بھی خاموشی ہی کو بہتر جانا۔ میں بائیں طرف بیٹھا تیزی سے گزرتے ہوئے مناظر دیکھ رہا تھا۔ ایک بڑے سے انٹرسیکشن کے بعد ایک پل آگیا تو حیدر نے کہا۔

''یہ ال گرہاور برج ہے جو دوبئ کریک پر بنا ہوا ہے۔ یہ کریک ہی دوبئ کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے، ڈیرہ ڈوبئی اور پار دوبئ، اب ہم پار دوبئ میں جمیرہ کی طرف جا رہے ہیں۔'' حیدر کی آواز خاموشی میں گھل کر رہ گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر ہلکی سی مسکان سے کہا۔

''اور کچھ؟؟'' اگرچہ میں نے طنزیہ انداز میں کہا تھا مگر وہ بڑی سنجیدگی سے شروع ہوگیا۔

''دوبئ جسے ''خریداروں کی جنت'' اور ''سٹی آف گولڈ'' کہا جاتا ہے، اسے اپنی موجودہ حیثیت ترقی اور خوشحالی تک پہنچنے میں کئی سال لگے ہیں۔ پہلے پہل یہ رفتار انتہائی ست تھی۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ یہاں اتنی بلڈنگیں بھی بن سکیں گی۔ شمال کی جانب اومان اور یمن کے درمیان تجارتی رابطے سے اپنی حیثیت منوائی، مشرق کی جانب سے پہاڑوں میں گھرا اور شمال مشرق سے عرب کے وسیع وعریض صحراؤں کے باعث ساری دنیا سے کٹا ہوا دوبئ صرف سمندری راستے کی وجہ سے باقی دنیا کے ساتھ رابطہ رکھ سکتا تھا۔ اگرچہ یہ ویرانی اس خطے کے باسیوں کو کچھ بھی نہیں دے رہی تھی لیکن تاجروں اور صحرائی بدوؤں کے ملنے سے یہی ویرانی دھیرے دھیرے اس خطے کو اہم ترین بناتی چلی گئی۔ 1833ء کے لگ بھگ'' یاس ''خاندان کی ایک شاخ کے سربراہ عبید بن سعید الخذوم ابوظہبی کو چھوڑ کر دوبئ میں آکے آباد ہوگئے اور تقریباً آٹھ سو افراد پہ مشتمل لوگوں نے مچھلی اور موتیوں کی تجارت کا آغاز کیا۔ وہ اونٹ اور بکریوں کو پالنے کے علاوہ کھجور کی پیداوار پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ یہ کوئی وسیع پیمانے پہ تجارت نہیں تھی لیکن آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ یہ علاقہ سارے گرد ونواح کے لیے تجارتی مرکز کے طور پر متعارف ہوگیا۔ 870ء کے وسط تک یہ تجارتی مرکز کے طور پر اپنی حیثیت منوا چکا تو یہاں پر ایران، ہندوستان اور مشرقی افریقہ سے تجارت کا دروازہ کھل گیا۔ موتیوں کی تجارت دوبئ میں بنیادی حیثیت رکھتی تھی مگر 1940ء میں ''کلچرڈ موتی'' کی ایجاد سے یہاں کی

تجارت کو دھچکہ لگا۔ یہ تجارت ختم ہو کر رہ گئی مگر یہ لوگ جلد ہی سنبھل گئے۔ موتیوں کی جگہ سونے کی تجارت نے لے لی۔1966ء میں تیل کی دریافت ہوئی تو دوبئ میں معاشی اور صنعتی استحکام آ گیا۔ تیل کی دولت نے انہیں مضبوط بنیاد فراہم کر دی اور یہاں پر دولت کی ریل پیل ہو گئی۔ دوبئ بھی برطانیہ کے توسع پسندانہ عزام کا شکار ہوا۔ 1971ء میں برطانیہ کے انخلا کے بعد ابوظہبی کے حکمران شیخ زین بن سلطان النہان اور دوبئ کے حاکم شیخ راشد بن سعید الخدوم کے درمیان ایک معاہدے کے تحت ریاستوں کا الحاق ہوا۔ اس طرح 2 دسمبر 1971ء میں متحدہ عرب امارات وجود میں آیا۔ ابوظہبی وفاقی حکومت اور تیل کی پیداوار کا مرکز ہے جبکہ دوبئ تجارت کا۔ دوبئ کی آبادی تقریباً دس لاکھ کے قریب ہے جس میں اسی فیصد لوگ غیر ملکی ہیں اور بیس فیصد مقامی باشندے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اسی فیصد غیر ملکی بھارتی ہیں اور باقی دیگر قومیتوں یا ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان عربی ہے، انگریزی بھی سمجھی اور بولی جاتی ہے لیکن فارسی کے علاوہ سب سے زیادہ اردو ہی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس اردو کو ہندی کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے اتنی تعداد میں یہاں ہونے کی کئی وجوہ ہیں۔ صدیوں پہلے یہاں جب ویرانی تھی، دوبئ محض ایک تجارتی اڈہ تھا تب ہندوستانی تاجر آتے تھے۔ تیل کی دولت سے پہلے جب انگریزوں کا تسلط تھا، اس وقت بھی کھجور اور مچھلی کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ تب یہاں کرنسی بھی برٹش انڈیا کی چلتی تھی جو آج بھی ان کے عجائب گھروں میں پڑی ہوئی ہے۔ قریب ترین ملک ایران اور ہندوستان تھا جہاں سے سامان آتا تھا۔ ہندو تاجر اور ساہوکاروں نے تب ہی سے اپنا تسلط جمانا شروع کر دیا۔ تب یہاں کے بادشاہ برائے نام بادشاہ تھے۔ وہ ہندو ساہوکاروں سے قرضہ لیتے اور پھر مکڑی کے جالے میں پھنس جاتے تھے۔ دولت اور عورت دو ایسی چیزیں تھیں جنہوں نے دوبئ کی سرزمین پر ہندوؤں کو آباد کرنے میں مضبوط سہارا فراہم کیا۔ یہاں تک کہ مقامی لوگوں نے بھارت میں رشتہ داریاں قائم کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسی فیصد غیر ملکیوں میں اسی فیصد بھارتی ہیں۔ ہندو ہر طرح کے کاروبار پر چھائے ہوئے ہیں۔ پچھلی دو دہائیوں سے بھارت نے اپنے ملک کی معیشت کے لیے ایک نئی طرح کی جہت اپنائی ہے جس میں عورت کا استعمال بہت حد تک ہے۔ اگرچہ یہ کوئی نئی بات نہیں لیکن بھارت نے اسے نئی طرز دے دی ہے۔ یہی بھارتی جہت اب دوبئ میں بہت زیادہ دیکھنے میں آ رہی ہے۔ دوبئ ایک اسلامی ریاست ہے، اس کی روایات بھی اسلامی ہیں۔ تاہم اس ریاست میں غیر ملکیوں کے ساتھ انتہائی درجے کی رواداری رکھی جاتی ہے۔ یہاں پر ہر مذہب کا فرد اپنی مذہبی روایات کے ساتھ آزادی اور سکون سے زندگی گزار سکتا ہے۔ ایک طرف

اگر شراب کھلے عام بکتی ہے تو دوسری جانب خوبصورت اور پر آسائش مساجد قائم ہیں۔ نائٹ کلبوں میں جسموں کی نمائش ہوتی ہے تو حجاب پہنے خواتین بھی عام دکھائی دیتی ہیں۔ ہوٹلوں میں قحبہ خانے ہیں تو ہر طرح کی سہولت سے مزین دینی ادارے بھی موجود ہیں۔ دراصل یہاں کے حکمرانوں نے ہر فرد کے لیے سب کچھ بنا دیا ہے اور فرد پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جدھر جانا چاہے، چلا جائے۔ دوبئی ایک مسلم ریاست ہے اور دنیا بھر کے مختلف مذاہب کے لوگوں کو یوں اپنے اندر سموتا چلا جا رہا ہے کہ اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔''

حیدر ایک ماہر گائیڈ کی طرح میری معلومات میں اضافہ کرتا رہا اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد کار ایک بڑی سڑک سے اتر کر ذیلی سڑک پر مڑ گئی اور اس کے ساتھ ہی ایک پوش رہائشی علاقہ شروع ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد کار ایک خوبصورت بڑے سے بنگلے کے سامنے رک گئی۔ ہارن کے جواب میں فوراً ایک تنومند شخص نے گیٹ کھول دیا اور گل شیر نے کار پورچ میں جا روکی۔ میں نے دور ہی سے ندیم اور اس کے ساتھ کھڑے ایک مرد اور عورت کو دیکھ لیا تھا۔ میرے کار سے باہر نکلتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھا اور گلے لگ گیا۔ لمحوں بعد میں نے اسے خود سے الگ کیا تو اس کی آنکھوں میں نمی تھی، میں پریشان ہو گیا۔

''اے، ندیم! کیا ہوا تجھے؟'' میرے لہجے میں تشویش پا کر وہ جلدی سے بولا۔

''شجاع بھائی! میں یہاں بہت خوش ہوں، بس آپ کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں۔''

''یہ تمہاری آنکھوں میں نمی؟''

''خوشی سے، شجاع بھائی! خوشی سے۔۔۔'' ندیم نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تو حیدر نے ندیم کے ساتھ کھڑے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ ستیش مہتہ ہے۔''

''نمسکار۔۔۔!'' فوراً ہی اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور پھر میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس نے بڑے سلیقے سے بال بنائے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں پر گول فریم کی نازک سی عینک، باریک باریک مونچھیں، کرتے پاجامے کے ساتھ اس نے ہلکے چرمی سلیپر پہنے ہوئے تھے۔ سانولا سا ستیش متہہ میری جانب بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ کا ذکر تو میں پاکستان میں سن چکا ہوں، کیسے ہیں آپ؟''

''بہت اچھا ہوں، آپ سنائیں، سفر کیسا گزرا؟'' اس کا لہجہ پر جوش تھا۔

''بس گزر گیا۔''میں نے دھیرے سے کہا تو حیدر نے ساتھ کھڑی لڑکی کی جانب دیکھ کر بتایا۔

''یہ کنول جیت کور ہے۔''

''جی آیاں نوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا نازک سا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا جس میں سونے کا کنگن تھا۔ پتلی سی کنول نے سیاہ جینز اور ہلکے گلابی رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی، کھلے بال کمر تک آئے ہوئے تھے۔ وہ قدرے سانولے رنگ کی تھی مگر نین نقش غضب کے تھے، شاید چڑھتی جوانی میں چہرے کے نقوش ایسے ہی غضب ناک ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس کا اتھ تھام لیا اور کہا۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''

''میں بھی بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا ذکر تو بہت عرصے سے یہاں ہو رہا ہے، بڑا تجسس تھا کہ آپ کو دیکھیں۔''

''پھر کیسا پایا مجھے؟''میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''پہلی نظر میں تو بہت اچھا، ویسے آپ کے بارے میں ہم نے سن بھی بہت رکھا ہے۔''کنول نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے ندیم سے پوچھا۔

''تم ائیر پورٹ کیوں نہیں آئے۔؟''

''میں نہیں لے کر گیا تھا، یہ یہاں ڈنر کا بندوبست کر رہے تھے اور میں اپنے دفتر سے سیدھا ائیر پورٹ گیا تھا۔''اس نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا تو میں چپ ہو گیا، تبھی وہ بولا۔'' آپ، حضور! اگر زحمت نہ کریں تو چلیں اندر وہیں اطمینان سے بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں۔''اس پر میں نے حیدر کی طرف غور سے دیکھا تو وہ قہقہہ لگا کے ہنس دیا اور پھر ہم سب اندر چلے گئے۔ وہ بڑا خوبصورت اور آرام دہ سٹنگ روم تھا۔ دبیز قالین پر صوفے اور درمیان میں دھری میز، وہ کمرہ روایتی انداز میں سجایا گیا تھا۔ میں ایک صوفے پر ٹک گیا تو ندیم سب کے بارے میں پوچھنے لگا۔ کچھ دیر یونہی باتوں میں گزری، تبھی حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ حضور کو کمرہ دکھا دیا جائے جہاں آپ غسل فرمائیں گے تا کہ بعد میں تناول ماحضر۔۔۔''

''تمہارے ساتھ کوئی لکھنؤ کا بندہ رہتا ہے کیا؟''میں نے بھنا کر پوچھا تو ہنس دیا۔ پھر میں اٹھا تو ندیم نے اوپری منزل پر موجود اس کمرے تک رہنمائی کی جہاں میرا سامان پہنچا دیا گیا تھا۔ بیگ اور سوٹ کیس میرے سامنے تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس میں کیا کچھ ہے۔

میں نے جیب سے کی پرس نکالا اور سوٹ کیس کھول لیا۔ اس میں میرے کپڑوں کے علاوہ ذاتی استعمال کی چیزیں بھری ہوئیں تھیں۔ میں تیار ہو کر نیچے سٹنگ روم میں آیا تو کھانا لگ چکا تھا۔ بھوک بڑے زوروں کی لگ رہی تھی، کھانا بھی خاصا پر تکلف تھا۔ اس دوران سبھی سے ہلکی پھلکی باتیں چلتی رہیں۔ کھانے کے بعد بنگلا دیشی باورچی نے ہمارے سامنے کافی لا رکھی، تبھی حیدر نے ستیش اور کنول جیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ دونوں بہت باصلاحیت ہیں، اب ندیم بھی ان کے ساتھ ہے۔ ان تینوں نے بہت حد تک کام سنبھال لیا ہے۔ اب تم آ گئے ہو تو سب کچھ تمہیں دیکھنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے کافی کا سپ لیا اور بولا۔ ''میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب آپ لوگوں کے درمیان اجنبیت نہیں رہنی چاہئے۔''

''شجاع صاحب کم از کم میرے لیے تو اجنبی نہیں ہیں۔'' ستیش نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ سے اور پھر ندیم سے ان کے بارے میں اتنا کچھ سن چکا ہوں کہ میں یہ تک بتا سکتا ہوں کہ ان کی پسند اور ناپسند کیا ہے۔''

''دراصل ندیم آپ کو مس کرتا رہا ہے۔'' کنول جیت نے اپنے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے ٹکاتے ہوئے کہا تو ستیش دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''باقی رہی کام وغیرہ کی بات، یہ تو چلتا رہے گا۔ وہ آپ کے ایک پاکستانی شاعر کے بقول ؎

فکر کیسی، اگر اللہ نے چاہا تو، قتیل
اپنے سب کام حسینوں کی دُعا سے ہوں گے''

یوں کافی دیر تک یونہی باتیں چلتی رہیں۔ پھر جب رات کافی ہو گئی تو حیدر نے ان تینوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اب آپ لوگ جا کے آرام کرو، بہت رات ہو گئی۔ صبح دفتر میں ملاقات ہو گی۔'' یہ سنتے ہی وہ تینوں اٹھ گئے۔ تو میں نے ندیم کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ارے، تم کہاں؟''

''یہ اپنے ندیم صاحب انہی کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہاں سے پیدل کا راستہ ہے، ایرانی ہسپتال کے ساتھ ایک بلڈنگ کے رہائشی اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ اسی بلڈنگ میں دفتر ہے، ہم وہاں صبح جائیں گے۔'' میں سمجھ گیا کہ وہ تنہائی چاہتا ہے اور مجھے بھی ایسے ہی کسی ماحول کی ضرورت تھی۔ ان سب نے باری باری ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔ ہم بھی اوپری منزل کے اس

کمرے میں آ گئے جہاں میرا سامان پڑا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی بیڈ پر پھیل گئے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال اس سے کرتا، اس نے درمیان میں ایش ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔

''شجاع! مجھے پتہ ہے کہ تم مجھ سے کیا کچھ پوچھنا چاہ رہے ہو گے، کتنے سوال ہوں گے تمہارے پاس جن کے جواب تمہیں چاہئیں۔ میں خود بھی تمہیں آج رات ہی ساری الف لیلیٰ سنا دینا چاہتا ہوں۔ ایسا اس لیے، میری جان! کہ اسی الف لیلیٰ میں نہ صرف تمہارے سوالوں کے جواب موجود ہیں بلکہ آئندہ آنے والے حالات میں تمہیں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں آسانی رہے کیونکہ اب تمہیں بہت سارے فیصلے کرنے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور درمیان میں رکھ دیا۔ پھر ہم دونوں ہی نے اپنے اپنے سگریٹ سلگائے تو اس نے بھرپور کش لے کر کہا۔ ''شجاع! زندگی بڑی عجیب سی شے ہے۔ انسان اپنے فیصلے اپنی خواہشوں کے مطابق کر لیتا ہے مگر حالات اپنے اندر کیا کچھ رکھتے ہیں، اس سے بے خبر ہوتا ہے۔ فیصلے کالعدم ہوتے ہیں، ارادے ٹوٹ جاتے ہیں اور خواہشیں دم توڑتی ہیں تو جینے کے لیے انسان سہارے تلاش کرتا ہے لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنے والے حالات اتنا کچھ دے دیتے ہیں کہ انسان نے کبھی اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں ہوتا۔ بے شمار نعمتیں مل جاتی ہیں اور یہی آزمائش کڑی ہوتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کش لے کر میری جانب دیکھا اور پھر بولا۔ ''دوست بھی نعمت ہیں، پرخلوص دوست قدرت کا عطیہ ہوتے ہیں۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو دولت کے معیار پر انسانوں کو پرکھتے ہیں۔ شجاع! میں تمہارے لاہور کے دوستوں سے واقف نہیں تھا۔ میں ان کے لیے اور وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ میں جب لاہور تمہارے پاس آیا تب ہی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ میرے لیے سبھی محترم ہیں۔ میں جب لاہور تمہارے پاس آیا تھا تب میرے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ تمہیں اپنے ساتھ دوبئی لے آؤں۔ مجھے بھرپور یقین تھا کہ تم آ جاؤ گے اس لیے میں سارے بندوبست یہیں سے کر کے چلا تھا۔ دوسرا مقصد جویریہ کے باپ کو یہ احساس دلانا تھا کہ ہم بھی ہیں جواب تک اسے نہیں بھولے، کم از کم میں اسے نہیں بھول سکتا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''بس سنتے چلے جاؤ، یار! ابھی تو کچھ بھی نہیں۔ اس ساری الف لیلیٰ میں بہت سے انکشاف ہیں، کہاں تک چونکتے رہو گے۔'' اس نے لمبا کش لیا اور پھر میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ''تم میرے سامنے چاہے جتنا مرضی انکار کرتے چلے جاؤ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح میں جویریہ کے باپ کو نہیں بھولا، اسی طرح وہ تمہیں بھی یاد ہوں گے اور اچھی طرح

ہوں گے۔ میں نے اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اس کا باپ اپنی ملازمت کی آخری نہج پر ہے۔ ایک آدھ سال میں وہ ریٹائیر ہو جائے گا۔ بہت ناجائز کمائی کی ہے اس نے، میں جانتا ہوں۔ میں نے چاہا تھا کہ تم یا تمہارے کسی صحافی دوست کے ذریعے اسے ننگا کر کے رکھ دیں، سزا یا جزا بعد کی بات تھی۔ بس وہ ہمارے سامنے گھٹنے ٹیک کر معافی مانگتا لیکن۔۔۔، یہ الگ سی بات ہے کہ جویریہ کے باپ کے ساتھ کیا کرنا تھا یا کریں گے۔ میں نے ٹھیک اسی جگہ پلاٹ خریدا ہے جہاں اس نے اپنی ناجائز کمائی سے کوٹھی بنوائی ہے۔ وہاں ایک شاندار گھر کی شروعات بہت جلد ہوگی۔"

"تمہیں یہ سب کچھ۔۔۔" میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"میں جب آبائی قصبے سے واپس لاہور آیا تو میری ایک طویل ملاقات حسن سے ہوئی۔ وہ بہت اچھا بندہ ہے۔ میں نے نائلہ اور زارا کے بارے میں تفصیلی طور پر جاننا چاہا تھا۔ ان کے بارے میں جو معلومات ملیں سو ملیں، تمہارے حالات جان کر پریشان ہو گیا۔ اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ مجھے تمہارے حالات بتائے جن میں تم پھنس کر رہ گئے تھے۔ بلاشبہ حسن تمہارا انتہائی مخلص دوست ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔ وہ میرے ہر آڑے وقت میں کام آتا ہے، وہ نہ ہوتا تو میں اب تک پاگل ہو چکا ہوتا۔"

"نہیں، پاگل نہیں۔ تم اس زمین پر ہی نہ ہوتے، زندگی اور موت کا اختیار تو میرے رب اللہ کے پاس ہے مگر اس دھرتی پر بھی تو کچھ وسیلے ہوتے ہیں۔ میں یہاں بھی آ گیا لیکن پھر اس سے رابطہ رہا۔ اس نے مجھے فون پر بتایا کہ کسی ودود شاہ وغیرہ کے ساتھ تمہاری ٹھن گئی ہے اور وہ قوت کے ساتھ تمہیں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ملک منیر۔۔۔۔"

"یہ حسن نے بتایا تمہیں؟" میں اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، اسی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں تم سے بات کروں اور تمہیں سمجھاؤں۔ اس کا کہنا تھا کہ شجاع کو یا تو چند دنوں کے لیے پس منظر میں چلے جانا چاہئے یا پھر دوبئی بلا لوں، وہ ٹھیک سوچ رہا تھا۔"

"حسن کا ڈر بلاوجہ تھا، وہ ودود شاہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"یہ تمہارا وہم ہے، پیارے! وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ معاملہ ماریہ یا منیر ملک تک

محدود نہیں تھا اس کی گینگ کا ہے، آصف چوہدری نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ ودود شاہ اور اس کی گینگ کو ختم کردے گا۔ یہ اس کی اپنی بقا کا بھی مسئلہ ہے۔''

''مگر۔۔۔ مگر حسن اور تم ۔۔۔ آصف چوہدری کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''تم نے حسن سے اپنے اور آصف چوہدری کے تعلق کو چھپایا۔ یہ حسن کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے تمہیں اس تعلق کے بارے میں جتایا نہیں ورنہ وہ بہت پہلے سے تم دونوں کے تعلق کے بارے میں جانتا تھا۔ اسے شک اس وقت ہوا تھا جب تم زخمی ہو کر ہسپتال جا پہنچے تھے۔ تمہیں شاید یاد نہ رہا ہو لیکن تم نے اس کے سامنے کسی آصف نامی شخص کو اقدام قتل سے باز ار رکھنے کے لیے کہا تھا اور ماریہ کو اپنا مسئلہ گردانا تھا لیکن ہوا کیا؟ ملک منیر قتل ہو گیا اور پھر ماریہ کی خودکشی ۔۔۔ حسن نے ساری کڑیاں ملائیں اور پھر وہ تم دونوں کے بارے میں جان کر خاموش رہا۔ حسن کو ملک منیر گینگ کے بارے میں بھی پوری طرح واقفیت تھی۔ پھر اس نے تھوڑا ماضی کو کریدا تو سب کچھ واضح ہو گیا، اس نے اپنے ذرائع سے آصف چوہدری کے ساتھ رابطہ کیا اور پھر تمہیں جتائے بغیر وہ اس کا بہت اچھا دوست بن گیا۔ دراصل حسن کی جڑیں ملک منیر گینگ میں زیادہ تھیں۔ ملک منیر کے بعد جب اس کا گینگ ابھرا تو وہ بھی تم سے انتقام لینے کے لیے تمہارے قتل کے درپے تھا۔ ان دنوں وہ پوری تیاری میں تھے کہ تم پر وار کر جائیں۔ انہیں سے ودود شاہ کی تھپکی مل گئی تھی، اسی باعث تو ودود شاہ نے اچانک ہی جارحانہ قدم اٹھایا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے کش لیا اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی۔

''یہ ودود شاہ کون ۔۔۔''

''حسن جانتا ہے اسے۔ وہ ملک منیر کا جگری دوست ہے۔ کچھ سال پہلے بنکاک چلا گیا تھا۔''

''مگر یوں اچانک ۔۔۔''

''او، بابو! میں نے کہا نا، کہ آصف چوہدری نے ودود شاہ کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے مگر حسن ہی نے اس سے کہا تھا شجاع کو ری پلیس ہو جانے دو، پھر جو مرضی کر لینا۔ اس نے فوری طور پر مجھ سے رابطہ کیا اور ۔۔۔ اور چند دنوں میں ودود شاہ کا کام ہو جائے گا۔''

''مجھے اس نے احساس تک نہیں ہونے دیا؟'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''اس نے کسی کو بھی احساس نہیں ہونے دیا۔ میں جب تک وہاں رہا، وہ مجھے دھیرے دھیرے بتاتا رہا۔ میں اس کی عقل اور دوراندیشی کی داد دیتا ہوں۔ اس نے بہت سوچ

سمجھ کر مجھ سے بات کی تھی اور پھر میرے ساتھ رابطہ رکھا جس کا نتیجہ دیکھ لو کہ تم یہاں ہو اور پوری طرح محفوظ ہو۔"

"حیدر! میں مانتا ہوں کہ اس کے خلوص میں کوئی شک نہیں لیکن یوں وہاں سے آ جانا کیا ایک بزدلانہ عمل نہیں ہے، کیا ودود شاہ وغیرہ انہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے؟"

"یہ کوئی بزدلی نہیں ہے، پیارے! اسے حکمت کہتے ہیں۔ وہ لوگ بھی تو تمہیں دھوکے سے مارنا چاہتے تھے، میں نے کہا نا، جسے میرے سوہنے رب نے زندگی دینی ہوتی ہے اس کے سو وسیلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ وہاں تمہارے لیے حالات انتہائی خطرناک ہو چکے تھے۔ لیکن ان خراب ترین حالات میں بھی تمہاری بھلائی چاہنے والے بہت تھے۔"

"مثلاً؟" میں نے پوچھا۔

"زارا، اس نے ہمیشہ تمہاری بھلائی چاہی ہے۔"

"اب میں تمہیں پاگل کہوں گا۔ تم خود ہی۔۔۔"

"میں نے ہی تمہیں اس سے دور رہنے کا مشورہ دے رہا تھا اور وہ بھی تم سے بے اعتنائی برت رہی تھی لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ وہ تمہارے لیے مخلص ہے، تبھی اس نے تم سے غیروں والا سلوک کیا۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا، پھر سنجیدگی سے بولا۔ "یہ تو تم بھی جانتے ہو اور اچھی طرح سمجھتے ہو کہ یہ جو فلم سٹار قسم کے لوگ یا خصوصاً شوبز سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان کا کسی نہ کسی گروپ، مافیا انڈر ورلڈ کے لوگوں سے تعلق ضرور ہوتا ہے۔ ان کے سہارے چلتے ہیں، وہ انہیں تحفظ دیتے ہیں اور یہ لوگ انہیں کیا کچھ دیتے ہیں، یہ بھی تم جانتے ہو۔ زارا اصل میں ملک منیر گینگ سے تعلق رکھتی تھی۔ جب تمہاری اس فلم سٹار ہما سے ان بن ہوئی تو اس کا فائدہ اٹھا کر زارا تمہارے قریب کر دی گئی۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ کسی بھی وقت اس کے ذریعے تمہیں گھیرا جا سکے۔ وہ بات تو انہی کی مانتی تھی مگر وقت کے ساتھ وہ تم سے متاثر ہو گئی۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی لیکن ملک منیر کے قتل ہو جانے کے بعد وہ خوف زدہ ہو گئی سو اس نے اپنا منہ بند رکھا۔ اس گینگ کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو کئی لوگوں نے پر پرزے نکال لیے۔ ایک بار تو ملک منیر گینگ بکھر گیا، پھر اس کا گینگ ابھر کر سامنے آیا۔ ان دنوں تم ندیم کے ذریعے اس کی مدد کر رہے تھے۔ حسن نے مجھے زارا کے متعلق بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔ ان دنوں زارا دہرے عذاب میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ تم پر اپنا آپ ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی اور تمہیں بھی بچا لینا چاہتی تھی کیونکہ انہی دنوں اس کا گینگ انتقام کے چکر میں زارا پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ تمہیں گھیرے اور پھر کسی ویرانے میں تمہاری لاش گرا دی جائے۔ میں زارا کو کریدتا

چاہتا تھا۔ مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی اور اس نے مجھے صاف لفظوں میں ساری صورت حال بتا دی۔ میرا اس کے ساتھ تعلق محض ایک ڈرامہ تھا تا کہ تم اس سے متنفر ہو جاؤ اور وہ تم ہو گئے۔ میں نے یہاں آ کر زارا سے رابطہ رکھا۔ وہ مجھے حالات سے باخبر رکھے ہوئے تھی۔ حسن اور زارا کی اطلاعات نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا اور پھر میں نے حسن سے کہا کہ وہ فوری طور پر تمہیں وہاں سے نکال دے، کچھ انتظامات تو مکمل تھے اور پھر تم یہاں آ گئے۔''

''حسن کتنا گہرا ہے۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

''وہ آصف چوہدری کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا کہ ودود شاہ کو قتل نہ کرے بلکہ ویسے ہی چھوڑ دے، اس طرح معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔''

''مگر وہ چھوڑے گا نہیں، میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''ہاں، یہ آپشن بھی اس کے ذہن میں ہے۔ ایسی صورت میں اس کے پاس بندوبست ہے، کیا ہے؟ میں نہیں جانتا مگر ایک بات سے مجھے بہت خوشی ہوئی، شجاع!''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے اس رات جتنے بھی دوست ملوائے، سبھی تمہارے ساتھ مخلص ہیں۔ تمہیں بھی پتہ ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ معاشی لحاظ سے تمہاری پوزیشن کیا ہے۔ تمہارے والدین کا کاروبار۔۔۔ وہ اپنی جگہ، میں اس کی بات نہیں کرتا۔ تم نے لاہور میں رہ کر کیا کمایا اور کیا خرچ کیا۔ تم سوچو کہ جس قدر گھمبیر حالات سے تمہارا واسطہ پڑا ہے، کیا تم اکیلے ان سے نکل سکتے تھے؟''

''نہیں، حیدر! بالکل نہیں۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''عامر نے تمہارے لیے بہت خوچ کیا۔ نائلہ نے بنا کچھ کہے ساری جمع پونجی تم پر لٹا دی۔ وہ مسز خان والا گھر جسے تم کرایہ پر سمجھ رہے تھے، نائلہ کی ملکیت ہے اور مسز خان وغیرہ اس کے کرایہ دار ہیں مگر اس نے تمہیں احساس نہیں ہونے دیا محض اس لیے کہ کہیں انا وغیرہ کے چکر میں تم وہاں رہنے سے انکار نہ کر دو اور یہ ندیم اس کے یہاں آنے کا سارا خرچ نائلہ نے دیا۔ میں نے اسے بہت منع کیا کہ میں کر رہا ہوں مگر اس نے زبردستی دیا۔ اس سے بڑھ کر اس نے ایک لمبی رقم دی تا کہ ندیم اپنے والدین کو دے جائے اور وہ اس رقم سے اس کی چھوٹی بہن کی شادی کر دیں۔ یہ سب لوگوں کی محبتیں کس وجہ سے تھیں، میرے خیال میں کچھ عرصہ پہلے تک تم ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں ہو گے؟''

''بس کرو، حیدر! میرا دماغ پھٹ جائے گا؟''

''حوصلہ کرو، میرے دوست! اور سنو کہ میں نے یہ سب تمہیں کیوں باور کرایا ہے۔ وہ اس لیے کہ خلوص اور محبت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں لیکن مجھے یہ بتاؤ ضرورت پڑنے پر تم کسی کی کیا مدد کر سکتے ہو؟ اب یہ مت کہنا کہ جان دے دو گے۔ یہ انتہائی گھٹیا اور تھرڈ کلاس ڈائیلاگ ہے، زندگی کی حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو، یار۔!'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''شجاع! تم یہاں رہو گے تو ہو سکتا ہے، میرے بہت سارے کاموں پر تمہیں اعتراض ہو لیکن جان لو کہ دولت ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ میرا یہ سب کچھ بتانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ تم یہاں رہ کر بھلے کوئی کام نہ کرو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ جب واپس جانا چاہو، جا سکتے ہو اور مجھے پھر بھی کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ تمام حالات تمہارے سامنے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں رہ کر ڈھیر ساری دولت کماؤ اپنے لیے، ان دوستوں کے لیے جو قدم قدم تمہاری مدد کرتے رہے اور وقت آنے پر تم ان کی بھی مدد کر سکو۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے پیکٹ کے ایک سگریٹ میری طرف بڑھا کر دوسری خود سلگا لی۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر لفظ میرے ہونٹوں پر آ کر دم توڑتے رہے اور میں خاموش رہا۔ ہمارے درمیان یہ خاموشی اس قدر بڑھی کہ ہم دونوں ہی کے سگریٹ ختم ہو گئے۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور اٹھ گیا، پھر سلیپر پہنتے ہوئے کہا۔

''تم سو جاؤ، باقی باتیں پھر ہوں گی'' یہ کہہ کر وہ نکل گیا مگر اس کی کہی ہوئی باتوں کی بازگشت کتنی ہی دیر تک میرے اردگرد پھیلی رہی۔ مجھے یہ زعم تھا کہ سب کے بہت کام آ رہا لیکن وہ سب میرے لئے اتنا کچھ کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ دباؤ کے باعث میرے سر میں پھر سے درد ہونا شروع ہو گیا ہے۔ میں نے ساری سوچیں ذہن سے جھٹک دیں اور سکون سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا، پھر نجانے کب میں نیند کی بانہوں میں جا گرا۔

پتہ نہیں رات کا وہ کون سا پہر تھا۔ ایک عجیب اور ناسمجھ آنے والے خواب کے باعث میں بیدار ہو گیا۔ اس خواب کا تاثر کیا تھا؟ میں اس کا تعین ہی نہ کر سکا۔ نہ کوئی خوف، نہ ڈر، نہ خوشی اور نہ مایوسی، بس ایک خلا تھا جس میں سناٹا بول رہا تھا۔ ایک انجانی گرفت تھی جس نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ وہ خواب میرے ذہن پر اس قدر سوار ہوا تھا کہ میں نے گھڑی کی طرف بھی نہیں دیکھا۔ بس یونہی کمرے میں پھیلی نیلگوں روشنی میں آنکھیں کھولے، خواب کی جزئیات کو پھر سے ذہن میں دہرانے کی کوشش کرتا رہا۔ میرے خیال میں وہ سرو پا خواب تھا۔

میں ایک کھلی سڑک پر تنہا پیدل چلتا جا رہا تھا۔ میرے اردگرد اندھیرا تھا لیکن میرے ساتھ ساتھ روشنی چل رہی تھی۔ اس روشنی سے نہایا ہوا تھا اور اس روشنی کے باعث محض چند فٹ تک ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سیدھی سڑک اندھیرے میں گم ہوگئی تھی اور سڑک کنارے لگے قطار میں کھڑے درخت سوکھے ہوئے تھے، ایک بھی ایسا درخت نہیں تھا جس پر ذرا سا بھی سبزہ ہو۔ میرے ساتھ چلنے والی روشنی محدود سی تھی جس میں ایک بے تاثر منظر میرے ساتھ چلتا چلا جا رہا تھا اور کوئی انجانی قوت مجھے آگے ہی آگے چلتے جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ سیاہ تارکول کی سڑک اور سوکھے درختوں کی قطاریں اور محدود روشنی! میں چلتا چلا جا رہا تھا اور اس اندھیرے ویرانے میں ہر طرف سناٹا تھا۔ پھر پتہ نہیں کتنا وقت اسی طرح پیدل چلتے ہوئے گزر گیا کہ اچانک میرے پاؤں تلے سے وہ سڑک غائب ہوگئی اور میں ہوا میں تیرنے لگا۔ میرا جسم بے وزن ہو چکا تھا۔ میں اوپر ہی اوپر اٹھنے لگا۔ وہ محدود سی روشنی وہیں پڑی رہ گئی۔ کتنی دیر تک یونہی بے کیف سناٹا رہا۔ وہ محدود روشنی پڑے پڑے پھیلنے لگی اور سڑک کنارے سوکھے درختوں پر چڑھنے لگی۔ اسی روشنی سے وہ درخت چمکنے لگے اور پھر ان میں آگ بھڑک اٹھی۔ مجھے لگا جیسے ان درختوں سے اٹھنے والے دھویں سے میری آنکھیں جلنے لگی ہیں۔ یہ چبھن دھیرے دھیرے بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ میں آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہوگیا۔ میں اپنے بے وزن جسم کے ساتھ کتنی دیر تک خلاؤں میں تیرتا رہا، اس کا مجھے اندازہ نہ ہو سکا اور پھر اچانک میں زمین کی طرف لوٹنے لگا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب نہ آگ تھی اور نہ دھواں، بس اندھیرا تھا جو ہنوز میرے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔ میرے پاؤں زمین پر ٹکے تو نیچے ریت تھی، بھربھری ریت۔ مجھے یوں لگا جیسے میں تھک چکا ہوں۔ میں وہیں ریت پر ڈھیر ہو جانا چاہتا تھا لیکن وہی انجانی قوت مجھے سفر پر آمادہ کر رہی تھی۔ میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک طویل سفر کے بعد میرے سامنے افق پر روشنی نظر آنے لگی۔ وہ سرخی مائل ہونے کی بجائے دودھیا تھی جیسے چاند نکل آنا چاہتا ہو۔ وہ چاند نہیں، روشنی کی ایک لکیر تھی جو انتہائی سرعت سے میری جانب بڑھنے لگی۔ جس سے ہر طرف جگمگاہٹ ہوگئی۔ پورا ماحول روشن ہوگیا۔ وہ روشنی کی تیز لکیر میرے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی اور پھر اس لکیر نے میرے پورے بدن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں اس روشنی کی ٹھنڈک کے باعث ایک سرور انگیز کیفیت میں اتراتا چلا گیا، اک سکون تھا جو میرے چاروں طرف پھیل گیا۔ نجانے کتنا وقت یونہی گزر گیا۔ پھر وہ روشنی میرے بدن سے اتر کر اندھیروں میں غائب ہوگئی۔ اس روشنی کے جدا ہوتے ہی میرے بدن میں تپش کا احساس ابھرنے لگا۔ جو لمحہ لمحہ بڑھتا چلا گیا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی اور میں پھر ایک انجانے سفر پر نکل

گیا۔ ایک طویل سفر تھا جس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ پھر صبح کے آثار پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ ہر طرف سنہری دھوپ پھیلنے لگی، تبھی میری نظر ایک نخلستان پر پڑی۔ سنہری ریت پر ایستادہ سبزہ ہی سبزہ۔ کھجور اور پام کے درخت، گھاس بھری زمین اور چمکتا ہوا پانی کا تالاب۔ میں وہاں جا پہنچا۔ اک پرسکون کیفیت میرے اندر اتر گئی۔ میں ایک درخت کے سہارے بیٹھ کر اس ماحول کو اپنے اندر اتارنا چاہتا تھا کہ وہی دودھیا روشنی کی لکیر وہاں تالاب کنارے پڑی ہوئی نظر آئی۔ میں چونک گیا، روشنی کی وہ لکیر زخمی تھی اور اس میں سے خون رس رس کر پانی سے بھرے تالاب میں گر رہا تھا۔ جس سے وہ تالاب آلودہ ہو رہا تھا۔ کرب کی شدت میرے اندر سرائیت کر گئی اور میرا وجود ٹوٹنے لگا، تبھی میری آنکھ کھل گئی۔

اس خواب کے باعث ایک عجیب طرح کی بے چینی میرے اندر تیرنے لگی تھی۔ میں کتنی دیر تک خالی الذہن سا اسی کیفیت میں ڈوبا رہا۔ بے وزن سا جسے کوئی ہوش ہی نہ ہو۔ دھیرے دھیرے میں اپنے حواس میں آتا چلا گیا۔ میں اٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ ابھی ملگجا اندھیرا تھا۔ میرا بیڈ پر لیٹنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے میں کمرے سے نکل کر نیچے آ گیا۔ یہاں بھی سناٹا تھا۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو کچن میں چلا گیا، فریج سے پانی نکال کر پیا اور پھر چائے بنانے لگا۔ ذرا سی توجہ ہٹی تو میں خواب کے تاثر سے نکل آیا اور میرے دماغ میں حیدر شیخ کی باتیں گونجنے لگیں۔ چائے بنانے کے ساتھ میں وہی کچھ سوچتا رہا۔ میں لاشعوری طور پر اس سے متفق تھا مگر پتہ نہیں کیوں، ایک جھجک تھی جو میرے یقین کے آڑے آ رہی تھی۔ نہیں، حیدر شیخ کے وہ کون سے ایسے کام تھے جو مجھے پسند نہیں آ سکتے تھے؟ میں چائے بنا کر سٹنگ روم میں آ بیٹھا۔

حیدر شیخ میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ ہم ایک ہی گلی میں رہتے تھے، ساتھ کھیلے اور سکول میں بھی ایک ساتھ رہے۔ وہ بچپن میں بہت دبو قسم کا لڑکا تھا اور میں قدرے شرارتی تھا۔ وہ دو وجوہ کی بنا پر میرے ساتھ دوستی رکھنے پر مجبور تھا۔ ایک میری مالی حالت تھی، میرے پاس خرچ کرنے کے لیے کافی پیسے ہوتے تھے اور دوسرا کبھی لڑائی جھگڑے کی نوبت آ جاتی تو میں ہی اس کا سہارا ہوتا۔ ہمارا شمار اس قصبے کے چند کاروباری گھرانوں میں ہوتا تھا جبکہ حیدر کے والد ایک نجی ادارے میں ملازم تھے جس سے بس ان کا گزارہ چل رہا تھا۔ وہ ایسے دن تھے جب کسی طرح کوئی بھی معاشی تفاوت ہمارے درمیان محسوس نہیں ہوتا تھا، بس دوستی تھی اور چل رہی تھی اور وہ دن بھی بڑے سنہری تھے۔ یوں ہم کالج تک آ پہنچے۔ ہمارے قصبے میں صرف انٹر تک کالج تھا۔ زندگی کا یہ وہ سنہرا دور ہوتا ہے جب اُمنگیں نکھر کر انسان کو اپنا گرویدہ کر لیتی ہیں اور

خواہشیں مچل مچل جاتی ہیں۔ میں قصبے کے ان چند خوبرو نوجوانوں میں سے ایک تھا جن کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا ک لڑکیاں ان میں دلچسپی رکھتی ہیں اور ایسا تھا بھی۔ ان دنوں ہمارے قصبے میں خاصی تعداد میں فون لگ چکے تھے جن میں متمول اور خوشحال گھرانوں کے علاوہ درمیانے درجے کے لوگ بھی شامل تھے۔ دوبدو ملاقاتوں کے علاوہ فون ہی ایسا رابطہ تھا جس کے ذریعے مجھے نہ صرف میری خوبروئی کا احساس دلایا جاتا کہ میں لڑکیوں کے درمیان کس قدر اور کس طرح زیر بحث رہتا ہوں۔ کن انکھیوں سے دیکھنا، میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی چونک جانا، اشارے کنایئے، ہنسی مذاق یہ سب فون کے ذریعے مجھے باور کرایا گیا۔ میری کئی لڑکیوں کے ساتھ ٹیلی فونک دوستی شروع ہوگئی اور میں انہیں بھرپور وقت دیا کرتا تھا کالج میں آ جانے سے زندگی یکسر بدل کر رہ گئی، ان دنوں میں تھا اور حیدر شیخ اور ہم دونوں کی دوستی مثالی تھی، ان دنوں کسی بھی لڑکے کے پاس بائیک ''اسٹیٹس سمبل'' سمجھا جاتا تھا اور میرے پاس بائیک بھی تھی۔ وہ دن بڑے خوبصورت اور راتیں بڑی سہانی تھیں۔ انہی دنوں جویریہ مجھ سے آن ٹکرائی تھی، ہم کالج کے دوسرے سال میں تھے۔

وہ فروری کے ابتدائی دن تھے۔ حیدر کو بازار سے کچھ کپڑے خریدنا تھے۔ ہم دونوں ہی شام کے وقت پیدل ہی بازار نکل گئے۔ وہ تنگ سا بازار تھا اور اس میں قدرے رش رہتا تھا۔ ہم اپنے دوست کی دوکان میں چلے گئے، کپڑے خریدتے اور باتیں کرتے کافی وقت گزر گیا۔ اس وقت ہم اٹھنا چاہ رہے تھے کہ ایک لڑکی دوکان میں داخل ہوئی تو میں اسے دیکھ کر چونک گیا۔ لمبے قد کی گوری چٹی لڑکی جس کی رنگت میں سیندور کھلا ہوا تھا، جدید تراش کے بیش قیمت لباس میں وہ نکھری نکھری، دکھائی دے رہی تھی۔ شانوں تک کٹے بال، گلے میں مفلر کی طرح دوپٹہ ڈالے بڑے اعتماد سے وہ دکان میں آئی تھی۔ وہ اس قصبے میں پہلی بار دکھائی دی تھی۔ پھر وہی ہوا۔ اس کی نگاہیں بھی میرے چہرے پر ایک لمحہ کو ٹکیں وہ بھی چونک گئی اور میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر سے نگاہیں ہٹائیں اور اٹھ گیا۔ میرا اور اس لڑکی کا آمنا سامنا محض چند لمحوں کے لیے ہوا تھا۔ وہ میرے قریب سے گزری تو مہنگے پرفیوم کی مہک نے خوشگوار تاثر دیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں پیچھے مڑ کر دیکھوں لیکن یہ میری عادت نہیں تھی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے والے پتھر کے ہو جایا کرتے ہیں اور میں پتھر ہونا افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ میں دوکان سے باہر آ گیا۔

''یہ کیا چیز تھی، یار۔!'' حیدر نے سرسراتے ہوئے کہا۔

''جو بھی تھی، تمہارے سامنے تھی۔'' مجھے اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

"پہلی بار دیکھا ہے۔" وہ بولا۔

"ہوں۔" میں نے ہنکارہ بھرا۔

"دوسری بار دیکھنے کی حسرت ہے۔" وہ پھر بولا۔ میں خاموش رہا تو اس نے اسی انداز میں کہا۔ "کون ہوسکتی ہے؟" حیدر نے یونہی کہہ دیا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ میں خاموش رہا اور پھر کتنی دیر تک اس جادو اثر حسن کے زیر اثر مسرور انگیز کیفیت میں ڈوبا رہا۔ وہ چند لمحے، میری پوری رات پر غالب آ گئے۔ اس پری چہرہ کا سراپا میری نگاہوں سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ ایک عجیب طرح کی بے چینی اور بے نام سا دکھ میرے میرے وجود کو گھیرے میں لے چکا تھا۔ جیسے کوئی ٹکٹیں جمع کرنے کا شوقین کوئی اچھی سی ٹکٹ دیکھ لے اور وہ اسے اپنی دسترس میں نہ لے سکے تو ایک اجنبی سا دکھ ہوتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت میری تھی۔ تین چار دن میں ایسی ہی الجھن میں رہا۔ میرے اندر یہ خواہش شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی تھی کہ اسے تلاش کروں اور پھر میں نے اپنی تمام تر کیفیات حیدر سے کہہ دیں۔

وہ میری بات سن کر چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"یار، شجاع! اسے تلاش کرنا کوئی اتنا مشکل نہیں ہے، چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"حتمی بات یہ ہے کہ وہ یہاں کی نہیں۔" وہ پورے یقین سے بولا۔

"ہاں، یہ تو مجھے بھی یقین ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"اگر وہ کسی کے ہاں مہمان آئی تھی تو اب تک وہ چلی گئی ہوگی یا پھر جانے والی ہوگی۔ ایسے میں اسے تلاش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اگر وہ یہاں لمبے عرصے کے لیے آئی ہے تو ہمارا اس سے دوبارہ آمنا سامنا ہو جانا بھی ممکن ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں خجل خراب ہونے کی ضرورت نہیں۔ دوبارہ سامنے آ گئی تو گم نہیں ہونے دیں گے، یوں اس سے متعلق سوچتے رہنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، یار۔!" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"آخر ہم بھی تو کوئی معمولی شے نہیں، ہماری بھی پرسٹیج کا مسئلہ ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ حیدر نے اگرچہ یونہی مذاق کیا تھا مگر بات میری سمجھ میں آئی اور میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ پھر کئی دن گزر گئے اور وہ میرے ذہن سے اتر گئی۔

وہ بھیگی ہوئی رات تھی۔ بارش سرشام ہوئی تھی، تیز ہوا کو بھی قرار آ گیا تھا۔ رات

گہری ہو چکی تھی اور میں پوری محویت سے ایک ناول پڑھنے میں مگن تھا۔ اچانک رات کے سناٹے میں فون کی تیز آواز نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ میرے سرہانے پڑے فون کی دوسری بیل اگرچہ مجھے کرخت لگی لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ اس وقت آنے والا فون یقیناً کسی لڑکی کا ہوگا، کس کا؟ یہ میں نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایسا فون کسی بھی ٹیلی فونک دوست کا ہوسکتا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا اور پورے دھیان سے اپنے مخصوص انداز میں ''ہیلو'' کہا۔ دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی، پھر قدرے سرسراتی آواز میں لڑکی نے پوچھا۔

''آپ شجاع ہو؟'' یقیناً یہ میرے لیے اجنبی آواز تھی۔

''جی، میں شجاع ہی بات کر رہا ہوں، آپ کون؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کے بارے میں پوری انفارمیشن لے چکی ہوں۔'' اس نے طرح دیتے ہوئے نخرے سے کہا۔ ایسی لڑکیاں مجھے زہر لگا کرتی تھیں اس لیے باوجود کوشش کے میں اپنے لہجے میں سے تلخی کو نہ چھپا سکا۔

''مجھے نہیں پتہ، آپ کون جاسوس ہیں لیکن کیا آپ بتا سکیں گی کہ اس وقت فون کیوں کیا، کوئی انفارمیشن باقی رہتی تھی کیا؟''

''آپ تو برا مان گئے، میں ابھی یہ تو نہیں بتا پاؤں گی کہ میں کون ہوں مگر فون کیوں کیا، اس بارے صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ باتیں کرنے کے لیے۔''

''مثلاً کیسی باتیں؟''

''کوئی سی بھی۔۔۔'' اس نے لاپرواہی کے سے انداز میں کہا، پھر اگلے ہی لمحے بولی۔ ''کیا آپ اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟''

''ابھی ایک لمحہ پہلے آپ کہہ چکی ہیں کہ میرے بارے میں آپ سب کچھ جانتیہو اور۔۔۔''

''وہ اس لیے جناب، کہ میں تصدیق کرسکوں کہ مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ درست بھی ہے یا نہیں؟''

''مگر آپ کو ایسی کیا افتاد آن پڑی کہ میرے بارے میں انفارمیشن لیتی پھریں؟''

''بس دل چاہا، آپ کو دیکھ کر لگا تھا کہ یہاں صرف آپ سے دوستی کی جاسکتی ہے۔'' اس نے کہا تو میرے ذہن میں جھما کا ہوا اور وہی لڑکی ذہن میں ابھر آئی۔ تبھی میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سننے لگا۔ پھر تقریباً ایک گھنٹہ کی طویل گفتگو کے بعد میں اس سے یہ اگلوانے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ وہی لڑکی ہے جس سے چند لمحوں کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ اس کا

نام جویریہ شکیل تھا۔ اس کا باپ ہمارے قصبے میں ایک اعلیٰ انتظامی عہدے پر فائز تھا۔ وہ حال ہی میں یہاں شفٹ ہوئے تھے۔ اگرچہ ان کا تعلق اوکاڑہ کے نواحی علاقہ سے تھا لیکن شہر شہر تبادلے کے باعث کہیں مستقل سیٹ نہیں ہو پائے تھے۔ اپنے نواحی علاقے میں ان کی اچھی خاصی زمینیں تھیں۔ جویریہ نے جب مجھے دیکھا تھا، تب سے مجھے تلاش کرنے کی خواہش دل میں رکھ لی تھی۔ چند دن قبل اس کی امید پوری ہوگئی۔ ہمارے ہی محلے کی لڑکی اس کی ہم جماعت تھی۔ یونہی باتوں ہی باتوں میں میرا حلیہ زیر بحث آیا اور پھر اسے مجھ تک پہنچنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے جی بھر کے میرے ساتھ باتیں کی تھیں۔ وہ مجھے قدرے مختلف لگی۔ وہ لاہور کے ایک معروف کالج میں پڑھتی تھی اور وہاں سے چھوڑ کر یہاں آئی تھی۔ اس کی باتیں، لہجہ اور انداز بہت مختلف تھا۔ اس میں دبو پن نہیں تھا۔ وہ تیز طرار تھی، اشارے میں کہی گئی بات کو فوراً سمجھتی تھی۔ پھر اسے بات کرنے کا سلیقہ بھی آتا تھا۔

یوں بات بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی۔ وہ روزانہ مجھے فون کرنے لگی اور ہماری باتوں کے ساتھ تعلق کا سلسلہ بھی دراز ہوتا چلا گیا۔ تقریباً دو ماہ تک ہم فون پر باتوں کے نشیب و فراز سے گزرتے رہے۔ دنیا جہان کے موضوعات زیر بحث ہوتے۔ جو تھوڑا بہت تکلف یا جھجک تھی، نجانے کب کی ختم ہو چکی تھی۔ یہ سلسلہ دراز رہا، یہاں تک کہ ہمارے امتحان آگئے۔ ہماری باتیں تو ختم نہیں ہوئیں مگر دورانیہ کم ہوگیا۔ امتحانوں کے بعد فراغت ملی تو جویریہ کی یہ خواہش بڑھنے لگی کہ ہم کہیں ملیں۔ یہ میرے لیے سب سے مشکل ترین مرحلہ تھا۔ فون تک بات ٹھیک تھی کیونکہ ہمیشہ اس نے فون کیا تھا اور اسے فون کرنے کا موقع اس لیے ملتا تھا کہ اس کا باپ [illegible] تھا۔ رات کے ایک مخصوص وقت وہ پی کر ''ٹن'' ہو جاتا اور سونے کی کوشش کرتا۔ وہ ہر طرح سے مطمئن ہو کر فون کرتی۔ میرے لیے جویریہ سے ملنا مشکل اس لیے تھا کہ قصبے میں ہر تیسرا فرد ایک دوسرے کو جانتا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ہم کہیں ملیں اور دوسروں کی نظروں میں نہ آئیں۔ بڑے شہروں کی نسبت ہمارے ہاں ایسی کوئی ''سہولت'' دستیاب نہیں تھی کہ ہم کہیں مل ملیں اور پھر سب سے بڑی بات کہ میرا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا کہ یوں چوری چھپے جویریہ سے ملوں۔ مجھے خود سے زیادہ اپنے خاندان کی عزت عزیز تھی۔ اس وقت یہ مل میرے پل صراط سے گزارنے والی بات تھی سو میں ٹال گیا جبکہ اس کا اصرار بڑھتا چلا گیا۔ حیدر شیخ میرے اور جویریہ کے درمیان ہر پل کی خبر رکھتا تھا۔ اس نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ اس لڑکی سے جان چھڑا لوں، یہ بدنامی کا باعث بن سکتی ہے۔ پھر ایک واقعہ نے مجھے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جویریہ نے فون کر کے ایک دوکان کا نام بتا کر فوراً پہنچنے کو کہا۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی

مگر وہ ٹال گئی۔ میں اور حیدر دیئے گئے وقت سے تھوڑی دیر بعد پہنچے۔ اس وقت وہ بازار سے نکل کر کھڑی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ ہماری نگاہیں ملیں اور وہ چلی گئی، واپسی پر ہمارے ایک شناسا شاپنگ سنٹر والے نے آواز دے کر کہا۔

''او، ہیرو! ذرا بات تو سن۔''

''کیا بات ہے؟'' میں اس کے پاس چلا گیا اور پوچھا۔

''یہ تمہارے لیے ایک تحفہ ہے، اچھا ہوا تم ادھر ہی مل گئے ورنہ یہ میں تمہارے گھر بھجوانے والا تھا۔''

''میرے لیے تحفہ؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''اب اتنے بھی بھولے مت بنو، ابھی کچھ منٹ پہلے یہاں ایک لڑکی چھوڑ گئی ہے اور ایسے وقت میں تمہارا بازار میں ہونا بھی سمجھ میں آ رہا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کے یوں کہنے پر مجھے شرمندگی ہوئی اس لیے میں نے قطعی انجان بنتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔''

''نہیں، یار! اس نے مجھے تمہارا نام پتہ سمجھایا ہے، تمہارا فون نمبر دیا ہے۔ وہ ہماری بہت اچھی کسٹمر ہے اس لیے۔''

''جو بھی ہے، وہ بہر حال میں نہیں ہوں، آئندہ محتاط رہنا۔'' میں نے کہا اور وہاں سے آ گیا۔ واپسی پر حیدر خاموش تھا۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے؟ اس رات میں نے اس واقعہ کا بہانا بنایا اور جویریہ کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ مجھے فون نہ کیا کرے۔ کئی دن گزر گئے مگر وہ فون کرنے سے باز نہیں آئی۔ میں اسے سمجھاتا کہ جو کچھ وہ چاہ رہی ہے، اس کا ہونا ممکن نہیں۔ میں اسے پیار سے سمجھانا چاہ رہا تھا مگر پتہ نہیں، اس کے دماغ میں کیا سمائی ہوئی تھی کہ میری بات مانتی ہی نہ تھی۔ پھر میں نے اس کا فون سننا ہی بند کر دیا۔

انہی دنوں کی ایک شام خوشگوار تھی۔ میں اور حیدر شیخ گھر سے نکلے اور یونہی گھومتے ہوئے اس چوک میں جا پہنچے، جہاں ہمارا مخصوص ٹھکانہ ہوا کرتا تھا، دوست احباب وہاں آ جاتے اور خوب گپ شپ لگتی۔ میں وہاں بیٹھے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ پولیس وین ہمارے پاس آ کر رکی۔ اس میں سے انسپکٹر سمیت چند سپاہی تیزی سے نکلے اور سیدھے ہماری طرف آئے۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سمجھتے، انسپکٹر نے آتے ہی ایک زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر جڑ دیا۔ ایسا ہی حال حیدر شیخ کے ساتھ ہوا، دو سپاہی اس پر پل پڑے تھے۔ اس کے ساتھ ان کے منہ سے غلیظ گالیوں کا طوفان نکل رہا تھا۔ دو چار منٹ ہماری دھنائی کے بعد ہمیں پکڑا

گاڑی میں ڈال کر تھانے لے گئے۔ پھر میں انسپکٹر کے کمرے میں ہی لا پھینکا گیا۔ مجھے ہلکا سا شک تھا کہ یہ ساری کاروائی کیوں ہو رہی ہے لیکن یقین نہیں تھا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ اس لیے میں نے پوچھا۔

''ہمیں ایسے کیوں لایا گیا ہے؟'' میرے یوں پوچھنے پر انسپکٹر نے گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ چند لمحوں بعد یہ طوفان تھما تو اس نے انتہائی نخوت سے کہا۔

''چوریاں کرتے ہو اور پھر پوچھتے ہو کہ کیوں لایا گیا ہے؟'' یہ سنتے ہی میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا ہم نے کوئی چوری نہیں کی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ محض اس الزام کا سہارا لے کر مجھے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہی جھوٹا الزام کسی مقدمے کی صورت اختیار کر لے اور پھر ہم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں۔ مجھے یہ ڈر نہیں تھا کہ ہمیں جیل ہو جائے گی، خوف صرف یہ تھا کہ میرے والدین کا اعتماد مجھ پر سے اٹھ جائے گا۔ وہ سر اٹھا کے کسی کے ساتھ بات نہیں کر سکیں گے اور میری وجہ سے انہیں دکھ ہوگا۔ میں نے یہ سب لمحوں میں سوچا تھا۔ جس کا ردعمل یہ ہوا کہ معاملہ میری برداشت سے باہر ہو گیا۔ مجھے یکدم ہی غصہ آ گیا، تاہم پھر بھی میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''انسپکٹر! میں نے کوئی چوری نہیں کی مگر میں سمجھ گیا ہوں کہ تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ تم چاہے جتنے مرضی مقدمات بنا لو مگر اب مجھے گالی نہیں دو گے یا پھر مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو اس کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔''

''اوئے، ٹڈی! تم بولتے بھی ہو۔'' انسپکٹر نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے انتہائی طنزیہ انداز میں کہا۔

''ہاں...... میں بولتا ہی نہیں، کچھ کر بھی سکتا ہوں۔ آزما لو۔۔۔''

''تمہاری بولتی ابھی بند کرتا ہوں، پہلے مجھے ذرا ایک فون کر لینے دو۔'' یہ کہہ کر اس نے فون سیٹ پر نمبر گھمائے۔ میں نے غور سے دیکھا، وہ جویریہ کے باپ ہی کے نمبر تھے۔ اس نے مبہم سے انداز میں مجھے پکڑ کر لے آنے کی بات کی اور مزید ہدایات کے لیے کچھ دیر دوسری طرف سے سنتا رہا۔ چند منٹ بعد اس نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''ہاں، تو کیا بکواس کر رہے تھے تم۔۔۔۔'' اس نے انتہائی غلیظ گالی دی۔ جس پر میں بھنا گیا۔ میں نے اس سے بھی غلیظ گالی بک دی۔ انسپکٹر کی آنکھوں میں یکدم ہی حیرت اتر آئی تو میں نے کہا۔

''تم چوری کی بجائے قتل کا پرچہ کاٹ دو۔ میں تو مجرم بن ہی جاؤں گا مگر یاد رکھنا، میری ابتدا تمہی سے ہو گی۔''

''بہت اونچے سروں میں بھونکتا ہے تو ''

''میں نہیں تم ۔۔۔تم بھونکتے ہو کسی کے ٹکڑا ڈالنے پر۔اس بھڑوے سے کہو، سامنے آ کر بات کرے۔اسے کہو۔اپنے داماد کے ساتھ اس طرح سلوک نہیں کرتے''میری بات سن کر وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔اس نے اٹھ کر میرے تھپڑ مارنا چاہا تو میں گالیاں دیتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔اس نے میز کے ساتھ لگی بیل بجائی تو فوراً ہی ایک سپاہی نمودار ہوا۔

''لے جاؤ اسے اور اچھی خاصی دھلائی کرو۔''

اس سپاہی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھی ٹھوکر میری پسلیوں میں دے ماری۔ میں درد سے دہرا ہو گیا۔اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا میرے کندھے پر مارا تو مجھے اپنا دماغ ماؤف ہوتا ہوا محسوس ہوا پھر بھی میں نے اسی ہاتھ سے ایک تھپڑ اس سپاہی کے جڑ دیا۔گالیوں کا شور دونوں طرف سے بڑھتا گیا۔تبھی ہمارے درمیان دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔کمرے میں شور سن کر دو تین سپاہی اور آ گئے۔وہ مجھے کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ برآمدے میں میرے ساتھ حیدر شیخ بھی پٹتا رہا۔انہوں نے ہمیں مار مار کر ادھ موا کر دیا۔پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں برآمدے میں تھا اور میرے اوپر کافی سارے لوگ جھکے ہوئے تھے۔جن میں میرے ابو کا شفیق چہرہ بھی تھا۔میرے ہوش میں آتے ہی حیدر شیخ کے والد نے انسپکٹر سے کہا۔

''آپ نے بچوں پر بہت ظلم کیا ہے؟''

''شکر کریں، ابھی ایف آئی آر نہیں کٹی ورنہ اس سے بھی بری حالت کر دیتا، انہیں سمجھاؤ، اب یہ بے غیرتی نہ کریں۔''

''ہاں، اب میں تیری بیٹی کے ساتھ عشق لڑاؤں گا۔''میں نے چھوٹتے ہی کہا تو انسپکٹر بھنا کر بولا۔

''آپ لوگ جاؤ، اسے ابھی اور علاج کی ضرورت ہے، کل عدالت میں اس کی ضمانت کروا لینا۔''

''دیکھو، انسپکٹر! پارٹی مت بنو۔ہم اسے ابھی لے کر جائیں گے اور اب نہ لے گئے تو پھر تمہاری وردی کا ہمیں کچھ خیال نہیں ہوگا۔''ابو کے ساتھ آئے ایک بااثر وکیل نے نرم انداز میں کہا تو انسپکٹر کو جیسے ہوش آ گیا۔وہ چند لمحے خاموش رہا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس وکیل نے فون پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اس سے تو ہم بعد میں معاملہ طے کر لیں گے۔تم اپنی کہو، کیا چاہتے ہو؟''

شاید انسپکٹر کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، غلط کر رہا ہے اور تھانے میں موجود اس وکیل اور دوسرے معززین شہر کا اثر و رسوخ کہاں تک ہو سکتا ہے سو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور ہم وہاں سے آ گئے۔ دراصل پولیس کو منہ زور کرنے میں خود عوام کا بھی ہاتھ ہے۔ عوام ہی سے چند ٹاؤٹ قسم کے لوگ پولیس کے ساتھ مل کر غریب اور بے سہارا عوام پر ظلم ڈھاتے ہیں جس کے باعث ٹاؤٹوں اور پولیس دونوں کی چاندی ہوتی ہے۔ بااثر لوگوں کے سامنے پولیس کا رویہ تابعداری کا ہے اور بے اثر لوگوں پر ہی اپنی ساری درندگی دکھاتے ہیں۔

میرے بدن سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور ایسا ہی حال حیدر شیخ کا تھا۔ میرے والد نے مجھے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور وہ مجھے کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ حیدر کا بڑا بھائی ڈاکٹر کو بلانے گیا ہوا تھا کہ ہمیں کوئی میڈیسن دے دی جائے۔ مجھے رہ رہ کر جویریہ اور اس کے باپ پر غصہ آ رہا تھا اور میں اپنا غصہ ان پر نکالنا چاہتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ انہیں فون کر کے دل کی بھڑاس نکالوں کہ مبین اختر آ گیا۔ وہ حیدر کا کزن تھا اور اس علاقے میں ایک بااثر صحافی کے طور پر جانا پہچانا جاتا تھا، اس نے آتے ہی کہا۔

''واہ، میرے شیر! سنا ہے انسپکٹر کو خوب سنائیں اور تھپڑ بھی جڑا ہے۔؟''

''ہاں، ایسا ہی ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''خیر، ہوا کیا تھا؟'' اس کے پوچھنے پر میں نے پوری کہانی سنا دی۔ وہ بڑے غور سے میرا ایک لفظ سنتا رہا، درمیان میں کچھ نہیں بولا۔ میں سب کچھ کہہ چکا تو وہ فون کے ساتھ ٹیپ ریکارڈ جوڑ کر بولا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں ان سب کو دیکھ لوں گا، بس تم ہمت رکھنا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون سیٹ میرے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''جویریہ کے باپ کا نمبر ملاؤ اور اپنا پورا غصہ نکال لو، بالکل نہیں ڈرنا۔'' میرے اندر خواہش تو پہلے ہی تھی۔ مبین اختر کے حوصلہ دینے پر میں نے فوراً نمبر ملائے۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہوا تو دوسری طرف اس کا باپ ہی تھا۔ اس نے ''ہیلو'' کہا تو میں بولا۔

''میں ہوں، تمہارا ہونے والا داماد۔۔۔''

''کیا بکواس کرتے ہو۔'' وہ چیخا۔

''یقین نہیں آتا تو اپنی بیٹی سے پوچھ لو، تم نے چند کتے بھجوا کر کیا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ تم انتظامی عہدے پر ہو، کیا اسی کا زعم ہے تمہیں؟''

''اس کا مطلب ہے، تمہارا کچھ اور علاج کرنا پڑے گا۔''

’’میرا اعلاج تو اب تمہاری بیٹی ہے، پورے شہر کو پتہ چل گیا ہے کہ مجھے تھانے کیوں لے جایا گیا۔ میں نے یہی کہنا ہے کہ تم مجھے داماد بنانا چاہتے تھے۔ میں نے تم لوگوں کو دھتکار دیا سو تم اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔‘‘

’’دیکھو، فضول بکواس مت کرو۔ میں تمہیں معاف کر دیتا لیکن لگتا ہے، تمہارا دماغ اب بہت اچھے طریقے سے ٹھیک کرنا پڑے گا۔‘‘

’’ظاہر ہے، تمہاری بیٹی پیار کے نشے میں بہت کچھ مجھے بتا چکی ہے۔تم نے تو میرا دماغ ٹھیک کرنا ہی ہے لیکن میں تمہیں معاف نہیں کروں گا‘‘

’’دیکھو، فضول۔۔۔‘‘

’’بکواس بند کرو اور اپنی بیٹی سمیت اس قصبے سے جلد از جلد دفعان ہو جاؤ۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔تم زیادہ سے زیادہ مجھے قتل کروا سکتے ہو اور تمہیں اب یہی کرنا ہو گا لیکن تم کیا سمجھتے ہو میں آسانی سے قتل ہو جاؤں گا؟‘‘

’’چلو پھر ٹھیک ہے، ایسے ہی سہی۔ اپنے قتل ہو جانے کا انتظار کرنا‘‘ اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، رسیور مبین اختر نے پکڑ لیا۔ اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔

’’تو مطلب، آپ دھمکی دے رہے ہیں؟‘‘

’’آپ یہاں کیسے؟‘‘ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

’’یہ میرے بھائی ہیں، مجھے ابھی پتہ چلا اور میں نے تمہاری یہ گفتگو بھی ریکارڈ کر لی ہے جس میں تم نے شجاع کو قتل کرنے کی دھمکی دی ہے۔تمہارے اختیارات اپنی جگہ لیکن ہم یہاں بستے ہیں۔ تمہاری یہ غنڈہ گردی ہمارے سامنے ہے۔ کل ہم پوری کہانی چھاپ دیں گے۔ بیٹی عشق کرتی ہے اور باپ غنڈہ گردی۔‘‘ وہ دوسری طرف کچھ سنتا رہا، پھر بولا۔ ’’تم جو مرضی کرو لیکن ہمیں بھی تو اختیار ہے کہ ہم جو کریں ۔ میں دیکھ لوں گا۔تم جو کر سکتے ہو، کرو۔ تمہارے دل میں کوئی حسرت نہ رہے۔ ہم سے جو ہو سکا، ہم کریں گے۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے رسیور رکھ دیا۔ پھر مبین اختر ہمیں کافی دیر تک حوصلہ دیتا رہا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر الگ کیا اور چلا گیا۔ حیدر اس رات میرے پاس ہی رہا۔

اگلا سارا دن میں اس انتظار میں رہا کہ پولیس آئے گی یا کچھ بھی ہو گا مگر کچھ نہ ہوا شام ڈھلے مجھے پتہ چلا کہ ایک شہری کے ہاں جویریہ کا باپ اور میرے ابو ملے، وہاں چند اور لوگوں کے ساتھ مبین اختر بھی تھا۔ ان کے درمیان مفاہمت ہو گئی، آئندہ کچھ بھی نہ کرنے کے وعدے کے ساتھ بات ختم ہو گئی۔

اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا مگر یہ میری زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوا۔ جویریہ کے باپ کو چاہئے تھا کہ مجھ پر چڑھ دوڑنے کی بجائے اپنی بیٹی کو سمجھاتا۔ میں اگر روکنے سے باز نہ آتا تو پھر مجھے سزا ملنی چاہئے تھی۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا لیکن میرے جاننے والوں میں یہ بات پھیل گئی کہ میں جویریہ کے عشق میں اس حال تک پہنچا ہوں۔ کہانی کچھ بھی نہیں تھی لیکن افسانے ڈھیروں بن گئے۔ جویریہ کا باپ ایک اعلیٰ انتظامی آفیسر ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ان دنوں میرا اتنا وزن نہیں تھا اس لیے اتنا احساس بھی نہیں تھا، بعد میں احساس ہوا کہ یہ لوگ صرف دولت اکٹھی کرنے کے لیے سرکاری نوکری نہیں کرتے بلکہ اختیارات کی وہ طاقت حاصل کرتے ہیں جس سے عوام کو دبایا جا سکے۔ ایک ہی علاقے میں ہرن کا شکار ان کے طبقے کے لیے جائز یا حق کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ کسی بھی دوسرے کے لیے ممنوع یا جرم ہوتا ہے۔ آزادی کے فوری بعد بائیس خاندانوں کا چرچا رہا ہے جواب تک ملکی وسائل پر قابض ہیں۔ تب سے اب تک ان کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں کہ اب انہیں ہلایا نہیں جا سکتا۔ پہلے وہ وسائل پر قابض تھے، اب انتظامی اور اختیاری عہدے بھی انہی کے قبضے میں ہیں۔ یہی وہ طاقت ہے جس کے بل پر یہ کالے انگریز خود کو رائل فیملی تصور کرتے ہیں اور غریب عوام کو اپنا خدمت گار۔ آزادی سے اب تک اسمبلیوں میں چہرے بدلے ہیں مگر مخصوص طبقہ نہیں بدلا۔

انہی دنوں مبین اختر میرے لیے ہیرو بن گیا۔ نجانے اس کے پاس کیا جادو تھا جس کی وجہ سے انسپکٹر میرے پاس معذرت کرنے کے لیے آیا۔ میں نے اسے انتہائی ذلیل کیا مگر وہ سب کچھ چپ چاپ سنتا رہا اور پھر معافی مانگ کر چلا گیا۔ لاشعوری طور پر میں اس صحافی سے متاثر ہو چکا تھا۔ انہی دنوں مجھے یہ آگہی ملی کہ ان لڑکیوں کے چکر میں اچھا بھلا انسان، گھن چکر ہو کر رہ جاتا ہے۔ غلط عمل، غلط ہی ہوتا ہے۔ اسے درست کہنا ہی دراصل سب سے بڑی غلطی ہے۔ جو بھیانک راستوں پر لے جاتی ہے۔ اگر میں جویریہ سے رابطہ نہ رکھتا تو یہ سب کچھ نہیں ہونا تھا۔ یہی بات مبین اختر نے مجھے اچھی طرح مختلف حوالوں سے سمجھائی تھی، اس نے کہا تھا۔

''دیکھو، گناہ اور ثواب کو ایک طرف رکھ دو۔ یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے یہ دیکھو کہ آیا تمہارا یہ عمل کسی شرمندگی کا باعث تو نہیں بنتا؟ پھر تمہاری اپنی ذات ہے، تمہارا مقام ہے۔ اپنے کردار میں ثابت قدم رہو گے تو دنیا تمہاری طرف لپکے گی۔ اگر اپنے کردار میں کمزور ہوئے تو دنیا تمہیں اپنی ٹھوکروں پر رکھے گی، مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ تمہاری عمر کے نوجوانوں میں جذبات مچلتے ہی نہیں، بھڑکتے بھی ہیں اور ان جذبات کو ہوا دینے والا ماحول ہمارے اردگرد

موجود ہے لیکن کیا تم اتنے کمزور ہو کہ اس ماحول کے تابع ہو کر عام لڑکوں کی طرح اپنا آپ گنوا لو گے؟ تمہیں تو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔''

پھر ایک بار اس نے مجھے سمجھایا تھا۔

''دیکھو، شجاع! ہمارے نوجوان طبقے کو یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ محبت اور جنس میں کیا فرق ہوتا ہے، وہ سب کچھ گڈ مڈ کر جاتے ہیں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کی رہنمائی نہیں کی جاتی۔ وہ محبت کو جنس اور جنس کو محبت خیال کرتے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے۔ جنس محض افزائش نسل کا ذریعہ ہے، جو یہ سمجھ گیا وہ اپنے آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ لذت کے حصول نے انسان کو گرا کر رکھ دیا ہے لیکن اگر وہ جنس کو افزائش نسل کا ذریعہ سمجھے گا تو پھر لذت بھی ایک مقصد بن جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی سمجھ دار اور ذی شعور انسان اپنی آئندہ نسل کے لیے برا نہیں سوچتا جبکہ محبت، انسانی سرشت میں شامل ہے۔ محبت انسان میں جمالیاتی حس کو بیدار کرتی اور اس کے من میں خوبصورتی بڑھاتی ہے۔ محبت کرنے والا انسان نہ صرف خود خوبصورت ہوتا ہے بلکہ دوسروں میں بھی خوبصورتیاں بانٹتا ہے۔ محبت کی خوشبو سے دوسرے بھی کیف آگئیں سرور حاصل کرتے ہیں۔ جس طرح جنس افزائش نسل کا ذریعہ ہے، اسی طرح محبت انسان میں اعلیٰ صلاحیتیں انسان کو اعلیٰ مقام تک لے جاتی ہیں۔ محبت خوبصورتی ہے اور اللہ خوبصورت چیزوں کو پسند کرتا ہے۔''

پھر اس کی ایک اور بات میرے ذہن میں پختہ ہو کر رہ گئی۔

''اپنے آپ سے محبت کرو، پیارے! خود سے محبت کرو گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ محبت کتنی بڑی قوت ہے۔''

مبین اختر نے دھیرے دھیرے میرے ذہن میں ایسی باتیں واضح کر دیں جس سے میں اپنے اندر تبدیلی محسوس کرنے لگا۔ اس کی رہنمائی اس وقت تک چلتی رہی جب تک میرا رزلٹ نہیں آگیا، مجھے مزید پڑھائی کے لیے قصبے سے باہر جانا تھا۔ میرے والد نے فیصلہ کیا کہ میں لاہور چلا جاؤں اور وہیں ہاسٹل میں رہ کر پڑھوں۔ میں اپنے ساتھ حیدر کو بھی لے جانا چاہتا تھا مگر اس کے والدین افورڈ نہیں کر سکتے تھے، یوں میں اکیلا ہی لاہور کی فضاؤں میں آگیا۔ جہاں سے میری زندگی کی نئی شروعات ہوئی۔

ال واصل روڈ پر موجود بلڈنگ میں وہ ایک شاندار آفس تھا۔ میں جب حیدر شیخ کے ساتھ وہاں داخل ہوا تو احساس ہوا کہ اس آفس پر خاصا خرچ کیا گیا تھا۔ استقبالیہ کے بعد ایک ہال تھا اور پھر چند کمرے، ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے حیدر نے کہا۔

"یہ تمہارا آفس ہے۔" میں ایک ہی نظر میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہاں ایک دفتر سے متعلق تمام سہولیات موجود ہیں۔ ایک بڑی سی میز کے عقب میں پڑی کرسی پر مجھے بٹھاتے ہوئے حیدر خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں بیٹھ چکا تو وہ میرے دائیں طرف پڑے صوفے پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"کیسا لگا، تمہیں یہ آفس؟"

"بہت شاندار ہے۔" میں نے بے ساختہ اعتراف کیا۔

"تمہیں یاد ہے، شجاع! میں بچپن میں معمولی معمولی سی چیزوں کے لیے بھی ترسا کرتا تھا، آج سب کچھ ہے مگر ہمیں ابھی اور آگے بڑھنا ہے اپنے لیے اور کچھ دوسرے لوگوں کے لیے، دولت کہاں سے آتی ہے، اس پر دھیان مت دینا۔ بس یہی سوچنا کہ تمہاری کمائی دولت کتنے لوگوں کو فائدہ دے گی۔" اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

"تقریر ہی کرتے رہو گے یا کوئی چائے کافی بھی پلاؤ گے؟" میں نے مسکراتے ہوئے ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنا چاہا تو وہ یکدم قہقہہ لگا کر ہنس دیا، پھر بولا۔

"تمہارے آفس میں بیٹھا ہوں، پوچھنا تمہیں چاہئے کہ میں کیا پیوں گا؟" میں نے انٹرکام کا رسیور اٹھا لیا، دوسری طرف کنول جیت کی آواز پہچان کر کہا۔

"کنول! ذرا یہاں آؤ لیکن آنے سے پہلے کافی کے لیے کہتی آنا۔"

"جی، سر۔!" اس نے کہا تو میں نے رسیور رکھ کر حیدر کی طرف دیکھا، اس نے ستائشی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر وہ مجھے اس علاقے کی اہمیت کے بارے میں بتانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کنول جیت آ گئی۔ اس کا چہرہ آنکھوں سمیت مسکرا رہا تھا، اس نے آتے ہی انتہائی خوشی سے کہا۔

"جی آیاں نوں، سر۔!"

"شکریہ، کنول۔" میں نے کہا تو وہ میرے سامنے دھرے صوفے پر بیٹھ گئی، وہ اس انتظار میں تھی کہ میں کچھ کہوں۔

"کیا سب آ گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی، آ گئے ہیں۔ ہم تین ہی تو ہیں، میں، ندیم اور ستیش۔"

"میں سب کے ساتھ ایک میٹنگ چاہتا ہوں"

"ٹھیک ہے، سر! ہم کچھ دیر بعد آ جاتے ہیں" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور چلی گئی۔ کافی پینے کے دوران میری اور حیدر کی گپ شپ چلتی رہی۔ وہ مجھے معلومات دیتا رہا، پھر وہ چلا گیا۔ تب

وہ تینوں میرے پاس دفتر ہی میں آ گئے۔

وہ لوگ ایک طرح سے آرگنائزر تھے۔ دوبئی کی زندگی میں جہاں لوگ خون پسینہ ایک کر کے کمائی کرتے تھے، وہاں وہ تفریح کے لیے نت نئے انداز بھی اپناتے ہیں۔ وہاں کی شامیں خاصی رنگین ہوتی ہیں۔ چونکہ وہاں پر ہر قوم کا فرد آباد ہے اس لیے وہ اپنی کیمونٹی کے حساب سے تفریح ڈھونڈتے ہیں۔ جس کے پاس زیادہ درہم خرچ کرنے کی قوت ہوتی ہے، وہ اپنی شام اتنی ہی رنگین اور حسین بنا سکتا ہے۔ ہندو یا بھارتی وہاں پر زیادہ تعداد میں ہیں اس لیے ان کا کلچر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ حیدر شیخ کے کفیل حسین سعد الموطاوی کے اپنے دو ہوٹل تھے۔ ایک پار دوبئی میں اور ایک ڈیرہ دوبئی میں۔ ڈیرہ دوبئی والا ہوٹل قدرے اوسط درجے کا اور پرانا تھا جبکہ پار دوبئی ہوٹل خاصا مہنگا تھا۔ یہ لوگ پاکستان اور بھارت سے فنکاروں کو مدعو کرتے اور یہاں نت نئے پروگرام کر کے دولت کما رہے تھے۔ اس وقت ان کا نیا نیا کام تھا اور وہ صرف ہوٹل تک محدود تھے۔ اس کے پلان میں اور بہت کچھ تھا لیکن وہ بہر حال وقت کے ساتھ ہونا تھا۔ وہ سارا دن ان سے تفصیلی تعارف کرتے اور کام کو سمجھنے میں گزر گیا۔

ستیش مہتہ ممبئی میں دادر کے علاقے میں پیدا ہوا۔ اس نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی جو تنگ و تاریک گلیوں میں تھا اور جہاں انتہائی غربت تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے سکول تک کی تعلیم حاصل کی۔ کالج میں پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ دولت کے بغیر وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ چھوٹے موٹے کام کرتا رہا۔ اسے ایک ڈریس ڈیزائنر کے ہاں ملازمت مل گئی جہاں سے اسے معقول آمدنی ہونے لگی لیکن پھر جلد ہی وہ ایک فیشن فوٹو گرافر کے پاس کام کرنے لگا جو ماڈلنگ کے حوالے سے خاصا مشہور تھا۔ یہاں سے اس کے تعلقات بڑھے اور اس نے پیسہ بھی کمایا۔ پھر اسے دوبئی کا چانس مل گیا، وہ دوبئی آ گیا۔ یہاں کچھ دیر بھٹکتے رہنے کے بعد ایک دوکان پر سیلز مین رہا اور پھر وہ حیدر شیخ کے پاس آن پہنچا۔ کنول جیت کور بھارتی پنجاب کے ہوشیار پور کی رہنے والی تھی۔ ماں بچپن میں ہی فوت ہو گئی تو باپ نے دوسری شادی کر لی۔ وہ پڑھ لکھ کر کسی اچھی سی ملازمت کی تلاش میں تھی۔ اسے دہلی میں ایک فور سٹار ہوٹل میں جاب مل گئی، وہ اپنی قسمت آزمانے دہلی آ گئی۔ یوں ہوٹل انڈسٹری میں قدم رکھا تو اسے بہت کچھ سمجھنے کو ملا۔ وہ باصلاحیت تھی اور زیادہ سے زیاد کمانے کا شوق تھا۔ اس نے دوبئی چلے جانے کا سوچا اور پھر وہ دوبئی آ گئی سو یہاں سے چند ماہ بعد ہی احساس ہو گیا کہ وہ محض ملازمت سے اتنی دولت نہیں کما سکتی جتنا وہ تصور لے کر یہاں آئی تھی، اس کے لیے اور بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ وہ طوائفوں اور ماڈل گرلز کو دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتے دیکھ رہی تھی لیکن اس کی اپنی

ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اس راہ پر چل نکلے۔ وہ واپس جانے کا سوچ رہی تھی کہ چند دوستوں کی وساطت سے اسے سعد المو طاوی کے ہوٹل میں جاب مل گئی۔ پھر وہ حیدر شیخ کے اس نئے پراجیکٹ میں آ گئی۔ باتیں کرتے ہوئے وقت کا احساس ہی نہ رہا، دو بجے تو ندیم نے کہا۔

”چلیں، لنچ کے لیے چلتے ہیں۔“

”وہ کہاں، بھئی؟“

”ہماری طرف سے ہے، یہیں قریب ہی ایک بہت اچھا ریستوران ہے۔“

”ٹھیک ہے، ابھی چلتے ہیں۔ میں ذرا حسن کو فون کر لوں۔“ میں نے کہا تو ستیش نے کہا۔

”او سوری، سر! مجھے یاد ہی نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک سیل فون نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کا فون، سر! میں نے اس میں قریب قریب اہم ترین فون نمبر فیڈ کر دیئے ہیں۔“

”شکریہ، ستیش۔!“ میں نے فون تھام لیا اور پھر ان سب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یار! یہ سر، آپ جناب کچھ عجیب سا نہیں لگتا۔ ہم دوست ہیں بھئی؟“

”یہ آپ کا بڑا پن ہے لیکن ہم پھر بھی ۔۔۔“ ستیش نے کچھ کہنا چاہا۔

”او کم آن، یار! چھوڑو ان تکلفات کو ۔۔۔“ میں نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی اور حسن کے نمبر ملانے لگا۔ وہ لوگ اٹھنے لگے۔ رابطہ ہو جانے پر حسن نے انتہائی مسرت سے کہا۔

”کیسے ہو، جان جی؟“

”میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ، کیسا چل رہا ہے؟“

”سب ٹھیک ہے۔“

”نائلہ کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے، تمہارے چلے جانے کے بعد خاصا روئی تھی، بہت عزت کرتی ہے تمہاری۔“

”میں نے اسے غلط نگاہ سے نہیں دیکھا، اس لیے شاید، آصف چوہدری کا سناؤ؟“

”اوہ، تو تمہیں حیدر نے بتا دیا؟ وہ ٹھیک ہے۔ بات چل رہی ہے، وہ ودود شاہ کو چھوڑ دے گا مگر کسی کی ضمانت پر تا کہ وہ بعد میں تنگ نہ کرے۔ بہر حال سب ٹھیک ہے، تم پریشان نہیں ہونا، سناؤ، ندیم کیسا جا رہا ہے؟“

''دوڑ رہا ہے، ایک دم ٹھیک ہے۔''

''آفس جوائن کرلیا۔؟''

''ہاں، اپنے ہی آفس سے بات کر رہا ہوں۔''میں نے بتایا تو اس نے مجھے خوش باش رہنے کو کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے قدرے اطمینان ہو گیا تھا۔ میں آفس سے اٹھ کر باہر آیا تو وہ تینوں میرے انتظار میں تھے۔ پارکنگ میں کھڑی سیاہ مرسیڈیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ستیش نے کہا۔

''یہ کار آپ کے استعمال میں رہے گی، فی الحال ڈرائیور ہے۔''

''تو چلو پھر۔۔۔''میں نے کہا اور کار کی طرف بڑھ گیا۔ ہمیں کوئی اتنا زیادہ وقت نہیں لگا، وہیں السطارا روڈ پر ہی ایک ریستوران میں بڑا مزیدار کھانا کھایا۔ اس دوران ستیش ہی زیادہ باتیں کرتا رہا۔ وہ اپنی ممبئی میں گزری ہوئی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتاتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ کنول جیت لفظوں میں اتنی باتیں نہیں کرتی تھی جتنا وہ نگاہوں سے اپنے جذبات کا اظہار کر دیتی تھی جیسے بنا کچھ کہے ذہنی رابطہ ہو جائے۔ تبھی میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں سکتی یا کہہ دینا نہیں چاہتی۔ بے تکلفی میں کھانا ختم ہوا اور ہم ریستوران سے باہر نکلے تو کنول جیت نے کہا۔

''آج شام آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں، آپ کو بھی پتہ ہے۔''

''تو پھر کیوں نہ آپ ہوٹل آجائیں۔ وہاں ہمارا آرگنائیز کیا ہوا پروگرام چل رہا اس طرح آپ کو دوبئی کی شاموں کا بھی اندازہ ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، کنول! میں نے بھی گھر میں کیا کرنا ہے؟''

''تو پھر پروگرام یہ بنا کہ آپ ہوٹل آجائیں گے، آپ ہمیں وہیں اپنا منتظر پائیں گے۔''ستیش نے کہا اور میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

''میرے ساتھ نہیں چلو گے؟''

''میں اور کنول پیدل ہی نکل جائیں گے''اس نے کہا تو میں نے ہاتھ ملایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا، ندیم بھی میرے ساتھ بیٹھا تو گاڑی چل دی۔

ہوٹل کا ڈائننگ ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ہی نظر میں اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں زیادہ تعداد بھارتی لوگوں کی تھی۔ خواتین کی تعداد زیادہ تھی اور وہ مختلف عمروں کی عورتیں تھیں۔ وہ سارے بڑی محویت سے سٹیج پر محو رقص ایک نوعمر لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ اسی ہال میں

مجھے ہوٹل کا منیجر ملا، کنول جیت نے تعارف کرایا تو میں کچھ دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بھی بھارتی تھا۔ اس نے ہمارے لیے مخصوص نشستوں کی طرف رہنمائی کی، ہم وہاں جا بیٹھے۔ میں سٹیج پر رقص کرتی لڑکی کی جانب متوجہ ہوا تو میرے دائیں طرف بیٹھی کنول جیت نے کہا۔

''یہ گجرات کے لوک فنکار ہیں، انہیں میں نے ہی آرگنائز کیا ہے۔''

''گڈ۔۔۔''میں نے ستائشی انداز میں کہا اور اس لڑکی کو غور سے دیکھا۔ وہ اپنے رقص میں کوئی لوک کہانی بیان کر رہی تھی۔ اس کے پیچھے سٹیج پر بیٹھے سازندے بڑی مہارت سے ساز بجانے میں محو تھے۔ گیروے رنگ کے کرتے اور سرخ رنگ کی مخصوص پگڑی پہنے وہ ہارمونیم، ڈھولک، بین اور گھنگھروں سے تال ملائے ہوئے تھے۔ انہی کے درمیان پیلے رنگ کا لباس پہنے وہ نوعمر لڑکی گجراتی میں گا رہی تھی۔ اس لڑکی میں عجیب طرح کا جذب تھا جس نے تماشائیوں کی ساری توجہ اپنی طرف کی ہوئی تھی یا شاید اس گیت میں کوئی ایسی کشش تھی۔ مجھے وہ زبان سمجھ میں تو نہیں آ رہی تھی اس لیے میں نے محو رقص لڑکی کو بھرپور انداز میں دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ اس نے فیروزی رنگ کا لمبا سا گھاگھرا اور سرخ رنگ کی چمکتی دمکتی چنریا اوڑھ رکھی تھی۔ بازو بھر کے چوڑیاں۔ ہاتھ اور پاؤں پر مہندی، گہرے میک اپ کے ساتھ اس نے کس کر چوٹی باندھی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ گیت اور رقص میں تیزی آتی گئی۔ وہ اپنے سر پر کٹوریاں رکھنے لگی۔ پھر گھڑا رکھ کر ناچنے لگی۔ اس نے اپنے پیروں کے نیچے گلاس رکھے، گھڑے رکھے گئے اور ان کی تعداد گیارہ تک جا پہنچی۔ انہی گھڑوں کو سر پر رکھے وہ تلواروں کے درمیان رقص کرتی رہی۔ پھر اس کے پیروں تلے کیل اور شیشے کے ٹکڑے بھی رکھے گئے لیکن وہ رقص کرتی رہی۔ یہ صرف اعضا کی شاعری نہیں تھی بلکہ توازن میں مہارت تھی۔ یہ سلسلہ خاصا دراز رہا اور پھر جب اس نے اپنا رقص ختم کیا تو گویا لوگوں کے رکے ہوئے سانس بحال ہو گئے۔ زبردست داد کے ساتھ وہ سٹیج سے اتر گئی۔ اگلے چند لمحوں میں ایک آدمی سٹیج پر نمودار ہوا۔ زرق برق گھاگھر انما نیلا چولا، سفید پاجامہ اور سر پر اسی رنگ کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تلواریں تھیں۔ وہ رقص کے ساتھ ان تلواروں کو اپنی انگلیوں پر چلاتا رہا۔ اس کی پرفارمنس کے بعد بارہ خواتین آ گئیں۔ جنہوں نے ہلکے پیلے رنگ کی سنہری بارڈر والی ساڑی اور میرون رنگ کے ہاف سلیو بلاوز پہنے ہوئے تھے، سونے اور پھولوں کے زیورات سے لدھی پھندی وہ کافی دیر تک اپنا رقص دکھاتی رہیں۔ پھر آخر میں ایک جوان رعنا قسم کی لڑکی نمودار ہوئی پہلی نظر میں وہ کوئی بت ہی دکھائی دیتی تھی۔ لانبا قد، بھرا بھرا سڈول بدن، پھنسی ہوئی سبز چولی کہ لگتا تھا، ابھی یہ کپڑا پھٹ جائے گا۔ گلے میں بڑا سا سنہری ہار، تیز قسم کا میک اپ اس کے آنے پرانا

ونسر نے خوب شور مچایا تھا اور وہ شور صحیح تھا، واقعی اس نے محفل لوٹ لی۔ سازندوں کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر خاتون نے راجھتانی لوگ گیت چھیڑا تو وہ ''بت'' حرکت میں آ گیا وہ کوئی لوک کہانی تھی جسے گیت کے انداز میں کہا جا رہا تھا۔ لمحہ لمحہ اس میں تیزی آتی گئی۔ وہ ناچتی رہی، یہاں تک کہ نگاہیں اس پر ٹکتی ہی نہ تھی۔ کنول جیت میری دلچسپی دیکھ کر اس راجھستانی گیت کا مفہوم بتاتی رہی۔ رات گئے تک وہ اپنے فن کے باعث اپنا آپ منواتی رہی، شو ختم ہونے پر ہم اٹھے تو ستیش نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''شجاع جی! وہ سامنے ایک شخص کو دیکھ رہے ہیں جس نے کھدر کا کرتا اور سفید پاجامہ پہنا ہوا ہے، وہی جس نے گول شیشوں کی عینک لگائی ہوئی ہے اور سر سے قدرے گنجا ہے۔''

''ہاں، میں دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے اس شخص کو دیکھا جو چند لوگوں میں گھرا ہوا تھا۔

''وہ نریندر ترپاٹھی ہے، یہاں بھارتی سفارت خانے میں ایک اعلیٰ عہدیدار۔ ہمارا ان سے خاصا کام رہتا ہے۔ میں انہیں آپ سے ملواتا ہوں، باقی آپ سنبھال لیجیے گا۔''

''ضرور۔۔۔'' میں نے کا تو ستیش اس کی جانب بڑھ گیا اور میں ندیم اور کنول جیت کے ساتھ ان گجراتی لوک فنکاروں کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد ستیش کے ساتھ نریندر آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ہماری طرف آ گیا۔

''آپ شجاع الدین ہیں۔۔۔'' ستیش نے تعارف کرایا تو اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے نمسکار کہا، پھر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

''آپ سے مل کر ''بوت کھسی'' ہوا۔''

''مجھے بھی خوشی ہوئی۔'' رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد کچھ دیر ہم اس پروگرام کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ وہ ان بھارتی فنکاروں سے بڑھا کر بات پاک بھارت تعلقات پر لے آیا۔

''دونوں کنٹریز کو اب دوستی کرنا ہوگی، خاص کر کے کلچر کے اوپر، دوہان ملک کی بنیاد ایک ہے۔''

''مگر، ترپاٹھی جی! درمیان میں تنے مسئلے ہیں جو حل طلب پڑے ہوئے ہیں۔ ان کا کچھ ہوگا تو دوستی کی بات بھی ہوگی۔''

''یہ تمہارا ہمارا مسئلہ ناہی، گلوبل ایٹوسفیر (عالمی منظر نامہ) سب ٹھیک کریں گا۔'' یہ

کہہ کر اس نے اس تقریر کے لیے پر تولنے چاہے۔ میں چند منٹ تک اسے برداشت کرتا رہا، جب وہ زیادہ ہی بھارت کے بارے میں رطب اللسان ہونے لگا تو میں نے کہا۔

''آیئے، کہیں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں، ساتھ میں تھوڑا حلق بھی تر کر لیں گے۔''

''ہائیں، سوجاع جی! ہم نے تو سنت ہے کہ آپ پیتے نا ہی ہو؟'' اس نے کہا تو میں چونک گیا، کیا اسے میرے بارے میں معلومات مل چکی ہیں، کیا میری یہاں آمد کے بارے میں دور تک توجہ ہونے لگی ہے؟ یہ بات میں نے ایک لمحہ میں سوچی اور اسی لمحے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے صحیح سنا ہے مگر کیا، ترپاٹھی جی! شراب سے ہی حلق تر ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ بھی تو مشروبات ہیں۔''

''آں، ہاں۔۔اصل میں یوں ہے، سوجاع جی! وقت بوت ہو گیا۔ ہم کسی وحت خود آوٗں گا آپ کے آفس، تب لانبی گپ شپ ہووے گی۔ اس سمے تو آگیا دیجیے۔'' اس نے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''چلیں ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔'' میں نے کہا اور باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ وہ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''بوت کھسی ہوا کہ کوئی باصلاحیت پرش (مرد) کلچرل کے مافق انڈیا، پاکستان کو پروجیکٹ کریں گا۔ یہاں بوت سپیس (خلا کام کرنے کے لیے میدان) ہے۔ آپ کھل کر کام کرو، ہم لوگن پورا کواپریٹ کرین گا۔''

''بہت شکریہ، نریندر جی! پھر کب آرہے ہیں آپ میرے آفس؟''

''میں ستیش کو بتا دوں گا، ہم ملتے رہیں گے۔'' اس نے کہا تو اتنے میں ہم ہال کے دروازے تک آپہنچے۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور ہم الگ الگ ہو گئے۔ میرے ذہن میں ترپاٹھی کی بات گونج رہی تھی۔ کیا اس نے جان بوجھ کر یہ حوالہ دیا تھا کہ وہ میرے بارے میں جانتا ہے یا غلطی کے ساتھ اس کے منہ سے نکل گیا؟ بہر حال جو کچھ بھی تھا، اسے میرے بارے میں معلومات فراہم کر دی گئیں تھیں۔ وہ معلومات کیا تھیں، یہ جاننا میرے لیے بہت ضروری تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا لابی کی طرف جانے لگا تو ستیش نے کہا۔

''ہمیں اجازت، شجاع جی؟''

''ارے کیوں، کیا ہوا؟ ابھی کھانا کھاتے ہیں، پھر میں آپ لوگوں کو ڈراپ کر دوں گا۔''

''وہ بات کچھ یوں ہے کہ ہم تینوں کو کہیں جانا ہے۔ شیخ صاحب یہیں ہوٹل میں
ہیں، آپ ڈنران کے ساتھ لیں گے۔'' اس نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن حیدر کہاں ہے؟'' میں نے کہا تو ندیم جلدی سے بولا۔

''ہم ابھی جا رہے ہیں نا! لابی میں مینجر ہمارا انتظار کر رہا ہوگا، وہ آپ کو حید
صاحب کے پاس پہنچا دے گا۔''

میں خاموش ہوگیا، چند منٹ بعد ہم لابی میں جا پہنچے۔ مینجر ہماری راہ تک رہا تھا،
پر نظر پڑتے ہی وہ ہماری طرف بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ چسپاں تھی۔ اس
نے پھر مجھ سے اتنی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا جیسے میں اس سے پہلی بار مل رہا ہوں حالانکہ وہ تھوڑ
دیر قبل مجھ سے مل چکا تھا۔ اس کے عقب میں قدرے مختصر لباس میں ایک لڑکی تھی جو مسلسل
میری جانب دیکھ رہی تھی، وہ تینوں رخصت ہوئے تو مینجر نے کہا۔

''آیئے۔۔۔'' میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔ پھر لفٹ کے ذریعے کچھ ہی دیر بعد
ہوٹل کی چھت پر جا پہنچے۔ ساحل سے آتی ہوئی بھیگی ہوا کی ٹھنڈک نے بدن میں خوشگواریت
دی۔ خاصی بڑی چھت پر چند ہی میزیں تھیں، فاصلے پر دھری ان میزوں کی اردگرد گنتی کے چ
لوگ تھے جن میں مخصوص قسم کی عورتیں زیادہ تعداد میں تھیں۔ میں نے ایک ہی نگاہ میں اندا
لگا لیا کہ اس پرسکون ماحول میں وہ سب تنہائی چاہتے ہیں۔ نیم تاریک ماحول میں ای
دوسرے سے بے نیاز ہر کوئی اپنے آپ میں مگن تھا۔ ایک طرف کونے میں حیدر شیخ کے سا
ایک جواں سال عربی بیٹھا ہوا تھا اور ان سے ذرا پرے فاصلے کم لباس میں دو لڑکیاں کھڑ
تھیں۔ مینجر واپس چلا گیا تو وہ لڑکی میرے ساتھ ساتھ اس میز تک آئی، دونوں ہی نے اٹھ
میرا استقبال کیا۔

''آپ حسین سعد الموطاوی ہے۔'' حیدر نے کہا تو موطاوی نہایت خوشگوار ان
میں بولا۔

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، بڑی خواہش تھی آپ سے ملنے کی۔'' موطا
نے شستہ اور صاف اردو میں کہا تو مجھے قدرے خوشگوار حیرت ہوئی۔ میں نے بھی گرمجوشی
اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''میں بھی آپ کے بارے میں ایسے جذبات رکھتا ہوں۔''

''معذرت خواہ ہوں، آپ کو لینے ایئر پورٹ نہیں آسکا میں العین میں مصروف تھ
یہ کہہ کر اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھئے''

''اس میں معذرت کی کیا بات ہے، ویسے یہ آپ کا بڑا پن ہے کہ آپ نے ایسا محسوس کیا؟''

''شجاع! میں دوستی کا قائل ہوں۔ٹھیک ہے، یہ سب میری کفالت میں ہیں لیکن ہم کام بھی تو کر رہے ہیں۔سخت ماحول اچھا تاثر نہیں دیتا'' وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ہمارے بیٹھتے ہی وہ لڑکیاں کھانا لگانے لگیں۔انتہائی پر تکلف کھانا تھا، اس دوران باتیں چلتی رہی جن میں کچھ ذاتی اور زیادہ تر کاروباری تھیں۔موطاوی نے مجھے وہاں میرے کام سے متعلق چند قانونی پہلوؤں سے آگاہ کیا۔کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔موطاوی کے ساتھ نشست خاصی معلومات افزا رہی، مجھے خاصا حوصلہ ہوا اور راہ مل گئی جس پر مجھے چلنا تھا۔ہم جب وہاں سے اٹھے تو رات خاصی گہری ہو چکی تھی۔پارکنگ سے حیدر میری گاڑی میں ہی آ گیا، اس کی گاڑی ڈرائیور لے جا چکا تھا۔حیدر نے گاڑی پارکنگ سے نکالی تو میں نے پوچھا۔

''لگتا ہے، تمہارے معاملات خاصے پراسرار قسم کے ہیں؟''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تھوڑی دیر بعد کیا ہونے والا ہے، اس بارے مجھے معلوم نہیں ہوتا۔''

''چند لمحوں بعد کیا ہو جانے والا ہے، یہ تو کسی کو بھی پتہ نہیں ہوتا، میری جان! ایسا ہو جائے تو۔۔۔''

''میں وہ بات نہیں کر رہا، ابھی ڈنر کے بارے میں مجھے احساس تک نہیں تھا۔''

''موطاوی نے کچھ دیر پہلے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ فری ہے اور آ سکتا ہے۔مجھے پتہ تھا کہ تم اِدھر ہوٹل ہی میں ہو، ستیش سے میرا رابطہ رہتا ہے یہ کوئی پراسرار بات نہیں، یہاں کی تیز زندگی کا ایک حصہ ہے۔''

''اور وہ تینوں کسی خاص کام کے لیے نکلے ہیں کیا؟''

''اوکم آن، یار! تمہیں آئے ہوئے صرف دو دن ہوئے ہیں۔تمہیں سب اس لیے پراسرار لگ رہا ہے کہ تم نئے ہو، کچھ دنوں بعد یہ تمہارے لیے بھی ایک معمول ہوگا۔''

''اوکے، حیدر! مگر ا بات اور ہے۔'' میں نے نریندر ترپاٹھی کی اس بات سے حیدر کو آگاہ کیا۔

''ہاں، یہ بات ہے سوچنے کی لیکن صحیح پوچھو تو یہ میرے لیے ذرا بھی حیران کن نہیں ہے۔یہ بھی یہاں کے ایک طبقے کا معمول ہے۔''

''یہ ایک الگ بحث ہے کہ یہ معمول ٹھیک ہے یا غلط؟ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخر اسے میرے بارے میں معلومات دیں کس نے ،کوئی ذریعہ تو رہا ہوگا؟''

''ظاہر ہے، وہ ذریعہ ہمارے اردگرد ہی ہوگا مگر اس کا مثبت پہلو تم یہ دیکھو کہ تمہاری اہمیت وہ کس قدر محسوس کر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، حیدر! مجھے اگر یہاں رہنا ہوگا تو میں اپنے انداز میں رہوں گا۔''

''اب تم صحیح ٹریک پر سوچ رہے ہو، یہاں ضرورت سے زیادہ آنکھیں اور کان کھول کر رہنا پڑتا ہے اور میری جان! بڑے کام کے لیے بڑا رسک تو بہر حال لینا پڑتا ہے۔'' اس نے کہا تو میں خاموش رہا اور روشن راہوں کو خالی الذہن سے دیکھتا رہا۔ گھر پہنچے تو میں قدرے تھکن محسوس کر رہا تھا سو مزید کچھ بات کئے میں اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں کمرے کی خنک فضا میں سکون سے سو گیا۔

میری آنکھ معمول کے مطابق صبح سویرے ہی کھل گئی۔ میں کچھ دیر یونہی بیڈ پر پڑا رہا، پھر منہ ہاتھ دھویا اور کچن میں جا کر چائے بنانے کے لیے کمرے سے نکلا۔ میں نے جیسے ہی دروازہ کھولا تبھی باہر کی تازہ ہوا کی ساتھ موسیقی کی مدہم آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں نے بڑی توجہ سے اس موسیقی کی سمت کا اندازہ کیا تو وہ نچلی منزل کے کسی کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ خالص ہندوستانی موسیقی تھی جیسے بھجن وغیرہ گاتے ہوئے بجائی جاتی ہے مجھے اچنبھا ہوا کہ یہ یہاں، اس گھر میں یہ کیسی ہندوستانی موسیقی؟ بنگلا دیشی باورچی تو مسلمان تھا۔ وہ ایسی موسیقی سن رہا ہے یا پھر کون اور ہے؟ اسی تجسس کی وجہ سے میں مجبور ہو کر آہستہ قدموں سے نچلی منزل پر آیا تو دائیں طرف راہداری کے ایک کمرے میں سے وہ موسیقی برآمد ہو رہی تھی۔ میں اس کمرے تک جا پہنچا۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا جس سے سامنے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں ایک طرف پڑے ڈیک سے وہ ہندوستانی موسیقی برآمد ہو رہی تھی، جس کے ردہم پر ایک لڑکی بڑے جذب سے ناچ رہی تھی۔ اس لڑکی کا رخ دوسری جانب تھا اور میں اس کی پشت کی طرف کھڑا تھا۔ اس کی ساری توجہ کا مرکز کرشن دیوتا کا وہ بت تھا جسے ''ہرنام'' کہتے ہیں۔ وہ چھوٹا سا بت ایک کارنس پر رکھا ہوا تھا، اس پر تازہ پھول تھے اور اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ وہ پتلی سی لڑکی پورے جوش اور جنون کے ساتھ ناچ رہی تھی، اسے اردگرد کا قطعاً ہوش نہیں تھا۔ اس نے ہلکے کاسنی رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی جس پر سیاہ رنگ کی کڑھائی تھی، دوپٹہ اس نے کمر سے باندھا ہوا تھا۔ اس کی لانبی چوٹی اتنی تیزی سے ہلکورے لے رہی تھی کہ ا

س پر نگاہ ٹکتی ہی نہ تھی۔ کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس لڑکی نے اسی کمرے کو مندر کے ماحول میں ڈھال لیا تھا۔ اس کا انگ انگ تھرک رہا تھا۔ وہ ایک بار بھی نہیں پلٹی جیسے کرشن دیوتا کے بت سے اس کا کوئی خاص رابطہ ہو اور اگر وہ ذرا سی بھی اِدھر اُدھر ہوئی تو وہ رابطہ ٹوٹ جائے گا۔ لمحہ لمحہ میرے اندر یہ سوال ابھرنے لگا کہ یہ لڑکی چہرے سے کیسی ہوگی؟ کون تھی؟ یہ سوال کہیں پس منظر میں چلا گیا۔ پھر اچانک میوزک تھم گیا۔ جس کے ساتھ ہی وہ بھی ساکت ہوگئی۔ اس نے بڑھ کر ڈیک آف کیا، قریب پڑی میز پر رکھی تھالی اٹھائی جس میں ایک دیا روشن تھا اور کرشن دیوتا کی مورتی کے سامنے لہرانے لگی۔ اس نے کچھ اور اگر بتیاں تھیں، بڑبڑانے کے انداز میں کچھ گاتی رہی، ساتھ میں ایک چھوٹی سی گھنٹی بھی بجاتی رہی۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بڑی دیر تک ساکت کھڑی رہی۔ میں غور سے اُسے دیکھتا رہا۔ مجھے لگا جیسے آمنے سامنے بت دھرے ہوں۔ چند لمحے اسی سناٹے میں گزر گئے، تبھی اس لڑکی کے بدن میں حرکت ہوئی۔ وہ اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پلٹی اور پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ خود بت بن گئی۔ وہ جو کوئی بھجن بڑبڑا رہی تھی، اس کے ہونٹوں ہی میں دب کر رہ گیا۔ میں بھی حیران تھا اور وہ بھی، وہ تو شاید اس لیے حیران ہوئی ہوگی کہ میں کون ہوں اور یہاں کیا کر رہا ہوں مگر میں اس کا حسن دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ زندگی میں حسین سے حسین تر لڑکیاں دیکھی تھیں، بہتیرا حسن نظروں سے گزرا تھا مگر میرے سامنے ہرنی جیسی آنکھیں میں حیرانگی بھرے کھڑی لڑکی حسن دلفریب اور منفرد تھا۔ شفاف جلد پر نقوش اتنے غضب کے تھے کہ کسی ایک نقش پر نگاہ ٹھہرتی ہی نہ تھی۔ گلابی چہرے پر ہلکا ہلکا پسینہ کسی پھول پر شبنم کے ہونے کا احساس دے رہا تھا۔ آنکھوں میں قدرے حیرانگی، کچھ کہنے کے لیے لرزتے ہونٹ، تجسس سے تنی گردن، تیز سانسوں سے ہلکورے لیتا ہوا بدن، بھرپور جوانی کا احساس دلاتا ہوا وجود، کتنے ہی لمحے یونہی گزر گئے۔ تبھی اس نے جھجکتے ہوئے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے ہوئے کہا۔

”نمسکار۔!“ اس کی کھنکتی ہوئی آواز بانہوں میں بھری چوڑیوں کی کھنکھناہٹ میں جذب ہو کر رہ گئی۔ پتلی پتلی انگلیوں اور مہندی سے رچے ہاتھ۔ پہلی بار کسی حسن نے مجھے متاثر کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑے میری طرف سے کسی جواب کے انتظار میں تھی، تب میں نے پوچھا۔

”کون ہیں آپ؟“

”ہم۔۔۔؟“ اس نے حیرانگی سے اپنے ہلکورے لیتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر

گھبراتے ہوئے کہا۔ ’’جی، ہم آرتی ہیں۔‘‘

’’آرتی۔۔۔!‘‘ میں زیرلب بڑبڑایا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے سے الگ نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ بنا پلکیں جھپکائے مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے شبنمی چہرے پر پھیلی معصومیت، تازگی اور الہڑپن کے باعث میں کسی جادو اثر شخص کی مانند ٹھٹک گیا تھا۔ حیرانگی میں ڈوبے ہوئے طویل لمحے طویل تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ میں خود کو یوں محسوس کرنے لگا جیسے کوئی خلا میں جا کر بے وزن ہو جائے۔ نجانے کتنے لمحے یوں گم ہو گئے، اچانک میرے اردگرد کا سناٹا جاگ اٹھا۔ میرے احساس کے ساتھ ہی میرا شعور بیدار ہو گیا۔ کئی سارے سوال میرے ہونٹوں تک آ کے رک گئے۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا۔ میں نے سبھی سوالوں کو منطق کے ترازو میں تولا۔ کوئی بھی ایسا سوال نہیں تھا جس کی وجہ میری سمجھ میں آئے کہ میں وہ سوال اس سے پوچھنے کا حق رکھتا ہوں۔ وہ جو کوئی بھی تھی، ایک ایسے گھر کی چھت تلے موجود تھی جس کا مالک میں نہیں تھا۔ مجھے اک ذرا سا بھی حق نہیں تھا کہ اس سے معلومات لیتا پھروں۔ میں نے اس کی غزالاں آنکھوں میں جمی ہوئی حیرت کو غور سے دیکھا اور پلٹ گیا۔ میں راہداری پار کرتے ہوئے خالی الذہن سائٹنگ روم میں آ کر ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ چند لمحوں بعد شاید میری آہٹ پا کر بنگالی باورچی آن وارد ہوا۔ اس نے بڑے ادب سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

’’کچھ چاہتا اے، شاب؟‘‘

’’صرف ایک کپ چائے اور وہ بھی ذرا جلدی۔‘‘ میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

’’ابھی لایا، شاب!‘‘ یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔

بلاشبہ اس وقت میرے ذہن پر آرتی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی بولتی ہوئی حیران آنکھیں، معصوم شبنمی چہرہ، لرزتا ہوا بدن اور خوشگوار اجنبیت جو ہم دونوں کے درمیان آن ٹھہری تھی۔ اس کا ایک ایک خال و خد میری نگاہوں سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ جو خاموشی ہمارے درمیان کچھ دیر آ کے ٹھہری تھی، اس میں کئی ساری باتوں کی ایسی شروعات تھیں جو میرے خاموش رہنے کی وجہ سے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان گنت سوال، جن کے جواب تشنہ تھے۔ اس وقت ایک ایسی اجنبی کیفیت مجھے اپنے حصار میں لے چکی تھی جسے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا، وہ میٹھی کسک تھی یا پریشان کن سنسنی؟ میں اس بارے کچھ بھی تعین نہ کر سکا۔ اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ کسی اونچے پہاڑ سے چھلانگ لگا کر ہواؤں میں تیرتا رہوں یا پھر

سمندر کی لہروں سے لڑتا ہوا بے دم ہو جاؤں۔

''شاب، چائے۔۔۔'' بنگالی باورچی نے چائے سے لبالب کپ میرے سامنے رکھا تو میں اس کیفیت سے نکل آیا۔ چائے کا کپ خالی ہونے تک آرتی بھی میرے ذہن سے اپنا تاثر ختم کر چکی تھی۔ میں خوشگوار موڈ میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو حیدر کے ساتھ آرتی بھی براجمان تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے انتظار میں تھے۔ میں نے ان کے قریب پہنچ کر خوشگواریت سے صبح بخیر کہا اور نیپکن سیدھا کرتے ہوئے بیٹھ گیا، تب حیدر میری جانب دیکھ کر بولا۔

''آپ ہیں، آرتی! ہماری بہت ہی معزز مہمان۔ آپ کچھ دنوں ہمارے ساتھ رہیں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے آرتی سے کہا۔ ''ان کا غائبانہ تعارف تو آپ سے ہو چکا، آپ شجاع ہیں۔''

''نمسکار۔!'' اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے ہوئے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھا۔ تب اس لمحہ میں نے محسوس کیا کہ وہ کیفیت جو پہلی بار اسے دیکھتے ہوئے مجھ پر طاری ہوئی تھی، ویسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اک ذرا سی لہر بھی نہ اٹھی۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر بلکہ آپ کو دیکھ کر۔'' میں نے کہا تو وہ آنکھوں سمیت مسکرا دی۔

''بہت سنا ہے آپ کے بارے میں۔ آپ کو دیکھ کر لگا ہے، آپ واقعی ایسے ہوں گے۔''

''بعض اوقات چہرے بہت زیادہ دھوکہ دے جایا کرتے ہیں، اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ کسی کے ظاہر پر نہیں جانا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے گلاس میں جوس انڈیلا اور بڑا سپ لیا۔

''لیکن، شجاع! دوستوں کی رائے بھی تو نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔'' یہ کہہ کر اس نے مکھن لگا ٹوسٹ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے پکڑ لیا تو حیدر بولا۔

''یہ آرتی اس وقت یہاں آئیں تھیں جب تم سو گئے تھے۔ وہ ستیش وغیرا انہی کو لینے گئے تھے۔ وقت نہیں تھا اس لیے وہ لوگ تفصیل بتائے بغیر چلے گئے۔'' حیدر نے یہ کہہ کر گویا میرے سارے سوالوں کا جواب دے دیا لیکن یہ آرتی ہے کون؟ اس بارے اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، مجھے بھی اتنی جلدی نہیں تھی۔ آخر کو اس نے مجھے سب کچھ بتا دینا تھا اس لیے ذرا سی دلچسپی لیے بغیر میں نے ناشتے میں مگن رہا۔ ناشتہ ختم کر کے ہم تینوں ہی پورچ کی طرف

بڑھے۔ ہلکی پھلکی باتوں سے اجنبیت قدرے تحلیل ہوگئی تھی۔ پورچ میں حیدر کی گاڑی آگے کھڑی تھی۔ حیدر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تو آرتی نے قدرے حیرت سے کہا۔

''کیا آپ نہیں جا رہے؟''

''نہیں، میں اپنی گاڑی میں اپنے آفس جاؤں گا، سی یو۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے گہرے گھنے براؤن بال کمر تک آئے ہوئے تھے جنہیں اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ہلکے میک اپ کے ساتھ اگرچہ وہ تروتازہ لگ رہی تھی مگر وہ صبح والی شبنمی تازگی نہیں تھی۔ آف وائٹ شلوار قمیص پہنے وہ نکھری نکھری دکھائی دے رہی تھی۔ ایک لمحہ ٹھٹک جانے والے کی طرح میری طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا، ہاتھ ہلایا اور حیدر کے ساتھ والی سیٹ پر جا بیٹھی۔ میرے لیے ڈرائیور دروازہ کھول چکا تھا۔ دفتر پہنچتے ہی میں نے حسن سے رابطہ کیا۔ وہ اپنے آفس پہنچ چکا تھا، میری آواز سنتے ہی پوری سنجیدگی سے بولا۔

''او جان جی! کیسے ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ، کیا خبریں چل رہی ہیں؟'' میرے لہجے میں خوشگواریت تھی۔

''بظاہر تو سب ٹھیک چل رہا ہے۔''

''اور آصف؟'' میں نے اشارتاً پوچھا۔

''ہاں، یار! اس کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہو رہا ہے۔ طے تو یہی ہوا تھا کہ وہ ودود شاہ کو چھوڑ دے گا مگر وہ اسکا گینگ گڑبڑ کر رہا ہے۔''

''وہ الٹی کھوپڑی کا بندہ ہے۔ خیر میں رابطہ کرتا ہوں اس سے۔۔۔''

''کوشش کر کے دیکھ لو مگر مجھے نہیں لگتا کہ ودود شاہ کمینگی سے باز آئے گا۔''

''حسن! میں اگر وہاں ہوتا تو یہ معاملہ اب تک حل ہو چکا ہوتا۔'' میں نے پوری سنجیدگی سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''نہیں، مزید بگڑ جاتا اور اس میں سراسر نقصان تمہارا ہوتا کیونکہ سارا معاملہ تمہارے گرد ہی گھوم رہا تھا۔ خیر یہ دلیلیں دینے کا وقت نہیں، اب اگر معاملہ خراب ہوا بھی تو ودود شاہ کی وجہ سے ہوگا۔ وہ حد سے زیادہ عقلمندی دکھا رہا ہے۔'' اس نے کچھ ایسے تشویش زدہ لہجے میں کہا کہ میں پریشان ہو گیا اور بے بسی سے بولا۔

''حسن! دھیان رکھنا، یار۔!''

''اُو، ! گھبراؤ نہیں، اللہ خیر کرے گا۔ ابھی تک تو سارا معاملہ ہاتھ میں ہے۔ درمیان والے لوگوں سے میرا رابطہ ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' پھر ایک لمحے توقف کے بعد بولا۔ ''تم سناؤ، سب ٹھیک چل رہا ہے نا؟''

''ہاں، سب ٹھیک ہے بلکہ ایک دم ٹھیک ۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے لہجہ کو خود اجنبی پایا۔ شاید ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو حوصلہ دے رہے تھے۔ پھر کچھ دیر باتوں کے بعد میں نے فون آف کر دیا۔ حسن کی باتوں سے میں قدرے پریشان ہوگیا تھا۔ میرے گرد الجھی ہوئی سوچوں کا حصار تن گیا۔ میں آصف چودھری کے بارے میں خوب جانتا تھا۔ وہ اپنے اکثر فیصلے نتائج سے بے پروا ہو کر کرتا تھا، پتہ نہیں، کتنی دیر تک میں پاکستان میں موجود اپنے دوستوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ انٹر کام کے بزر نے میری سوچوں کا حصار توڑا۔ دوسری جانب کنول جیت کور تھی، وہ میرے پاس آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔ میں نے آنے کے لیے کہہ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ نمودار ہوئی تو اس نے ہاتھ میں ایک اور بغل میں ایک فائل دبائے وہ میرے سامنے مسکراتے ہوئے کھڑی تھی۔

''کافی پئیں، سر!'' اس نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا پھر فائل نکال کر میز پر رکھ دی۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ مجھے اس وقت کافی کی شدت سے طلب ہو رہی تھی؟'' میں نے اس کا دل رکھنے کو کہا۔

''آپ کے لہجے سے، سر! بہت تھکا ہوا لہجہ تھا آپ کا۔'' کنول نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے، تم لہجہ بھی پہچانتی ہو؟'' میں نے یونہی بات بڑھائی اور مگ اپنے سامنے رکھ لیا تو وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔

''سر! انسانی تعلق میں، بھلے تعلق کی نوعیت کوئی بھی ہو صرف ایک شے ہے جو تعلق کو مضبوط اور محترم بناتی ہے اور وہ ہے ''انڈر سٹینڈنگ''، یہ بات نہیں کہ آپ میرے باس ہیں، میں یہاں ملازمت کرتی ہوں تو کوئی خوشامد یا چاپلوسی کے لیے ایسا کہہ رہی ہوں بلکہ یقین جانیں، بہت عرصے بعد آپ کی صورت میں کوئی شخص ایسا ملا ہے جس کی عزت کرنے کو، جس کا احترام کرنے کو دل چاہتا ہے۔''

''ایسا کیوں ہوگیا، کنول؟'' میں نے کافی کا سپ لیتے ہوئے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

''ساری دنیا کے مرد کہتے ہیں کہ ہم عورت کو نہیں سمجھ سکتے یا عورت سمجھ میں آنے والی

چیز ہی نہیں۔ میں کہتی ہوں کہ خود عورت کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ کیا چیز ہے مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ عورت میں بے پناہ صلاحیتیں ہیں اور زیادہ تر عورت ان صلاحیتوں کا منفی استعمال کرتی ہیں۔ جب بھی عورت اپنی صلاحیتوں کو مثبت انداز میں استعمال کرتی ہے تو ہی اردگرد کا ماحول پرسکون ہوتا ہے۔"

"کنول! یہ تو تم نے اپنی رائے دی نا، میں نے جو پوچھا ہے، وہ بتاؤ۔"

"وہی بتا رہی ہوں کہ میرے دل میں اگر آپ کے لیے اچھے جذبات پیدا ہوئے ہیں تو اس کی وجہ میں نہیں جانتی۔ بس آپ کو دیکھا تو دل نے کہا، میں نے سن لیا۔" پھر ایک لمحہ رک کر دھیرے سے بولی۔ "اس میں اگر آپ کہیں کہ کوئی مخالف جنس کی کشش ہو سکتی ہے تو ایسا قطعاً نہیں ہے۔ ایسے جذبات کا کہیں دور دور تک نام ونشان نہیں ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ میرے اندر آپ کے لیے پاکیزہ جذبات ہیں، تو ہی انڈرسٹینڈنگ جیسی صلاحیت بیدار ہوئی ہے۔"

"شکریہ، کنول۔" میں نے کہا تو اس نے سامنے دھری فائل سیدھی کر لی۔ پھر بڑے ہی خوشگوار لہجے میں بولی۔

"سر! یہ ہمارا، مطلب آپ کا اور ہمارا پہلا پراجیکٹ ہے۔ اسے میں اسسٹ کروں گی، سر! میں نے ایک خاکہ بنایا ہے جو آپ سے ڈسکس کرنا ہے۔"

"بڑی بات ہے، کنول! اب ہم کام سے لگ گئے، چلو کچھ تو مصروفیت ہوئی۔" میں نے کہا تو وہ بولی۔

"کیوں نہیں، سر!" یہ کہتے ہوئے اس نے فائل کھولی اور میری جانب دیکھ کر بولی۔ "سر! یہ میڈم زارا کے جو شو ہوں گے، ان کی تفصیل وغیرہ ہے۔ وہ آج شام پاکستان سے برطانیہ کے لیے فلائی کر جائیں گی، وہاں انہیں دو ہفتے رہنا ہے۔ واپسی پر وہ ہمارے پاس ایک ہفتہ رہیں گی۔ میں نے انہی دنوں کو پروگرام کی صورت دی ہے۔" یہ کہہ کر وہ تفصیل سمجھانے لگی۔ میرے کافی ختم کرنے تک وہ سب کچھ بتا چکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستانی فنکاروں کے ساتھ بھارتی فنکار بھی شامل کر دیئے جائیں تو شو زیادہ کامیاب رہیں گے۔ اس کی وجہ یہاں دوبئی کی بھارتی کمیونٹی تھی، جو بہرحال بھارتی فنکاروں کو دیکھنا پسند کرتی ہے۔ ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ اس دوران ستیش بھی آکر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ پھر تقریباً دو گھنٹے کی بحث کے بعد سب کچھ طے پا گیا۔ اس معاملے کے بعد میں نے پرسکون ہوتے ہوئے ستیش سے پوچھا۔

"یہ ندیم کدھر ہے؟"

''سر! اس کا کوئی پاکستانی دوست آیا ہوا ہے، اسی کے ساتھ ابھی تک فلیٹ میں ہے۔''
''کون ہے وہ؟'' میں نے یونہی تجسس سے پوچھا۔
''کوئی الطاف پاشا نامی نوجوان ہے، اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ پھر تیزی سے بولا۔ ''وہ، سر! رات ہم آپ کو بتائے بغیر آرتی کو لینے چلے گئے۔ ایسا ٹھیک تو نہیں تھا لیکن وہ دراصل۔۔۔''
''ڈونٹ وری، ستیش! وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ آپ لوگوں نے جو ٹھیک سمجھا، وہ کیا۔''
''مجھے کہنے دیں، سر!'' ستیش نے میری جانب دیکھ کر لجاجت سے کہا تو میں خاموش رہا۔ تب وہ کہتا چلا گیا۔ ''جب آپ نریندر ترپاٹھی سے بات کر رہے تھے، اسی وقت ہے حیدر صاحب کا فون ملا۔ اب یہ پوری طرح یقین تھی نہیں تھا کہ آرتی وہاں ملتی بھی ہے یا نہیں؟ وقت بہت کم تھا اور پوری تفصیل کا مجھے بھی علم نہیں تھا اس لیے کسی بھی الجھن سے بچنے کے لیے میں نے بس وہاں سے نکل جانا چاہا۔ خیر، وہ ہمیں مل گئی۔ جب اسے حیدر صاحب کے ہاں چھوڑا تو آپ سو چکے تھے۔'' وہ کہہ چکا تو میں نے کسی بھی قسم کے تبصرے سے گریز کیا، اسی لمحے سگریٹ نکالا اور سلگالی۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد وہ بولا۔
''کیا آپ کو معلوم ہے کہ آرتی کون ہیں؟'' میں نے ایک گہرا کش لیا اور نفی میں گردن ہلا دی۔ تب وہ دھیرے دھیرے بتانے لگا۔
''آرتی ملہوترا! ممبئی کے علاقے اندھیری کے ایک آشرم میں پلی بڑھی تھی۔ جس آشرم میں اس نے پرورش پائی وہ کرشن دیوتا کے ایک بڑے مندر کی وجہ سے چل رہا تھا۔ اسی مندر کے مہا پروہت سوامی پرمانند نے اس وقت آرتی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا جب وہ دودھ پیتی بچی تھی۔ اس کے ماتا پتا کون ہیں اور کہاں ہیں، یہ تو وہ پروہت جانے لیکن آرتی کی پرورش اسی ہوئی، وہیں ہوش سنبھالا اور تعلیم حاصل کی۔ پھر کرشن بھگوان کی داسی بن کر وہیں اس مندر سے منسلک ہو گئی۔ ایک ماہ قبل یہ دو اور داسیوں کے ساتھ دوبئی آئی ہیں۔ یہ تینوں داسیاں ان امیر ہندو گھروں میں جاتی ہیں، جہاں خصوصی طور پر عورتوں کے لیے پوجا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان محفلوں کو ہندو دھرم کے مطابق خاص مذہبی محفل بھی کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا تھا کہ یہ ان کا مذہبی ٹور تھا۔ یہ کسی بھی سٹیج وغیرہ کی بجائے محض پوجا کی محفلوں میں شرکت کرتی تھیں اور یہاں کی ہندو کمیونٹی کو دھرم کے بارے میں بتاتی رہی ہیں۔ ایسے ہی ایک محفل میں یہاں کے ایک ہندو جیولر شردشیٹھی کو آرتی کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی۔ اس نے آرتی کو حاصل کرنے کے لیے خاصی کوشش کی مگر ناکام رہا، اس نے بڑی سے بڑی قیمت لگائی مگر وہ

انہیں حاصل اس لیے نہیں کر سکا کہ یہ داسیاں اپنا آپ کرشن بھگوان کی امانت خیال کرتی ہیں۔ وہ اپنی پوتر تا کرشن بھگوان ہی کے لیے بچا کر رکھنا چاہتی ہیں ورنہ ان کی ساری تپسیا نشٹ ہو کر رہ جائے گی۔ شرد شیٹھی کو یہ ضد ہوگئی کہ وہ آرتی کو حاصل کر کے رہے گا۔ اس نے اپنے پورے وسائل اسے حاصل کرنے کے لیے لگا دیئے۔ جس آرگنائزر نے اسے یہاں بلوایا تھا وہ ان لوگوں کے مقابلے میں قدرے کمزور ہے۔ وہ حیدر صاحب کا دوست بھی ہے، ایسے وقت میں اس آرگنائزر نے حیدر صاحب سے مدد چاہی اور یوں آرتی اب حیدر صاحب کے پاس ہے۔"

وہ پوری تفصیل سے کہہ چکا تو میں نے الجھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، ستیش؟''

''وہ کیا؟''

''وہ جو تمہارا آرگنائزر ہے وہ اس قدر کمزور کیوں ہے کہ شیٹھی جیسے لوگوں سے ان داسیوں کو تحفظ نہیں دے سکتا؟''

''بات تحفظ کی نہیں، وہ تو یہاں کا قانون ہی اس قدر سخت ہے کہ اگر وہ آرگنائزر چاہے تو شیٹھی جیسے ان عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں۔ اصل میں وہ آرگنائزر کوئی پنڈت، پروہت یا دھرمی بندہ تو ہے نہیں، اس نے بھی کمائی کے لیے دھرم کی آڑلی ہے اور پھر یہاں پر آنے والی کوئی ستی ساوتری تو ہوتی نہیں، انہی لوگوں نے شیر کے منہ کو خون لگایا ہوا ہے۔ اب اگر شیٹھی جیسے لوگ ان سے عورتوں کی مانگ کرتے ہیں تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' ستیش نے قدرے تلخ انداز میں حقیقت سے پردہ اٹھایا۔ ہمارے درمیان خاموشی آن ٹھہری، تبھی کنول جیت نے کہا۔

''اصل میں، سر! بات یوں ہے کہ بھارت فلم کے ذریعے پوری دنیا کو اور خصوصاً ایشیا اور مڈل ایسٹ کو تو متاثر کر رہا ہے۔ یہ پرانی بات ہوگئی۔ میڈیا کے ذریعے اتنا بڑا نام حاصل کر لینا بلاشبہ بھارت کی کامیابی ہے لیکن شروعات کے وقت ایسی کوئی سوچ نہیں تھی، سوائے دولت کمانے کی خواہش کے۔ یہ فطری سی بات ہے کہ انسان کامیابی کے بعد کچھ اور بھی حاصل کرنے کی خواہش میں لگ جاتا ہے۔ پچھلے چند برسوں سے بھارت نے شوبز کے اس بڑے میڈیم کی بنیاد پر ایک ''کلچر پالیسی'' بنائی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسی کلچر پالیسی کی بدولت سفارتی اور تجارتی تعلقات کو فروغ دے۔ یہ ایک بہت بڑا یوٹرن ہے۔ ظاہر ہے، اس میں عورت کا استعمال ہونا ناگزیر ہے۔ اب اسی کلچر پالیسی میں عورت استعمال ہو رہی ہے۔ عورت کو ایک جنسی آلہ بنا کر مختلف غلافوں میں لپیٹ کر پیش کیا جا رہا ہے۔''

کنول جیت! یہ مت بھولو کہ تم بھی ایک بھارتیہ ناری ہو۔ میں تمہاری۔۔۔"

"ایک منٹ، ستیش ایک منٹ۔۔۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "میں بھارتیہ ناری تھی، اب نہیں ہوں کیونکہ مجھے بھارتیہ ناری ہونے پر کوئی فخر نہیں ہے۔" کنول کے لہجے میں آگ تھی جس کی حدت محسوس کی جاسکتی تھی۔ یہ آگ کیوں تھی؟ اس کا اندازہ آنے والے وقت میں ہی کیا جاسکتا تھا اور وہ ایسا وقت نہیں تھا کہ بات کا رخ کسی اور طرف موڑا جائے۔ میں خاموش رہا، تبھی ستیش نے کہا۔

"چلیں، چھوڑ دیں اس بات کو مگر میں تمہاری اس بات سے اختلاف کرتا ہوں کہ عورت کو بری طرح استعمال کیا جارہا ہے۔ تم شاید یورپ کے وژن میں انڈین عورت کو دیکھ رہی ہو۔ تمہیں شاید انڈین ماتھالوجی کے بارے میں زیادہ جانکاری نہیں۔ عورت، بھارتی کلچر کی بنیاد ہے۔"

"میں نے شاستروں اور پرانوں کی تعلیم تو نہیں حاصل کی لیکن کالج دور میں انڈین ماتھالوجی کے بارے میں جانتی ہوں۔ کیا ارتھ شاستر میں لکھا نہیں پڑھا کہ عورت کو بطور ہتھیار استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جاسوسی کا نظام کس قسم کی عورتوں کے ذریعے چلانے کی تعلیم دی گئی ہے۔ سنو! تمہیں اگر نہیں پتہ تو وہ ویشیا ہیں، کیا یہ انڈین کلچر میں تسلیم شدہ بات نہیں ہے کہ طوائف اس کلچر کا حصہ ہے؟"

"وہ تو پوری دنیا کے ہر کلچر کا حصہ ہے۔" ستیش نے جلدی سے کہا۔

"لیکن جو اہتمام انڈین کلچر میں ہے وہ کہیں نہیں، یہاں نفرت کا شائبہ تک نہیں۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ رکی پھر قدرے مصالحانہ لہجے میں بولی۔ "دیکھو، ستیش! میرا تعلق بھی بھارت سے ہے۔ دھرم سے ہٹ کر بھی اگر بات کی جائے تو کچھ اخلاقی تقاضے ایسے ہوتے ہیں جنہیں نبھایا جاتا ہے، وہ انسانیت کے لیے لازمی ہوتے ہیں۔ تم بھی یہ جانتے ہو کہ غربت ختم کرنے کی بجائے توسیع پسندی کے لیے زیادہ کام ہوا ہے۔ خواہش وہی ہے، مقصد وہی لیکن چہرہ تبدیل کرلیا ہے اور اس میں بھارتیہ ناری کو طوائف بنا کر رکھ دیا ہے۔"

"مثلاً یہ بات تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"کیا بھارتی فخر سے اپنی فلم کے ذریعے دوسرے ملکوں کے عوام کو متاثر کر لینے کو اپنی کامیابی نہیں گردانتے؟ میں مانتی ہوں کہ فلم ایک طاقتور میڈیم ہے لیکن کیا تم نے اس خواہش میں پاگل ہو کر اپنی عورت کو ننگا نہیں کرلیا۔ پچھلے چند سالوں کی فلموں کا موازنہ کرلو، عورت کے کپڑے کس تیزی سے اتارے گئے ہیں، یہ تو سامنے کی بات ہے، ستیش! کلچر پالیسی میں کیا کیا

بھیانک پن ہے، تم سوچ کر لرز جاؤ اور شاید تم نہ لرزو کیونکہ تم عورت نہیں ہو اور نہ ہی مرد، کی
مرد اپنی عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں، انہیں ننگا نہیں کرتے۔" کنول جیت یکدم ہی شعلہ
بن گئی۔

"دیکھو، ہر ملک، ہر دیس کو اپنے وسائل بڑھانے کا حق ہے۔ بھارت اگر ثقا
کے ذریعے اپنے انسانی وسائل بڑھا رہا ہے تو یہ ایک اچھی پالیسی ہے، لوگوں کو کمانا چاہئے۔"

"تو پھر آرتی کو بھی کمانا چاہئے، اسے اپنی پوترتا کا احساس کیوں ہے۔ تمہاری
پالیسی اگر بھارتیہ ناری کو طوائف بنا رہی ہے تو اس میں پوترتا کی گنجائش کہاں؟ ا
اور طوائف بن کر انسانی وسائل میں اضافے کا باعث بنے۔" کنول نے تیزی سے کہا تو ستیش
چونکتے ہوئے بولا۔

"اوہ، اب سمجھا تمہارے غصے کی وجہ، کیوں تم کلچر پالیسی کا سہارا لے کر اپنا غ
نکال رہی ہو۔ تم کہیں آرتی سے جیلس تو نہیں ہو گئی ہو؟"

"بڑی گھٹیا بات کی ہے تم نے، ستیش! میں اس سے کیوں جیلس ہونے لگی لیک
ہاں، میرا یہ سوال ضرور بنتا ہے کہ تم اس کی اتنی وکالت کیوں کر رہے ہو؟ مگر مجھے اس جواب
بھی ضرورت نہیں۔" کنول نے غصے میں کہا۔ یہی وہ وقت تھا جب بحث میں تلخی گھل جانے
اندیشہ تھا۔ عمومی بحث سے بات ذاتیات پر اتر آئی تھی سو میں نے بات کا رخ موڑ دیا اور
کے لیے کسی اچھے ریسان کی بابت پوچھنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہم لنچ کے لیے نکل گئے۔

کنول جیت کور کا جذباتی پن پہلی بار میرے سامنے ظاہر ہوا تھا۔ اس کے لفظوں میں
جو آگ چھپی ہوئی تھی اس کا کسی قدر اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا۔ یکدم بھڑکنا اور بھڑک کر سلگتے رہ
کسی اندرونی خلفشار کی نشاندہی کر رہا تھا۔ تبھی میں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا کہ کنول سے
ایک لمبی ملاقات انتہائی ضروری ہے کیونکہ کنول نے جو کچھ بھی کہا تھا، ٹھوس حقیقتوں کی بنیاد پر ک
تھا۔ پچھلی دہائی سے بھارت نے جو روش اپنائی ہوئی ہے، اس کی بنیاد میں تسلط کی خواہش ہے
یہ تسلط چاہے کاروبار میں ہو یا ثقافت میں یا پھر ذہنوں پر، ہندو کی اپنی ایک خاص ذہنیت تو ہے
ہی، اسے مزید سہارا یہود دوستی سے ملا۔ بھارت اب یہودی منافقت اور سازش کے ذریعے اپ
تسلط قائم کرنے کی ازلی خواہش پر گامزن ہو چکا ہے۔ یہودیوں کو ہندوؤں کی صورت میں ایک
فطری دوست میسر آیا تو بھارت کی جُون ہی بدل گئی۔ یوں بھارت پرانے ہتھیاروں اور فطری ذ
ہنیت کو نئے انداز میں سامنے لا کر عالمی سطح پر خود کو متعارف کروانے کی فکر میں ہے۔ دو ع
جہاں پر وہ پہلے ہی سے اپنی جڑیں قائم کر چکے ہیں، وہاں ان کی مزید آبیاری کے لیے جس

طرح انفارمیشن ٹیکنالوجی اور پھر عورت کو استعمال کیا جا رہا ہے، اس سے یہی لگتا ہے کہ وہ یورپ اور امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑ جانا چاہتا ہے۔ آرتی کے بارے میں ستیش کی یہ بات میرے حلق سے نہیں اترتی تھی کہ وہ اپنی پوترتا بچانے کے لیے چھپ جانے پر مجبور ہوگئی ہے۔ کیا وہ آرگنائزران داسیوں کو لے کر یونہی دوبئی آ گیا تھا، کیا دوبئی کا قانون اتنا ہی بے حیثیت ہے؟ وہ اگر پوجا کی محفلوں میں یا دھرم کے معاملات کے لیے یہاں آئی ہیں تو کیا یہاں کی ہندو کمیونٹی میں ان کی کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں۔ کیا یہاں کی ہندو کمیونٹی دھرمی معاملات کے لیے کوئی بھی ایسا پریشر گروپ نہیں رکھتی جوان پنڈت، داسی یا کم از کم ہندو ازم کے لیے کام کرنے والا ہو۔ کیا دھرم کے معاملات لاوارث پن کا شکار ہے؟ وہ لوگ جنہوں نے ان داسیوں کو ممبئی سے یہاں بھجوایا ہے، کیا انہوں نے آنکھیں بند کر کے آرگنائزر پر یقین کر لیا اور انہیں دوبئی بھجوا دیا؟ اور سب سے اہم سوال کہ کلچر کے غلاف میں دھرم کا پرچار؟ سوالوں کی ایک قطار تھی جو میرے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔

اس شام میں گھر پہنچا تو میرے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ میں نے ایزی ہو کر پین کلر کھائی اور تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گیا۔ میرے اندر ہلکی ہلکی بے چینی تیرتی رہی جس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس دن میں نے کنول جیت کور کی باتیں بہت دیر تک سوچی تھیں۔ سوچ کا رخ بدلا تو اس میں مختلف لوگوں کے چہرے اور ہی روپ میں دکھائی دینے لگے۔ اس میں آرتی بالکل ہی پراسرار انداز میں سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے کچھ دیر تو اسے سوچا پھر اسے جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگا مگر نیند نہیں آئی۔ میرا دل چاہا کہ میں کھلی فضا میں جاؤں۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر نیچے آیا اور پائیں باغ کی طرف نکل آیا، تبھی میری نگاہ سوئمنگ پول پر پڑی جو وہاں سے کچھ فاصلے پر پام اور کھجور کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہاں حیدر کے ساتھ کچھ لڑکیاں نظر آئیں۔ ڈھلتی ہوئی شام، سمندر کی نم آلود ہوا اور سوئمنگ پول پر رنگینی سے ماحول میں نشہ اتر آیا تھا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ سکول کے دنوں میں چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لیے ترسنے والا اس قدر دولت مند ہو گیا ہے کہ اب وہ خواہشیں بھی پوری ہو رہی ہیں جو اس نے کی ہی نہیں تھیں۔ یہی سوچتے ہوئے میرے ذہن میں آیا کہ ان میں آرتی تو نہیں۔ اگر موجود ہے تو پھر اس کی پوترتا؟ اسی تجسس کے باعث میں سوئمنگ پول کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ حیدر شیخ نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں جو شرمناک حد تک مختصر لباس میں تھیں۔ ان میں آرتی نہیں تھی۔ میں وہیں کنارے پر بچھی بید کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا، تبھی حیدر تیرتا ہوا میرے قریب

کنارے پر آ کر بولا۔

''باؤ جی، خیریت ہے؟''

''میرا سر درد کر رہا تھا۔ کھلی فضا میں بیٹھنے کو دل چاہ رہا تھا، تمہیں دیکھ کر اِدھر آ گیا۔''

''آ جاؤ، نہر میں نہانے کی یاد تازہ کرلو۔'' اس نے آنکھ دباتے ہوئے کہا پھر ان لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ پسند نہیں ہیں تو دوسری آسکتی ہیں۔''

''اُونہیں، یار! تم مزے کرو۔''

''وہ تو کر رہا ہوں ۔تم نے کوئی پین کلر لی، چائے یا کافی؟''

''لی ہے، باقی دل نہیں کر رہا۔'' میرے آزردہ لہجے پر اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

''اوئے کہیں لاہور چھوڑنے پر اداس تو نہیں ہو؟''

''حیدر! یہ تم جانتے ہو کہ لاہور چھوڑنے پر میں اداس نہیں ہوں۔''

''میں سمجھ گیا، تم تنہائی محسوس کر رہے ہو گے۔'' یہ کہہ کر وہ پول سے باہر نکل آیا۔ میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو، میرے یار! یہاں ہر بندہ مصروف ہے، تم بھی مصروف ہو جاؤ۔ اپنے اردگرد رنگینی پیدا کرلو۔ یوں۔۔۔''

''تم جو سمجھ رہے ہو، وہ نہیں ہے۔ بس میرے سر میں درد ہو رہا ہے، اور کچھ نہیں۔''

''اچھا۔'' اس نے ہلکے سے کہا اور پاس پڑا فون اٹھا کر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ دو چار جگہ بات کرنے کے بعد وہ اٹھا، فریش جوس کا گلاس بھر کے میرے ہاتھ میں تھمایا اور خود پول میں چھلانگ لگا دی۔ میں ہلکے ہلکے سپ لیتے ہوئے انہیں دیکھتا رہا۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد میرا فون بج اٹھا۔ دوسری جانب کنول جیت تھی۔

''آپ کہاں ہیں، سر! میں آپ کو یہاں حیدر صاحب کے گھر میں تلاش کر رہی ہوں۔''

''میں سوئمنگ پول پر ہوں۔''

''نہا رہے ہیں آپ؟''

''نہیں، ویسے ہی بیٹھا ہوں کیوں، خیریت؟''

''ٹھیک ہے، سر! میں آ رہی ہوں۔''

''اونہیں، تم اِدھر مت آنا۔ یہاں حیدر اور۔۔۔'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''سر! یہ میرے لیے نیا تو نہیں ہے۔ ڈونٹ وری۔۔۔'' کنول نے ہنستے ہوئے کہا۔

''مگر مجھے اچھا نہیں لگے گا تم بیٹھو، میں آ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کیا اور

اٹھ کھڑا ہوا۔ حیدر نے سوالیہ انداز میں دیکھا تو میں اسے بتا کر عمارت کی جانب چل پڑا۔ کنول جیت پر نگاہ پڑی تو میں چونک گیا۔ وہ صحیح معنوں میں ''پنجابن کڑی'' نظر آرہی تھی۔ ملٹی کلر کے شلوار قمیص، براؤن سلیپر، لمبا سا دوپٹہ، کانوں میں جھمکے اور بازو بھر چوڑیاں۔ مجھے ایک دم خوشگواریت کا احساس ہوا، لاشعوری طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔

''ہش کے بھئی، پنجابی کڑیئے۔!'' میری شوخی پر وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔

''تسی پنجابی اُو۔۔۔'' (آپ پنجابی ہیں)

''تے ہور کیہہ، اسیں اِدھر دے پنجابی تے تسی اُدھر دے پنجابی۔'' (تو اور کیا ہم ادھر کے پنجابی اور تم ادھر کی پنجابن) یہ کہتے ہوئے میں مسکرا کر بیٹھ گیا۔ تبھی میں نے کنول کا دھواں ہوتا ہوا چہرہ دیکھا، جہاں یکدم ہی ویرانی اتر آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی جسے اس نے کمال خوبصورتی سے چھپا لیا۔

''آپ اردو اور انگریزی اس قدر روانی سے بولتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ آپ پنجابی ہیں۔''

''ہاں، پنجابی، میری مادری زبان، اردو قومی اور انگریزی مجبوری ہے۔''

''ہاں، مجبوری۔۔۔ سرجی! یہ مجبوری کیا کچھ نہیں کروا دیتی۔'' وہ گم ہوتے ہوئے لہجے میں کہتی کہتی یکدم چونک اٹھی۔ پھر تیزی سے بولی۔ ''اب دیکھیں نا! انگریزوں نے کتنا مجبور بنا دیا ہے کہ گرو جی مہاراج کی جنم بھومی تک جانے کے لیے ویزا لینا پڑتا ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں کہ لمحوں کے فیصلے انسان کو بہت دور تک لے جاتے ہیں۔''

''کیا تمہیں اس المیہ کا احساس ہے؟'' میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''بالکل ہے، میں بتاؤں کہ تاریخ اور وہ بھی ہندوستان کی تاریخ میرا پسندیدہ مضمون رہا ہے اور اب بھی میں اس میں خاصی دلچسپی محسوس کرتی ہوں۔ وہ ایک بھیانک حقیقت تھی۔ وقت گزر گیا۔ اب ہماری قوم کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو رہا ہے اور یہ سب ہندو ذہنیت کے باعث ہے جو دوسروں کو غلام بنا لینا چاہتے ہیں۔''

''کنول! تمہاری دوپہر والی باتوں سے اور اب بھی، ایسا لگتا ہے جیسے تم ہندوؤں سے نفرت کرتی ہو۔''

''ہندو سے نہیں، ہندو ذہنیت سے بلکہ یوں کہیں، برہمن ذہنیت سے۔ وہ دوسروں کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی میں ان کی بقا ہے مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ نفرت کے بیج سے محبت کے پھول نہیں کھلا کرتے، انسانوں کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو، سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کی مثال دیکھ لو، باضمیر سکھ ہی نہیں دوسری قومیں بھی ہندو ذہنیت کے خلاف لڑ رہی ہیں۔'' میرے یوں کہنے پر کنول جیت چونک اٹھی۔

''کیا آپ جانتے ہیں آپریشن بلیو سٹار کے بارے میں؟'' اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔

''اتنا ہی جتنا ذرائع ابلاغ سے معلومات مجھ تک پہنچی ہیں۔'' میں نے عام سے انداز میں کہا۔ پھر اچانک ہی میرے ذہن میں سوال آ گیا۔ میں نے بلا جھجک وہ پوچھ لیا۔

''کنول! اگرچہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے لیکن ستیش ایک ہندو ہے اور۔۔۔''

''میں سمجھ گئی، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' اس نے تیزی سے کہا پھر دھیرے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''میں یہ نہیں کہتی کہ میں پوتر ہوں، ستی ساوتری ہوں، معصوم یا پاک ہوں مگر ایک اپارٹمنٹ میں رہنے کا مطلب بھی نہیں کہ اس کی رسائی میرے جسم تک بھی ہو۔آپ ابھی تک وہاں آئے نہیں۔اگر آئیں تو دیکھیں گے کہ میں ایک الگ کمرے میں رہتی ہوں۔ حیدر صاحب نے بھی اس بارے میں ضمانت دی ہے کہ اگر میں ان کے ساتھ نہ رہنا چاہوں تو اپنی رہائش ہوٹل میں لے جا سکتی ہوں اور پھر ندیم بھی تو وہیں رہتا ہے۔ وہ ہمارے ''تعلق'' کو بڑی اچھی طرح جانتا ہے۔''

''اچھا، کنول! یہ بتاؤ، ستیش اور ندیم میں کیا فرق محسوس کیا ہے تم نے؟''

''دیکھیں، جن بنیادی تصورات اور خیالات پر انسان کی سوچ پروان چڑھتی ہو اور پھر انہی خطوط پر اس کی تربیت بھی ہو گئی ہو تو وہ فطرت بن جاتی ہے۔ ہندو ذہنیت اور مسلم ذہنیت الگ الگ ہیں اور اسی مطابق ان کا رویہ ہوتا ہے۔''

''خیر، ہم بھی کن باتوں میں الجھ گئے۔ میں نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ اس وقت تم کیسے آئی ہو؟''

''ندیم صبح کا نکلا ہوا ہے، وہ واپس نہیں آیا۔ ستیش بھی دفتر سے جانے کے بعد اپارٹمنٹ نہیں گیا۔ میں اکیلے میں گھبرا رہی تھی۔ میں کہیں جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ حیدر صاحب کا فون آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو کمپنی دو، سو میں ادھر چلی آئی۔''

''اچھا تو پنجابن کڑی مجھے کمپنی دینے آئی ہے۔'' میرے یوں کہنے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ تب میں نے کہا۔''تم ذرا بیٹھو، میں شاور لے کر فریش ہو جاؤں پھر کہیں باہر چلتے ہیں۔''

"جیسے آپ کی مرضی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میز پر دھرا ہوا میگزین اٹھا لیا اور میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں سٹنگ روم میں واپس آیا تو کنول جیت کے ساتھ آرتی ملہوترا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ باتیں کر رہی تھیں، مجھے دیکھتے ہی خاموش ہو گئیں۔

"آرتی جی! کیسی ہیں، آپ؟" میں نے خوشگوار انداز میں کہا تو وہ ہنس دی پھر بڑی ادا سے بولی۔

"ہم بالکل ٹھیک ہے، آپ سناؤ؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا اور صوفے پر بیٹھی کنول سے کہا۔ "تو پھر چلیں، کنول؟"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟ مطلب، کوئی ضروری کام ہے؟"

"کام تو کوئی نہیں، بس یونہی گھومنے کے لیے جا رہے ہیں۔"

"اگر ہم کہیں کہ آپ کہیں نہ جائیں بلکہ آج کی شام ہمارے ساتھ اس گھر میں گزاریں تو کیسا ہے؟" یہ کہتے ہوئے آرتی کے لہجے میں تجسس تھا اور قدرے التجائیہ انداز تھا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں، آرتی؟" میں نے پوچھا۔

"آج میں نے کھانا بنایا ہے۔ خالص بھارتی پکوان، ہم چاہیں گے کہ آپ ڈنر ہمارے ساتھ لیں۔"

"اوہ، تو یہ بات ہے، آپ کھانا بنا لیتی ہو؟"

"جی کیوں نہیں، کیسا بناتی ہوں، یہ تو آپ چکھ کر ہی بتائیں گے؟" اس نے قدرے تفاخر سے کہا۔

"کیوں، کنول! یہ رسک لے لیا جائے؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا تو وہ بھی قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

"میرا خیال ہے ٹرائی کر لینے میں کوئی حرج نہیں، باقی آپ جیسا چاہیں۔" کنول نے کہا تو میں صوفے پر بیٹھ گیا اور دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"چلیں، آج ڈنر یہیں پہ کرتے ہیں۔" میرے یوں کہنے پر آرتی کھل اٹھی، چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"آپ کو تھوڑی دیر اور انتظار کرنا ہوگا۔ اتنے میں حیدر صاحب بھی آ جائیں گے۔ آپ گپ شپ لگائیں، ہم کچن میں جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چل دی۔ میں نے سگریٹ

سلگاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، بلاشبہ آرتی کا انداز شاہانہ تھا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں خیال آیا۔ کیا داسی ایسی ہی ہوا کرتی ہے؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے کنول کی طرف دیکھا، وہ بڑی گہری نظر سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ پھر نگاہیں ملتے ہی وہ ہنس دی تو میں نے پوچھا۔

''کیا بات ہے، کنول؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے ہونٹوں کا ایک کون سکیڑتے ہوئے کہا۔

''کچھ تو ہے جو یوں مسکرا رہی ہو؟'' میں نے یونہی بات بڑھا دی۔

''اگر کچھ سوچنے کی بات ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں سوچ رہی تھی۔ انسان بھی کیا چیز ہے، کبھی انتہائی معمولی باتوں سے بہل جانے والا اور کبھی انہی معمولی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا لینے والا۔''

''مجھے نہیں پتہ، کنول! کہ تم یہ کس بنیاد پر کہہ رہی ہو لیکن انسان اپنے اندر ایسی ہی رنگا رنگی رکھتا ہے، کچھ بھی ممکن ہے۔''

''اچھا، شجاع جی! آپ ایک بات تو بتائیں۔'' یہ کہہ کر وہ میرا عندیہ پانے کے لیے میرے چہرے پر دیکھتی رہی۔ میں خاموش رہا تو وہ بولی۔ ''کیا آپ کے مذہب میں بھی برہمچاری کا تصور ہے؟''

''نہیں، کنول! ایسا نہیں ہے۔ جنس جیسے اہم عمل کے لیے ہمارے دین میں پوری وضاحت موجود ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں، چونکہ یہ ایک فطری تقاضہ ہے اس لیے دینی تعلیمات اسے انسان ہی کے دائرے میں رکھتی ہیں جبکہ دوسرے مذاہب اسے حیوانیت کی سطح پر لے آتے ہیں۔''

''پھر میں آپ سے یہ سوال ضرور کروں گی کہ آپ عورتوں سے دور کیوں رہتے ہیں؟''

''کون کہتا ہے کہ میں عورتوں سے دور رہتا ہوں۔ دیکھو، تمہارے پاس نہیں بیٹھا ہوا۔''

''میرا مطلب، عورتوں سے وہ خصوصی تعلقات؟'' کنول نے بلا جھجک اپنی بات کی وضاحت کر دی۔

''اوہ، میں سمجھا، کنول! اصل میں بات یہ ہے کہ آپ ایک ہی واقعہ کو ہزار زاویوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اختلاف اپنے اپنے نکتہ نظر کی وجہ سے ہو سکتا ہے لیکن اس سے بھی ماورا ایک اور بات ہے۔ وہ ہے تعلق کی نوعیت۔ کیا تعلق میں پاکیزگی ہے؟ ہمارا تعلق اپنی بیوی سے کیسا ہوتا ہے لیکن اگر اس میں پاکیزگی نہیں ہے تو وہ تعلق حیوانیت کی سطح پر آ جاتا ہے۔ میں

عورت کو محض ایک جنسی آلہ نہیں سمجھتا بلکہ انسان سمجھتا ہوں اور انسانی تعلقات میں پاکیزگی کا قائل ہوں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ پہلے میں ایسا نہیں تھا۔ اب عقل آ گئی ہے۔'' آخر فقرہ کہتے ہوئے میں مسکرا دیا۔

''میں دیکھتی ہوں کہ سب بھوکے بھیڑیئے کی طرح۔۔۔''

''روش، زمانے کی روش ہے، معمول بن چکا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی ان جیسا نہیں ہوتا تو وہ حیرانگی ظاہر کرتے ہیں جیسے کہ ابھی تم نے ''برہمچاری'' والا سوال کر ڈالا۔ کنول! یہ جان لو کہ پوترتا یا پاکیزگی کا تعلق روح سے ہوتا ہے۔۔۔نہیں یہ اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔''

''یہ کیا بات کی، آپ نے؟''

''کنول! یہ ایک بنیادی فلسفہ ہے۔ دنیا کے سارے مذاہب اسے کسی نہ کسی صورت میں مانتے ہیں۔ یہیں سے اپنے آپ کی پہچان کا آغاز ہو جاتا ہے۔ خیر، یہ لمبی باتیں ہیں۔ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ ہمارے درمیان اگر پاکیزگی والا تعلق ہوگا تو اعتماد کس قدر مضبوط ہو سکتا ہے۔ اگر ذہن میں محض جسم اور اس کی لذتیں ہوں تو بے چینی اور بدسکونی کا گراف کیا ہوگا؟ اسی بنیادی فرق کو سمجھ لو تو ساری بات نکھر کر سامنے آ جائے گی۔''

''اوہ، شجاع جی! میں نہیں سمجھتی کہ آپ اس قدر موٹی موٹی باتیں بھی کر سکیں گے۔ یقیناً مجھے خوشی ہوئی آپ سے ایسی باتیں کر کے۔ یقین جانیں، میرے لیے یہ بالکل منفرد باتیں ہیں۔''

''ہمارے ساتھ رہو گی تو یونہی عیش کرو گی۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

''شجاع جی! ایک بات اور بتائیں اور وہ یہ ہے کہ ایسی باتیں آپ نے سیکھی کہاں سے؟''

''یہ سب کچھ ہمارے اندر ہوتا ہے، کہیں باہر سے نہیں آتا۔ من میں سب کچھ موجود ہے۔ یہ ہماری سوچ ہے کہ ہم من کے خزانے سے کس بات کو پکڑتے ہیں اور اس کو اپنی خواہشوں کا مقصد جان لیتے ہیں۔ کوئی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عورت اور اس کے جسم کی لذتیں ہی سب کچھ ہے لیکن کچھ لوگ جانتے ہیں کہ یہ سب فریب نظر ہے، اپنے آپ سے دھوکہ ہے۔ زندگی کی اصل حقیقت انسانیت کا احترام ہے۔ اسے میں تمہیں دوسری طرح بتا دوں کہ ہمارے

دین میں نکاح سے پہلے کسی عورت سے جنسی تعلق بالکل حرام ہے لیکن جب وہ آپ کے نکاح میں آگئی تو آپ پر اس کے حقوق فرض ہو گئے۔ آپ اسے احترام دیں۔ اس کی فقط جسمانی ضرورتیں نہیں بلکہ ذہنی، اخلاقی اور روحانی ضرورت پوری کریں۔ عورت اس مرد کے ساتھ سکون محسوس کرے تو یہی انسانیت کا احترام ہے۔ لذت ثانوی حیثیت سے اختیار کر جاتی ہے اور سامنے رہتا ہے، انسان۔!'' میں نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ کی یہ ساری باتیں اپنی کوئی عملی حیثیت رکھتی ہیں یا بس یونہی تصوراتی ہیں؟''

''تم اپنی بات کی خود ہی تردید کر رہی ہو، ایک طرف برہمچاری والا سوال اور دوسری طرف تمہارا یہ سوال، دیکھو، کیا میری دسترس میں عورتیں نہیں ہیں؟''

''بالکل ہیں، آپ کے پاس دولت ہے، آپ خود اتنے سمارٹ ہیں اور۔۔۔''

''اصل میں ہر انسان کا اپنا ایک دائرہ ہوتا ہے۔ اس سے تجاوز ہی غلط بات ہے۔ میری بانہوں میں آ کر کوئی عورت پگھل جائے اور میں اس سے منہ موڑ کر کہوں کہ بس یہی میری حد ہے تو یہ انتہائی ظلم ہے۔ آپ ابتدا تو کر چکے، آپ کی حد دوسرے کی ناک تک ہے۔ اس سے آگے غلط بات کی شروعات ہیں۔'' یہ کہتے کہتے میں چونک گیا۔ یہ کنول مجھے کس طرح ''پھرول'' رہی ہے۔ یہی سوچ ذہن میں آتے ہی میں مسکرا دیا اور اس سے پوچھا۔

''کنول! آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''میں نے کیا کہنا، میں تو یونہی گپ شپ لگا رہی ہوں بس، پلیز، ایک بات اور۔۔۔'' اس نے انگلی کھڑی کرتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا۔

''بولو۔'' میں نے کہا۔

''کسی بہت بڑے مقصد کے لیے اپنی پوترتا قربان کر دینا کیسا ہے؟''

''تم بات کو گھما کر پھر وہیں لے آئی ہو۔ میں نے کہا نا کہ روحانی پاکیزگی ہی اصل پاکیزگی ہے۔ جسم قربان ہوا کرتے ہیں جب مقصد کے لیے جسم اور اس کی لذتیں ثانوی حیثیت اختیار کر جائیں۔ لیکن، کنول! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس سوال کا پس منظر کیا ہے۔''

''ہے پس منظر، شجاع جی! لیکن ابھی اس کا وقت نہیں پھر کبھی سہی۔ یہ میں آپ سے شیئر ضرور کروں گی۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر زبردستی مسکرا دی۔ پھر ہم دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی اور میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ کتنے ہی لمحے یونہی گزر گئے۔ تبھی حیدر اور اس کے ساتھ وہی دو لڑکیاں اندر آ گئیں۔ وہ ہم دونوں کو دیکھ کر حیرت

سے بولا۔

''ارے، تم لوگ تو خاموش بیٹھے ہو۔ میرا تو خیال تھا کہ آپ لوگوں میں کوئی زبردست قسم کی بحث چھڑی ہوئی ہوگی۔'' میں نے حیدر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس کی طرف دیکھ کر ان لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ حیدر میری نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا اس لیے بجائے مزید بات کرنے کے وہ ان لڑکیوں کو لے کر باہر کی طرف چلا گیا۔ چند ہی لمحوں بعد بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ آرتی کچن سے وارد ہوئی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔

''یہ حیدر صاحب آئے تھے؟''

''ابھی آجاتے ہیں۔'' میں نے کہا تو مسکراتے ہوئے بولی۔

''بس کچھ دیر بعد ڈنر کرتے ہیں۔ میں فریش ہو آؤں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی سمیت چل دی۔ ڈنر پر ہم چاروں ہی تھے۔ کنول، آرتی، حیدر اور میں۔ میز انڈین کھانوں سے بھری پڑی تھی۔ خوشگوار باتوں کے دوران ڈنر چلتا رہا۔ کھانے کے بعد سوڈا پیتے ہوئے آرتی نے بڑے مان سے پوچھا۔

''شجاع جی! کیسا لگا میرے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا؟''

''بہت اچھا، اگر ہم کسی سلطنت کے شہنشاہ ہوتے تو کہتے، جاؤ فلاں جاگیر تمہارے نام کی لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم شہنشاہ نہیں ہیں ورنہ تمہیں کچھ دان کر دیتے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ اب بھی کچھ دان کر سکتے ہیں۔''

''مثلاً؟'' میں نے یونہی مذاق سے پوچھا۔

''محض ایک مسکراہٹ، ہمارے لیے بڑا تحفہ ہوگی اور۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''اور۔۔۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اور ہماری ایک چھوٹی سی خواہش پوری کر سکتے ہیں لیکن آپ کہیں تو کہ مانگ۔۔کیا مانگتی ہے۔؟''

''چلو میں کہے دیتا ہوں کہ مانگ کیا مانگی ہے، داسی؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں نے سنا ہے یہیں دوبئی میں ایک مندر ہے۔ میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔ آپ کوئی ایسا بندوبست کر سکتے ہیں۔'' اس نے پہلے میری طرف پھر حیدر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''دیکھو بھئی، آرتی! ہمارے تو ہاتھ کھڑے ہیں۔ تمہاری یہ خواہش شجاع ہی پوری کر سکتا ہے۔ پہلے مندر تلاش کرنا اور پھر تمہیں وہاں لے جانا۔'' اس نے کھرے لہجہ میں کہہ دیا۔

''کیوں، شجاع جی! لے چلیں گے آپ؟'' اس نے التجائیہ انداز میں کہا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، تبھی کنول بول پڑی۔

''مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے کہ وہ مندر کدھر ہے۔ اسے میں تلاش کرلوں گی، لے کر آپ چلے جایئے گا۔''

''چلیں، ٹھیک ہے، میں تمہیں مندر لے جاؤں گا۔'' میں نے کہا تو آرتی کھل گئی۔ یکدم ہی اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہے۔ پھر کنول کو ڈرائیور اس کے اپارٹمنٹ چھوڑ آیا۔

اگلی صبح دفتر پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے ندیم کو بلوایا۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھا تو میں نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

''یہ جناب کل کہاں غائب رہے ہیں۔ آپ کی مصروفیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ فون کر کے اپنے بارے میں اطلاع بھی نہیں دے سکے؟''

''سر جی! مجھے آپ کو فون کر دینا چاہئے تھا۔'' اس نے مختصراً کہا اور خاموش ہوگیا۔

''وہ کون سا پاکستانی دوست تھا جس کے ساتھ تم نے کل کا دن گزارا؟''

''الطاف پاشا؟ یہیں پر اس سے ملاقات ہوئی ہے۔ اچھا بندہ ہے۔ وہ آپ سے بھی ملنا چاہتا ہے۔''

''کیوں؟''

''ایسے ہی، بس میرے حوالے سے۔''

''مطلب، اتنی جلدی تم نے اسے اپنا سب کچھ بتا دیا؟''

''بتا دیا لیکن یہ کوئی اتنی جلدی نہیں، میں جب یہاں آیا تھا تب ہی سے اس کے ساتھ دوستی ہوگئی اور ہم ایک دوسرے کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''حیرت ہے، پہلے کبھی تم نے اس کا ذکر نہیں کیا؟'' میں نے کہا تو وہ خاموش رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب وہ مزید کچھ کہنے والا نہیں۔ اگر میں اصرار کر کے پوچھوں گا بھی تو شاید جھوٹ بول دے مگر پریشانی والی بات تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، اس بندے سے اپنا تعلق کیوں چھپا رہا ہے۔ وہ کون تھا اور کیسا بندہ تھا؟ یہ جاننا تو ضروری تھا۔ ندیم سے مجھے ایسے کسی رویئے کی امید نہیں تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنا بدلہ ہوا رویہ لیے میرے سامنے موجود تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ یہی سوال پوری شدت سے پوچھنا چاہ رہا تھا مگر یہ سوال میرے ہونٹوں پر ہی دم توڑ گیا۔ میں نے ایک نظر ندیم کی طرف دیکھا اور پھر انٹر کام پر کنول جیت اور ستیش کو بلوا

لیا تا کہ اپنے کام کے بارے میں ڈسکس کی جا سکے۔تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہماری ڈسکس ختم ہوگئی۔تب ندیم فوراً ہی اٹھ گیا۔ پھر اس کے ساتھ ستیش بھی۔شاید میرا رویہ ایسا ہو گیا تھا کہ فضا میں تناؤ آ گیا تھا اس لیے کنول نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''سر! میں نے اس مندر کا پتہ چلا لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، وہ سب ڈرائیور کو سمجھا دو۔ مجھے تم سمجھاؤ گی تو بھی پتہ نہیں چلے گا۔''

''ٹھیک ہے، سر!'' کنول جیت نے دھیمے سے کہا اور اٹھ گئی۔اس وقت میرے ذہن میں ندیم کا رویہ تھا۔ مجھے قدرے دکھ ہوا تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ یہی سوال بار بار میرے ذہن میں گھوم رہا تھا اور کئی سارے جواب میرے ذہن میں ایک کے بعد ایک کر کے آتے چلے گئے تاہم مطمئن کر دینے والا جواب تو ندیم ہی کے پاس تھا۔ دفتر میں کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے میں اٹھ گیا۔

میں اپنے کمرے میں آ کر فریش ہوا اور ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا۔ ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ دروازہ ہلکے سے بجا اور پھر کھلتا چلا گیا۔ سامنے آرتی کھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا، اس نے پوچھ لیا۔

''آپ اتنی جلدی آ گئے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''میں ٹھیک ہوں مگر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں آ گیا ہوں اور وہ بھی جلدی؟''

''حیدر صاحب کا فون آیا تھا کہ آپ گھر پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے ابھی لنچ بھی نہیں لیا۔'' اس نے کہا تو مجھے یکدم ہی حیدر پر غصہ آ گیا۔ میں نے آرتی کو کسی قسم کا کوئی جواب دینے کی بجائے فون اٹھایا اور حیدر کے نمبر پش کر دیئے۔ رابطہ ہو جانے پر اس کی آواز ابھری۔

''جی، جناب! خیریت سے ہیں۔''

''میں تو ٹھیک ہوں لیکن تم میری جاسوسی کیوں کرتے ہو۔''

''جاسوسی ۔۔۔'' اس نے قدرے حیرانگی سے کہا اور پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"مطلب آرتی تمہارے پاس پہنچ گئی ہے۔ یار! مجھے تمہارا خیال نہیں رکھنا چاہئے؟''

''یار! کیا میں دودھ پیتا بچہ ہوں۔ میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں اور پھر تم یہ عورتوں بھیج کر مجھ پر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو، بولو؟'' یہ کہتے ہوئے میں اسے بے نقط سنا دیں۔

''یار! اس وقت وہی گھر میں ہے اس لیے میں نے اس سے کہہ دیا۔ میں نے دفتر فون کیا تھا تو پتہ چلا تم گھر آ گئے ہو۔''

''تم مجھے میرے سیل فون پر بھی کال کر سکتے ہو، براہ راست پوچھ سکتے ہو۔''

''پرسکون ہو جاؤ، یار! میں آ رہا ہوں۔ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''خاک بات کرنی ہے تم نے۔۔۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے اس وقت شدت سے حیدر پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ میں ایک لمحہ کو بھول گیا کہ آرتی ابھی وہیں کھڑی ہے۔

''ہم سے کچھ بھول ہو گئی؟'' آرتی نے گلوگیر لہجے میں کہا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''نہیں، آرتی! تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ میری ہی سوچ کا ٹریک کسی اور سمت میں ہے۔''

''ہم سمجھے نہیں۔'' اس نے کہا۔

''تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، پلیز، تم جاؤ۔'' میں آپ سے تم پر اتر آیا۔

''نہیں، شجاع جی! آپ ہمارے ساتھ ایسا سلوک مت کرو یا تو ہماری غلطی بتاؤ یا پھر ایسے طریقے سے بات نہیں کرو۔'' اس نے قدرے تن کر کہا۔

''کیا چاہتی ہو، تم؟'' میں نے ذرا سخت انداز میں کہا تو وہ پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی اور بڑے ہی گھمبیر انداز میں بولی۔

''جس طرح آپ کے بارے میں سنا تھا اس سے یہ تو نہیں لگتا تھا کہ آپ بزدل ہوں گے لیکن آپ اپنے رویئے سے ثابت کر رہے کہ آپ بزدل شخص ہیں۔'' اس نے ایک بڑی بات بڑی آسانی سے کہہ دی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہوں میں نگاہ ڈال کر دیکھنے لگی تو میں نے پوچھا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو، تم؟''

''یہی کہ آپ تو اپنے آپ کو بارود بنائے بیٹھے ہیں جو عورت کے ذرا سا ساتھ لگنے سے بھڑک اٹھے گا۔ آپ اپنے سے ڈرتے ہیں۔ اپنی شخصیت میں کہیں کوئی خامی رکھتے ہیں جو عورت سے یوں بدک رہے ہیں۔'' یقیناً آرتی کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اسے سمجھانے کے لیے ایک لمبی بحث کی ضرورت تھی مگر میں اس پر ایک لفظ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کیونکہ میں لفظ ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھا سو میں نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا اور بڑے نرم انداز میں کہا۔

''تم کہہ چکیں، جو کہنا تھا یا ابھی کچھ باقی ہے؟''

''ہمارا خیال ہے کہ اتنا ہی بہت ہے۔اس پر اگر آپ جواب دے سکیں تو؟'' یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''مگر میں جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہوں، تم جا سکتی ہو اور ہاں، آج شام تیار رہنا۔ میں تمہیں مندر لے جاؤں گا۔'' میں نے کہا تو وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔اس کے چہرے پر کس طرح کے جذبات ابھرے، میں نے یہ دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی اور ٹی وی سکرین پر دیکھنے لگا۔ وہ چند لمحے بیٹھی رہی پھر اٹھ کر چلی گئی۔تھوڑا وقت گزرا ہوگا کہ آرتی دوبارہ آگئی۔ اس کے ساتھ بنگالی باورچی ہاتھ میں ٹرے تھامے کھڑا تھا۔

''شاب! لنچ۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ میں نے اسے اشارے سے بیڈ پر رکھ دینے کو کہا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ واپس آیا تو آرتی میرے بیڈ پر براجمان تھی۔ میں نے اسے ایک دفعہ کھانے میں ساتھ دینے کہا۔

''میں کھا چکی ہوں۔'' اس نے مختصراً کہا اور گلاس میں پانی ڈالنے لگی۔ میں کھا چکا تو وہ دونوں برتن سمیٹنے لگے، تبھی میں نے آرتی سے کہا۔

''ہو سکتا ہے، میری آنکھ لگ جائے۔تم مجھے وقت پر جگا دینا۔'' اس پر آرتی نے کوئی جواب نہ دیا اور میں بیڈ پر پھیل کر لیٹ گیا۔

میں تیار ہو کر پورچ میں کھڑا تھا کہ آرتی آتی ہوئی دکھائی دی۔اس نے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ہاف سلیو بلاوز اور سفید سینڈل۔ عام ہندو عورتوں کی طرح اس کی کمر کھلی ہوئی تھی۔ وہ بلا جھجک پچھلی سیٹ پر آن بیٹھی تو ڈرائیور نے گاڑی بڑھا دیا۔تبھی آرتی نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''کتنا وقت لگے گا؟''

''ایک گھنٹہ بھی لگ سکتا ہے یا اس سے زیادہ بھی دیکھیں، ٹریفک کیا کہتی ہے۔ ''ڈرائیور نے مودب لہجے میں کہا۔ میں خاموش رہا اور پھر یہ خاموشی طویل ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک بڑے سے چوک سے گزرتے ہوئے ڈرائیور نے کہا۔

''سر! ہم سیف روڈ سے علی ابن طالب روڈ پر ہیں۔آگے بہت زیادہ رش ہوتا ہے اور غالباً ہمیں پارکنگ کے لیے بھی جگہ نہ ملے۔ہمیں یہیں کہیں پارکنگ کے لیے جگہ دیکھنا ہوگی اور یہاں سے تھوڑا پیدل چلنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، لیکن دیکھ لو اگر کہیں قریب ترین جگہ مل جائے۔'' میں نے کہا تو وہ بولا۔

''میں دیکھتا ہوں کہ دوبئی میوزیم کی پارکنگ میں جگہ مل جائے۔'' میں نے ڈرائیور

کے ساتھ وقت ایڈجسٹ کرلیا کہ ٹھیک دو گھنٹے بعد وہ ہمیں لے لے گا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ہمیں ایک مینار والی بڑی مسجد کے سامنے اتار دیا۔

مندر اسی عالیشان مسجد سے متصل ہے۔ مسجد کے دروازوں کے سامنے دوبئی میوزیم ہے۔ میوزیم کی طرف سے دیکھیں تو مسجد کے دروازے پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے جبکہ مسجد کا نام کہیں نظر نہیں آتا۔ مسجد کے دو دروازے مندر کی طرف ہیں۔ چونکہ مسجد کا صحن کافی اونچا ہے اس لیے ان دونوں دروازوں کے باہر بھی سیڑھیاں ہیں اور صحن کی سیڑھیوں کے بالکل سامنے مندر کی سیڑھیاں۔ مندر اور مسجد کے درمیان حد فاصل سٹیل کے دو دو فٹ پائپ ہیں۔ مسجد کے حصے میں ٹائلیں لگی ہوئیں ہیں جبکہ مندر کی جانب کچی جگہ ہے۔ عورتیں اور مرد پیدل ہی مسجد کے اردگرد سے ہوتے ہوئے مندر جا رہے تھے۔ اس وقت خاصا رش تھا۔ شمال کی طرف سے مندر کا مین دروازہ تھا اور دروازے پر بے شمار قسم کے پھولوں کے ہار لٹک رہے تھے۔

''میں پوجا کے لیے کچھ چیزیں لینا ہے۔'' آرتی نے میری طرف دیکھ کر دھیمے لہجے میں کہا۔

''آؤ، دیکھتے ہیں یہاں سے اگر کوئی ایسی دوکان ہوئی تو؟'' میں نے کہا تو آرتی نے بڑے نرم انداز میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے اس پر ذرا سا بھی ردعمل ظاہر نہیں کیا بلکہ نارمل انداز میں چلتا رہا۔ پتلی پتلی گلیوں میں ہوتے ہوئے ایک ایسی گلی میں آگئے جہاں بہت سی ایسی دوکانیں تھیں جن پر ہندوؤں کی پوجا پاٹ کا سامان دھرا ہوا تھا۔ مختلف پھولوں کے ہار، گجرے، دیوتاؤں کی تصویریں، منگل سوتر، چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں، چھوٹی چھوٹی پیتل کی کٹوریاں، تھالیاں، دیئے، پرشاد کے لیے مٹھائیاں وغیرہ۔ آرتی وہاں سے کئی چیزیں اکٹھا کرتی رہی۔ ایک تھال میں پوجا کے لیے کئی کچھ سجایا، خاصے پھول لیے۔ میں نے بل دینے کے لیے پرس نکالا تو اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''شاید اس طرح ہماری پوجا سویکار نہ ہو۔'' آرتی نے دبے ہوئے لہجے میں کہا تو میں نے پرس واپس جیب میں رکھ لیا۔ اس نے درہم دیئے اور وہاں سے پلٹ پڑے۔ مندر انہی چھوٹی چھوٹی پتلی گلیوں کے اوپری منزل پر بنا ہوا تھا۔ میں مندر کے بڑے دروازے تک آرتی کے ساتھ گیا۔ دروازے پر ہندی میں کچھ لکھا ہوا جو ظاہر ہے ہندی نہ جاننے کی وجہ سے مجھے سمجھ میں نہ آیا۔ میں دروازے پر رک گیا۔ آرتی نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا۔ اس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اندر چلنے کا کہا لیکن یونہی میرے دل میں اک کھٹکا سا ہوا، اندر جانے کے لیے میرا دل نہیں مانا۔ جس بات سے دل میں کھٹکا ہو، دل دھڑک جائے اس سے

باز آجانا چاہئے، یہی بڑوں کی نصیحت ہے۔اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا لیکن میں نے آہستگی سے چھڑایا اور پیچھے ہوگیا۔ چونکہ وہاں رش تھا اس لیے آرتی اگلے ہی لمحے مندر کے اندر چلی گئی۔مندر کی سیڑھیوں کے سامنے لمبا سا لان تھا۔خوبصورت سرسبز و شاداب گھاس، لان کی حد بندی کے لیے باڑ اور اس حد بندی میں جا بجا رکھے ہوئے بنچ تھے۔میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ماتھے پر تلک لگائے ہندو عورتیں اور مرد خاصی تعداد میں وہاں نظر آرہے تھے۔میں کافی دیر تک وہیں بیٹھا ان لوگوں کو دیکھتا رہا۔پھر اکتا کر وہاں سے اٹھ گیا۔آرتی کا دھیان، گیان کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا تھا۔ میں وہاں سے دھیرے قدموں سے چلتا ہوا لان سے باہر آگیا۔ پھر پتلی گلی سے نکلتا ہوا کھلے میں آنکلا جہاں خوبصورت ٹائلوں سے مزین فرش تھا اور اس کے آگے صاف و شفاف نیلگوں سمندر۔ وہاں بے شمار چھوٹی چھوٹی کشتیاں تھیں اور کارگو ٹائپ لانچیں۔ میں چند منٹ ان کا نظارہ کرتا رہا پھر پلٹ گیا۔راستے میں ایک گروسری شاپ سے خوشبوئیں خریدیں اور یوں اچھا خاصا وقت ضائع کر کے میں دوبارہ مندر کے دروازے پر آگیا۔ جہاں ایک طرف آرتی پیتل کا تھال ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی اور اس کے چہرے پر پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے اس کی سانس میں سانس آگئی ہو۔وہ تیزی سے میری طرف بڑھی۔میں اور وہ پہلو بہ پہلو چلتے چلے گئے۔ یہاں کہ مسجد کے قریب سے گزر کر شارع علی ابن طالب پر آگئے۔ ڈرائیور دیئے گئے وقت پر پہنچ جانے کو تھا۔ہم دونوں وہیں کھڑے تھے اور خاموش تھے۔آرتی کے ہاتھ میں پیتل کا ایک تھال اب بھی پکڑا تھا۔اس میں مٹھائی، پھول اور دیا پڑا ہوا تھا۔شاید پانی سے بھری کٹوری بھی تھی۔آرتی خاموش تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی خاموشی میں دخل دوں۔عین متعین وقت پر ڈرائیور گاڑی لے آیا۔ میں نے جیسے ہی آگے بیٹھنا چاہا تو آرتی بولی۔

''آپ پیچھے بیٹھئے گا، ہمارے ساتھ۔'' اس کی نظروں میں التجا تھی۔ میں نے پہلے اسے بیٹھنے کا موقع دیا اور پھر خود بیٹھ گیا۔گاڑی نے ابھی کچھ فاصلہ طے کیا ہی تھا کہ اس نے تھال میں سے مٹھائی اٹھا کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''یہ لیں، بھگوان کا پرشاد ہے۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کھا لیا۔وہ ایک طرح سے لڈو قسم کی مٹھائی تھی۔پھر کٹوری سے پانی میرے ہاتھ پر ڈال دیا۔

''اسے پی لیں۔'' میں نے وہ پی لیا تو وہ بڑے جذبات سے بولی۔''بہت شکریہ۔'' اور ساتھ ہی اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا۔میں نے اس کا سر نہیں ہٹایا۔کافی دیر بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''آرتی! کیا دعا مانگی ہے وہاں پر؟''

''یہ پوچھنے والی باتیں تھوڑی ہوتی ہیں۔ بس مانگ لیا جو مانگنا تھا۔''

''مثلاً، کیا میرے لیے کوئی پرارتھنا کی ہے؟'' میں نے قدرے اصرار سے پوچھا۔

''ہوں، کی ہے لیکن آپ یہ مت پوچھئے گا کہ کیا؟''

''چلیں، ٹھیک ہے۔ کچھ نہ کچھ تو مانگا ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو اس نے میرے کاندھے سے سر اٹھا لیا اور دھیرے سے انداز میں بولی۔

''دیکھیں، شجاع! زندگی میں انسان کو وہ سب کچھ نہیں ملتا جس کی وہ چاہ کرتا ہے لیکن ہمیں بھگوان سے پرارتھنا کرتے رہنا چاہئے۔ نجانے کب اور کس وقت ہم پر دیا (رحم) کر دے۔ میرا یقین یہی ہے کہ وہ ہماری ضرورتوں سے بڑھ کر ہمیں دیتا ہے۔'' میں جواباً خاموش رہا اور پھر سارے راستے ہمارے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ جس وقت گاڑی گھر کے پورچ میں رکی تب اندھیرا پھیل چکا تھا، ہم سٹنگ روم میں داخل ہوئے تو سامنے صوفے پر حیدر براجمان تھا اور اس کے ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ کنول جیت، ستیش اور ندیم بیٹھے ہوئے تھے۔

''آیئے آیئے، سرکار! ادھر ہمارے پاس پدھاریئے۔'' مجھے دیکھتے ہی حیدر نے انتہائی شوخی سے کہا تو مجھے اپنے دوپہر والے غصے کا خیال آ گیا۔ یقیناً یہ اسی کا ردعمل تھا کہ وہ یہاں میرے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا تو ندیم نے کہا۔

''شجاع، بھائی! کافی دیر لگا دی۔''

''کیا تم لوگ باجماعت میرا انتظار کر رہے تھے؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تو اور کیا، حضور! ہم نے سمجھا، آپ کہیں گم ہی نہ ہو گئے ہوں۔'' حیدر نے یہ کہتے ہوئے میری طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''یہ لیجئے، پرشاد'' آرتی سب کو وہ مٹھائی دے رہی تھی۔ ستیش نے انتہائی عقیدت سے وہ پرشاد لیا پھر پانی پی کر ہاتھ سر پر پھیر لیا۔ ندیم اور کنول جیت کو دینے کے بعد وہ تھال میز پر رکھ کے صوفے پر بیٹھ گئی تو حیدر نے پوچھا۔

''کہو، آرتی! کیسا رہا تمہارا مندر جانا، آسانی سے مل گیا تھا؟''

''جی، میں شجاع جی کی شکر گزار ہوں۔ مجھے ذرا سا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔''

''یہ اپنا شجاع ہے ہی اتنا پیارا۔'' حیدر مجھے آنکھ مارتے ہوئے بولا تو میں نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا۔

''تم بدل گئے ہو یا پھر تمہیں یہاں کے ماحول نے تبدیل کر دیا ہے۔''

''مطلب، میں سمجھا نہیں؟'' حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم میرا خیال رکھنے کے لیے کبھی کنول جیت سے کہتے ہو، کبھی آرتی سے۔ کوئی مرد نہیں ہے تمہاری نظر میں جس کے ساتھ میں بہت اچھا وقت گزار لوں۔'' میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھا۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے، پیارے! کہ مجھے عورتوں کی محفل نہ دو۔ میں یہیں گم ہو کر نہیں رہنا چاہتا۔ آئندہ میرا اس طرح کا خیال نہ رکھا کرو۔''

''ویری سوری، شجاع جی! اس طرح کہہ کر آپ ہماری نسوانیت کی توہین کر رہے ہیں۔'' آرتی نے ذرا تلخی سے کہا تو حیدر تیزی سے بولا۔

''نو، آرتی! تم ایک لفظ بھی نہیں کہو گی۔ میرا دوست ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں ہی غلط تھا اور جہاں تک توہین والی بات ہے۔ تم شاید اس بت کو نہ سمجھو، یہ شخص کہیں زیادہ عورتوں احترام کرتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا رخ میری طرف موڑا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''سوری، شجاع! میں آئندہ خیال رکھوں گا۔''

''یہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا اور بولا۔

''آج پتہ ہے یہ سارے کیوں جمع ہیں یہاں پر؟''

''نہیں، مجھے نہیں پتہ۔''

''آج بھرپور ڈنر ہوگا اور پھر اچھی سی فلم دیکھی جائے گی اور آج کی شام، شجاع کے غصے کے نام!'' یہ کہہ کر وہ میرے قریب ہوا اور دھیرے سے پوچھا۔ ''اب تو غصے نہیں ہے نا؟'' اس پر میں نے ہنس دیا تو سبھی خوش ہو گئے۔ تبھی مجھے مندر کے قریب سے لیدی گئی خوشبوؤں کا خیال آیا۔ ڈرائیور ایک طرف میز پر رکھ گیا تھا، وہ اٹھا کر میں نے سب میں بانٹ دیں۔

''لیجئے یہ میرا پرشاد ہے۔'' میرے یوں کہنے پر سبھی ہنس دیئے۔ میں صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری جانب حسن تھا۔

''ارے، او جان جی! کدھر ہو؟'' اس کے لہجے میں تھرتھراتی ہوئی شوخی تھی۔

''جہاں تم نے دھکیلا تھا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو قدرے سنجیدگی سے بولا۔

''ایک بری خبر ہے، آصف چودھری نے ودود شاہ قتل کر دیا ہے۔'' اس نے ٹھہرے

ہوئے انداز میں کہا تو میں چونک گیا۔

''وہاٹ، کب ہوا یہ واقعہ؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''آج دوپہر کے بعد۔۔۔''

''اور تم مجھے اب بتا رہے ہو؟''

''تو کیا ہوا، میں اس کی گینگ کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بہت بپھر گیا ہے۔ وہ اپنے لوگوں کو حکم دے چکا ہے کہ شجاع اور آصف چودھری سے متعلق جو کوئی بھی شخص ہے اسے اٹھالو یا قتل کر دو۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ لوگ تم تک بھی پہنچیں گے۔ عامر اور دوسرے لوگ؟''

''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو، م ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ میں نے سارا بندوبست کرلیا ہے۔''

''کیا خاک بندوبست کیا ہوگا تم نے، یہی وقت تھا جب میری ضرورت تھی۔ میں دیکھ لیتا ایک ایک کو، میں پہنچ رہا ہوں۔ جو مجھے پہلی فلائیٹ ملی اسی پر آ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

''کیا ہوا؟'' حیدر نے پوچھا تو میں نے سب کچھ کہہ دیا۔

''فوراً میری فلائیٹ کا بندوبست کرو۔ میں لاہور جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ اس سے پہلے کہ حیدر مجھے جواب دیتا اس کا سیل فون بول اٹھا۔ وہ حسن کا فون ہی تھا۔ حیدر اس سے کافی دیر باتیں کرتا رہا۔ پھر فون بند کر کے بولا۔

''حوصلہ رکھو، اس نے آئی جی اور محکمہ داخلہ کے وزیر سے بات کر لی ہے۔ بندے متعین ہو چکے ہیں۔ وہاں پر کوئی چڑی بھی پر نہیں مار سکتی۔ حسن اپنے گھر میں ہے اور پولیس نگرانی کر رہی ہے۔ رہی عامر کی بات تو وہ اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔''

''اور آصف۔۔۔'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''وہ تو اب میدان میں ہے۔'' حیدر نے کہا تو میں نے تیزی سے آصف کے نمبر پش کر دیئے۔ رابطہ ہو جانے پر میں نے اس کی آواز سن کر کہا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں۔''

''ٹھیک سن رہے ہو، وہ بہن۔۔۔ بہت تنگ کر رہا تھا۔ وہ تو وہ، اس کی گینگ کا ہر بندہ منافق نکلا۔ میں نے آج چھوڑ دیا تھا اسے لیکن اگلے گھنٹے میں انہوں نے میرے دو بندے مار دیئے۔ مجھے بروقت پتہ نہ چلتا تو تم میری خبر سنتے۔ میں نے بس درمیان والے بندوں کو

بتایا اور ودود شاہ کو پار کر دیا۔"

"صورت حال کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے، ان کی گینگ کا ایک ایک بندہ تلاش کر کے ختم کروا رہا ہوں۔ آج یا کل وہ پار ہوں گے۔"

"لیکن تم ان سب کا مقابلہ۔۔۔ آصف میں آ رہا ہوں۔ پہلی فلائیٹ سے آ رہا ہوں۔۔۔ تم گھبراؤ نہیں۔ خدا کے لیے مجھے روکنا مت۔"

"تم یہاں آ کر کیا کرو گے، میری پریشانی میں اضافہ ہوگا۔ مجھے۔۔۔"

"بکواس کرتے ہوئے تم، میں نے چوڑیاں پہنی ہوئی ہیں یا میں ہتھیار چلانا بھول گیا ہوں۔"

"دیکھو، میرے دوست! ہر بندے کی اپنی ایک جگہ ہوتی ہے۔ تم جہاں پر ہو وہیں ٹھیک ہو۔ اگر ضرورت پڑی تو میں بھی تمہارے پاس آ جاؤں گا، میرے لیے جگہ بنا کر رکھو۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"یہ وقت تفصیلی باتوں کا نہیں ہے۔ یہ ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں تو میں خود آ رہا ہوں دوبئی یا کچھ دنوں کے لیے تمہیں یہاں بلاؤں گا۔ میرے ذہن میں پورا ایک پلان ہے اور باقی رہا یہ ودود شاہ کا گینگ، آج رات ہی اس کی خبر سنا رہا ہوں۔"

"دیکھو مجھے بہلاوے مت دو۔"

"کم از کم میں تمہیں بہلاوے نہیں دے سکتا۔ سارے حالات میرے ہاتھ میں ہیں، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"وہ نائلہ۔۔۔"

"وہ سب لوگ میری نظر میں ہیں۔ حسن سے میرا پوری طرح رابطہ ہے۔ یہ گھڑی مشکل ضرور ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ میں بے بس ہو جاؤں۔ پولیس بھی ان کا خاتمہ چاہ رہی ہے۔ ان کے دماغ میں یہ نہیں آتی کہ جب وہ ہی نہیں رہا تو کہاں کی دشمنی۔۔۔"

"دیکھو، آصف! اگر تم لوگوں کو کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر پاؤں گا۔"

"پاگل ہو گیا ہے، صبح تک سب کچھ پرسکون ہو جائے گا۔ ابھی تو وہ ودود شاہ کو دفنا رہا ہیں۔ تم سکون سے سو جاؤ، رب سوہنا بھلی کرے گا۔"

"مجھے یوں چین نہیں آئے گا۔ میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور پھر الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ میں

نے فون کان سے ہٹایا تو حیدر نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

''تو رو رہا ہے؟''

''میں رو رہا ہوں؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے آنکھوں پر ہاتھ لگایا تو مجھے نمی محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا، ''نہیں، میں نہیں رو رہا۔ تم بہر حال میری سیٹ کا بندوبست کرو۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی واپس آجاؤں گا۔''

''اچھا، میں دیکھتا ہوں، آؤ کھانا کھاتے ہیں۔'' حیدر نے کہا تو مجھے نائلہ کا خیال آیا۔ میں اسے لمحے اسے کال کی۔

''کیسی ہو؟'' میں نے اس کی مدھر آواز سنتے ہوئے پوچھا

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور اس وقت حسن صاحب کے گھر میں ہوں۔'' اس نے خوشگوار انداز میں کہا۔ پھر سکون سے بولی'' آپ پریشان مت ہوں۔ میری حسن صاحب سے ابھی تفصیلی بات ہوئی ہے میرا خیال بھی یہی ہے کہ میں آپ کو سمجھاؤں کہ آپ یہاں نہ آئیں۔''

''تم بھی نائلہ۔۔''

''میں بھی شجاع! میں بھی۔''

''ایک دو دن کے لیے۔۔۔''

''قطعاً نہیں، میں خود آرہی ہوں دوبئی۔ بس یہ ذرا معاملہ ٹھیک ہو جائے۔''

''عامر؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اسے کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ آگے کیا ہوگا، وہیں آکر طے کریں گے لیکن آپ یہ یاد رکھیں کہ آپ نے واپس نہیں آنا۔''

''او کے!'' میں نے حتمی انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔ تبھی حیدر نے کہا۔

''شجاع! تم گھبراؤ مت۔ جس وقت تم چاہو، سیٹ او کے ہو جائے گی لیکن اس وقت تمہارے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایک لاکھ درہم کا بندوبست کیا ہے۔ وہ میں حسن کو بھجوا رہا ہوں۔ پیسے کی ایک اپنی طاقت ہوتی ہے، یار!'' اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لفظ منہ ہی میں تھے کہ اس کا سیل فون بجا۔ وہ کچھ دیر دوسری طرف سے سنتا رہا پھر فون بند کر کے حسن کے نمبر پش کیے۔ وہ کہتا رہا اور میں سنتا رہا۔

''حسن میں ایک لاکھ درہم بھجوا رہا ہوں، وہ آصف چودھری پر وار دینا، ضرورت پڑی تو مزید بھجواؤں گا۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ میں نے تمہارا نمبر دے دیا ہے انہیں۔ میں نے

یہاں درہم دے دیئے ہیں۔ روپے وہ تم تک پہنچا دیں گے۔۔۔ نہیں نہیں ابھی کچھ دیر بعد وہ تمہیں کال کر لیں گے۔ تم ان کے ساتھ ایڈجسٹ کر لینا کہ کس طرح کرنا ہے۔۔۔ ہاں یہ ٹھیک ہے، میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ او کے، رابطہ رکھنا۔ اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''اوئے چل، بھائی اٹھ، کھانا کھا لیں۔ کچھ نہیں ہونے والا۔ سب ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور پھر ہم سب کھانے کی میز تک جا پہنچے۔ پھر کھانے کے بعد سب اپنے اپنے ٹھکانے تک جا پہنچے۔

وہ رات میں نے بڑی مشکل سے گزاری۔ بار بار نیند سے چونک جاتا۔ مجھے یوں لگتا جیسے ابھی فون کی گھنٹی بجی ہے لیکن غور کرنے پر پتہ چلتا کہ میرا وہم ہے۔ یونہی سوتے جاگتے صبح ہوگئی۔ میرا سر ہلکا ہلکا درد کر رہا تھا میں باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر نیچے سٹنگ روم میں آگیا۔ پورے گھر پر خاموشی طاری تھی۔ میں نے خود چائے بنانے کے لیے فریج کھولا تو نجانے کدھر سے بنگالی باورچی آٹپکا۔

''ہم چائے بناتا ہے، شاپ! آپ بیٹھو۔'' میں کچن سے نکل آیا۔ تبھی راہداری میں سے بھجن کی آواز گونج اٹھی۔ یقیناً آرتی نے اپنی عبادت شروع کر دی تھی۔ میں وہیں کھڑا کافی دیر تک وہ موسیقی سنتا رہا۔ باورچی چائے دے گیا تو میں ٹہلتے ہوئے آرتی کے کمرے کی جانب چل دیا۔ اس کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ اس نے گدا اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا اور بھجن کی موسیقی کے ساتھ تال ملائے رقص میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں چائے کے ہلکے ہلکے سپ لیتا رہا اور اس کے تھرکتے ہوئے جسم کو دیکھتا رہا۔ بلاشبہ وہ ماہر رقاصہ تھی۔ میری چائے ختم ہوگئی تو کچھ دیر بعد کیسٹ بھی رک گئی جس کے ساتھ ہی آرتی کے پاؤں تھم گئے۔ وہ مورتی کے سامنے اپنے انداز میں بہت کچھ کرتی رہی۔ پھر میرا احساس کر کے پلٹی تو مجھے سامنے پا کر کھل اٹھی۔

''آپ شجاع جی! آیئے۔'' اس نے بڑی ادا سے کہا تو میں اندر چلا گیا۔ تب تک وہ گدا دوبارہ فرش پر بچھا چکی تھی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ میں بیٹھا تو وہ بھی بیٹھ گئی، اگر بتیوں سے کمرہ مہک اٹھا تھا۔ اس نے خمار آلود لہجہ میں کہا۔

''لگتا ہے، آپ رات بھر اچھی طرح سو نہیں پائے ہیں۔ آپ کی آنکھوں سے اب بھی خمار جھلک رہا ہے۔''

''ہاں، یار! ایسا ہی ہے۔''

''چلیں، کوئی بات نہیں آج آپ دفتر مت جائیں۔ سکون سے سو جائیں۔''

''ادھر کیلا پڑا رہا تو بے سکون رہوں گا، نیند تو پھر بھی نہیں آئے گی۔ وہاں دل بہل جائے گا۔''

''سو جانے کی کوشش تو کریں، آپ۔۔۔''

''مجھے پتہ ہے نا، آرتی! کہ نیند نہیں آئے گی۔ ان حالات میں بھلا کیسے سو سکتا ہوں۔''

''آپ ایک کام کریں۔ یہاں آرام سے لیٹ جائیں، ہم آپ کو سو جانے میں مدد دیتے ہیں۔''

''لیکن۔۔۔'' میرے یوں کہنے پر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آواز نکالی۔

''شی ای ای ی۔۔۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے میرے کاندھے پر دباؤ ڈالا اور لٹا دیا۔ پھر بڑی آہستگی سے اس نے میرے پاؤں مسلنے شروع کر دیئے۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی جادو تھا۔ میں آہستہ آہستہ نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر مجھے ہوش ہی نہ رہا کہ میں کہاں ہوں میری آنکھ کھلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں کہاں ہوں؟ آرتی ایک طرف یوگا کا کنول آسن جمائے بیٹھی تھی۔ وہ انتہائی مختصر لباس میں بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں کتنی دیر تک اسے بیٹھا دیکھتا رہا۔ پھر جیسے ہی میں نے کروٹ بدلی، اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، بڑے دھیمے لہجے میں بولی۔

''کیسی نیند آئی؟''

''بھئی زبردست، تم نے کیا جادو کر دیا تھا۔''

''ہم نے کیا جادو کرنا ہے۔ بس ذرا ٹچ تھراپی میں قدرے مہارت ہے۔''

''ٹچ تھراپی۔۔؟''

''ہاں، یہ بھی ویدوں کی ایک تعلیم ہے۔ مجھے اس کا علم دیا گیا ہے۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ چھونے سے، لمس سے بہت کچھ ممکن ہے۔''

''کمال ہے۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ پھر سامنے کلاک پر نظر پڑتے ہی میں چونک گیا۔ آدھے سے زیادہ دن گزر چکا تھا۔ میں نے سیل فون تلاش کرنا چاہا تو وہ ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ میں نے مس کالیں دیکھیں، ان میں ایک ہی نمبر سے کئی کالیں آچکی تھیں۔ میں اس پر رنگ کی تو فوراً ہی فون اٹھا لیا گیا۔ دوسری جانب ندیم تھا۔

''خیریت، ندیم؟'' میں نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔

''کہاں ہیں، آپ؟''

''میں گھر میں ہی ہوں۔ کیوں، خیریت؟''

"شجاع، بھائی! خیریت ہی ہے۔ آپ جلدی سے تیار ہو جائیں، میں آپ کو لینے کے لیے آرہا ہوں۔"

"میں پوچھ رہا ہوں، خیریت؟"

"میں نے بھی یہی کہا ہے، شجاع بھائی! کہ خیریت ہی ہے۔ آپ بس تیار ہو جائیں جلدی سے۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں کسلمندی سے اٹھا تو آرتی نے کہا۔

"آپ فریش ہو آئیں، میں ناشتہ بناتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے نکل آیا۔ میں اپنے کمرے میں آکر فریش ہوا اور جب نیچے آیا تو ناشتہ تیار تھا۔ اس وقت میں چائے پی رہا تھا کہ ندیم آگیا۔ اس نے بہترین تراش کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے کپ رکھ دیا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔

"یار! بتا بھی دو آخر جانا کدھر ہے؟"

"آپ گاڑی تک چلیں۔" ندیم نے کہا اور میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد گاڑی ایک بڑے ہوٹل کے سامنے جارکی جو ایرانی ہسپتال سے بالکل سیدھی روڈ پر واقع تھا۔ ندیم میرے ساتھ چلتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ لفٹ سے دوسری منزل پر پہنچے اور ایک کمرے کے سامنے رک گئے۔ ہمارے رکتے ہی دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے ایک جوان رعنا قسم کا نوجوان کھڑا تھا۔ بہترین سوٹ پہنے وہ کوئی بزنس مین دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے میرے چہرے پر دیکھا اور مسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"مجھے الطاف پاشا کہتے ہیں۔ آیئے، تشریف لے آئیں۔" یہ کہہ کر اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ پھر ہم تینوں آمنے سامنے کی کرسیوں پر جا بیٹھے تو وہ بولا۔

"میں انتہائی معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی جبکہ میرا فرض بنتا تھا کہ میں آپ کے پاس آؤں۔" اس نے کہا تو مجھے قدرے غصہ آنے لگا۔ اس قدر تجسس پھیلایا جا رہا ہے، آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ تاہم میں نے اپنا لہجہ نرم رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ سمجھ نہیں آرہا کہ یہ سب کیا ہے؟"

"یہی بات کہنے کے لیے تو آپ کو یہاں تک آنے کی زحمت دی ہے لیکن، شجاع بھائی! اس سے پہلے ماحول کی اجنبیت ختم ہو جانی چاہیے۔ میں آپ سے صرف ایک بات پوچھتا ہوں کہ پاکستان میں آپ کا کون سا ایسا دوست ہے جس پر آپ سب سے زیادہ اعتماد کر

سکتے ہیں۔'' اس نے انتہائی مودب اور نرم لہجے میں پوچھا تو میں نے بے ساختہ کہا۔

''حسن۔!''

''تو حسن صاحب کے نمبر ملائیں اور ان سے میرے بارے میں دریافت کریں۔

''اس نے کہا تو میں نے حسن کے نمبر پش کر دیئے۔ دوسری بیل پر رابطہ ہو گیا۔ میرے ہیلو کہنے کے ساتھ ہی وہ چہک کر بولا۔

''او جان جی! کیسے ہو؟''

''یہ الطاف پاشا کون ہے؟'

''جس کے پاس تم ابھی بیٹھے ہوئے ہو۔''

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''میری بات غور سے سنو، یہ جو کچھ بھی کہتا ہے اس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ سمجھ لو کہ میرے لیے یہ تم ہو۔''

''حسن! یہ سب کیا ہے؟''

''یہی سمجھانے کے لیے تمہیں یہاں بلایا گیا ہے۔ ان کی بات غور سے سنو۔ پھر ہر طرح سے فیصلہ کرنے کا تمہیں اختیار ہے۔ وِش یو گڈ لک۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے فون بند کر کے رکھا، سگریٹ سلگائی اور الطاف پاشا سے کہا۔

''جی، جناب! فرمائیں؟ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔''

''میرا تعلق اس خفیہ فورس سے ہے جو پاکستان کے مفاد کے لیے کام کرتی ہے۔ یہاں میں ڈیوٹی پر ہوں۔ بظاہر میں یہاں کمپیوٹر پارٹس کا بزنس کرتا ہوں۔ حسن صاحب کا تعلق بھی ہماری فورس سے ہے مگر وہ ایک خاص شعبہ میں ایڈجسٹ ہو چکے ہیں۔ خیر، یہ تو میرا تعارف تھا۔ حسن صاحب نے ہی یہاں ندیم صاحب سے رابطہ کرنے کو کہا اور میں اسے اپنی اصلیت بتائے بغیر اس کا دوست بن گیا۔ ابھی میں سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ ابھی کچھ وقت تھا اس کے بعد میں نے اپنا تعارف کروانا تھا مگر رات کی صورت حال کے باعث ایسا آج ہی کرنا پڑا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا۔ شاید وہ میرے چہرے پر کوئی ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر کہتا چلا گیا۔'' آپ پاکستان میں جس قسم کا بھی خطرہ اپنے دوستوں کے لیے محسوس کر رہے ہیں اس کے بارے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، وہ سب سنبھال لیا گیا ہے۔ آصف چودھری نے ودود شاہ کو بھی رات ہی ٹھکانے لگا دیا ہے۔ وہ بندہ ویسے ہی ڈرگز کے معاملے میں پاکستان کو مطلوب تھا۔ ہلچل اچھی خاصی ہے لیکن وہ لوگ محفوظ

ہیں۔ کوئی کیس وغیرہ نہیں بنے گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ میرا مطلب ہے، آپ کو یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''الطاف جی! لگتا ہے، میرے یہاں رہنے کا کوئی خاص مقصد ہے جو یوں ۔۔۔'' میں نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔

''جی۔ یہ ساری پلاننگ حسن صاحب کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ملکی مفاد میں یہ نیک کام آپ کے ہاتھوں ہو۔ اگر آپ اپنے ملک وقوم کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو؟''

''مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''دیکھیں، شجاع صاحب! آپ کا دوست حیدر یہاں پر غیر قانونی دھندوں میں ملوث ہے۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کیسے اور کس طرح کے دھندے میں ملوث ہے لیکن جن لوگوں کے لیے وہ کام کر رہا ہے ہمیں ان پر اعتراض ہے۔ حیدر ایک بہت بڑے نیٹ ورک کا حصہ بن چکا ہے۔ ہمیں اس سے بھی غرض نہیں، وہ بنا رہے، دونوں ہاتھوں سے دولت اکٹھی کرتا رہے لیکن آفٹر آل جسے اس سارے نیٹ ورک کا مفاد پہنچ رہا ہے وہ ہمارے، ہماری قوم اور ہمارے ملک کے خلاف ہے۔''

''ایسا کون سا نیٹ ورک ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں پر جو غیر قانونی دھندے ہوتے ہیں ہمیں ان سے اس لیے کوئی غرض نہیں ہے کہ وہ جانیں اور یہاں کی حکومت، یہاں کا قانون اور قانون نافذ کرنے والے ادارے لیکن ہمیں ان کاموں کو روکنا ہے جن کے باعث ہمارے ملک کو نقصان پہنچتا ہے۔ آپ کو شاید پتہ نہیں ہے کہ بھارتی خفیہ تنظیم نے دوبئی کے علاوہ ماریشش کو اپنی خفیہ سرگرمیوں کے لیے چن لیا ہے۔ دوبئی ایک مسلم ریاست ہے مگر انڈین یہاں پر ذہنی غلاظت پھیلا رہے ہیں۔ میں آپ کو ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں جو کہ کارگل میں بھارت معاشی طور پر گھٹنے ٹیک رہا تھا۔ اس کی معیشت کو سنبھالا دینے کی خاطر زندگی کے ہر شعبہ سے بھارتی سامنے آگئے۔ لتا منگیشکر ان کی مشہور گلوکارہ نے بھارت سے دوبئی کا سفر کیا۔ یہاں سے اس نے جو دولت سمیٹی۔ ساری کارگل کے فنڈ میں جمع کروا دی۔ یقیناً اس میں اگر بھارتی کمیونٹی نے کچھ دیا ہوگا تو مسلم لوگوں کا پیسہ بھی ہوگا۔ دوسرے لوگوں کی طرح شوبز کے لوگ اپنے ملک کی معیشت کو مضبوط کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ جنس سمیت جو ذہنی ابتری پھیلائی جا رہی ہے وہ ایک بالکل الگ شعبہ ہے اور آپ کو اسی مقصد کے کے لیے اپنے نیٹ ورک میں لایا گیا ہے تاکہ آپ بھی یہی غلاظت اپنے ہاتھوں سے لوگوں میں پھیلائیں۔''

''حیدر کہاں تک جا چکا ہے؟''

''بہت آگے تک جہاں سے اس کی واپسی ممکن نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے تو اب وہ اپنے باپ کو بھی قتل کر سکتا ہے۔''

''الطاف! یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''وہی جو ایک تلخ حقیقت ہے۔ آپ مجھ پر اعتبار نہ کریں لیکن اپنی آنکھیں اور کان کھول کر رکھیں۔ جب آپ کو یقین ہو جائے تب آپ میری بات مان لیجئے گا۔''

''دیکھو، الطاف! اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو تم مجھے اپنے ملک کے لیے لڑنے والا وہ سپاہی پاؤ گے جو ہراول دستے میں ہوتا ہے۔''

''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور انتہائی محتاط رہنے کی درخواست کرتا ہوں۔ چند دنوں سے آرتی نامی عورت آپ کے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ کوئی داسی وغیرہ نہیں بلکہ تربیت یافتہ ایجنٹ ہے۔ وہ صرف اور صرف آپ کو ''راہ'' پر لانے کے لیے آئی ہے۔'' الطاف نے کہا تو میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔

ہمارے درمیان اجنبی خاموشی آن ٹھہری تھی۔ وہ شاید میرے ردعمل کا انتظار کر رہا تھا جبکہ میری خاموشی کی وجہ وہ انکشاف تھا جو بہر حال میرے لیے تکلیف دہ تھا۔ دولت کی ہوس کا بھی عجیب نشہ ہوتا ہے۔ یہ بڑھتا ہی جاتا ہے، کم نہیں ہوتا۔ مجھے آرتی سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ وہ کس کے لیے کیا کر رہی ہے۔ اپنی وطن کے لیے جان ہتھیلی پہ لیے پھرتی ہے یا وہ بھی حصول دولت کے لیے خطروں سے کھیل رہی ہے۔ میرے لیے حیدر شیخ کا یہ نیا روپ دکھ کا باعث تھا۔ غربت سے نکلنے کی خواہش اس طرح کے حالات لے کر سامنے آئے گی، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اک انسانی ضمیر ہی ہوتا ہے جو انسان کو صحیح اور سیدھے راستے پر رکھتا ہے بشرطیکہ انسان اپنے ضمیر کی آواز سن لے اور پھر مان بھی لے۔ انسان جب اپنے ضمیر کو نظر انداز کر دیتا ہے تو پھر اس سے کچھ بھی سرزد ہو سکتا ہے۔ اپنا ایمان گروی رکھ دے، وطن فروشی کرے یا پھر ذلالت کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جائے۔ نجانے کیوں میرے اندر سے یہ آواز اٹھ رہی تھی کہ اگر حیدر شیخ نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے تو بہت غلط کیا ہے، اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔

''لیکن تمہارا اپنا ہی خیال ہے کہ دوست جو بھی کر رہا ہے، چاہے وہ دوسروں کی نگاہ میں غلط ہے لیکن میرے لیے ٹھیک ہے کیونکہ وہ میرا دوست کر رہا ہے۔ ایسے میں حیدر شیخ کے اس طرز عمل پر تمہاری کیا رائے ہے؟'' دور کہیں اندر سے میرے ضمیر نے مجھے ٹہوکا دیا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' لاشعوری طور پر میں بڑبڑایا۔

''کیا کہا آپ نے؟'' الطاف پاشا نے پوچھا تو میں اپنے حواسوں میں آ گیا، اگلے ہی لمحے میں نے خود پر قابو پایا اور اس کی طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''سنو، پاشا! وہ اس کا راستہ ہے اور میرا راستہ اپنا ہے، بہر حال مجھے بتاؤ، کرنا کیا ہے؟''

''فی الحال اندھیرا ہے، بہت گہرا اندھیرا لیکن اس اندھیرے میں بہت کچھ چھپا ہوا ہے۔ ہمیں یہ سب آپ کو بتانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ آپ محتاط رہیں، آنکھیں اور کان کھلے رکھیں۔''

''مطلب کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، ہمیں اس سے ۔۔'' میں نے کہنا چاہا تو الطاف نے میری بات قطع کر دی۔

''وہ یہاں بہت کچھ کر رہے ہیں لیکن ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ پچھلے دو ماہ سے جو یہ لوگ اکٹھے ہوتے چلے جا رہے ہیں، ان کا مقصد کیا ہے۔ ہمیں صرف تصدیق کرنا ہے کہ وہ کہیں پاکستان دشمن عزائم تو نہیں رکھتے۔ ایسی کچھ معلومات ملی بھی ہیں۔''

''کیسی معلومات؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ابھی ابتدائی قسم کی معلومات ہیں اور محض اندازہ ہے۔ جیسے ہی کچھ یقینی معلومات ملیں تو میں وہ آپ ہی کو بتاؤں گا۔'' اس نے قدرے بے بسی سے کہا۔

''دیکھو، الطاف! اگر میں کسی طرح بھی اپنے ملک اور قوم کے لیے کچھ کر سکتا ہوں تو مجھے روحانی خوشی ہو گی بنا لالچ اور بغیر مفاد کے، آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے، شجاع جی! کہ آپ ہی ہمیں لیڈ کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ہی ہمیں بتائیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا، پھر اس نے بات بدل دی۔ اس نے تفصیل سے مجھے آرتی کے بارے میں بتایا۔

آرتی کبھی بھی مذہبی نہیں رہی تھی۔ وہ چند سال پہلے اچانک ہی ماڈل گرل کے طور پر سامنے آئی تھی۔ اس دنیا میں آنا اور پھر غائب ہو جانا بس ایسے ہی تھا جیسے بجلی کا کوندا۔ وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہری تھی۔ اسے فلموں میں کام کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا اس لیے دادر سے اندھیری ایسٹ کے درمیان شٹل کاک بنی رہی۔ ممبئی ہی کے یہ دونوں مختلف علاقے اپنا الگ الگ ماحول رکھتے ہیں جبکہ غربت اور امارت کا اپنا علیحدہ ہی کلچر ہوا کرتا ہے۔ دادر کا علاقہ اور اس میں گنجان آباد محلہ جس کی بوسیدہ اور تنگ و تاریک گلیوں میں رہ کر آرتی نے بڑے بڑے

خواب دیکھے۔ ان خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کی خواہش اس وقت شدت سے بڑھ گئی جب وہ کالج میں آئی، وہ ماڈلنگ کے راستے سے بالی وڈ سلور سکرین تک پہنچنا چاہتی تھی مگر اسے گمان تک نہیں تھا کہ جس چمک دمک کی طرف وہ بڑھ رہی ہے، اس کی راہ میں کس قدر بھیانک اندھیرے ہیں۔ بلاشبہ وہ حسین تھی، اس پر غضب یہ تھا کہ وہ ایک پرکشش جسم کی مالک تھی۔ ہیرا چاہے مٹی میں پڑا ہوا ہو، وہ ہیرا ہی ہوتا ہے۔ ایسا مٹی میں پڑا ہوا ہیرا اگر کسی جوہری کے ہاتھ لگ جائے تو اس کی اصل قدرو قیمت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ سادھنا نامی ایک عورت کی نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ اس نے پوری لگن سے آرتی کو''گھڑ'' دیا۔ وہ ماڈلنگ میں کچھ ہی آگے بڑھی تھی کہ ایک صنعت کار نے اسے رکھیل کے طور پر رکھ لیا۔ اس میں کئی فائدے تھے، سادھنا اور خود اسے معقول آمدنی میسر آ گئی تھی۔ اندھیری ہی میں موتی لال اپارٹمنٹ میں وہ ایک اپارٹمنٹ کی مالک بن گئی۔ یہاں رہ کر اس نے بالی وڈ کی فلمی دنیا میں قدم رکھنے کا سوچا اور پوری طرح محنت شروع کر دی۔ وہ دادر میں موجود اپنے گھر والوں کو بھول چکی تھی اور پوری توجہ سے ان راہوں کی تلاش میں لگ گئی جو اسے بالی وڈ سلور سکرین تک پہنچا دیتے۔ اس نے اپنی کوشش جاری رکھی لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ بالی وڈ میں انڈر ورلڈ کا راج کتنا اور کس قدر ہے۔ آرتی انڈر ورلڈ کے لیے بہترین خام مال تھی اور ایسے ہی خام مال کے لیے بہتیرے گھات لگائے ہوئے ہوتے ہیں۔ آرتی کو اس دنیا میں راجندر رومانامی ایک لڑکا ملا جس نے سنہرے خوابوں کے انبار لگا دیئے۔ وہ اس صنعت کار کو بھی بھول گئی مگر کچھ عرصہ ساتھ رہنے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ سلور سکرین تک جانے والی راہوں سے دور بھٹک گئی ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اپنی منزل نہیں پا سکے گی تو اس نے اپنی راہ ہی بدل ڈالی۔ راجندر روما نے اسے ایک نائٹ کلب میں ڈانسر کے طور پر زبردست آفر دی۔ آرتی نے وہاں چند دن ڈانس کیا اور پھر وہ غائب ہو گئی۔ دو سال تک اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ وہ کوئی اتنی اہم شخصیت نہیں تھی کہ وہ اسے یاد رکھا جاتا۔ سوائے ان چند لوگوں کے جو شبنمی چہروں کو یاد رکھتے ہیں اور ان کا وقت بہت اچھا گزرا ہوتا ہے۔ دوبارہ جب وہ نظر آئی تو سوامی پرمانند کے آشرم میں تھی۔ ہو سکتا تھا کہ لوگ اس بات پر یقین کر لیتے کہ آرتی نے نوجوانی میں دنیا تیاگ دی ہے اور عام لوگوں کے لیے وہ اداسی ہی تھی لیکن وہ لوگ جو نظر دیکھنے والے تھے، وہ جان گئے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں کے درمیان آ گئی تھی جو ایک خفیہ تنظیم کے مفادات کے لیے کام کر رہے تھے۔ آرتی کے بارے میں شاید ہی خیال کیا جاتا کہ وہ دوبئی میں اپنے دھرم کی سیوا ہی کے لیے وارد ہوئی ہے مگر اس نے شردشیٹھی کے بارے میں جو کہانی سنائی تھی، وہ

ضرورت سے زیادہ جھوٹ پر مبنی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والی دوسری دولڑکیاں بھی غائب ہو چکی تھیں۔ آرتی کا حیدر شیخ کے پاس آنے کا مقصد کیا ہوسکتا ہے؟ یہی مقصد جان لینے سے ان کے منصوبے کے بارے میں معلومات یقینی ہوسکتی تھیں۔ الطاف پاشا کی خواہش تھی کہ میں آرتی کے قریب ہو جاؤں یا پھر وہ کس مقصد کے لیے سرگرم ہے، یہ جاننے کے لیے ایسا ضروری تھا۔ تقریباً چار گھنٹے کی طویل بات چیت کے بعد میں کافی حد تک مطمئن ہو گیا تھا کہ میرے گرد تنے ہوئے حالات کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہیں۔ کسی بہت بڑے مقصد کے لیے میں گہری سازش کے حصار میں ہوں۔ میں نے رب کا شکرادا کیا اس نے مجھے اندھیرے میں نہیں رکھا بلکہ روشنی سے نواز دیا۔ اب میں محتاط تھا اور کسی ان دیکھی کھائی میں گرنے سے بچ سکتا تھا۔ الطاف پاشا سے جب رخصت ہوا تو میرے ذہن سے بوجھ ہٹ چکا تھا۔ اس نے بڑی اپنائیت سے ہمیں الوداع کہا۔

اسی شام جب میں گھر پہنچا تو آرتی سٹنگ روم میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک امریکی فیشن میگزین تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھی۔ اس نے سفید ٹائٹس قسم کا پاجامہ اور ہلکے سبز رنگ کی سلیولس شرٹ پہنی ہوئی تھی، درمیان میں سے مانگ نکال کر بال کس کے باندھے ہوئے تھے اور چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ وہ دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور بڑے جذب سے آنکھیں بند کر کے نمسکار کیا۔

”کیسی ہو، آرتی؟“ میں نے اپنائیت سے پوچھا۔

”ایک دم ٹھیک، آپ کیسے ہیں؟“ وہ میرے چہرے کو بہ غور دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں بھی ٹھیک ہوں۔“ میں نے اس کے سامنے دھرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا تو وہ اپنا چہرہ دائیں بائیں پھراتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

”بالکل بھی نہیں لگتا کہ آپ فریش ہیں۔ لگتا ہے، آج آپ نے بہت کام کیا ہے جبھی تھکن آپ کے چہرے سے نظر آ رہی ہے “

اس کا لہجہ ہنوز تشویش زدہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ آرتی کا یہ نفسیاتی حربہ ہے۔ اگر اس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو چکا ہوتا تو شاید میں اسے حقیقت ہی خیال کرتا۔ اس دن میں نے جسمانی طور پر کچھ بھی نہیں کیا تھا لیکن ذہنی ریاضت خوب ہوئی تھی ...... میں مسکرا دیا اور ہولے سے بولا۔

”آرتی! تمہیں کیسے پتہ چلا کہ آج میں نے بہت کام کیا ہے؟ یقین جانو، بہت تھکن ہو رہی ہے۔“

''کوئی بات نہیں، آپ یوں کریں کہ شاور لے کر فریش ہو جائیں۔ آج میں نے بڑی مزیدار ڈش بنائی ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا تو میں نے پوچھا۔

''حیدر کہاں ہے؟''

''شاید وہ نہ آئیں، انہوں نے فون کر کے بتایا تھا کہ الیکشن جا رہے ہیں۔'' آرتی زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

''چلیں جی، ٹھیک ہے۔'' میں یہ کہتے ہوئے اٹھا اور اوپر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ میں جب فریش ہو کر واپس آیا تو وہ کھانے کی میز پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ کھانا واقعی ہی لذیز تھا۔ کھانے کے دوران ہم میں ہلکی پھلکی باتیں چلتی رہیں، کھانا ختم ہوتے ہی آرتی سوڈا لے آئی۔

''کاش! ہم کہیں گھومنے پھرنے چلتے۔'' آرتی نے ایک ہلکا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو، مگر یونہی خواہ مخواہ خطرہ مول لینا میرے خیال میں عقل مندی نہیں ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے غیر جذباتی لہجہ میں کہا تو اس پر گویا اوس پڑ گئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔

''کیوں نہ کوئی اچھی سی فلم لگا کر دیکھیں؟''

''میں تھکا ہوا ہوں، اب سونا چاہوں گا، تم انجوائے کرو۔'' میں نے جان بوجھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ مجھے کمپنی نہیں دیں گے؟ پلیز، تھوڑی سی دیر کے لیے ہی سہی۔۔۔'' اس نے لجاحت سے کہا تو میں صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے تقریباً لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فلم لگا کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ وہ باتیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن میری سوچیں الجھی ہوئی تھیں۔ ہوں، ہاں کے دوران میں نے سارے خیالوں کو ذہن سے جھٹکا اور سو گیا۔

چلتی ہوئی زندگی ایک ایسے موڑ پر آ گئی تھی، جہاں سے ایک راستہ خود غرضی کی سمت بھی جاتا تھا۔ حیدر شیخ کی زندگی میرے سامنے تھی۔ معمولی معمولی سی نا آسودہ خواہشوں سے لے کر غیر متوقع خواہشوں کے پورا ہو جانے تک یہ خود غرضی کی راہ تھی، جس پر وہ چلا۔ بس ایک ضمیر کی آواز اس نے نہیں سنی۔ ایک نظر سے دیکھا جائے تو حیدر نے جو کیا، ٹھیک کیا۔ میں اسے دوش نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے لیے اس سسٹم میں کوئی ایسی راہ نہیں تھی جس پر ایمان داری سے چلتے ہوئے وہ اپنی طے شدہ منزل پا لیتا۔ یہاں الجھی ہوئی زندگی میں قدم قدم پر استحصال ہو رہا ہے۔ منزل تک دوڑ لگانا باہمت لوگوں کا کام ہے لیکن اس دوڑ کا کیا کیا جائے جب کوئی

جیت والی منزل تک پہنچے تو وہاں کوئی اور میں میڈل پہنے اپنی جیت کا اعلان کر رہا ہو۔ یہ لا حاصل دوڑ کس طرح کے جذبات پیدا کرے گی۔ سامنے کی بات ہے یا پھر ماحول کسی گھنے جنگل کی مانند ہے۔ جہاں محض خوف ہوتا ہے اور درندوں سے پناہ تلاش کی جاتی ہے۔ خوف، استحصال، بے انصافی اور ظلم میں صاف اور سیدھی راہیں کہاں دستیاب ہو سکتی ہیں؟ ایسے میں اس قوت کا حصول ضرورت بن جاتا ہے، جس سے اپنی بقا ممکن ہو سکے۔ ہمارا ماحول ایک گھنا اور تاریک جنگل ہے اور اس میں ہم اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ زندگی کے اس موڑ پر ایک اور راستہ بھی تھا جس پر چلتے ہوئے یہ احساس سکون دیتا ہے کہ میں صرف اپنی ہی بقا کی جنگ نہیں لڑ رہا بلکہ ان کے لیے بھی ہے جو میرے ساتھ وابستہ ہیں، جنہیں میری ضرورت ہے اور میں ان کے کام آسکتا ہوں۔ یہ تعلق محض رشتے ناتوں تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ کئی ایک قرض اتارنے کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ ان میں سب سے اہم اس مٹی کا قرض تھا جو میری ذات سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اب یہ چوائس میرے لیے تھی کہ میں کون سی راہ اپناتا؟ ایک طرف مجھے وہ سارے لوگ بھولنا تھے جو قدم قدم پر میرے کام آتے رہے اور اگر دوسری راہ پر جاتا تو پاکستان میں موجود دوستوں کی طرف سے اطمینان میسر آنے کے علاوہ اپنی مٹی کا قرض اتارنے کے قابل ہو جاتا۔ میں جب بھی اپنا تجزیہ کرتا ہوں تو یقینی طور پر اپنے بارے میں میرا یہی فیصلہ ہوتا ہے کہ میں ظلم کا ساتھ نہیں دے سکتا بلکہ لاشعوری طور پر میرا ردعمل ظلم کے خلاف ہوتا ہے۔ الطاف پاشا نے جو صورت حال میرے سامنے رکھی تھی، ایسے حالات میں نا چاہتے ہوئے بھی میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ حیدر شیخ کیسا بھی تھا، اسے اس کے چنگل سے نکالنا تھا اور وہ مقصد جو بھارتی دوبئی کی سرزمین پر لے کر آئے تھے، اسے سبوتاژ کرنا تھا۔ الطاف پاشا کی یہ بات مجھے بہت اچھی لگی تھی کہ وہ لوگ دوبئی میں جو چاہے کریں، ہمیں اس سے غرض نہیں۔ یہ ان کا اور دوبئی کے حکام کا معاملہ ہے لیکن اگر وہ یہاں رہتے ہوئے پاکستان کے خلاف کسی سازش میں ملوث ہیں تو ان کا راستہ روکنا ہمارا فرض بنتا ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ مجھے کسی اہم فیصلے تک پہنچنا تھا، میرے ذہن میں سوچ ابھری کہ کیا میرا دوبئی آنا قسمت میں لکھا ہوا تھا؟ میں نے اپنے ماضی کو ٹٹولا تو حالات کی کڑیاں اسی سمت نشاندہی کر رہی تھیں، حالات ایک سیل رواں کی طرح مجھے بہاتے رہے، پرسکون زندگی میں اچانک ہی ہنگامے بھر گئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سلیم قارانی سے شروع ہونے والا قصہ یہاں تک آن پہنچے گا۔ شاید حالات مجھے کسی خاص سمت میں دھکیل رہے تھے اور میں وہاں تک آن پہنچا تھا جس کے لیے یہ ساری ہنگامہ آرائی تھی؟ میں نے خوب سوچا اور پھر فیصلہ کر لیا کہ مجھے

اپنے اپنے وطن کے لیے لڑتا ہے، اس گمنام سپاہی کی طرح جسے انعام کا لالچ نہیں بلکہ اپنے فرض سے لگن ہوتا ہے۔ میں نے اپنے طور پر طے کر کے حسن کو فون کر دیا، تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔

''حسن! کیا الطاف پاشا پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟''

''بالکل، اور وہ بھی آنکھیں بند کر کے، انہیں بھی ایسا ہی کرنا ہوگا کیونکہ جب تم اس کھیل میں شامل ہو گئے تو پھر وہ محض تماشائی ہوں گے۔ سارا کھیل تمہیں کھیلنا ہے، جب انحصار ہی تم پر ہوگا تو پھر بد اعتمادی کہاں ہو سکتی ہے؟''

''اور وہ آصف چوہدری کا تحفظ؟'' میں نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

''میں تمہیں بتاؤں کہ تم اطمینان رکھو، آصف پوری طرح محفوظ ہے۔ ان کا گینگ بھی غائب ہے، وہ بھی اب نظر نہیں آ رہا۔ باقی سب دوست ٹھیک ہیں، ان کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں نا یہاں۔'' حسن نے اعتماد سے کہا تو مجھے حوصلہ ہوا۔

''چلو ٹھیک ہے، میں فکر مند نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا تو وہ قہقہہ لگا کے ہنس دیا، پھر بولا۔

''یہ جو تمہارے ذمے کام لگایا جا رہا ہے، اس کا فیصلہ کہیں عام لوگوں میں نہیں ہوا۔ بہت اعلیٰ سطح کے لوگ ہیں وہ، جان جی! اور ہاں، جو کچھ بھی کرنا ہے، پورے دھیان سے۔ باقی ساری فکر مجھ پر چھوڑ دو۔'' یہ کہہ کر وہ مجھ سے مزید باتیں کرتا رہا اور پھر فون آف کر دیا۔

میں سہ پہر کے قریب چائے پی رہا تھا۔ ندیم، کنول اور ستیش جا چکے تھے۔ میں یونہی انٹرنیٹ سے کھیل رہا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا، وہ حیدر کی کال تھی۔

''پیارے! کیا کر رہے ہو؟'' لہجے میں خوشگواریت تھی۔

''چائے پی رہا ہوں۔'' میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔

''پھر کیا پروگرام ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جو حکم دو، باس؟'' میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا تو اس نے نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''جلدی سے گھر پہنچو، میں انتظار کر رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میری سنے بغیر اس نے فون آف کر دیا۔ میں نے اطمینان سے چائے ختم کی، نیٹ آف کیا اور آفس سے نکل آیا۔ پورچ میں دو لینڈ کروز اور ایک ہنڈا کارڈ دیکھ کر لگا کہ کچھ معمول سے ہٹ کر ہے۔ کیا ہے؟ یہ اندر جا کے ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ سٹنگ روم میں حیدر کے ساتھ ایک یورپین لڑکی بیٹھی ہوئی تھی، سفید

چٹری کے علاوہ اس میں کوئی خاص بات یہی تھی کہ اس کے سنہرے بال کندھوں تک بکھرے ہوئے تھے اور اس نے انتہائی مختصر لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ لمبا سا یورپی لڑکا تھا۔ دوسرے صوفے پر آرتی کے ساتھ ایک ہندو لڑکی تھی جو ماتھے پر تلک کی وجہ سے پہچانی جا رہی تھی۔

''لیں جی، آگئے وہ جن کا شدت سے انتظار تھا۔'' حیدر نے مجھے دیکھتے ہی نعرہ لگانے والے انداز میں کہا۔

''طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟'' میرا لہجہ تشویش زدہ تھا۔

''ارے، میری جان! آج ہم وہاں جا رہے ہیں جہاں مستی ہوگی، اتنی مستی کہ خواہ مخواہ بہک جانے کو جی چاہے۔'' حیدر نے دائیں آنکھ دباتے ہوئے مخصوص انداز میں کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ موج مستی کے موڈ میں ہے۔ میں نے پھر بھی آرتی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آج کچھ ''خاص'' تو نہیں کھلا دیا اسے؟''

''ارے نہیں، ہم ایسے نہیں کر سکتے۔'' اس نے شوخی سے کہا۔ تو حیدر یورپی جوڑے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''یہ ایلکس ہے اور اس کے ساتھ سوسن'' پھر ہندو لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اوشا ہے۔'' میں نے باری باری سب سے ہاتھ ملایا تو آرتی اٹھتے ہوئے بولی۔

''آئیں، شجاع! میں آپ کو تیار ہونے میں مدد دوں۔''

''لیکن جلدی۔'' حیدر نے تاکید کی۔

''مگر، آرتی! ایسی کیا تیاری کرنی ہے، کیسے سفر پر جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ آئیں تو، میں بتاتی ہوں۔'' اس نے کہا تو میں اس کے ساتھ اپنے کمرے میں چل دیا۔

اس وقت شام ہونے کو تھی جب ہم لینڈ کروز میں بیٹھے شہر سے باہر جا رہے تھے۔ حیدر شیخ، بھارتی لڑکی اوشا اور دو ملازم ہم سے آگے جانے والی لینڈ کروز میں تھے جبکہ دوسری میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ میرے ساتھ آرتی تھی اور پچھلی سیٹ پر ایلکس اور سوسن تھے۔ ان کا پروگرام صحرا میں رات گزارنے کا تھا جسے وہ ڈیزرٹ نائٹ، سفاری یا ایسے ہی دوسرے ناموں سے پکارتے تھے۔ وسیع صحرا میں کھلے آسمان کے نیچے رات کے اندھیرے میں مستی کا تصور لے کر جانے والے کیا کچھ کرتے ہوں گے، یقیناً اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں۔ شہر کی حدود ختم ہوئی تو سورج بھی صحرا کی اوٹ میں غروب ہونے کی کوشش میں تھا۔ میں

حیران تھا کہ آرتی اب تک چپ کیوں ہے جبکہ وہ تو بات کہنے کا موقعہ ڈھونڈا کرتی تھی۔ یو رپی جوڑا بھی خاموشی سے کھڑکی کے باہر جھانک رہا تھا، شاید صحرا نے ان پر جادو کر دیا تھا۔ میں نے آرتی کے چہرے کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کیے، ستے ہوئے چہرے کے ساتھ نجانے کیا سوچ رہی تھی۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اپنی توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔ کتنے ہی لمحے یونہی گزر گئے۔ اس وقت جب ہم بڑی سڑک سے اتر کر کچے راستے پر آئے تو آرتی نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

''کس قدر خوبصورت ویرانی ہے۔''

''آرتی! یہ تو وہی لفظ ہے جو چاند پر اترنے والے خلا باز نے کہے تھے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہمیں اس سے بھی زیادہ اچھے لفظ کہنا چاہئے تھے۔''

''مثلاً؟''

''وہ تو چاند ہے جہاں چاندنی بکھری ہوئی ہے یہاں دیکھیں، سونا پھیلا ہوا ہے۔'' اس نے پھر سے خود کلامی کی۔

''آرتی! تم نے یہ کیسے سوچا؟''

''مطلب؟'' آرتی نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ تمہیں یہ منظر پسند ہیں یا ان مناظر سے انسپائر ہو رہی ہو۔ میں تمہاری اس بات کو کس انداز سے لوں؟'' میں نے یونہی بات بڑھائی۔

''ہماری بات اور ہم۔۔۔'' آرتی نے مضحکہ خیز انداز سے کہا۔ ''کیا حیثیت ہے ہماری، آپ اسے جس انداز سے بھی لے لیں، ہمیں کون سا کوئی گلہ شکوہ ہوگا۔'' اس کا بات کرنے کا انداز ایسے تھا جیسے وہ کہنا تو بہت کچھ چاہ رہی ہے لیکن کہنے سے کچھ حاصل نہ ہونے کی وجہ سے، کہہ نہیں پا رہی۔ میں اس سے باتیں کرنا چاہ رہا تھا، اس لیے بات بڑھاتے ہوئے بولا۔

''آرتی! ان چند دنوں میں مَیں نے تمہیں اتنا پریشان اور ڈیپریس نہیں دیکھا۔ آج کیا بات ہوئی؟''

''نہیں، شجاع جی! ہم پریشان نہیں ہیں۔ بس سوچ رہے کہ بعض اوقات انسان کو کس قدر متضاد حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ جیسے یہ ویرانی ہے۔ انسان ویرانگی سے وحشت محسوس کرتا ہے، دور بھگتا ہے لیکن ہم صحرا کی ویرانگی میں حسن محسوس کرتے ہوئے اپنا وقت اچھا

گزارنے کی خاطر اس طرف جا رہے ہیں اور جیسے۔۔ جیسے آپ اور ہم۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''کہو نا، آرتی! کیا کہنا چاہتی ہو؟'' میں نے اسے حوصلہ دیا۔

''بیکار سی بات ہے۔ آپ کہیں گے، کیا بے سروپا باتیں کر رہی ہے۔''

''بات تو ہے نا۔۔۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کا تو مزید سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

''بات تو تب اہم ہوا کرتی ہے جب کہنے والا کسی کے لیے اہم ہو، غیر اہم سنہری باتیں بھی کرے تو وہ مٹی جیسی ہوتی ہیں۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا، آرتی! تم آخر کہنا کیا چاہ رہی ہو؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے، جب باتیں ہی احمقانہ ہوں گی تو ان کی سمجھ کہاں سے آئے گی۔ جب ہم ہی آپ کے لیے اہم نہیں تو ہماری باتوں کی کیا حیثیت؟''

''او، آرتی! تم غلط سوچ رہی ہو۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''ایسی بات نہیں ہے۔ تم میرے لیے بہت محترم ہو، بڑی اہم ہو کیونکہ تم میرے دوست کی بہت اچھی دوست ہو۔ یہ تعلق۔۔۔''

''اب آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ کیا ہمارا اہم ہونا آپ کے دوست کی وجہ سے ہے۔ ہمارا وجود کچھ حیثیت نہیں رکھتا، کیا ہم کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے؟''

''معاف کرنا، آرتی! مجھے نہیں پتہ کہ تم سونا ہو یا مٹی لیکن اپنے دوست کی وجہ سے میں تمہیں جانتا ہوں اس لیے تم میرے لیے معتبر ہو تعلق کا یہی اعتبار ہی دراصل رویئے کی بنیاد ہوتا ہے، یہی تعلق کی وجہ ہے کہ تم ہو، تمہاری اہمیت ہے، اس وقت ہمارا ساتھ ہے اور آرتی! تم بھی سمجھتی ہو کہ ہر تعلق کی ایک حد ہوتی ہے اور میں اپنی حدوں میں رہنا پسند کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''کہیں آپ یہ تو نہیں کہنا چاہ رہے کہ ہم دونوں میں اگر دوستی ہو جائے تو حیدر جی برا محسوس کریں گے یا انہیں اچھا نہیں لگے گا؟'' بالآخر اس نے وہی بات کہہ دی جو میں اس سے اگلوانا چاہتا تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے سننے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بات یہ نہیں ہے۔ وہ تو چاہتا ہے کہ میں اس طرح کے تعلقات بناؤں۔ اس کی نگاہ میں ہر عورت بس ایک عورت ہے اور۔۔۔'' میں نے کہتے ہوئے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔

"شجاع جی! ہم نہ تو حیدر جی کی داشتہ ہیں اور نہ رکھیل، وہ ہم پر کوئی ادھیکار نہیں رکھتے۔ یہ چند دن جو ہم ان کے پاس ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہمارے جسم و جاں کے مالک ہیں اور پھر کیا آپ اور حیدر جی کے درمیان اتنا بھی اعتماد نہیں کہ وہ ہمارے متعلق آپ کو ٹھیک ٹھیک بتا سکیں؟ ہم تو چند آپ کے پاس ہیں، چلے جائیں گے۔ ہمیں یاد رہے گا تو آپ کا رویہ جو بہر حال ہمیں دکھ دے گا۔"

"میرا نہیں خیال کہ میں نے تمہارے ساتھ غلط رویہ رکھا ہوا ہے؟"

"کیا نظر انداز کر دینا تضحیک نہیں ہے؟" اس نے تیزی سے کہا۔

"تمہیں تمہارے جسم کو یا تمہاری ذات کو؟" میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

"ہم اور ہمارا جسم ہماری ذات سے الگ ہیں؟" اس نے جواب کی بجائے سوال کر دیا۔

"تم یوں نہیں جان پاؤ گی، آرتی! خیر، آؤ، آج سے ہم دوستی کرتے ہیں۔" میں نے بائیں ہاتھ سے سٹیرنگ سنبھالتے ہوئے دایاں ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے حیرت زدہ چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھا اور اپنا ریشمی ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اس کی طرف بھر پور نگاہوں سے دیکھا تو اس کے چہرے پر خوشگواریت اتر آئی۔ وہ دھیرے سے میرے قریب ہوئی اور اپنا سر میرے کاندھے پر رکھتے ہوئے بولی۔

"ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ ہمارے دوست ہو۔" جواباً میں نے کچھ نہیں کہا البتہ دائیں ہاتھ سے بڑے پیار سے اسے سمیٹ لیا، گویا اپنے مقصد کے حصول کے لیے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اب حالات کی لہریں کہاں لے جاتی ہیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ لہریں کہیں ڈبو دیتی ہیں، کسی انجان ساحل سے آشنا کرتی ہیں یا ان دیکھے جزیرے پر اترتی ہیں، جہاں سے واپسی کا راستہ ممکن ہو گا بھی یا نہیں؟ میں نے نہیں سوچا۔

ہمارے سفر کا اختتام صحرا میں نصب عارضی چار دیواری کے پاس ہوا۔ نجانے وہ صحرا کا کون سا حصہ تھا اور ہم کہاں تھے۔ ایک طرف پارکنگ تھی، جہاں کافی ساری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں اُترا تو کھلی فضا نے طبیعت میں یکدم ہی خوشگواریت بھر دی، حیدر نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"آئیں، حضور! آگے بڑھیں۔" میں اس کے ساتھ چلتا ہوا عارضی طور پر بنی چار دیواری میں داخل ہو گیا۔ اندر کا منظر بڑا ہی ہوش ربا تھا، عیش و عشرت کے سبھی سامان موجود تھے۔ کہیں گوشت بھونا جا رہا تھا اور کہیں تلا جا رہا تھا۔ شراب، شباب اور خوشبو کی وافر مقدار

موجود تھی۔ عین درمیان میں قالین بچھے ہوئے تھے جن کے کناروں پر گاؤ تکئے دھرے ہوئے تھے، درمیان میں نیم عریاں رقاصہ ناز و انداز دکھا رہی تھی۔ کھانوں کی خوشبو، عریاں جسم اور مقامی موسیقی کے ساتھ میزبانی کا مقامی انداز۔۔۔ یوں لگا جیسے الف لیلہ کے کسی منظر میں اتر آئے ہیں۔ یقیناً یہ سب انگ انگ میں مستی بھر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں یہ سب دیکھ رہا تھا کہ حیدر نے میرے کاندے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اتنے غور سے مت دیکھو، میرے یار! ابھی تو شروعات ہیں جبکہ ہمیں تو یہاں رات گزارنی ہے۔"

"کیا ہوش رہے گا؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مدہوش ہونے کے لیے تو آئے ہیں۔" اس نے اوشا کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔ شاید وہ کچھ اور کہتا کہ ایک مقامی عربی اس کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ چند لوگ تھے، وہ مقامی انداز میں ملتے رہے اور پھر مقامی زبان میں حیدر سے باتیں شروع ہو گئیں۔ مجھے ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ یہی وہ صاحب ہیں جو یہاں ہمارے میزبان ہوں گے۔ وہ ہمیں لے کر ایک طرف بچھے قالین پر بیٹھ گیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی کھانے پینے کا سامان سجا دیا گیا۔ حیدر نے ہمارا تعارف کروایا اور وہ اپنی باتوں میں لگ گئے۔ کچھ دیر کھانے پینے سے لطف اندوز ہونے کے بعد حیدر نے کہا۔

"آج کی یہ رات اور یہ ماحول آپ کے لیے ہے، اس سے جس طرح چاہیں لطف اندوز ہوں۔" اس نے یہ انگریزی میں کہا تو یورپی جوڑا اٹھ گیا۔ اوشا جو پہلے ہی حیدر کے قریب بیٹھی تھی، مزید جڑ گئی تو آرتی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

"آئیں، کچھ سرگوشیاں ہم بھی کر لیں۔" وہ مسکراتی آنکھوں سے بہت کچھ کہہ رہی تھی، تب میں نے کہا۔

"سرگوشیاں ہی نہیں، آرتی! میں تمہاری خاموشیاں بھی سنوں گا، آؤ" ہم اٹھ گئے اور وہاں آ کر رک گئے جہاں وہ رقاصہ ناچ رہی تھی۔ بڑا ہیجان خیز رقص تھا۔ اس نے ایسی سکرٹ پہنی ہوئی تھی جس سے بدن کھلا وس ہو رہا تھا۔

"یاں بیٹھیں یا تنہائی میں چلیں؟" آرتی نے اپنے انگلی کی پوریں میری گردن پر پھیرتے ہوئے پوچھا۔ میرے بدن میں چونٹیاں رینگنے لگیں، میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''جیسے تم چاہو، آرتی۔۔۔''

''یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔'' آرتی نے خمار آلود لہجے میں کہا اور میرے ساتھ خود کو لپٹائے ہوئے چل دی۔ وہ سیدھی اس سٹال پر گئی جہاں مختلف برانڈ کی شراب کی بوتلیں دھری ہوئی تھیں۔ اس نے وہاں سے ایک بوتل اٹھائی اور چل دی۔ میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ اس نے مختلف جگہوں سے کھانے پینے کا سامان لیا اور اس پنڈال سے قدرے فاصلے پر لگے خیموں کی طرف بڑھ گئی۔ میں اس کے انداز سے سمجھ گیا کہ وہ پہلے بھی ایسے ہی کسی ماحول سے آشنا ہے۔ وہ ایک خیمے کے پاس رک گئی۔ وہ خالی تھا۔ اس کے اندر قالین بچھا ہوا تھا اور اس کے اوپر ریشمی چادر بچھا گدا تھا۔ ماحول کو مزید خواب ناک بنانے کے لیے موم شمعیں جلائی گئیں تھیں۔ ایک طرف صراحی اور بلوریں جام دھرے ہوئے تھے۔ ہوا کی لہروں پر سوار پنڈال سے مقامی موسیقی اور صحرا کی چاندنی، یہ سارا ماحول عقل گم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں جاتے ہی گدے پر لیٹ گیا۔ آرتی نے سارا سامان ایک طرف رکھا اور میرے جوتے اتارنے کے لیے بڑھی۔

''ارے، یہ کیا کرتی ہو؟'' میں نے پاؤں سمیٹتے ہوئے کہا۔

''مت منع کیجئے ہمیں۔'' اس نے میری سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا اور میرے پاؤں سے جوتا اتارنے کے لیے بڑھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا جلدی سے اپنے جوتے اتار کر ایک طرف رکھ دیئے، تب وہ قدرے مایوسانہ انداز میں بولی۔

''کیا ہوتا جو ہم جوتے اتار دیتے۔''

''بات ہونے یا نہ ہونے کی نہیں، آرتی! تم کوئی خادمہ تھوڑی ہو۔'' میں نے یونہی بات کہہ دی۔ تو وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

''ہاں بھی اور شاید نہیں بھی۔۔۔''

''کتنی پرسکون تنہائی ہے۔'' میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہے۔'' وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی، پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شجاع جی! ذرا ماحول کو سمجھیں۔''

''ضروری نہیں کہ ہر چیز کو سمجھا جائے، کبھی کبھی بغیر سمجھے ہی سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے؟'' میں نے دھیرے سے کہا تو وہ مسکرا دی پھر ہمارے درمیان یونہی یہاں کے ماحول کے بارے باتیں چلتی رہیں۔ اس دوران اس نے کھانے پینے کا سامان کھول لیا۔ میں ہاتھ دھونے خیمے سے باہر نکل گیا، واپس آیا تو آرتی نے دو جام بنا کر رکھے ہوئے تھے۔

''آرتی! تمہیں پتہ ہے کہ میں پیتا نہیں ہوں۔''

''کیوں؟'' اس نے یوں پوچھا جیسے میں کسی بہت بڑی نعمت سے محروم ہوں۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آپ اپنے دھرم کی وجہ سے تو منع نہیں کر رہے؟''

''بات دھرم کی نہیں۔ جو چیز ٹھیک نہیں ہے، وہ ٹھیک نہیں ہے اور پھر اس کے پینے سے بندے کو اپنے آپ کا ہوش نہیں رہتا۔''

''کبھی کبھی مدہوش ہو جانا چاہئے، سرور کی لذتوں سے آشنائی حاصل کرنے کا تجربہ ہی سہی۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ ضروری ہے کہ مدہوش ہونے کے لیے شراب ہی کا سہارا لیا جائے، کس کا ساتھ بھی تو مدہوش کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔'' میں نے خمار آلود لہجے میں کہا جس پر اس کا چہرہ مزید گلابی ہو گیا اور نجانے کہاں سے خمار اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔

''ٹھیک ہے ہم بھی نہیں پیتے۔'' اس نے بھرا ہوا جام اٹھا کر انڈیلنا چاہا۔

''دیکھو، میری وجہ سے اپنی مستی غارت مت کرو۔ اب اسے بھرا ہے تو پی جاؤ۔''

''لیکن ہم نے تو دو بھرے ہیں، ایک آپ کا اور ایک ہمارا۔'' اس نے قدرے معصومیت سے کہا۔ جو یقیناً مصنوعی تھی۔

''تمہیں مجھ سے پوچھنا چاہئے تھا، آرتی!'' میں نے اپنی انگلیوں سے اس کے گال چھوتے ہوئے کہا تو وہ جیسے پگھل گئی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی اور جام اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ میں نے ٹن پیک سوڈا کھول لیا۔ کھانے کے دوران وہ اصرار کر کے مجھے کھلاتی رہی۔ جب ہم کھا پی چکے تو اس نے اپنا سر میرے زانو پر رکھ دیا اور گدے پر پھیلتے ہوئے بولی۔

''شجاع جی! کبھی سوچا تھا آپ نے کہ میرے جیسی لڑکی یوں تنہائی میں ایک رات آپ کے ساتھ بسر کرے گی؟''

''زندگی پلاننگ کا نام تو نہیں ہے کہ جو پلان کر لیا، سو ہو گیا۔'' میں نے یونہی طرح دی۔

''نہیں، یہ ہمارے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' اس نے میرے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''سچ پوچھو، آرتی! تو نہیں سوچا تھا۔''

''مگر ہم نے سوچا تھا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''ہم نے چند دن پہلے سوچا کہ کاش! ایسا ہو جائے اور ہماری خواہش پوری ہو گئی۔''

''جن کی خواہشیں پوری ہوں، یقیناً وہ خوش قسمت ہوتے ہیں۔''

''یقیناً، شجاع! ہم خوش قسمت ہیں اگر ہمیں آپ کا پیار میسر آجائے۔''

''آرتی! تمہارے نزدیک پیار کا مفہوم کیا ہے، محض جسم کی تسکین؟''

''نہیں، شجاع'' وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولی۔''ایسا ساتھ جو اٹوٹ ہو، اس میں ضروری نہیں کہ بدن بھی شامل ہو۔''

''ایسا اٹوٹ ساتھ کیسے ممکن ہے؟''

''ہم ملے ہیں تو یہ دن جو ہمیں میسر ہیں، اتنے بھرپور ہوں، اتنے بھرپور ہوں کہ اگر ہم ساتھ نہ بھی رہیں تو ذہنوں میں، یادوں میں یہ سب تازہ رہے۔''

''انسان ہوں نا، آرتی! میں بھی کسی کا ساتھ چاہتا ہوں۔ شاید تم سے بھی زیادہ۔۔۔'' میں نے اس کے چہرے پر انگلی کی پور پھیرتے ہوئے کہا۔''بلاشبہ تم حسین ہو۔ یہ تمہاری کاجل بھری آنکھیں، یہ سرخ ہونٹ، یہ ریشمی گال اور پھر یہ تمہارے خوبصورت بال، یہ کسی کو بھی گھائل کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ میں روبوٹ نہیں ہوں، میں بھی جذبات اور احساسات رکھتا ہوں مگر آرتی! میں نے کہا نا، کہ ہماری حدیں ہوتی ہیں اور ہم ان حدوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔''

''کیسی حدیں؟ یہ ساری خود ساختہ باتیں ہیں، بہانے ہیں شجاع! ہم اس وقت آپ کے پاس ہیں، آپ کی دسترس میں ہیں۔ ہم چاہ رہے ہیں کہ کوئی ہمیں پیار کرے، ہمیں ہماری مرضی سے توڑ پھوڑ ڈالے تو۔۔۔ تو شجاع! یہی حقیقت ہے، باقی سب افسانے ہیں'' آرتی نے کرب سے کہا اور جام کا تکلف کیے بغیر بوتل منہ کو لگالی۔

''تم جذباتی ہو رہی ہو۔'' میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''سنو! حدیں کیا ہوتی ہیں۔ سامنے کی حقیقت کو تو ہر کوئی مان لیتا ہے لیکن وفا کسے کہتے ہیں؟ بلاشبہ تمہارا بدن میری دسترس میں ہے۔ اسے خوبصورت، سڈول اور گداز بدن سے انحراف ممکن تو نہیں لیکن تم میں اور مجھ میں ایک وعدہ آن رکا ہے، مجھے اس کا پالن کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر میں ایک لمحہ کو رکا اور پھر پوچھا۔''آرتی! کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟''

''نہیں، شاید محبت ہم جیسوں کے لیے بنی ہی نہیں۔'' اس نے لاپرواہی سے کہا۔

''میں تمہارے بدن کی پکار کا جواب بھی دوں تو میں پھر بھی تمہارا نہیں ہو پاؤں گا۔ میرا ذہن، میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہوگا۔ اپنے ہی وعدوں پر لکیر کھینچ کر اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں گا۔ آرتی! مجھے یہ بتاؤ کہ کسی کی تپسیا یا ریاضت نشٹ ہو جائے تو کیا یہ اچھی بات ہے؟''

''نہیں، شجاع! ہم ایسا کبھی نہیں چاہیں گے۔'' اس نے میرے سینے پر اپنی ہتھیلی پھیلاتے ہوئے کہا۔

''تو بس یہی ہماری حدیں ہیں۔ ہم دونوں کے درمیان سے ایک جسمانی تعلق نکال دو، یہی ہماری مضبوط دوستی کی بنیاد ہوگا۔'' میں نے کہا تو جواب میں وہ خاموش رہی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم اتنی پیاری ہو، تمہیں اتنا پیار کیا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے زندگی بھی کم ہو۔ تم اسے اپنے عورت پن کی توہین مت سمجھنا۔ میں مجبور ہوں، آرتی! اپنے کہے ہوئے لفظوں کی زنجیروں کا قیدی، مجھے معاف کر دینا۔''

''نہیں، شجاع! آپ بہت اچھے ہو مگر آپ کو ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔'' اس نے انتہائی جذباتی لیکن خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ پھر بوتل سے چند گھونٹ لیے اور منہ صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، آپ کو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ یہی انفرادیت ہی تو ہمیں گھائل کر گئی ہے۔ سبھی میرے بدن کو بھوکی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ میں شاید مردار ہوں اور باقی سارے گدھ ہیں یا پھر۔۔۔ پھر ایسی لاوارث شے جسے سبھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک آپ۔۔۔ شجاع! ایک آپ ایسے ہیں جس کی نگاہوں میں ہوس نہیں ہے۔ میں نے سمجھا، یونہی پوز کر رہے ہیں مگر آپ سچے نکلے، شجاع! میں دل سے آپ کا احترام کرتی ہوں۔'' بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ پھر وہ دیر تک روتی رہی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ جب اس کی گرفت بوتل پر ختم ہوگئی تو میں نے اسے خود سے جدا کر کے لٹا دیا، بوتل ایک طرف رکھی اور دوسرے کنارے پر خود لیٹ گیا۔ نیند میری آنکھوں سے غائب تھی۔ اس وقت وہ ایک دشمن کے روپ میں میرے قریب لیٹی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ہی میدان جنگ میں تھے، وہ اپنی چال میں کامیاب ٹھہری جبکہ میں ایک بڑا حملہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پھر میں شاید سو گیا تھا یا ابھی گہری غنودگی میں تھا کہ سیل فون بجنے سے میں اپنے حواسوں میں آ گیا، دوسری جانب حیدر تھا۔

''باؤ جی! رات کیسے گزری؟''

''بہت اچھی۔'' میں نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

''چلو آؤ، چلیں۔ پارکنگ تک پہنچو'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے فون آف کر کے آرتی کی طرف دیکھا، وہ بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ اس کا چھلکتا ہوا بدن میرے سامنے تھا، سانس کے زیر و بم سے ہی اس میں زندگی کا احساس کیا جا سکتا تھا ورنہ تو وہ ساکت پڑی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، وہاں ہلکی سی کرختگی تھی جیسے کوئی بے زار ہو۔

کہتے ہیں کہ کسی کے اندر کے احوال کا جائزہ لینا ہو تو اسے سوتے ہوئے دیکھو۔ اس وقت جو اس کا چہرہ کہہ رہا ہوگا، وہ اس کے اندر کا احوال ہوگا۔ میں نے آرتی کو جگایا، کچھ دیر کوشش کے بعد وہ اٹھ کر میرے ساتھ چل دی۔ شاید اس کا نشہ نہیں اترا تھا، وہ میرے ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ میں جب پارکنگ کے پاس پہنچا تو حیدر وہاں پر موجود تھا، اس نے بہت غور سے ہم دونوں کو دیکھا۔ واپسی پر دونوں گاڑیاں ڈرائیور چلا رہے تھے، میں اور آرتی پچھلی نشست پر تھے اور ڈرائیور کے ساتھ اوشا بیٹھی ہوئی تھی۔ گھر پہنچے تو سورج ابھر آیا تھا اور اس کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ میں نے آرتی کو اس کے کمرے تک پہنچایا تو وہ جیسے مجھ سے چمٹ ہی گئی۔

''ادھر ہی سو جائیں آپ۔۔۔'' وہ بڑبڑائی۔ تو میں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے تم اطمینان سے لیٹ جاؤ، میں یہیں ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ پھر مجھے بھی ہوش نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں۔ میری آنکھ کھلی تو میں کمرے میں اکیلا تھا۔ میں نے وقت دیکھا، شام کے سائے ڈھلنے والے تھے۔ میں اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر سناٹا تھا۔ میں سٹنگ روم سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں آیا تو ہر شے سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ افراتفری کا وہ عالم نہیں تھا جو میرے ہونے کی وجہ سے وہاں ہوتا تھا، میں دھیرے سے مسکرا دیا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

اس رات ڈنر پر میں اور آرتی تھے، حیدر نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ بھوک چونکہ زوروں کی لگی ہوئی تھی اس لیے ساری توجہ کھانے پر رہی۔ خوب ڈٹ کر کھانے کے بعد میں اور آرتی باہر کھلی فضا میں نکل آئے۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''میرا کمرہ کس نے ٹھیک کیا تھا؟''

''جس نے بھی ٹھیک کیا ہو، آپ اسے کوئی سزا دینا چاہتے ہیں؟'' وہ شوخی سے بولی۔

''نہیں، جناب! ہم نے یونہی پوچھنے کی گستاخی کی ہے۔'' میں نے بھی عام سے لہجے میں کہا۔ ہم دھیرے دھیرے قدموں سے چلتے ہوئے سوئمنگ پول تک جا پہنچے۔ آرتی وہاں دھری ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر ڈھیر ہوگئی تو مجھے بھی بیٹھنا پڑا۔ مدہم روشنی میں ارد گرد کے سارے منظر خوابیدہ سے تھے۔ پرسکون پانی کا عکس ٹھہرا ٹھہرا سا تھا، کھلے کھلے لباس میں آرتی میرے سامنے تھی اور میں امتحان میں گھرا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اگر کوئی من چاہا ساتھی ہوتا تو یہ رومان پرور ماحول مدہوش کر دینے کے لیے کافی تھا۔ چاند کی چاندنی بھی جوبن

پر نہیں آئی تھی، کچھ دیر بعد وہ بھی اس ماحول میں نشہ گھول دینے والی تھی۔ میں نے آرتی کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں میرے لیے پیار ہلکورے لے رہا تھا۔ دکھ کی ایک لہر میرے اندر سرائیت کر گئی۔

''کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟'' آرتی نے اک ادا سے پوچھا۔

''تمہارا حسن دیکھ رہا ہوں، اگر کوئی خنجر بھی تمہاری طرح حسین ہوتا تو میں بڑے آرام سے اپنی گردن اسی خنجر سے کٹوا لیتا۔''

''آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں۔'' اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا، پھر ادا سے بولی۔ ''اچھا چھوڑیں ان باتوں کو، یہ بتائیں، رات نشے میں کچھ زیادہ تنگ تو نہیں کیا آپ کو؟''

''کیا تمہیں احساس ہے کہ تم نے تنگ کیا تھا؟''

''مطلب کوئی اوٹ پٹانگ حرکت، کوئی فضول بات؟'' آرتی زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

''او، نہیں، یار!'' میں نے کہا اور بات بدلتے ہوئے اچھا۔ ''آرتی! تم داسی ہو، اپنی پوترتا بچانے کے لیے حیدر کے پاس چھپی ہوئی ہو۔ پھر بھی تمہارا مجھ سے ایک خاص مطالبہ رہا یہ متضاد رویئے ہیں، ایسا کیوں؟''

''ہمیں احساس تھا کہ آپ کسی بھی وقت ہم سے یہ سوال ضرور کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ قدرے سنجیدہ ہوئی اور پھر کہتی چلی گئی۔ ''ہماری حیثیت اگر ایک داسی کی ہے تو یہ بعد کی بات ہے، پہلے ہم ایک عورت ہیں۔ ہماری اپنی خواہشات، ہمارے جذبات اور تشنگی ہے۔ ہم آشرم میں تھے تو وہاں کے ماحول کے مطابق جیون گزارا اور اب آشرم سے باہر ہیں تو ہمارا من چاہتا ہے کہ ہم بھی عام لوگوں کی طرح جیون بتائیں۔''

''آرتی! یہ تضاد کیوں؟''

''آپ کو یہ تضاد نظر آتا ہے مگر جب آپ اسے ہماری نگاہ سے دیکھیں گے تو کچھ بھی ابہام نہیں ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی، میں چپ رہا تو وہ بولی۔ ''آپ نے محض جسم کی پکار کو بنیاد بنا کر یہ سوال کیا ہے تو، شجاع جی! مندر میں یا آشرم میں ایک داسی کو یہ خدمت بھی کرنا پڑتی ہے، دھرم کے انوسار (مطابق) یہ خدمت کر کے بھی ہم پوتر ہیں اور اس وقت بھی ہم پوتر ہیں جب کوئی من چاہا مل جائے جسے ہمارا من چاہے۔ شردھ سیٹھی سے ہمارا من نہیں ملا، ہم نے اس سے خود کو بچا لیا اور آپ کو دیکھا تو لگا جیسے آپ کسی دیوتا کے اوتار ہیں۔ پھر ہمارے پاس ہے ہی کیا، یہی ایک جسم!''

''آرتی! مجھے تمہاری باتیں بالکل بھی سمجھ نہیں آ رہیں۔''

''ایسا اس لیے ہے، شجاع جی! کہ آپ اپنے دھرم کی عینک سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔آپ کے نزدیک یہ سب کیا ہے، میں اس سے غرض نہیں۔''

''ہو سکتا ہے، تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اگر میں تمہارے اس فلسفے کو سمجھنا چاہوں تو۔۔۔''

''ہم شاید نہ سمجھا پائیں کیونکہ ایک داسی کا دھرم یہ ہے کہ وہ خاموشی سے خدمت کرتی چلی جائے۔''

''آرتی! تمہارے اس خدمت کے عمل کا درس دینے کے لیے کوئی بنیادی فلسفہ ہوگا، جو مطمئن کر دے؟''

''ہم کب کہتے ہیں کہ ایسا فلسفہ نہیں ہوگا۔''

''کچھ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اسے سمجھ سکوں؟'' میں نے کہا تو وہ قدرے جوش سے بولی۔

''ہاں، یہیں دوبئی میں ایک چھوٹا سا آشرم ہے جہاں سوامی ہری داس ہوتے ہیں، وہ گرور جنیش کے سچے پیروکار ہیں، وہ سب جانتے ہیں۔''

''کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''کیوں نہیں مگر ہمیں یہ پتہ نہیں کہ وہ آشرم ہے کہاں، معلوم کر لوں گی تو بتا دوں گی۔''

''ٹھیک ہے، آرتی! میں ان سوامی جی سے ضرور ملنا چاہوں گا۔۔۔'' میری بے تابی میرے لہجے سے عیاں تھی۔

''اتنی بھی کیا جلدی، مہاراج ابھی تو آپ کی داسی، آپ کے سامنے موجود ہے۔ '' آرتی نے خمار آلود لہجے میں کہتے ہوئے انگڑائی لی۔ میں مسکرا کے رہ گیا، وہ میری طرف دیکھتی رہی تو میں نے کہا۔

''آؤ، آرتی! چلیں مجھے کچھ فون کرنا ہیں۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ پھر ہم دھیرے قدموں سے چلتے سٹنگ روم میں آ گئے۔ میں صوفے پر بیٹھا اور آرتی کو چائے بنا کر لانے کا کہہ دیا۔ وہ چلی گئی تو میں اس بدنام زمانہ شخص کے بارے میں سوچنے لگا جو گرور جنیش کے نام سے شہرت پا کر پھر وقت کے اندھیروں میں گم ہو گیا تھا۔

یوں تو ہندوستان کی سرزمین پر بہتیرے ایسے لوگ ہوئے ہیں جنہوں نے ہندو دھرم پر کسی نہ کسی طرح اثر ڈالا مگر رجنیش نامی شخص نے ہندو دھرم میں ایسی جہت متعارف کرائی جس سے ہندو دھرم ایک غلیظ اور کریہہ صورت میں سامنے آیا۔ رجنیش بنیادی طور پر سنیاسی تھا۔ اس کے خیالات نہایت پیچیدہ اور پراسرار قسم کے تھے جو اس نے مذہبی روحانیت میں لپیٹ کر پیش کیے۔ اس نے اپنے خیالات وافکار کا پرچار بھارتی شہر پونا کے ایک چھوٹے سے آشرم سے کیا، بہت جلد لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کے گرد جو لوگ جمع ہوئے، ان کا تعلق دولت مند گھرانوں سے تھا۔ جبکہ اس کے چیلوں میں انتہائی درماندہ قسم کے لوگ شامل تھے۔ اس نے دھرم میں ایک نئی طرح کی بنیاد رکھی اور گرو رجنیش اور رجنیش دیوتا کے نام سے بھی پکارا گیا۔ دراصل یہ شخص جنسی مریض تھا۔ عورت، شراب اور دولت اس کی فطری کمزوریاں تھیں۔ یوں دھرم کی آڑ لے کر اس نے روحانیت کے ریشمی کپڑے میں اپنے خیالات پیش کیے جو سراسر بے راہ روی پر مبنی تھے۔ اسی بے راہ روی کو اس نے "انسان کی فطری آزادی" کا نام دے رکھا تھا۔ اس نے مادر پدر آزادی کو روحانیت کی اعلیٰ سطح قرار دے کر اس کے لیے نامعقول دلیلوں اور گھٹیا جواز کا انبار لگا دیا۔ دنیا بھر سے پراسرار علوم کی تلاش میں بھارت آنے والے اور وہ لوگ جو روحانیت میں دلچسپی رکھتے تھے، گرو رجنیش کے بچھائے ہوئے جال میں پھنستے چلے گئے۔ بھارتی پنڈت گرو رجنیش کی اس شہرت سے خائف ہو گئے۔ انہوں نے اپنی حیثیت و مقام بچانے اور اپنے دھرم میں نئی جہت کو ختم کرنے کے لیے باقاعدہ محاذ شروع کیا۔ جس کے نتیجے میں رجنیش کے خیالات وافکار پر پابندیاں لگنے لگیں، یہاں تک کہ اس پر بھارت کی زمین تنگ ہو گئی اور وہ امریکہ چلا گیا جہاں اسے اور آزادی میسر آ گئی۔ اس کے پاس کون سی قوت تھی جس کے زیر اثر لوگ اس کے اردگرد جمع ہوتے تھے؟ یہ بحث طلب موضوع نہیں تاہم انہی خیالات و افکار کے باعث اس کے گرد چیلوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، دولت کے انبار لگ گئے۔ سفر کے لیے لاتعداد رولس رائس کاریں، رہائش کے لیے عالی شان مکان، دنیا کی عمدہ ترین شراب اور خوبرو جوان لڑکیاں اسے میسر تھیں۔ رجنیش بنیادی طور پر غلیظ اور کریہہ انسان تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ جیسا ملک جہاں جنسی بے راہ روی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، اس حکومت نے 1985ء میں اس کی تعلیمات کی وجہ سے اسے گرفتار کیا۔ اس پر متعدد مقدمات ہوئے اور اسے امریکہ سے نکال دیا گیا۔ وہ واپس بھارت آ گیا۔ غالباً 1990ء کے لگ بھگ وہ انتہائی گمنامی میں مر گیا۔ زندگی کی روشن خیالیاں اپنی جگہ لیکن روشن حقیقت سے منہ موڑنے والا گہری کھائی میں گرتا ہے۔ دراصل اس نے بھی برہمن ازم کے خلاف اُٹھائی

تھی اور انہی کے ہاتھوں ختم ہو گیا۔ میں حیران تھا کہ جس کی تعلیمات اتنی غلیظ اور کریہہ تھی اور وہ اپنی موت آپ مر چکی تھیں، دوبارہ کس طرح زندہ ہو کر سامنے آ رہی تھیں۔ وہ تعلیمات جنہیں بھارتی برہمنوں نے اپنی ہزیمت خیال کیا تھا، انہوں نے کس طرح اس کے پرچارکوں کو زندہ چھوڑا؟ اب بھی اگر رجنیش کے چیلے، اس کے خیالات کے پرچارک موجود تھے تو یہ نہایت خطرناک بات تھی۔ مادیت پرست لوگ اس جال میں کچے دھاگے سے بندھے چلے آتے ہیں۔ مجھے سوامی ہری داس سے ضرور ملنا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ دوبئی میں کیسے عزائم لے کر بیٹھا ہے۔ میں یونہی مضطرب ہو گیا۔ سوامی ہری داس تک پہنچنے کے لیے واحد راستہ آرتی کی صورت میں تھا اور میں اسے کسی شرط بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔

''جناب! مزید ار چائے پیش خدمت ہے۔'' آرتی کی آواز پر میں چونک گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور پیالی پکڑ کر میز پر رکھ دی۔ اس نے بھی اپنی پیالی میز پر رکھی اور میرے سامنے ایک ٹانگ سمیٹ کر اور دوسری صوفے سے ٹکا کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ نجانے کیوں مجھے وہ ان لمحوں میں اجنبی لگی، اتنی اجنبی کہ بس اس سے نفرت کا احساس نہیں ہوا۔ ایسا احساس کا جس میں شناسائی کی رمق بھی نہیں ہوتی۔ میں نے اس احساس سے جان چھڑانے کی خاطر چائے کی پیالی اٹھالی۔ چند سپ لیتے ہوئے میں مسلسل سوچتا چلا جا رہا تھا کہ مجھے اپنے سر میں درد کی شدت بھری لہر محسوس ہوئی۔ انہی لمحوں میں جانا کہ جب بھی کوئی ذہنی ریاضت کرتا ہوں تبھی یہ درد آن وارد ہوتا ہے تو کیا یہ درد عمومی نوعیت کا نہیں جسے میں اب تک نظرانداز کرتا چلا جا رہا ہوں؟

''شجاع جی! کیا بات ہے، آپ اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہیں؟'' آرتی نے مجھے چونکا دیا۔

''آرتی! میرے سر کا درد بہت شدت سے اٹھتا ہے اور پھر تھوڑا بہت دیر تک رہتا ہے، اب بھی اچانک لہرا اٹھی ہے۔''

''کیا یہ اکثر ہوتا ہے؟'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہوں، اکثر ہو جاتا ہے، غفلت یہی رہی کہ اب تک ڈاکٹر کو چیک نہیں کروا پایا۔''

''آپ ابھی پریشان مت ہوں، چائے پی لیں، ابھی آپ کے سر کا درد ختم ہو جائے گا۔'' آرتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مطلب، وہی پچ تھراپی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی، بالکل، بس آپ جلدی سے چائے پی لیں۔'' آرتی نے کہا اور اپنی چائے ختم کرنے لگی۔ میں پیالی خالی کر چکا تو انہیں ایک طرف رکھ کر میرے پیچھے آ کر بیٹھ گئی۔ پھر دھیرے سے اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ تھوڑی دیر تک اپنی انگلیوں سے میرے سر اور ماتھے پر ہلکا ہلکا مساج کرتی رہی، حیرت انگیز طور پر چند منٹوں میں میرے سر کا درد ختم ہو گیا۔

''یہ کیسا جادو ہے، آرتی؟''

''جادو نہیں، ایک معمولی سا فن ہے جو ہمیں آشرم میں سکھایا گیا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''اب مجھے سکون سے نیند آئے گی۔''

''کیا آپ ابھی سے سو جائیں گے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تو اور کیا؟'' میں نے مصنوعی حیرانگی سے کہا۔

''ابھی تو شام ڈھلی ہے، ابھی سے سو کر کیا کریں گے آپ؟'' پھر ایک لمحہ بعد سوچنے والے انداز میں بولی۔ ''چلیں، کوئی اچھی سی فلم دیکھتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے دھیرے سے میرا سر اپنی ران سے ہٹایا اور اٹھ گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس رات میں نے سر درد کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا اور فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں چیک اپ کرواتا ہوں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ میرا اسیل فون بج اٹھا، دوسری طرف حسن تھا۔

''کیا ہو رہا ہے، جان جی؟'' اس نے خوشگواریت سے پوچھا۔

''جی رہے ہیں، پردیسی بندے کا کیا ہے؟'' میں نے یونہی چھیڑنے والے انداز میں دھیرے سے کہا۔

''اوئے، اداس ہو گئے ہو یا کوئی اور بات ہے؟'' حسن یکدم ہی سنجیدہ ہو گیا۔

''ارے نہیں، میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔ یہاں تو ہر طرح کی عیاشی ہے، یہاں کون اداس ہو سکتا ہے، تم سناؤ، کیسی خبریں چل رہی ہیں؟''

''ٹھیک ہے سب، ہر طرف سکون ہو گیا ہے وددو شاہ کے بڑے بیٹے سے بات ہو گئی ہے، وہ ہر طرح کے سمجھوتے پر راضی ہو گیا ہے۔ وہ خود بھی کسی نئے پھڈے میں نہیں آنا چاہتا۔ اس کی گینگ کے لوگ بپھرے ہوئے تھے، انہیں بھی اسی نے سنبھالا ہے۔ اس نے تسلیم کیا ہے کہ غلطیاں اس کے باپ سے ہوئی ہیں۔''

''چلو، یہ تو معاملہ ختم ہوا، نائلہ کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ بیٹھی ہے میرے پاس۔''

''ارے واہ ''میں نے کہا تو اس نے فون نا کو دے دیا۔

''کیسے ہیں آپ؟''اس کے لہجے میں سکون تھا۔

''میں ٹھیک ہوں تم ٹھیک ہو نا؟''میں نے بڑے ٹھہرے لہجے میں کچھ دیر حال احوال کے بعد میں نے پوچھا۔''عامر کیسا ہے؟''

''پتہ نہیں، کئی دن ہوئے، ملاقات نہیں ہوئی۔''

''خیریت؟''

''میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ میں اب اسے امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔''

''پھر کیا سوچا ہے تم نے۔۔۔؟''

''ابھی تو کچھ بھی نہیں، بس اپنا گارمنٹس کا بزنس دیکھ رہی ہوں اسی سے فرصت نہیں ملتی۔''اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ تنہائی محسوس کر رہی ہے۔ میں نے کچھ دیر اسے تسلی دی اور پھر حسن سے باتیں کر کے فون آف کر دیا۔ ایک آسودگی میرے من میں اتر گئی تھی۔ میں نے فون ایک طرف رکھا تو آرتی کا احساس ہوا، وہ میرے سامنے بیٹھی میرے چہرے کی طرف دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس نے قدرے رندھے ہوئے گلے سے پوچھا۔

''شجاع جی! ایک بات تو بتائیں؟''

''پوچھو۔''

''آپ نے ہمیشہ اپنے دوستوں سے بات کی ہے، ان کے لیے پریشان ہوتے ہیں، انہی کی خوشی میں خوش رہتے ہیں۔ آپ نے اپنے خاندان کے کسی فرد کے ساتھ کبھی بات نہیں۔ ایسا کیوں؟''

''بڑی بات ہے کہ تم نے یہ محسوس کیا۔ دراصل، آرتی! بات یہ ہے کہ میرے گھر والوں کے بارے میں کوئی خبر نہیں تو مطلب ''سب اچھا'' ہے۔ انھیں پتہ ہے کہ میں کہاں ہوں، انہیں کوئی معاشی مسئلہ نہیں کہ میری طرف دیکھیں۔ بس میرے باپو کو یہ آس ہے کہ میں کب گھر لوٹتا ہوں، منہ سے وہ بھی مجھے آنے کے لیے نہیں کہتے۔''

''مطلب، کہیں ناراض؟''

''ارے نہیں، بس ایک ذہنی رابطہ ہے اور وہ چل رہا ہے۔''میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی بے ربط سا ہنس دی پھر بڑی بے دلی سے اس نے ریموٹ سے فلم چلا دی۔ ہم دونوں بیٹھے دیکھتے رہے، تبصرہ کرتے رہے۔ جب رات بھیگ گئی اور فلم بھی ختم ہو گئی تو ہم دونوں ہی اپنے اپنے کمروں کی طرف چل دیئے۔ میرے ذہن میں کہیں تھا کہ شاید آرتی ایک ہی کمرے

میں سونے کی ضد کرے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ رات گزر گئی۔

میں دفتر پہنچا تو کافی لیٹ ہو چکا تھا، کنول جیت میرے انتظار میں تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''کنول! خیریت؟''

''بالکل خیریت ہے، آپ تو پریشان ہو گئے؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''وہ اس لیے کہ اگر تمہاری مجھ سے براہ راست بات ہو جاتی تو ٹھیک تھا، اب فون آرتی نے سنا تو اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔''

''آج سب فائل کرنا تھا، میں نے یہی کنفرم کرنا تھا کہ آپ دفتر آ رہے ہیں یا نہیں؟''

''تو، کنول! میرے سیل فون پر کال کرنا تھی۔'' پھر اس سے پہلے کہ وہ سوری وغیرہ کہتی، میں نے جلدی سے کہا۔ ''آئندہ براہ راست مجھے کال کر لیا کرو۔''

''ٹھیک ہے، سر'' یہ کہتے ہوئے اس نے فائل کے ساتھ دھرے کاغذ اٹھانا چاہے تو میں جلدی سے بولا۔

''ارے، کنول! سارا دن یہ کام ہوتا رہے گا۔ پہلے ذرا اچھی سی کافی پلاؤ، ذرا موڈ بنے تو کام ہو''

''لگتا ہے، سر! آپ نے اچھی خاصی چھٹی منائی ہے۔'' اس نے معنی خیز لہجہ میں کہا تو میں مسکرا دیا۔

''کون جانے، کون کس عذاب سے گزرا ہے۔'' میں نے مبہم انداز میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کے ہنس دی اور اٹھ گئی۔ وہ نکلی تو ندیم آ گیا۔ میں نے انتہائی مختصر انداز میں اسے پچھلے دن کی روداد سنائی اور کہا۔

''سوامی ہری داس کے بارے میں الطاف پاشا سے پوچھو، اس کے بارے میں کچھ معلومات ہوں تو مجھے بتاؤ۔''

''وہ کوئی خاص آدمی ہے؟'' ندیم نے پوچھا۔

''یہ تو اس سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہوگا ، ہو سکتا ہے، یہ اہم آدمی ہو۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔''

''ہم کوشش کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ میز پر دھری کنول کی فائل دیکھنے لگا۔ پھر اگلے ہی چند لمحوں میں کنول کافی لے کر آ گئی، تبھی ندیم ہنستے ہوئے بولا۔

''یہ کنول تو آپ کو پوری طرح اسسٹ کر رہی ہے اور تو اور، ہماری کل کی چھٹی بھی

غارت کروادی اور خود بھی رات گئے تک نہیں سوئی۔'' اس نے کہا تو کنول جیت لاشعوری طور پر پنجابی میں بولی۔

''او، جناب! کم وی تے مکانا سی۔'' (او جناب کام بھی ختم کرنا تھا۔)

''جی، کنول! کام ختم کرنے سے ہی ختم ہوتا ہے۔'' میں نے انگریزی میں کہا تو وہ ہنس دی۔

''یہ ندیم بھی تو لاہور ہی کے ہیں؟'' وہ بولی۔

''جی، اور کبھی موقع ملا تو پاکستان میں موجود سارے گرودوارے پھرادوں گا'' ندیم نے قدرے شوخ ہوتے ہوئے کہا۔

''بڑی مہربانی جناب کی۔'' کنول نے باقاعدہ ہاتھ ماتھے پر لے جاتے ہوئے کہا، پھر میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''سچی بات کہوں، شجاع جی! یہاں کام کوئی بھی نہیں ہے لیکن آپ لوگوں کے ساتھ دل لگ گیا ہے، ذرا بھی وطن کی یاد نہیں آتی۔ مجھے لگتا ہے جیسے ہم گھر میں ہی ہوں۔''

''جھوٹ کہہ رہی ہو تم۔'' میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا تو وہ جھٹ سے بولی۔

''نہ جی، جھوٹ تے نئیں کہہ رہی۔'' پھر قدرے ہوش سے بولی۔ ''پر اپنے تو یاد آتے ہیں نا۔۔۔!''

''چلو آج یہ سارا فائنل کر کے لنچ یہیں کرتے ہیں، بولو، کیا کھلاؤ گی؟''

''دھن بھاگ میرے، شجاع جی! جو کہیں۔۔۔''

''آلو کی بھجیا اور پراٹھے، پودینے کی چٹنی اور لسی۔۔۔'' میں نے جھٹ کہا تو وہ اسی تیزی سے بولی۔

''حاضر ہوگی۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے جلدی سے فائل کھول لی۔ ندیم نے انٹر کام پر ستیش کو بلوا لیا، کچھ دیر بعد سب فائنل ہو گیا۔ کنول سب کچھ سمیٹتے ہوئے بولی۔ ''میں جا رہی ہوں، مجھے مارکیٹ بھی جانا ہوگا۔ آپ وقت پر پہنچ جائیں۔''

''یہ ندیم تمہارے ساتھ مدد کے لیے جائے گا۔'' میں نے کہا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ وہ لوگ گئے تو میرے پاس ستیش رہ گیا۔

''خاصے مصروف ہو گئے ہو۔'' میں نے اس سے یونہی بات بڑھانے کے لیے کہا۔

''اصل میں کنول نے میرے ذمے پبلسٹی لگا دی ہے، ٹکٹ اور پبلسٹی کو میں نے دیکھنا ہے۔ وقت تھوڑا ہے اور اس حساب سے کام زیادہ ہے اس لیے مصروف تو ہونا ہی تھا۔''

''ہاں، یار! میں بھی آتے ہی ایک دائرے میں بند ہو کر رہ گیا ہوں، باہر نکلا ہی نہیں۔ نہ کوئی پارٹی، نہ کوئی ڈسکو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ زیرلب مسکرا دیا۔ پھر دھیرے سے بولا۔

''آپ خود ہی باہر نہیں نکلتے ورنہ کیا کیا رنگینیاں یہاں پر نہیں ہیں۔ یہ میڈم زارا کے ٹور پر دیکھئے گا، کیسے کیسے لوگ ملتے ہیں۔''

''ستیش! ہنگامے کبھی کبھی اچھے لگتے ہیں، لطف تو سکون اور شانتی میں ہی آتا ہے۔'' میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''ایسا بھی بہت کچھ ہے، آپ وقت تو دیں۔'' وہ اسی لہجہ میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''وقت کہیں سے جا کے لانا ہے، اپنا ہی تو ہے۔'' میں نے کہا تو وہ اٹھ گیا۔ اسے کچھ فون کرنا تھے اور اس نے نیٹ پر اپنی پسندیدہ سائٹ کھول لی پھر میں چونکا اس وقت جب کنول جیت کا فون آیا کہ لنچ تیار ہے۔ میں نے کمپیوٹر آف کیا اور ستیش کو لے کر اس کے اپارٹمنٹ چلا گیا۔

کنول جیت میرے لیے قدرے معمہ تھی۔ جب تک الطاف پاشا نے مجھے صحیح صورت حال کے بارے میں آگاہ نہیں کیا تھا۔ تب تک اپنے اردگرد موجود لوگوں کے بارے میں میرا زاویہ نگاہ کچھ اور تھا لیکن جیسے ہی آگہی ہوئی، سب کچھ بدل گیا۔ پہلے میں کنول جیت کو اک شعلہ جوالا قسم کی لڑکی سمجھتا تھا جو بس بھڑک اٹھنے کو تیار بیٹھی ہے۔ اس میں وقت اور حالات کے کئی آپشن ہو سکتے تھے لیکن اب میں خود سمجھنا چاہ رہا تھا کہ وہ کیا ''چیز'' ہے؟ اس سے متعلق ڈھیروں سوال ذہن میں آتے مگر حتمی جواب کوئی بھی نہیں تھا، انداز سے ہی ہو سکتے تھے۔ حیدر شیخ کے ساتھ ستیش جیسے شخص کا ہونا تو صاف تھا، کنول جیت بھی ان کی طرح ہی تھی۔ ظاہر ہے، انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر انہیں اپنے ساتھ ملایا ہوگا۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ بھی ان کی طرح تنظیم ہی سے متعلق تھی۔

میں پہلی بار ان کے اپارٹمنٹ گیا تھا۔ ندیم سٹنگ روم میں ٹی وی دیکھ رہا تھا جبکہ کنول جیت کچن میں مصروف تھی، ہمیں دیکھتے ہی بولی۔

''جی آیا نوں، آپ پہلی بار یہاں آئے ہیں۔''

''ہاں، کنول! پہلی بار۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ جلد ہی کنول نے کھانا میز پر لگا دیا۔ گرم گرم پراٹھے، آلو کی بھجیا، پودینے کی چٹنی، رائتہ اور لسی دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ کھانا کھاتے ہی ندیم اٹھ گیا۔

’’مجھے تو اجازت دیں، بڑے کام پڑے ہیں کرنے والے۔‘‘اس نے کہا تو ستیش بولا۔

’’میں بھی چلتا ہوں۔‘‘

’’چلیں، ٹھیک ہے، ہمارے لیے تو کوئی کام نہیں ہے، ہم ابھی کچھ دیر بیٹھیں گے۔‘‘میں نے کہا تو وہ دونوں چلے گئے۔ کنول جیت برتن سمیٹنے لگی۔

’’کنول! تمہارا کمرہ کون سا ہے؟‘‘ میں نے ہانک لگائی۔

’’یہ ساتھ والا۔‘‘اس نے اشارے سے کہا تو میں اٹھ کر اس کے کمرے میں چلا گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی جو سب سے پہلی چیز اپنی طرف متوجہ کرتی تھی وہ بابا گرونانک کی ایک بڑی سی رنگین تصویر تھی جس پر کچھ تازہ اور کچھ پرانے پھول چڑھے ہوئے تھے۔ اس کے قریب ہی دِیا اور اگربتیاں وغیرہ تھیں۔ ایک بڑا سا میٹرس زمین پر بچھا ہوا تھا۔ کچھ کتابیں، پرانے اخبار اور میگزین، زنانہ استعمال کی چیزیں اور کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر کمرے کی حالت افراتفری کی عکاسی تھی۔ وہ میرے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔

’’کنول! تم سگھڑ لڑکی نہیں ہو۔‘‘

’’یہ بالکل ٹھیک کہا آپ نے، کمرہ صاف ستھرا ہو اور ہر شے سلیقے سے رکھی ہو تو مجھے پریشانی ہونے لگتی ہے۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے میٹرس پر پڑی چادر ٹھیک کی اور بولی ’’آئیں، تشریف رکھیں۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔‘‘

’’چھوڑو چائے کو، ابھی لسی پی ہے۔ تم بیٹھو یہاں۔‘‘میں نے کہا تو بالکل میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ میری نظر پھر سے گرونانک کی تصویر پر پڑی تو میں نے بے ساختہ کہا۔

’’کنول! میں جب بھی گرو جی کی تصویر دیکھتا ہوں تو مجھے انہی کا ایک شعر یاد آجاتا ہے۔‘‘

’’کون سا؟‘‘اس نے انتہائی اشتیاق سے پوچھا۔

نہ میلا، نہ دھندلا، نہ بھگوا، نہ کچ
نانک لالو لال ہے، سچے رتا، سچ!

’’آپ کو یہ شعر کہاں سے یاد ہے؟‘‘ وہ انتہائی خوشی سے بولی۔

’’پتہ نہیں، کب سے یاد ہے۔ میں نے! ایسے ہی کہیں پڑا تھا، شاید میگزین تھا یا کوئی اخبار تھا۔‘‘میں نے کرتے ہوئے کہا تو وہ آنکھوں سمیت ہنس دی، پھر بڑی چاہ سے بولی۔

''چلو یاد تو ہے نا!'' یہ کہتے کہتے وہ اچانک بولی۔

''لگتا ہے، آپ کو سکھ دھرم کے بارے میں دلچسپی ہے ضرور آپ اس دن آپریشن بلیو سٹار کے حوالے سے بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔''

''نہیں، کنول! اصل میں پڑھنے کی لت بچپن سے پڑ گئی۔ سو جو سامنے آیا، پڑھتے چلے گئے۔ پھر کام ہی لکھنے پڑھنے کا شروع کر دیا۔ اصل میں ہمارے اردگرد ہونے والے واقعات اپنا اثر تو چھوڑتے ہیں ذہنوں پر، یا درہ جاتے ہیں۔ تم گئی ہو کبھی پاکستان؟'' میں نے آخری فقرہ کہتے ہوئے بات بدل دی۔

''بہت بچپن کی بات ہے، تب مجھے اتنا ہوش نہیں تھا۔ ہمارا پورا پریوار گیا تھا، دھندلا دھندلا سا یاد ہے، پھر حسرت ہی رہی۔''

''اگر کبھی موقع ملا تو میں پاکستان میں تمہارا میزبان ہوں گا، ندیم نے جو آج مذاق میں بات کہی ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ سچ ہو جائے۔''

''یہ تو واہ گرو کی کرپا ہوگی۔'' اس نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا، پھر آنکھیں کھول کر بولی۔ ''میں اور کیا سیوا کروں آپ کی؟''

''ارے کنول! اس دیار غیر میں دو اجنبی اگر کچھ وقت گزار لیں تو اس سے بڑھ کر اور کیا عیاشی ہوگی؟''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' یہ کہہ کر کنول جیسے یادوں میں کھو گئی۔ پھر کتنی دیر تک وہ اپنے کالج اور اپنی سہیلیوں کے بارے میں بتاتی رہی، اوٹ پٹانگ باتیں شرارتیں اور یادیں، جب اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو میں نے کہا۔

''کنول! اب بس جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ بالکل پنجابی کڑی بن جاؤ۔ پھر کافی پینے کے لیے نکلیں۔''

''یوں اچانک؟'' اس نے قدرے حیرت سے کہا۔

''ہمیں کسی کی اجازت درکار ہے کیا؟'' میں نے کہا اور اٹھ کر سٹنگ میں روم میں آ گیا۔ پھر کافی دیر بعد ہم دونوں وہاں سے نکل پڑے۔ اپارٹمنٹ سے نکل کر جب میں گاڑی الواصل روڈ پر لے آیا تو اچانک احساس ہوا کہ کنول جیت ایک عورت ہے جس کی مثال اخروٹ سے دی جاسکتی ہے۔ وہ ٹوٹے ٹوٹے گی لیکن اوپر سے جتنی مشکل ہے، اندر سے اتنی ہی آسان ہے۔ مجھے بھی جلدی نہیں تھی۔ یہ سوچتے ہوئے میں زیرلب مسکرا دیا۔ دوران سفر ہم یونہی اِدھر اُدھر کی گپ شپ لگاتے رہے۔ اسی روڈ پر خاصا آگے جا کر ایک کافی شاپ پر

کنول جیت نے گاڑی رکوائی۔ گاڑی پارک کر کے ہم اندر جا بیٹھے۔ وہاں جا کر مجھے احساس ہوا کہ یہ کافی شاپ نام ہی کی کافی شاپ تھی ورنہ وہاں سب کچھ ملتا تھا، زیادہ تر انڈین تھے۔ کافی اور اسنیکس کا آرڈر دے کر ہمیں وہاں بیٹھے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک سکھ نوجوان ہمارے قریب آ کر رک گیا اور اسے دیکھ کر کنول حیرت سے کھڑی ہو گئی۔ وہ دونوں جب اچھی طرح مل چکے تو کنول نے اسے بیٹھنے کو کہا، پھر میرا تعارف کراتے ہوئے بولی۔

''یوں سمجھ لو، میرے باس یہی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ ''یہ دلیپ سنگھ ہے، ہمارے ہی محلے میں رہتا تھا۔ آخری بار دو سال پہلے میری ملاقات ہوئی تھی اس سے، اس کی بڑی بہن میری کلاس فیلو تھی۔''

''بڑی خوشی ہوئی دلیپ، آپ سے مل کر۔'' میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا جو اس نے مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی، اور اتنی خوشی ہو رہی ہے کنول دیدی کو دیکھ کر کہ بتا نہیں سکتا۔''

''ویسے تو آیا کب سے ہے یہاں؟''

''ہمارے کہاں ٹھکانے، ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر بیٹھے ہیں، اِدھر اُدھر ہی پھرا رہے ہیں۔''

''چل ابھی تو تو کافی پی، پھر گھر چلتے ہیں، خوب باتیں ہوں گی۔''

''باتیں کیا کرنی ہے، دیدی! رونا ہی ہے نا، بیٹھ کے، مجھ میں اب ہمت نہیں۔'' دلیپ نے انتہائی دکھ سے کہا تو کنول نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں، میرے ویر! ایسی باتیں مت کر، ابھی جینا ہے۔'' اس نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''سوری، شجاع جی۔۔۔!''

''نہیں، کنول! ایسی کوئی بات نہیں۔'' پھر میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''دلیپ! یہ بڑے مزے کا اتفاق ہے۔ آج ہی پہلی دفعہ ہم کافی پینے کے لیے باہر نکلے ہیں اور تم سے ملاقات ہو گئی۔'' میں نے ماحول خوشگوار بنانے کی خاطر یونہی بات کہی۔

''میں چند دن پہلے ہی دوبئ آیا ہوں۔ میرے پاس دیدی کا ایڈریس تو نہیں تھا لیکن یہ پکا پتہ تھا کہ یہ دوبئ ہی میں ہیں۔ یہ نہ ملتیں تو میں انہیں ڈھونڈ لیتا۔''

''وہ کیسے؟'' کنول نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں ایک بڑا بھونپو لے کر ٹیکسی پر بیٹھتا اور اعلان کرتا پورے دوبئ میں پھرتا، کہیں نہ کہیں تو آپ میرا اعلان سن لیتیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر یونہی اِدھر اُدھر کی باتوں میں

کھو گئے۔ جب کافی پی چکے تو میں نے گاڑی کی چابیاں کنول کو دیتے ہوئے کہا۔

''لو، کنول! تم لوگ گاڑی رکھو، صبح ملاقات ہوگی۔''

''او نہیں، بھائی جی! میرے پاس گاڑی ہے۔'' دلیپ جلدی سے بولا۔ ''کنول دیدی میرے ساتھ جائیں گی، اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو۔۔۔''

''ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، اور ہاں کل لنچ میرے ساتھ کرنا۔'' میں نے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

''جی، ضرور، کیوں نہیں۔'' میں ان سے ہاتھ ملا کر وہاں سے نکل آیا۔

میں چابی انگلی میں گھماتا ہوا سٹنگ روم میں آیا تو حیدر سامنے بیٹھا ہوا تھا، میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بڑے خوشگوار لہجے میں بولا۔

''اب تو اکیلے گاڑی لے کر نکل پڑے ہو......؟''

''یہ آپ ہی کی کرپا ہے، مہاراج۔'' میں اس کے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔

''لگتا ہے، آرتی کے قرب کا اثر ہونے لگا ہے۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے قہقہہ مارا۔ تو میں نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

''یار! واقعی سوہنی کڑی ہے۔'' وہ میری بات سن کر بولا۔

''اوئے، شجاع! شکر ہے، تیرے رنگ ڈھنگ بھی بدلے۔''

''یار! میں نے سوچا، اتنی رنگینیاں ہیں تو کیوں نہ ان سے لطف لیا جائے۔ یونہی خشک خشک رہنے سے فائدہ، اپنی جان کیوں جلائیں؟''

''یہی چار دن تو ہیں زندگی کے، خوب مزے کرو کل کس نے دیکھی۔'' حیدر نے لاپرواہی سے کہا تو میں نے پوچھا۔

''یہ اپنی آرتی کدھر ہے؟''

''ہائے رام'' اس نے ناک پہ انگلی رکھ کر زنانہ انداز میں کہا اور پھر کھل کے ہنس دیا۔ میرا قہقہہ اس سے بھی بلند تھا۔ تبھی اچانک ہی آرتی نمودار ہوئی، مجھے دیکھتے ہی بولی۔

''آ گئے آپ؟''

''جناب! آ گئے۔'' میں نے صدقے واری ہوتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چائے لاؤں آپ کے لیے؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''ارے نہیں، آرتی! میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کافی پی ہے، ابھی دل نہیں چاہ رہا۔''

''یہ ابھی کچھ نہیں پیئے گا، کچھ دیر بعد سوئمنگ پول پر جوس پیئے گا اور تم بھی ہمارا ساتھ دو گی، کیوں؟''اس نے میری طرف دیکھ کر کہا تو میں نے رضا مندی میں کاندھے ہلا دیئے۔

''کیا ہو گیا آج میرے لعل کو جو کہوں مانتا جا رہا ہے، اڑیل ٹٹو کی طرح ضد نہیں کر رہا؟''

''وقت پڑنے پر جب تیرے جیسے بندے کو باپ بنالیا ہے تو کہاں کی ضد۔''

''اچھا، تو تو مجھے گدھا کہہ رہا ہے؟''

''کہہ کیا رہا ہوں، تم ہو ہی گدھے۔''میں نے کہا اور ٹانگیں پسار کر صوفے پر لیٹ گیا۔

اس وقت شام ہو رہی تھی جب میں، حیدر، آرتی اور دو لڑکیاں سوئمنگ پول کے کنارے تھے۔ آرتی آخر میں وہاں پہنچی تھی اور جیسے ہی اس نے گاؤن اتارا تو میں اسے باتھ کا سٹیوم میں دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ اس کا جسم ایسے سانچے میں ڈھیلا ہوا تھا کہ پہلے ایسا جسم نظر سے نہیں گزرا تھا۔ مجھے جھرجھری آ گئی۔ آرتی میری نگاہوں سے اندر کا حال جان چکی، تبھی وہ میری طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''پہلے آپ کودیں گے یا میں؟''

''دونوں۔''یہ کہتے ہوئے میں نے اسے بازو سے پکڑا اور پول میں چھلانگ لگا دی۔ میں اور آرتی دیر تک نہاتے رہے۔ متاثر ہو جانے کا لمحہ آ کے گزر چکا تھا، اب وہ میرے سامنے تھی اور اس کے خال و خد، سانپ اپنے رنگوں اور ملائمت میں بڑا خوبصورت ہوتا ہے لیکن اس کے اندر چھپا زہر انسانی زندگی ختم کر دینے کی قوت رکھتا ہے۔ یقیناً میں اس جنگل میں قدم رکھ چکا تھا جہاں ہر لمحہ کسی نہ کسی دشمن سے واسطہ پڑنے کی توقع تھی۔

اس رات ڈنر کے بعد حیدر کہیں چلا گیا۔ نہانے سے خاصی تھکن ہو گئی تھی اس لیے آنکھوں میں نیند اتر آئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ اے سی کی خنک ہوا مجھے تھپک رہی تھی کہ میرا سیل فون بج اٹھا، دوسری جانب ندیم تھا۔

''آپ نے جو کام ذمے لگایا تھا، وہ معلومات مل گئی ہیں۔''اس نے انتہائی محتاط انداز میں کہا۔

''کیسا پایا اسے؟''میں نے غنودگی میں کہا۔

''خاصا بڑا کام ہے، تفصیل دفتر میں مل جائے گی۔''اس نے گریز پا لفظوں میں کہا۔

''ٹھیک ہے، آرام کرو۔''میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اک تجسس تو بہر حال

تھا کہ وہ معلومات کیا ہوگی تاہم اس وقت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے بڑے سکون سے سو گیا۔

میں معمول کے مطابق ہی دفتر پہنچا تھا۔ روٹین کے کام نپٹانے کے بعد ندیم کو بلوایا، اس نے آتے ہی کہا۔

''شجاع بھائی! اک محل نما گھر ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ بہت مخصوص قسم کے لوگ اس کے پاس آتے جاتے ہیں، خصوصاً شام کے وقت خاصے لوگ ہوتے ہیں جنہیں وہ بھاشن دیتا ہے۔ سیکورٹی خاصی سخت ہے، خصوصی ریفرنس کے ساتھ ہی وہاں جایا جا سکتا ہے۔''

''کوئی مزید معلومات؟''

''فی الحال تو یہی ہے۔ چونکہ یہ پہلی بار سامنے آیا ہے اس لیے فوری طور پر کچھ میسر نہیں مگر جلد ہی بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

''میں چند دنوں میں اس سے ملنے والا ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ ایک آدھ دن میں ہی یہ بندوبست ہو جائے۔ یہ بات الطاف کو بتا دینا اور ہاں، ایک لڑکا دلیپ سنگھ آج کل تمہیں کنول جیت کے ساتھ نظر آئے گا، اس سے متعلق معلوم کرو۔''

''کنول جیت کے بارے میں بھی اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ بھی ان لوگوں کے لیے اک نیا پنچھی ہے جسے وہ اپنے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے میں اور آپ یہاں پر موجود ہیں۔ حیدر ہی کے ایک انڈین دوست کی وساطت سے وہ یہاں پہنچی ہے۔''

''یہ معلومات ۔۔۔؟''

''الطاف اور اس کے دوسرے ''دوست'' خاصا ہوم ورک کر چکے ہیں۔'' ندیم نے دھیرے سے کہا۔ میں مزید بات کرنا چاہتا تھا کہ ستیش آ گیا، تب بات بدل دی گئی۔

اس دوپہر میرے سامنے دلیپ سنگھ اور کنول جیت بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم اس وقت یہی سوچ رہے تھے کہ لنچ کہاں لیا جائے؟ دلیپ کا خیال یہ تھا کہ یہیں کچھ منگوا لیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت آپ کی باتوں میں گزر جائے۔ ہوٹل آنے جانے میں جو وقت ضائع ہونا تھا، وہ بچ جائے۔ جبکہ میں چاہ رہا تھا کہ دلیپ سے پہلی ملاقات ہے اس لیے اسے اچھا سا کھانا کھلانا چاہیے۔ ہم میں یہ طے نہیں ہو رہا تھا کہ کیا کریں؟ کنول اس معاملے میں بالکل الگ بیٹھی ہوئی تھی کہ اتنے میں آرتی کا فون آ گیا۔

''جی، فرمائیں؟'' میں نے انتہائی نرم لہجہ میں کہا۔

''آپ کہہ رہے تھے کہ آپ سوامی ہری داس سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''ہاں یاد آیا۔۔۔بالکل، میں نے کہا تھا '' میں نے اپنے لہجے پر قابو پا۔۔ ہوئے کہا۔

''ہم نے ان کے بارے میں معلوم کرلیا ہے اوران سے وقت بھی لے لیا ہے۔''

''بہت اچھی بات ہے، کب جانا ہے ان کے پاس؟''

''ابھی کچھ دیر بعد، شام کے وقت تو ان کے پاس مصروفیت ہی بہت ہوتی ہے۔ہم آرہے ہیں، آپ کو دفتر سے پک کرلیں گے......''

'' آرتی! ابھی تو میرے پاس مہمان بیٹھے ہیں، میں ان کے ساتھ لنچ لینے وال ہوں۔کم ازکم دو گھنٹے بعد فراغت ہوگی۔''

''پھر تو دوبارہ وقت لینا پڑے گا؟''

''اچھا تم گھر پر ہی رہو، میں تمہیں دوبار بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، کنول جلدی سے کہہ اٹھی۔

''خیریت، شجاع جی! کوئی ایمرجنسی؟''

''اُونہیں، ایک سوامی سے آرتی ملوانا چاہ رہی تھی۔ابھی کچھ دیر بعد کا اس نے وقت لے لیا ہے اوراب اصرار کررہی ہے کہ میں ابھی اس کے ساتھ چلوں، آؤ چلتے ہیں۔اس سے پھر کسی وقت مل لیں گے۔''میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو دلیپ بولا۔

''شجاع صاحب! میں آج دیدی کے پاس ہی ہوں۔آپ اطمینان سے جائیں، ڈنر آپ کے ساتھ لے لیں گے۔اس میں اتنا پرابلم کیا ہے؟''اس نے سادہ سے انداز میں کہا تو وہ مجھے اچھا لگا۔

''دلیپ، یار! کیا سوچ گے تم؟''

''سوچنا کیا ہے۔لنچ نہ سہی، ڈنر سہی اب ذرا اچھے ہوٹل میں کرلیں گے۔''اس نے ہنستے ہوئے کہا۔تو میں بھی ہنس دیا ''یہ سوامی جی کون ہیں۔ادھر دوبئی میں ہی ہیں یا۔۔۔؟ ''کنول نے پوچھا۔

''ادھر دوبئی میں ہی ہیں کوئی سوامی ہری داس۔''میں نے لاپرواہی کے سے انداز میں کہا اورآرتی کے نمبر ملانے لگا۔رابطہ ہو جانے پر میں نے اسے آجانے کو کہا اورکولڈ ڈرنگ کے ساتھ اسنیکس منگوالیے ابھی ہم کھاپی ہی رہے تھے کہ آرتی کا فون آگیا۔

''میں گراؤنڈ فلور پر ہوں، آجائیں آپ۔''

''بس میں دو منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے رسیور رکھ دیا اور اٹھ گیا۔

میں نے دلیپ سے ہاتھ ملانے کے بعد جب کنول سے ہاتھ ملایا تو میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئیں تھیں۔ مجھے لگا، اسے میرا یوں جانا اچھا نہیں لگا مگر یہ وقت کسی بھی قسم کی کوئی بات کہنے کے لیے موزوں نہیں تھا۔ اسی لمحے میں نے سوچا کہ رات ڈنر پر خوب جی بھر کے باتیں کروں گا اور ان لمحات کا ازالہ کر دوں گا۔ یہی سوچتے ہوئے میں گراؤنڈ فلور پر آ گیا۔ آرتی ایک طرف کھڑی نظر آ گئی۔ ہم دونوں چلتے ہوئے گاڑی تک آئے، ہمارے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی بڑھا دی۔

وہ ایک عالیشان رہائش گاہ تھی۔ اس کی طرز تعمیر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پر خاصی دولت خرچ کی گئی ہے۔ مین گیٹ کے عین ساتھ ایک ریسپشن بنی ہوئی تھی، گاڑی رکتے ہی آرتی اتری اور سیدھی وہاں چلی گئی۔ چند منٹ بعد ہمیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ایک بڑے سے پورچ میں گاڑی رکی، ہم دونوں اتر آئے۔ بڑے سے دروازے کے ساتھ سیکورٹی کے لوگ تھے، وہیں اسکریننگ ہوگئی اور ہم ایک عالیشان قسم کے سٹنگ روم میں جا بیٹھے۔ اس وقت وہاں پر کوئی نہیں تھا۔ اگلے چند لمحوں میں نوعمر خادمائیں نظر آنا شروع ہوگئیں۔ ہمیں وہاں بیٹھے چند منٹ ہوئے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت وہاں آئی، اسے دیکھتے ہی آرتی کھڑی ہوگئی اور ناچار مجھے بھی کھڑا ہونا پڑا۔ اس کا سر سفید لیکن جلد نوجوان لڑکیوں کی طرح تھی۔

''پدھارو، بالک۔۔!'' اس نے ایک ہاتھ بڑھاتے ہوئے نرم سے انداز میں کہا اور پھر ہمارے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہم بیٹھے تو اس نے کہا۔ ''سوامی جی کے پاس ابھی کچھ لوگ ہیں، ابھی وہ اٹھیں گے تو آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔''

''بڑی کرپا ہے، ماتا جی! آپ نے اتنی جلدی وقت لے دیا۔''

''تم نے کہا ہی کچھ اس طرح تھا کہ مجھے ایسے ہی کرنا پڑا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ تو میں چونک گیا۔ وہ عورت جس مذہب سے بھی تعلق رکھتی تھی، اپنی عمر لباس اور شاید مرتبے میں تقدس کا اظہار کر رہی تھی۔ صرف ایک لمحہ کو میں سمجھ گیا کہ وہ سب کچھ اسی لبادے سے ظاہر ہو رہا ہے، بس دکھاوا ہے اور اندر سے وہی ازلی تشنہ عورت ہی ہے کیونکہ میں نے اس کی نگاہ میں پسندیدگی کی وہی رمق دیکھ لی تھی، جو مجھے دیکھتے ہی اس طرح کی عورتوں کی آنکھوں میں اتر آتی تھی۔ وہ جو اک دباؤ یہاں کے ماحول کی وجہ سے میرے ذہن پر تھا، یکدم ہی ختم ہوگیا اور میں انتہائی پرسکون حالت میں آ گیا۔

''سوامی کب تک مل سکیں گے ہمیں؟'' میں نے براہ راست اس عورت کی آنکھوں

میں جھانکتے ہوئے پوچھا تو وہ بھی قدرے چونک گئی۔ ہوسکتا ہے، کسی نے اس سے اس انداز میں بات نہ کی ہو مگر اس کے چہرے پر کوئی ایسے آثار نہیں ابھرے جس سے مجھے یہ احساس ہو کہ اس نے برا منایا ہے۔ اس نے جذب سے میری جانب دیکھا اور دھیرے سے بولی۔

''ابھی تھوڑا سمے تو لگے گا، پھر اتنی جلدی کاہے کی ہے۔ ابھی کچھ ٹھنڈا پیئو اور شانت ہو جاؤ۔ جانو کہ یہ آشرم شانتی ہی شانتی دان کرتا ہے۔'' ادھیڑ عمر عورت شاید کچھ اور کہتی مگر اتنے میں دو خادمائیں کافی سارے لوازمات کے ساتھ آن وارد ہوئیں۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی، میں نے ابھی لنچ لیا ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''پھر بھی تھوڑا بہت، جو من چاہے جل پان کیجئے۔'' وہ عورت خمار آلود لہجے میں بولی۔ تو میں نے ٹن پیک سوڈا اٹھا لیا، آرتی نے بھی میری تقلید کی ہم نے چند چسکیاں ہی لی تھیں کہ ایک طرف کے دروازے سے ایک نوعمر جوڑا وارد ہوا۔ وہ یوں تھے جیسے انتہائی خمار آلود ہوں۔ وہ عورت ان کی طرف متوجہ ہوگئی اور پھر اٹھ کر داخلی دروازے تک چھوڑنے گئی۔ یقیناً اب ہماری باری تھی۔ میں نے پیک رکھ دیا تو وہ عورت ہمیں لے کر ایک راہداری میں آئی اور پھر ایک کمرے میں داخل ہوگئی۔ مدہم روشنی میں ایک بار تو کچھ بھی نظر نہ آیا مگر چند ہی لمحوں بعد اس بڑے سارے کمرے میں مجھے قالین کے اوپر کسی جا کی کھال پر سفید براق چادر میں ملبوس ایک کالا بھجنگ شخص بیٹھا نظر آیا۔ اس کی جسامت مریل سی تھی، سفید بال کاندھوں تک آئے ہوئے تھے اور بے تحاشا بڑھی ہوئی داڑھی مونچھیں، اسے مزید ہیبت ناک بنا رہی تھیں۔ پتلی سی ناک اور چھوٹی چھوٹی زرد آنکھیں۔ پہلی نظر میں وہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی بھٹکی روح ہو۔ گہرے میرون رنگ کے پردوں کے پس منظر میں اس کی اُوڑھی سفید چادریں آنکھوں میں لگ رہی تھیں۔ شاید کمرے میں لوبان سلگ رہا تھا یا کوئی مہک بہر حال اجنبی سی تھی۔ جس سے دماغ میں خمار سا چڑھ گیا۔ میں ابھی ماحول کو سمجھ ہی رہا تھا کہ آرتی اس شخص کے پیروں میں جا پڑی، اس نے آرتی کے بدن پر ہاتھ پھیرا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے قریب جا بیٹھا۔

''سوامی جی! یہ ہمارے دوست ہیں، ہم انہیں آپ سے ملانے لائے ہیں۔''

''کب سے دوستی ہے؟'' جسم کی نسبت اس شخص کی آواز خاصی بھاری تھی۔

''یہی، چند دن ہوئے ہیں۔'' آرتی نے قدرے دھیمی آواز میں کہا۔

''پوچھو کیا پوچھنا تھا تمہیں؟'' ہری داس نے براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تو میں بولا۔

''یہی، سوامی جی! کہ پوترتا کا آخر معیار کیا ہے؟''

''تمہارے ذہن میں یہ سوال کیسے پیدا ہوا؟''

''اسی آرتی کی وجہ سے، اس کا کہنا ہے کہ مندر یا آشرم میں ایک داسی اپنے وجود سے خدمت کرتی ہے۔ دھرم کے مطابق یہ تب بھی پوتر ہے۔ یہ تب بھی پوتر ہے جب یہ اپنے من چاہے شخص کے ساتھ وقت گزارے لیکن اس وقت اس کی پوترتا خطرے میں پڑ جاتی ہے جب کوئی اور اس کی طرف ہاتھ بڑھائے جسے یہ نہ چاہے، یہ کیسی پوترتا ہے؟''

''اصل میں تم اس سوال کو خود ہی سمجھنا نہیں چاہتے، بالک '' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رکا، پھر کہتا چلا گیا۔''کل سے جز جدا ہو جائے تو وہ جز بھی کل ہوتا ہے اور کل اپنے طور پر کل ہی رہتا ہے۔ کوئی گرو اپنی داسی سے خدمت لیتا ہے تو دونوں پوتر ہیں، جیسے کل میں کل مل جائے، پانی میں پانی مل جائے تو حاصل پانی ہی رہتا ہے اصل یہ ہے کہ من جب پوتر ہے تو سب پوتر ہے، من کی کھٹک ہی پاپ ہے۔ پوتر جسم میں اگر من پوتر ہے تو ہر عمل پوتر ہے۔''

''معاف کیجئے گا، یہ کوئی معیار نہیں ہے، نہ تو میں بحث کرنے آیا ہوں اور نہ ہی کسی مذہب کا تقابل کرنے، میں یہ فلسفہ سمجھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا

''آخر کیوں، بالک؟ '' اس نے کہا تو میں نے آرتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرے نزدیک آنا چاہتی ہے، یہ اس کا تقاضہ تھا مگر میرا من نہیں چاہا۔ کیا اس کا عمل پوتر کہلائے گا جب کہ اس کے دھرم کے انوسار یہ مجھے ہاتھ بھی لگائے تو اس کا دھرم بھرشٹ ہو سکتا ہے؟''

''یہ تم وہ باتیں کر رہے ہو جو مذہبی لوگوں نے تم تک پہنچائی ہیں، گرور جنیش جی اسی خاطر اپنا جیون تیاگ گئے۔ ہندو کی سب سے بڑی غلطی یہی رہی اور آج بھی ہے کہ وہ خود کو مہا سمجھتا ہے اور باقی سب نچلے درجے کے لوگ، انہوں نے نفرت بانٹی ہے۔ یہ سب برہمن سوچ کی پیداوار ہے۔ وہ سب کو غلام بنا لینا چاہتے ہیں پھر صرف ہندو دھرم ہی میں نہیں، سارے ہی مبلغ جو اخلاقیات کا درس دیتے ہیں، انہوں نے مذہب کو نفرت کی بنیاد بنا ڈالا۔''

''مطلب، آپ کے نزدیک مذہب نفرت پیدا کرتے ہیں؟''

''لیبل مذہب کا لگ جاتا ہے لیکن عمل تہذیبی ہوتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب میں کتنے مذہب ہیں لیکن سب تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، یوں جو مذہب مطالبہ کرتا ہے، وہ تو پورا نہ ہوا جس سے انسان زہر آلود ہو جاتا ہے۔ آسمان نے دیکھا، تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی ہجرت اسی خطے میں ہوئی، لہو رنگ ہجرت، یہ مذہب کا نہیں، تہذیب کا

ٹکراؤ تھا۔"

"سوامی جی! شاید ہم موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔"

"میں موضوع سے نہیں ہٹ رہا بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ قوت جو انسانیت کی بقا کے لیے ضروری ہے، کیا ہم اسے پہچانتے ہیں؟ وہ ہے، محبت، یہ کہیں باہر نہیں پڑی ہوئی، ہمارے اندر موجود ہے۔ ضرورت ہے اسے باہر لانے کی، جب یہ آئے گی تو ہی ایک انسان دوسرے انسان کے قریب آئے گا۔ دل تک پہنچنے کا راستہ محبت ہے۔ اور یہی وہ قوت ہے جو انسان کے اندر کے زہر کو ختم کر سکتی ہے۔ اب دیکھو، آرتی نے تم سے قریب ہونا چاہا تو اس کے من میں کوئی دھرم، کوئی زہر، کوئی نفرت، کوئی تعصب نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو وہ محبت تھی۔ جو وہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔"

"یہ ایک الگ موضوع ہے، ہم اس پر پھر کسی وقت بات کریں گے، میں کہنا یہ چاہ رہا ہوں کہ جب من دھل جائے اور کوئی میل نہ رہے تو کیا وہ پوترتا نہیں ہوگی؟ یقیناً وہاں پوترتا ہے۔" اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ یہ جنس کی حمایت میں دلیلوں کے ڈھیر لگائے گا، سو کہا۔

"خیر، میرے سوال کا جواب آپ نے دے دیا۔ اب اجازت چاہوں گا۔"

"لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے من کے شیشے سے میل اب بھی نہیں اترا، تم مطمئن نہیں ہوئے؟"

"سوامی جی! میں کوئی پہلی یا آخری بار تو آپ کے پاس نہیں آیا، میں آؤں گا، بار بار آؤں گا جب تک میں مطمئن نہ ہو جاؤں۔"

"ہمیں خوشی ہوگی۔ تمہارا جب جی چاہے، یہاں آ جانا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک خاص بات سے نکتہ اٹھایا اور بھاشن دینے لگا۔ اس کی باتیں جذبات کو بھڑکانے اور ہیجان پیدا کرنے والی تھیں۔ جس میں جنس کی حمایت میں کئی طرح کی دلیلیں تھیں جب کہ میرا دماغ اس کی پہلی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے پوچھوں، کیا یہ حقیقت ہے کہ مذہب ہی محبت کی راہ میں رکاوٹ ہے، کیا جنس ہی انسانی ضرورت ہے؟ میں سمجھ گیا کہ جس طرح ہندو دھرم کی اپنی کوئی بنیاد نہیں، بالکل اسی طرح اس سوامی کے خیالات کی بھی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ بحث یا مباحثہ بالکل ہی فضول تھا۔ آرتی بہر حال خوش تھی کہ اسے پوترتا کا جواز میرے سامنے مل گیا ہے۔ کافی دیر بعد اس کا بھاشن ختم ہوا تو ہمیں اجازت ملی۔ آرتی اس وقت سوامی جی کے خیالوں سے مخمور ہو رہی تھی جبکہ میرے اندر غصے کی ہلکی ہلکی لہر اٹھ رہی تھی جسے میں نے مصلحت وقت کے تحت دبا لیا۔ وہاں سے نکلے تو وہی ادھیڑ عمر خاتون سامنے آ گئی، اس نے

آرتی کو گلے لگالیا اور پھر میرے گلے پر انگلیوں کی پور رکھ کر بولی۔
"میں تمہارا انتظار کروں گی تا کہ تمہیں پھر سے خوش آمدید کہہ سکوں۔" اس بار اس نے انگریزی میں کہا لیکن جیسے ہی اپنی انگلیاں میری گردن سے ہٹائیں۔ میرے بدن میں عجیب سی سرسراہٹ دوڑ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کیا فن ہے؟ وہ شاید میرے چہرے پر کوئی ردعمل دیکھنا چاہتی تھی، کوئی ایسا تاثر نہ پا کر اسے مایوسی ہوئی۔ ہم وہاں سے آگئے۔ واپسی پر اچانک آرتی نے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"کیسا پایا آپ نے سوامی جی کو؟"
"آرتی! یہ ان کے اپنے خیالات ہیں، ضروری نہیں کہ ہر شخص اس سے متفق ہو۔" میں نے کہا۔
"مگر پھر بھی اپنے دھرم کے انوسار تو انہوں نے جو کہا، ٹھیک کہا۔" آرتی دھیرے سے بولی۔
"میں کب کہتا ہوں کہ غلط کہا، مگر یہ الگ سی بحث ہے۔" میں نے پیار سے اس کے سر پر تھپکی لگاتے ہوئے کہا تو وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ تبھی میں نے ڈرائیور سے کہا۔
"یار! مجھے دفتر ڈراپ کر دینا۔"
"نہیں، بالکل نہیں، سیدھے گھر چلو۔"
"ابھی گھر جا کے کیا کرنا ہے، مجھے دفتر میں کام ہے۔"
"ہوتے رہیں گے کام اور جا کے کیا کرنا ہے، میں وہیں جا کر بتاؤں گی۔" وہ بولی تو میں نے سوچتے ہوئے کہا۔
"لیکن آج کی شام میری کنول جیت کے ساتھ طے ہے، تب اس طرح ضدمت کرنا۔"
"چلیں، نہیں کرتی۔" اس نے کہا اور اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا۔
شام ڈھلے تک میں گھر میں ہی رہا، مجھے معلوم تھا کہ آرتی محض یونہی گھر لے جا رہی ہے۔ اس نے سوائے باتوں کے اور کچھ نہیں کیا، بس ایک بار حریدار قسم کی چائے پلائی تھی۔ میں نے فریش ہو کر کنول جیت کو فون کیا۔ وہ اپارٹمنٹ میں ہی تھی، فون ندیم نے اٹھایا تھا۔
"خیریت سے ہیں آپ؟" کنول نے ہیلو کی بجائے یہ فقرہ کہا۔
"میں بالکل ٹھیک، تم ٹھیک ہو؟" میں نے پوچھا۔
"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔
"دلیپ کہاں ہے، کیا پروگرام ہے، کس ہوٹل جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

’’وہ اپنے فلیٹ گیا ہے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ اپنا پروگرام بتانے لگی۔

’’چلو ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں تمہیں پک کرنے، دلیپ سے کہو، وہ وہیں آ جائے۔

‘‘میں نے طے کیا اور فون بند کر دیا۔

میں کنول کے اپارٹمنٹ پہنچا تو وہ میرے انتظار میں تھی۔ وہ میرے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

’’شجاع جی! میں آپ سے ایک بات کہنا چاہوں گی۔‘‘

’’کہو۔‘‘ میں نے عام سے انداز میں کہتے ہوئے گیئر لگا دیا۔

’’یہ کہتے ہوئے مجھے اپنا بہت کچھ داؤ پر لگانا پڑے گا، کیا آپ میرا خیال رکھ سکیں گے؟‘‘ اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ کوئی اہم معاملہ ہے، اس لیے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’کنول! میں نہیں کہتا کہ میں بہت مہان ہوں لیکن اتنا تو کر سکتا ہوں کہ دوسروں کا مان رکھ لوں۔ اگر تم مجھ پر اعتبار کر رہی ہو تو میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔‘‘

’’تو پھر جان لیں، شجاع! آپ ایک بہت بڑے جال میں پھنس رہے ہیں اور یہ ایسا جال ہے جس سے کوئی نکل نہیں سکتا۔‘‘

’’مطلب؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’آرتی! آپ کو جس راہ پر لے کر چلی ہے، وہ اندھی کھائی کی طرف جاتی ہے۔‘‘

’’تمہارا مطلب سوامی ہری داس یا آرتی؟‘‘

’’سوامی ہری داس ایک بہت بڑا زہر پھیلانے والا منصوبہ لے کر آیا ہے، انسانیت کو قتل کر دینے والا زہر۔۔۔‘‘ کنول نے انتہائی زہر آلود لہجے میں کہا تو میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کنول میری جانب سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ تنا ہوا تھا، میں اس کی حالت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ مجھے بالکل بے خبر سمجھتے ہوئے باخبر کرنے کے لیے بہت بڑا رسک لے چکی تھی۔ کنول جیت کے اس عمل کے پیچھے دو باتیں ہی ہو سکتی تھیں۔ اگر وہ ان لوگوں میں سے تھی جو حیدر شیخ کو اپنی راہ پر لا چکے تھے تو یقیناً انہیں مجھ پر شک ہو گیا تھا اور اپنی تسلی کے لیے کنول کے ذریعے ہمدردی کی آڑ میں کوئی نئی چال چل رہے تھے۔ مقصد تو واضح تھا کہ وہ مجھے ہر صورت میں اپنی راہ پر لا کر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ میں اگر ان کی خواہش کے مطابق سر خم کر دیتا تو ٹھیک تھا ورنہ وہ اپنی توانائی مجھ پر کیوں ضائع کرنے لگے۔ ایسی صورت

میں یا تو مجھے واپس پہنچ جانا تھا، بصورت دیگر یہیں کہیں موت میری منتظر تھی لیکن اگر کنول جیت مخالفین کے گروہ میں سے تھی تو اتنا بڑا رسک لینا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ میرے ذہن میں کیا ہے، میں کس نہج پر سوچ رہا ہوں اور مستقبل میں میرے ارادے کیا ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ میں حیدر شیخ کے نیٹ ورک میں شامل ہوں، ایسے میں کنول جیت کے دن پورے ہونے کا پورا یقین تھا۔ آخر اس نے اتنا بڑا رسک کس بل بوتے پر لیا اور وہ مجھے ہی اس منصوبے سے کیوں آگاہ کر دینا چاہتی ہے؟ اسی ایک لمحے نے جیسے میرے ذہن میں برقی رو دوڑا دی۔ میں نے اپنی سوچوں کو سمیٹا اور توجہ سڑک پر لگا دی، پھر چند لمحوں بعد میں نے پوچھا۔

''یہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، کیا اسے سمجھ بھی رہی ہو؟''

''بالکل، میں سمجھ بھی رہی ہوں اور آپ کو سمجھانا بھی چاہتی ہوں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اسے سنجیدگی سے لیتے ہیں یا نہیں؟'' اس نے اعتماد سے کہا تو مجھے لگا جیسے وہ اپنے بکھرے ہوئے خیالات پر قابو پا چکی ہے۔

''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے ایسا کیوں کہا لیکن یہ سوال ضرور کروں گا کہ مجھ سے ہمدردی کی وجہ؟''

''کہنے کو تو میں بہت سارا جھوٹ کہہ سکتی ہوں مگر میرا اپنا یقین ہے کہ جہاں تعلق میں پاکیزگی ہو، وہاں پر کچھ بھی غلط نہیں ہونا چاہئے لہٰذا ابھی میں اس بارے کچھ بھی نہیں کہہ سکی اور پھر میں نے بھی آپ سے کچھ بھی نہیں کہا، محض آپ کو خبردار کیا ہے۔'' اس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کنول! جس ماحول میں ہم رہ رہے ہیں، اس میں ایسی باتیں تو زندگی سے ہاتھ دھونے کے مترادف ہوتی ہیں۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''یہ تمہاری مہربانی ہے اور تمہارا اچھاپن ہے کہ تم نے میرے لیے ہمدردی محسوس کی لیکن۔۔۔''

''میں اپنے ضمیر سے مطمئن ہوں، شجاع جی! رہی زندگی، تو پہلے ہم کون سا جی رہی ہیں؟'' اس کے لہجے میں نفرت ابل رہی تھی، تبھی میں نے جانا کہ یہ بحث طویل ہو سکتی ہے جو سراسر وقت ضائع کر دینے والی بات تھی اس لیے میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''چلو چھوڑو ان باتوں کو، تم ہری داس کے منصوبے کا ذکر کر رہی تھیں؟'' میں نے کہا تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی پھر اطمینان سے بولی۔

''یقیناً آپ یہ منصوبہ تفصیل سے جاننا چاہیں گے؟''

''یہ تو ہے، کنول جیت!'' میں نے پر مسرت لہجے میں کہا۔

''تو اس کے لیے بس وہاں پہنچنا ہے جہاں دلیپ سنگھ ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔'' وہ بولی۔

''مطلب، دلیپ بھی؟'' میں نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

''پوری تفصیل کے ساتھ آپ کے ہر سوال کا جواب دیا جائے گا۔'' اس نے قدرے شوخی سے کہا اور سیٹ کی پشت کے ساتھ اپنا سر لگا دیا۔ میرے ذہن میں لاتعداد سوال ابھر آئے مگر کسی کا جواب بھی ان لمحوں میں میسر نہیں تھا۔ یہ راز کیا ہے؟ یہ کچھ وقت بعد کھلنے والا تھا سو میں نے پوری توجہ ڈرائیونگ پر مبذول کر دی۔

خالد بن الولید روڈ پر ایک انڈین ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تو چند لمحوں بعد دلیپ سنگھ نظر آ گیا۔ وہ ہمارا منتظر تھا، اسی لیے وہ دروازے کی سیدھ میں بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں ملتے ہی اس نے ہاتھ ملایا۔ وہ قدرے گوشے میں دھری ہوئی میز پر بیٹھا تھا۔ ہمارے قریب پہنچتے ہی وہ کھڑا ہو گیا، نہایت گرم جوشی سے یوں ہاتھ ہلایا جیسے ہم پہلی بار مل رہے ہوں۔

''دلیپ! زیادہ بوریت تو نہیں ہوئی؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''نہیں، بس ابھی پانچ منٹ پہلے ہی پہنچا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میرے سامنے والی نشست پر بیٹھ گیا۔ کنول جیت میرے دائیں طرف کرسی سنبھال چکی تھی۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ ویٹر آرڈر لینے کے لیے آ گیا، تب میں نے کنول جیت سے کہا۔

''یہ شعبہ تمہارا ہے۔ جو سمجھ میں آئے، منگوا لو۔''

''جی، بہت اچھا۔'' اس نے مینو کارڈ سنبھالتے ہوئے کہا اور آرڈر دینے لگی، ویٹر چلا گیا تو اچانک دلیپ سنگھ نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔

''آپ کو پتہ ہے کہ میں کیا کام کرتا ہوں؟'' اس نے پوچھا تو مجھے احساس ہوا کہ اب تک مجھے معلوم نہیں کہ وہ کام کیا کرتا ہے۔ میں نے نفی میں گردن ہلائی تو وہ ہنس دیا، پھر بولا۔ ''بنیادی طور پر میں فارماسسٹ ہوں اور میں نے اس کی تعلیم کینیڈا سے حاصل کی ہے۔ فارماسسٹ، یعنی ادویات کی جانچ پڑتال کرنے والا۔''

''یہاں بھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، میں نے اپنی کمپنی سے طویل چھٹی لی ہوئی ہے اور اب یہاں ایک دوسری دوائیوں کی کمپنی میں کام کرتا ہوں۔

”یہ سب کیوں؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”یہ میں آپ کو بعد میں بتاتا ہوں لیکن پہلے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ دوائیوں کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہیں؟“ وہ میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”مثلاً کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی کہ ان کے سائیڈ ایفکٹ وغیرہ ہوتے ہیں؟“ اس نے کہا۔

”بالکل، یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے۔“ میں نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

”یعنی مقبول عام طریقہ علاج ایلو پیتھک میں ایسا ہوتا ہے، ہر شخص جانتا ہے۔ اس کے علاوہ ہومیو پیتھک طریقہ علاج بھی ہے اور ”ہربل ادویات“ ہیں جنہیں ہم لوگ دیسی یا یونانی طریقہ علاج بھی کہتے ہیں، دنیا بھر میں اور خصوصاً برصغیر میں ایلو پیتھک ادویات آنے سے پہلے اسی طریقہ دیسی یا یونانی طریقہ علاج پر بھروسہ کیا جاتا تھا اور اب بھی اسے قبولیت عام حاصل ہے۔ اس طریقہ علاج کے بارے میں عمومی تاثر یہ نہیں ہے کہ اس کی سائیڈ ایفکٹ بھی ہوں گے لیکن اس کے بھی ضمنی اثرات ہوتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ذرا سا رکا، میں خاموش رہا تو وہ کہتا چلا گیا۔ ”بظاہر ایک دوائی جو کسی خاص بیماری کے لیے بنائی جاتی ہے، اس کی دیگر نتائج بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جلد سامنے آجائیں یا قدرے دیر سے، سوامی ہری داس بنیادی طور پر ایک سنیاسی ہے اور آپ کو پتہ ہوگا کہ بھارت میں یہ سنیاسی لوگ کیسی کیسی عجیب وغریب قسم کی دوائیاں تیار کرتے ہیں۔ ہری داس کا سنیاس کوئی معمولی نوعیت کا نہیں۔ جنگلوں، بیابانوں کی خاک چھاننے کے بعد اور اپنے گرو کی سیوا سے دوائیوں کے بارے میں اسے جو معلومات ملی ہیں، وہ اپنی جگہ کمال کی ہیں لیکن اس کے علاوہ وہ کچھ ایسی صلاحیتوں کا مالک بھی بن گیا ہے جسے عام لوگ چمتکار سمجھتے ہیں۔“

”دلیپ! ہری داس کی تعریف بعد میں کرنا، پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اس کا منصوبہ کیا ہے؟“

”وہی بتا رہا ہوں نا!“ یہ کہتے ہوئے وہ قدرے مسکرا دیا۔ ”وہ ایک ایسی دوا بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے جو اس کے زہریلے منصوبے میں موثر ہتھیار کے طور پر کام دینے والی ہے۔ بظاہر وہ دوائی عام قسم کی اعصاب کو طاقت دینے والی دوا ہے لیکن اصل میں وہ انسانی بدن میں ان جگہوں پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے جنسی خواہش تیز تر ہو کر شدت اختیار کر لے۔ وہ اس دوا کو پوری دنیا میں پھیلا دینا چاہتے ہیں لیکن فی الوقت ان کا ہدف دوبئی اور پاکستان ہے۔“

''وہ شاید ہی ایسا کر سکیں۔'' میں نے تحمل سے کہا۔ ''ہر ملک میں دوائیاں چیک کرنے کے لیے لیبارٹریاں موجود ہیں۔''

'یہ اس کا چمتکار ہے، یہی اس کے سنیاس کی حکمت ہے۔ وہ ایسی دوائی تیار کر چکا ہے اور اسے مختلف لوگوں پر آزما کر اس کے نتائج دیکھ رہا ہے۔ میں نے خود اس دوا کا تجزیہ کیا ہے۔ اگر میرے ذہن میں یہ ہوتا کہ اصل میں یہ دوا کس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے تو میں کبھی بھی اس تک نہ پہنچ پاتا۔ میرے سینئرز نے بھی اس کے ٹسٹ لیے ہیں، نتیجہ وہی کہ اعصاب کو طاقت دینے والے نسخے سے بات آگے نہیں بڑھی لیکن جب اس کا عملی مشاہدہ کیا گیا تو اس کے نتائج وہی نکلے جو میں بتا چکا ہوں۔ اعصاب کو سکون ضرور ملتا ہے، بندہ خود کو پہلے سے بہت بہتر بھی محسوس کرتا ہے لیکن کچھ وقت بعد جنسی خواہش شدت سے کرتا ہے۔''

''دلیپ سنگھ! کیا واقعی ایسا ہو چکا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''جی، شجاع جی! ایسا ہو چکا ہے اور یوں جانیں کہ تمام تجربات کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں رہ گئی ،اب ویاگرا تو دل کے مریضوں کے لئے بنا تھا، استعمال کہاں ہو رہا ہے۔ ہری داس کی اس دوا کو اب تو بس اسے خوبصورت پیکنگ دے کر مارکیٹ میں لانا باقی رہ گیا ہے۔ اب یہ پتہ نہیں کہ وہ اس دوائی کو یہاں دوبئی سے لانچ کریں گے یا بھارت سے امپورٹ کریں گے، دوائیوں کی نئی کمپنی متعارف کروائیں گے یا کسی مشہور معروف کمپنی کا سہارا لیں گے۔ بہر حال جو بھی ہوگا، آپ ذرا یہ تصور کریں کہ جب یہ دوائی عام ہاتھ میں پہنچے گی تو کیا نتائج سامنے آئیں گے؟''

''بہت بھیانک۔۔۔'' میں نے مستقبل کا تصور کرتے ہوئے کہا، پھر۔ ''دلیپ! کیا اور بھی ایسا دوائیاں مارکیٹ میں ہیں؟''

''ہیں، مگر اتنی شدید نوعیت کے نتائج والی نہیں اور وہ زیادہ تر دوائیوں کے روپ میں بھی نہیں، آرائش حسن اور ایسی ہی دیگر چیزوں میں ہیں۔ وہ اپنے عمل میں اتنی اثر انگیز نہیں رکھتیں، اس لیے ان کا احساس نہیں ہوتا۔'' دلیپ نے کہا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ ایک افسردہ سی خاموشی جس نے ماحول کو آرزدہ کر دیا۔ دنیا میں کئی مافیا سرگرم ہیں جن میں ڈرگ مافیا بھی پوری قوت اور شدت سے انسانیت کے لیے زہر پھیلا رہا ہے۔ جہاں زندگی بچانے کے لیے ادویات تیار ہو رہی ہیں، وہاں زندگی کے خاتمے کے لیے بھی ڈرگز بنائی جا رہی ہیں۔ ''یابا'' نامی ڈرگ جو تھائی لینڈ اور اس کے گرد و نواع کے ممالک میں تیزی سے پھیل رہی ہے، وہ بھی تو بظاہر دوائی ہے لیکن نشہ کی ایک نئی قسم کے طور پر مقبول ہو رہی ہے۔ مارفیا کا انجکشن

بھی تو دوائی ہی ہے لیکن اس کا غلط استعمال انسان کو زندہ درگور کر دیتا ہے۔ ممنوعہ ادویات کے بارے میں آئے روز سنا اور پڑھا جارہا ہے۔ ایسے حالات میں ہری داس کا یہ ''کارنامہ'' نہ تو غیر معمولی نوعیت کا تھا اور نہ ہی حیرت زدہ کر دینے والا کہ انسانیت دشمن لوگ کیا نہیں کرتے۔ اچھی بھلی دوائیاں تو رہیں ایک طرف، جعلی دوئیاں انسانی رگوں؟ میں اتاری جارہی ہیں۔ ایسی دوائیاں جو ایکسپائر ہو چکی ہوتی ہیں، انہیں مارکیٹ میں لاکر مریضوں کو دیا جاتا ہے۔''

''کہاں کھو گئے آپ؟'' کنول جیت نے پوچھا تو میں اپنے حواسوں میں آ گیا۔ تب میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے دلیپ سنگھ سے پوچھا۔

''یہ سب تمہیں کیسے پتہ چلا، کس طرح تم نے دوائی تک رسائی حاصل کی۔''

''میں بتاتی ہوں۔'' کنول جیت نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر کرب پھیلا ہوا تھا۔ اس نے سوچتی ہوئی نگاہیں مجھ پر ڈالیں اور پھر کہتی چلی گئی۔ جسے میں نے بہت غور سے سنا تھا۔

ان دنوں کنول جیت کالج میں پڑھتی تھی۔ وہ جوانی کی پر بہار وادی میں قدم رکھ چکی تھی۔ اس کے اردگرد خوشیاں تھیں، زندگی تھی اور قہقہے تھے۔ وقت بڑے پرسکون انداز میں گزر رہا تھا۔ وہ چار بہن بھائی تھے۔ ایک اس سے بڑا، ایک چھوٹی بہن اور پھر بھائی۔ اس کا بڑا بھائی امرتسر میں جاب کرتا تھا اور خالصتان تحریک کا زبردست حامی تھا، یہی جرم تھا جو اس کی زندگی کے خاتمے کا باعث بنا۔ وہ ان دنوں امرتسر سے ہوشیار پور آیا ہوا تھا۔ کنول جیت جب کالج سے واپس آئی تو گھر میں ماں سمیت تینوں بھائی بہن قتل کیے جا چکے تھے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کے لاشے لہو سے تر دیکھے تھے۔ وہ بھیانک منظر وہ برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو گئی۔ بظاہر قتل کی وجہ ڈکیتی ہی تھی لیکن چند دنوں بعد ہی اسے اور اس کے باپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ خالصتان تحریک کے حمایت کرنے کی سزا ہے۔ پھر وہ باپ بیٹی ہوشیار پور میں نہیں رہ سکے، دہلی آگئے جہاں اس نے اپنی زندگی کا آغاز نئے سرے سے کرنا چاہا اور اس میں وہ کامیاب بھی ہو گئی۔ اس نے اپنی زندگی کا یہ مقصد بنا لیا کہ جب بھی اس نے اتنی طاقت حاصل کر لی کہ اپنے ان دیکھے دشمنوں سے انتقام لے سکے تو ضرور لے گی۔ دہلی جو اس کے لیے دیار غیر ہی تھا، وہاں سیٹ ہو جانے میں ان لوگوں نے بھرپور ساتھ دیا جو خالصتان تحریک کے پر جوش جیالے تھے۔ کنول جیت نے بہت محنت کی، صرف دو سالوں میں وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی لیکن اس دوران اس کے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ وہ تحریک کے ان لوگوں سے وابستہ رہی تھی جو پوری جان سے اس تحریک کو انتہائی درندگی سے کچلا گیا تھا۔ اس درندگی میں

وسعت آئی تو وہ لوگ جو خالصتانی تحریک سے وابستہ تھے، دوسرے ملکوں کا رخ کرنے لگے۔ اس طرح انہیں دو فائدے ہوئے۔ ایک تو انہیں پناہ مل گئی، دوسرا وہ اپنی تحریک کو زیادہ مضبوط بنانے کے لیے ملکی سطح پر آ گئے۔ اس تحریک کی آبیاری میں جہاں مذہبی جذبات کی شدت کارفرما تھی، وہاں مادی وسائل کی دستیابی میں رکاوٹیں ختم ہونے لگیں۔ وہ بھی انہی لوگوں کے کہنے پر دوبئی آ گئی، سارا بندوبست ان لوگوں ہی نے کیا تھا۔ اب اس نے اپنا آپ تحریک کے لیے وقف کر دیا ہوا تھا۔ اس نے انتہائی اختصار سے کہا اور پانی سے لبالب گلاس اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا، چند گھونٹ لینے کے بعد اس نے گلاس رکھ دیا اور بولی۔

''میں نے یہاں آ کر قدرے سکون محسوس کیا۔ مجھے ایک ایسے ہوٹل میں ملازمت مل گئی جہاں بھارتی سفارتی وفد ٹھہرتے تھے۔ میں اپنی جاب کے ساتھ تحریک کے لیے بھی کام کرتی رہی۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ کسی کو شک تک نہ ہو۔ انہی دنوں میری زندگی میں جسویر سنگھ نامی شخص آیا۔ وہ اکثر اسی ہوٹل میں ٹھہرا کرتا تھا۔ بظاہر وہ کھیلوں کے سامان کا تاجر تھا لیکن اصل میں وہ ''را'' کا بہترین ایجنٹ تھا۔ یہ مجھے اتفاق سے ہی معلوم ہوا تھا۔ اس روز اس نے بے تحاشا پی ہوئی تھی اور اول فول بک رہا تھا۔ اس نے اپنے منہ سے یہ بات کبھی نہیں بتائی لیکن میں نے بعد میں تصدیق کر لی۔ مجھے اس میں دلچسپی ہو گئی لیکن میں نے اپنا آپ بچائے رکھا۔ ایک دن میں اس کے پاس گئی تو خاصی تھکی ہوئی تھی۔ اس نے اعصاب کو طاقت دینے اور پرسکون ہو جانے کے لیے ایک معجون قسم کی دوا کھلائی اور واقعی کچھ دیر بعد میں پرسکون ہو گئی جیسے کبھی تھکاوٹ ہوئی نہ تھی۔ اس نے وہ دوا مجھے دے دی، میں نے اس سے خاصا سکون محسوس کیا لیکن چند دن بعد میں خود اسے تلاش کرتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گئی۔ چند لمحوں میں اس نے خود پر قابو پایا اور پھر بولی۔ ''جسویر ہی سے مجھے اس دوا کا چمتکار بارے معلوم ہوا۔''

''کیا تمہیں سوامی ہری داس سے متعلق معلوم تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ہم کئی بار وہاں گئے تھے۔ جسویر نے مجھ سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا اور وہ اس میں مخلص بھی دکھائی دیتا تھا مگر وہ یکدم غائب ہو گیا، بعد میں پتہ چلا کہ اسے بھارت جانا پڑا یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا۔ میں جو اپنے حواسوں میں نہ رہی تھی، آہستہ آہستہ اس پاگل پن سے باہر آنے لگی اور پھر میرے دوستوں نے مجھے سنبھال لیا۔'' کنول جیت کہہ چکی تو دلیپ سنگھ دھیرے سے بولا۔

''میں کنول دیدی سے بہت چھوٹا ہوں۔ ہم انہی کے محلے میں رہتے تھے بلکہ میں

انہی کے آنگن میں کھیلا ہوں۔ میرے پریوار کو بھی یہی سزا ملی۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کون یہ سب کرتا رہا اور کن کے کہنے پر یہ سب درندگی ہوتی رہی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خیر، میں دہلی میں ہی پڑھتا تھا۔ اس لیے بچ گیا۔ میرا دیدی سے رابطہ تھا۔ ان کے دوبئی آنے سے پہلے ہی میں کینیڈا چلا گیا۔ پھر ہماری ملاقات تو نہ ہوئی لیکن رابطہ رہا۔ ان کے ساتھ جو سانحہ ہوا، مجھے معلوم ہو گیا۔ میں نے وہ دوا کینیڈا منگوائی۔ ان کی کیفیات کے بارے میں جان کر کچھ دوائیں بھجوائیں جس سے یہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئیں اور اس دوائی کے اثرات بھی زائل ہو گئے۔ یہ بھارت واپس جانا چاہ رہی تھیں لیکن وہاں کون تھا؟ میں نے تحریک کے ساتھیوں کی مدد سے انہیں یہیں روکے رکھا۔''

''میری احتیاط ہی میرے کام آئی۔ تحریکی ساتھیوں سے رابطے کا کسی کو گمان تک نہیں تھا لیکن جسویر سے تعلقات، ہری داس کے ہاں آنا جانا اور دوسرے لوگوں سے ملاقات کے باعث میں آسانی سے ان کے نیٹ ورک میں آ گئی۔ جسویر پہلے بھی میری لاعلمی میں مجھے ''را'' کے لیے استعمال کرتا رہا تھا سو میں ان لوگوں کی نظروں میں تھی۔ مجھے سعد الموطاوی کے ہوٹل میں جاب کی آفر ہوئی اور پھر حیدر شیخ کے ساتھ کام کرنے کو کہا گیا۔'' کنول جیت نے مزید تفصیل بتائی تو دلیپ بولا۔

''مجھے دو ہفتے ہو گئے ہیں یہاں آئے ہوئے۔ دیدی سے میرا فون پر رابطہ رہا، احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں ان سے نہ ملوں سو نہیں ملا۔ اس دن دیدی نے مجھے فون کیا تو باتوں باتوں میں بتایا کہ یہ آپ کے ساتھ کافی پینے جا رہی ہیں، یوں ملاقات ہو گئی۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے رکا، پھر گہری سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ ''اب رہی یہ بات کہ ہم نے یہ سب کچھ آپ ہی سے کیوں کہا؟ معاف کیجیے گا، شجاع جی! ہمیں معلوم نہیں کہ آپ کون ہیں اور آپ کا پس منظر کیا ہے۔ میں یہاں اسی امکان کا جائزہ لینے آیا تھا کہ ہری داس کے منصوبے کو کس طرح غارت کیا جائے لیکن مجھے روک دیا گیا۔ میرے تحریکی دوستوں نے بتایا کہ اس پر کام ہو رہا ہے اور یوں آپ سے متعارف ہوئے۔ مجھے نہیں پتہ کہ کس کا، کس سے کیا رابطہ ہے مگر مجھے یہی کہا گیا ہے کہ یہ ساری صورت حال آپ کو بتا دوں۔ اسے آپ کیسے کریں گے، ہمیں یہ بھی نہیں معلوم لیکن سب آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔'' اس نے یہ سب گہری سنجیدگی سے کہا تھا۔ میں نے اس تناؤ کو ختم کرنے کے لیے خوشگوار لہجے میں کنول جیت سے کہا۔

''تم نے مجھے احساس ہی نہیں ہونے دیا؟''

''آپ مجھ سے جیسی چاہیں قسم لے لیں، مجھے تین دن پہلے تک آپ کے بارے

میں قطعاً علم نہیں تھا۔ میں آپ کو اسی نیٹ ورک کا ایک حصہ سمجھتی رہی لیکن نجانے کیوں میرا من آپ ہی کی طرف کھینچا چلا جاتا تھا اور مجھے آپ کا احترام کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ میں باوجود آپ کو دشمن سمجھتے ہوئے آپ کا احترام کرتی رہی اور ہوسکتا ہے، یہ سلسلہ کچھ دن اور چلتا مگر آرتی ضرورت سے زیادہ اپنا فرض ادا کررہی ہے۔ اس کی تیزی سے ہی ہمیں وقت سے پہلے سب کچھ بتا دینے پر مجبور کردیا ورنہ یہی معلومات آپ کو کسی اور انداز سے معلوم ہوتیں۔"

میں دلیپ سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ اگر وہ ہری داس کے منصوبے کو غارت کرتے تو کس طرح کرتے لیکن ویٹر کھانا لے کر آگیا۔ میں خاموش رہا، وہ کھانا رکھ کے چلا گیا تو میں نے کہا۔

"دیکھو بھئی، اس وقت رزق سامنے آگیا ہے۔ سب کچھ چھوڑو اور اطمینان سے کھاؤ۔ پھر باتیں ہوتی رہیں گی۔" میرے یوں کہنے پر کشیدہ ماحول قدرے خوشگوار ہوگیا۔ ان دونوں کے چہروں پر مسکان سجی تو مجھے لگا کہ میں ایک دم ہلکا پھلکا ہوگیا ہوں۔ ایک دوسرے کی دلچسپیاں، چھوٹی چھوٹی، پسند و ناپسند جیسی ہلکی پھلکی باتوں کے خوشگوار ماحول میں کھانا ختم ہوا۔ میری کوشش تھی کہ دوبارہ تلخ یادیں نہ دہرائی جائیں، اس لیے میں نے دلیپ سنگھ سے پوچھا۔

"یار! مجھے بتاؤ، یہ ہری داس اینڈ کمپنی اس منصوبے سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں، اصل میں ان کا مقصد کیا ہوسکتا ہے؟"

"ایک سیدھی سی بات جو بالکل سامنے کی ہے، یہی ہوسکتی ہے کہ یہ لوگ دولت کمانا چاہتے ہیں۔ اس پراجیکٹ کی کامیابی کے لیے مضبوط نیٹ ورک اور زبردست پشت پناہی کی ضرورت ہے اور وہ ہری داس کو حاصل ہے۔ اس کا ایک بدنام تنظیم سے گٹھ جوڑ بھی معمولی نوعیت کا نہیں ہوسکتا، یقیناً یہ ایک گہری سازش ہے۔ یہ سازش وہ کس مفاد کے لیے کر رہے ہیں، یہی نکتہ تلاش کرنا ہی دراصل اس کے خلاف کسی کاروائی کی بنیاد بن سکتا ہے۔"

"یہ سب کچھ اتنا مشکل نہیں ہے۔" کنول جیت نے جلدی سے کہا۔

"یہ سب معلوم ہو جانا عین ممکن ہے، ذرا سی محنت سے وہ لوگ بھی بے نقاب ہو جائیں گے جو اس سازش میں شریک ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ لوگ بہت زیادہ مضبوط ہیں، اسی لیے تو وہ اتنی دیدہ دلیری سے اپنا کام کرتے چلے جارہے ہیں اور ہم ان کے سامنے آنہیں سکتے۔" دلیپ نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، پیارے! اگر ان بے ضمیروں کی غارت

گری لکھی ہوئی ہے تو ایسا ہو کر رہے گا، تم گھبراؤ نہیں۔'' میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہی تو میں آپ سے کہنے والا تھا کہ ہم سب تو تماشائی ہو کر رہ گئے ہیں۔ اکھاڑے میں آپ اتر چکے ہیں۔ دیکھیں، اب نتیجہ کیا نکلتا ہے؟'' وہ قدرے مسکراتے ہوئے بولا۔

''رب سوہنا اچھا ہی کرے گا، یار!'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا وہ یکدم ہی سنجیدہ ہو گیا۔

''شجاع، ویر! یہ مت سمجھئے گا کہ آپ اس جنگ میں تنہا ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں، اس میں بھلے ہماری جان چلی جائے۔ ہمیں ان بے غیرتوں سے انتقام لینے کا موقع ہی اب ملا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اعتماد کرو، میری جان!'' میرے یوں کہنے پر دلیپ اور کنول کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ ماحول پھر سے حزن آلود ہونے لگا۔ اس لیے میں نے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ پارکنگ تک آتے آتے ہمیں کچھ وقت لگ گیا اور پھر دلیپ سنگھ اپنی راہ ہو لیا، میں کنول جیت کو ڈراپ کر کے گھر آ گیا۔

میری توقع کے عین مطابق آرتی سٹنگ روم میں بیٹھی ہوئی فلم دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی مشرقی انداز دلربائی کے ساتھ میری طرف بڑھی، یوں جیسے عرصہ ہوا ہم ایک دوسرے سے ملے نہ ہوں۔ اگرچہ وہ میرے سینے سے لگی ہوئی تھی لیکن میرے من میں نفرت امنڈ رہی تھی۔ میں نے اس کے عریاں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے پیچھے ہٹایا تو اس کی چکنی جلد سے مجھے یوں گمان ہوا جیسے میں نے کسی سانپ کے بدن پر رکھ دیا ہو۔ طبیعت یکدم ہی مکدر ہو گئی، تاہم اس کا چہرہ سامنے آ جانے تک میں نے خود پر قابو پا لیا اور پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر پوچھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

''آپ کے انتظار میں ہم فلم سے دل بہلا رہے تھے۔'' اس نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ میں اسے لیتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا، تب اس نے بڑے ناز سے پوچھا۔

''چائے چلے گی؟''

''نہیں، سادہ پانی۔'' میں نے اس کی خمار آلود نگاہوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو وہ

اٹھ کر پانی لے آئی۔ میں صوفے پر پھیل کے بیٹھ چکا تھا۔ میں نے پانی پی کر گلاس اس کی طرف بڑھایا تو اس نے پوچھا۔

''پھر خوب وقت گزارا کنول جیت اور اس کے کزن کے ساتھ؟''

''اصل میں یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ میں انہیں دوپہر کے وقت ہی کھانا کھلا دیتا لیکن تمہیں سوامی جی کے ہاں جانے کی جلدی تھی، بس اسی وجہ سے شام غارت ہو گئی، بہت بور تھے وہ لوگ، اپنی کہے گئے۔ کنول اگر کولیگ نہ ہوتی تو میں انہیں چھوڑ کر آ جاتا۔''

''کیسا ہے اس کا کزن؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''جیسے عام سکھ نوجوان ہوتے ہیں، کینڈا کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا ہے۔ بس اچھا ہے، اس کی سوچ بھی دولت کمانے تک محدود ہے۔''

''او، جو کوئی کسی چیز کو چاہتا ہے وہی اسے نہیں ملتی جیسے ہم محبت کے طلب گار۔'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر میری طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کے ہنس دی۔

''آرتی! کیا تم اسے محبت نہیں سمجھتیں کہ میں اس وقت تمہارے پاس ہوں؟''

''ہاں ہے لیکن ہم تو مدہوش ہو جانا چاہتے ہیں۔'' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

''انتظار کرو، کبھی نہ کبھی تو تمہاری مراد پوری ہو گی۔'' میں نے کہا تو وہ صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی، یونہی اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اچانک اس نے کہا۔ ''ہم آپ کو ایک گیت سنائیں۔''

''گیت اور تم؟''

''ہاں، ہمیں بہت سارے گیت آتے ہیں لیکن اس وقت ہم ایک ہی سنائیں گے، آج شام ہی سے ہمیں بہت یاد آ رہا ہے۔''

''اچھا، سناؤ'' میں نے کہا تو وہ آنکھیں بند کر کے جذب سے گانے لگی۔

''من میں جلتی اگن
اُو، جاناں! من میں جلتی اگن
جیون صحرا، قسمت ٹھہرا۔۔۔ آبلہ پائی کے دکھ سہنا
دکھ دریا کے پار اترنا۔۔۔ ساون رُت میں ترسے رہنا
ہر منظر سے بچھڑے رہنا۔۔۔ تیری چاہ میں جلتے رہنا
جیسے روشن دیا!
اُو، جاناں! من میں جلتی اگن

چھن چھن چھنکیں، دل آنگن میں۔۔۔ باندھ کے گھنگھرو، ٹوٹے سپنے
سر سنگیت کی سب تانوں میں۔۔۔ بھیگی یاد، سلگتے وعدے
میرے گیتوں کے شبدوں میں۔۔۔ تیری چاہت کے رنگ اترے
چاہ میں تیری ڈوب گئی ہوں
جیسے کچا گھڑا!
اُو، جاناں! من میں جلتی اگن
اُو جاناں! من میں جلتی اگن!''

آرتی نے یہ گیت بڑے جذب سے گایا تھا۔ اس کی آواز بھی اچھی تھی۔ اس لیے اس گیت کا تاثر کچھ دیر تک رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کے میری آنکھوں میں دیکھا۔ نجانے وہ کیا ڈھونڈ رہی تھی، میں نے بہر حال اس کی تعریف کی۔

''بہت پیارا گیت گایا تم نے، بہت اچھا لگا۔'' میں نے کہا تو اس نے اپنی ہتھیلی میرے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

''تو لایئے ہمارا انعام۔''

میں نے چند لمحے سوچا اور پھر اس کی ہتھیلی تھام کر اس کے ماتھے پر اپنے لب رکھ دیئے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت میرے جذبات ذرا مشتعل نہیں ہوئے، مجھے ایسے لگا جیسے کسی برتن کے ساتھ لب لگا دیئے ہوں۔ وہ حیرت زدہ سی میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر وہ سمٹی اور سمٹ کے میرے ساتھ لگ گئی۔ وہ کتنی دیر تک یونہی چھوئی موئی سی میرے ساتھ لپٹی رہی، وہ شاید سکون محسوس کر رہی تھی لیکن میرے اندر بے سکونی کا دھواں پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کتنی دیر تک بے حس و حرکت رہی۔ جب میرے لیے دھواں کی کڑواہٹ نا قابل برداشت ہو گئی تو میں نیند آنے کا بہانہ کر کے اٹھ گیا۔

میں اپنے بیڈ پر آ کے لیٹا تو میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ انکشاف انگیز اور مصروفیت بھرا دن میرے لیے حیرت سے زیادہ اضطراب کا باعث بن رہا تھا۔ سوچوں کا اک حصار تھا جس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، ذہن بار بار سوامی ہری داس کی باتوں اور اس کے خوف ناک منصوبے کی طرف چلا جاتا۔ دلیپ سے جب میں نے یہ پوچھا تھا کہ آخر وہ اس منصوبے سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس نے محض سطحی سی بات کی تھی، اسے شاید اندازہ ہی نہیں تھا کہ جنسیت، قوموں کو تباہ حال کر دیتی ہے۔ کسی بھی قوم کو ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی طور پر تباہ حال کرنا ہو تو اسے جنسی آزادی دے دی جائے۔ کیونکہ یہی آزادی بے راہ روی پیدا کرتی

ہے، جس سے اخلاقی اقدار کا جنازہ تو نکلتا ہی ہے، بے راہروی کی ایسی ایسی بھیانک صورتیں سامنے آتی ہیں کہ انسانیت بلبلا اٹھتی ہے۔ جنس ایک فطری عطیہ خداوندی ہے، ایک قوت ہے۔ اس کا جائز اور صحیح استعمال ہونے سے فطرت ان ثمرات سے نوازتی ہے جس مقصد کے لیے یہ قوت انسان اور حیوان کو ودیعت کی گئی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جس قوم یا قبیلے نے جنسی قوت کو میانہ روی میں نہیں رکھا اور اسے اس کے فطری تقاضوں کے ساتھ نہیں نبھایا، وہ تباہ و برباد ہوگئی۔ دنیا بھر کے مفکرین جو انسانیت کی فلاح چاہتے ہیں۔ جو انسان کو انسان خیال کرتے ہیں، ان کے نزدیک جنسی بے راہ روی انسان ذہنی صلاحیتوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ انتشار کی وجہ سے یکسوئی جیسی نعمت اس سے چھن جاتی ہے۔ جب خیالات ہی پراگندہ ہو جائیں، وہاں اچھی اور تخلیقی سوچ کہاں پیدا ہوگی؟ یہاں احتیاط کا مطلب راہبانیت نہیں بلکہ جنس جیسی قوت کا جائز اور فطری استعمال ہی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ میڈیکل سائنس اور طب یونانی کے تمام مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ جنسی بے راوی سے انسانی صلاحیتوں کی نشوونمارک جاتی ہے، ہوس کی تباہ کاریاں انسان کے ''تصور'' کو تباہ کر دیتی ہیں اور انسان اپنے ہاتھوں خود ہی قتل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے یہاں یہ سوال اٹھے کہ اگر جنسی بے راہ روی ہی ذہنی صلاحیتوں کی قاتل ہے تو پھر یورپ اور امریکہ اتنے اوج کمال تک کیسے پہنچ گیا۔ حالانکہ وہاں جنسی بے راہ روی بھی اپنے عروج پر ہے؟ ایسا سوال کوتاہ نظری، ذہنی پستی اور بیمار سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر یورپ اور امریکہ نے مادی ترقی کی ہے تو کیسے؟ یہی نا، کہ پس ماندہ ممالک کو برباد کیا۔ آلات قتل پھیلائے، گھٹیا سازشیں کیں بدامنی، ذہنی انتشار، بھوک اور عدم تحفظ کا احساس دیا۔ کسی کا گھر برباد کر کے اپنا محل خوبصورت بنانا، دنیا کا انتہائی ذلیل اور گھٹیا ترین عمل ہے۔ ایسا وہی کرتے ہیں جن کی سوچ بیمار اور منفی ہوتی ہے۔ انسانیت کا قتل کیسے کیا جاتا ہے، یورپ اور امریکہ کی ترقی کے گن گانے والے، کیا ان کے معاشرے میں موجود اخلاقی قدروں کے بارے میں جانتے ہیں؟ وہ جو اپنی ''تہذیب'' کو عظیم ثابت کرنے کے لیے دن رات پسماندہ ممالک کے لوگوں کے ذہنوں میں قطرہ قطرہ پروپیگنڈا کا نشہ ٹپکاتے رہتے ہیں۔ کیا واقعی یورپ اور امریکہ کی تہذیب ایک ''عظیم تہذیب'' ہے، کیا ایسی تہذیب کو عظیم کہا جاسکتا ہے جس میں انسانیت سوز واقعات اپنے عروج پر ہیں؟ مادہ پرست لوگ ایک دوسرے سے بیزار ہیں۔ ناجائز اولاد ان کے لیے رستا ہوا ناسور بن چکی ہے۔ جہاں بوڑھوں کو معاشرے کا کچرا سمجھ کر اولڈ ہاؤس کے کونوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ جہاں جنسی وحشت ایک کھیل کی حیثیت اختیار کر

گیا ہو۔ جہاں ہم جنس پرستی اس قدر غالب ہو کہ ہو ہم جنس سے شادی تک کا قانون پاس کروا لیا جائے۔ جن کے ساحل ننگ دھڑنگ لوگوں سے اٹے پڑے ہوں اور پھر سے وحشی ہو جانے کی تڑپ جن میں موجود ہو۔ سیکس فری ایریا میں انسان جاوں سے بھی بدترین صورت حال میں پائے جائیں تو تف ہے ایسی ''عظیم تہذیب'' اور اُس کے گُن گانے والوں پر۔ جہاں انسانوں سے ہٹ کر جاوں سے جنسی اختلاط کے متمنی ہوں۔ ایسی عظمت پر اور ایسی تہذیب کو عظیم کہنے والوں پر، کیا ایسا معاشرہ، ایسی تہذیب، حقوق انسانی کی علمبردار ہو سکتی ہے۔ کیا وہ دنیا اور خصوصاً پسماندہ ممالک کی راہنمائی کر سکتے ہیں؟ ہاں، وہ تعفن جوان کے معاشرے میں پیدا ہو کر نا قابل برداشت ہو چکا ہے، اُسے ریشمی کپڑے لپیٹ کر ان پس ماندہ ممالک میں پھینکا جا رہا ہے جنہیں اپنی تہذیب، اپنی معاشرت، اپنے دین اور اپنی روحانی قدروں کا پتہ نہیں۔ جن کے نزدیک مادیت ہی سب کچھ ہے، وہ اس گند کو بڑے احترام سے اپنے گھروں میں لا کر اپنی اولاد میں بانٹ رہے ہیں۔ جنسی بے راہ رو معاشرے میں کیا کیا انسانیت سوز مظاہرے ہوتے ہیں۔ اس کی صرف ایک مثال ہی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہو گی لیکن اس کے لیے جو ذرا سی عقل رکھتا ہے۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ''ایڈز'' کا جرثومہ عورت اور بندر کے ملاپ سے پیدا ہوا۔ کون نہیں جانتا کہ ایڈز امریکہ پیدا ہوئی۔ ذی عقل کے لیے اتنا سوچ لینا ہی کافی ہے کہ وہ کن ممالک میں پھیل رہی ہے اور کیوں؟ یہی صحت مند سوچ سبھی رازوں سے پردہ ہٹا دے گی۔ کون نہیں جانتا جنوبی ایشیاء کے ممالک میں غربت، افراتفری، بیماری، غیر صحت مندانہ رجحان، منشیات، جنسی بے راروی، افلاس، یہ سب کن کی پیدا کردہ ہے۔ اس خطے کے لوگوں کو چاہئے تو یہ تھا کہ برطانیہ کے چلے جانے کے بعد اپنی نسل نو کے لیے ایسی خرابیوں کے خلاف مصروف بہ عمل ہو جاتے لیکن ہوا کیا؟ تاریخ شاہد ہے کہ یہی خرابیاں موجود ہیں۔ ذرا سی عقل رکھنے والا یہ شخص یہ بھی جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے! کولمبس کے امریکہ دریافت کر لینے کے بعد امریکہ میں آباد ہونے والے اولین لوگ جرائم پیشہ تھے۔ اپنے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے یہ جزیرہ موزوں ترین تھا۔ یورپ تب بھی ذلت کے انتہائی گھٹیا درجے میں گرا ہوا تھا جیسے اب ہے۔ ایسے میں یہودی نے اپنی تجارت کے فروغ اور اپنے مذہب کو بچانے کے لیے اسی جزیرے کو محفوظ ٹھکانے کے طور پر چنا لہٰذا یہودیت نے اپنے مفاد کی خاطر امریکہ اور یورپ کی تہذیب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، یہ سب کے سامنے ہے۔ اس جدید ترین دور میں بھی وہ اپنی اس صدیوں پرانی روایت کو کیوں نبھا رہے ہیں کہ وہ غیر یہودی سے شادی نہیں کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ بڑے مقصد کے لیے وہ اپنی نسل کو محفوظ

رکھا اور یہی نسل تفاخر انہیں دنیا پر حکمرانی کرنے کے مقصد کے لیے سرگرم رکھے ہوئے ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ وہ عددی لحاظ سے تھوڑے ہیں۔ کوئی غیر یہودی ان کا مذہب قبول کرنا چاہے تو وہ اسے بطور یہودی اپنے مذہب میں جگہ نہیں دیتے۔ وہ اس سوچ پر بھی پوری طرح عمل پیرا ہیں کہ غیر یہودیوں کو ان کے اپنے مذہب پر رائج نہ ہونے دیا جائے۔ انہی اہداف کو حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس تقریباً پانچ سو سالہ تجربات موجود ہیں اور اس میں شارٹ کٹ ترین راستہ کسی قوم کو تباہ حال کرنے کے لیے اس میں جنسی بے راہ روی پیدا کرنا ہے۔ یہودیوں نے اہل ہندو کو اپنے استعمال شدہ تیر بہدف تجربات سے نوازا۔ جنسی بے راہ روی پیدا کر کے یہودیوں نے جو نتائج حاصل کیے وہ اہل ہندو کو بتائے، اسی سوچ کے سہارے بھارتیوں نے ''کلچر پالیسی'' کو عام کرنے کے لیے کمر ہمت کس لی۔ بھارتی یہ جنسی بے راہ روی کیوں پیدا کرنا چاہیں گے، ان کے مقاصد کیا ہوں گے؟ صاف اور سیدھی بات ہے کہ جو گڑ دینے سے مر جائے، اسے زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ کھوکھلے مادہ پرست جنس زدہ بیمار سوچ رکھنے والے اجسام جو صلاحیتوں سے عاری ہوں، ان پر گولیاں ضائع نہیں کی جاتیں۔ بلکہ اپنے من پسند خیالات ان کے ہاتھ میں تھما دیئے جاتے ہیں۔ وہ اپنے ملک میں غیر ہندوؤں کی سوچ کو مذہبی رہنے ہی نہیں دینا چاہتا۔ جبکہ خود ہندو اور ہندومت کی تعلیمات جنس کی تعلیم دیتی ہے۔ آرتھا، دھرما، کاما (فن، مذہب اور جنس) ہی ان کے مذہب کی بنیاد ہے۔ شاید بھارت اپنی ازلی بزدلی کے باعث اتنا حوصلہ کر لینے میں وقت لیتا لیکن یہودی گٹھ جوڑ سے جو کلچر پالیسی سامنے آئی ہے۔ وہ ایک تیر سے کئی نشانے لینے والی بات ہے۔ عام سی بات ہے کہ کوئی وقت تھا، فلم چوری چھپے دیکھی جاتی تھی اور ایسا کرنے والے کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ آج ہم اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ بیٹھ کر بھارت کی جنسی جذبات ابھارنے والی فلموں کو بڑے اطمینان سے دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ گھر تو گھر، سفر بھی محفوظ نہیں رہا۔ کیا یہ اہل ہندو کی کامیابی ہے؟ نہیں قطعاً نہیں۔ یہ ہماری بدترین ناکامی ہے۔ کوئی ہندو آ کر ہمیں فلم نہیں تھماتا، ہم خود یہ تعفن اپنے گھروں میں لے جاتے ہیں۔ ذرا تصور کریں کہ وہ شخص جس نے پاکستان کی تحریک میں دیوانہ وار حصہ لیا ہو، جس نے اپنی بیٹی کو اس لیے کنویں میں دھکیل دیا کہ اس کی عصمت محفوظ رہے اور کافروں کے ہاتھوں برباد نہ ہو۔ وہ بیٹی جس نے اپنی عزت کے لیے اپنی جان دے دی، یہ لوگ اگر زندہ ہو کر دوبارہ ہمارے ماحول میں آ جائیں اور ہمیں اجتماعی طور پر ایسی حالت میں دیکھ لیں کہ ہم ہندوؤں کی جنسی جذبات ابھارنے والی فلمیں رغبت سے دیکھ رہے ہیں تو ان کا احساس کیا ہوگا، وہ اپنی قربانی

کے متعلق کیا خیال کریں گے؟ اس تعفن کی سڑاند ابھی سے ظاہر ہونا شروع ہوگئی ہے۔ تصور کریں اس وقت کا جب ہماری آنے والی نسلیں اس گند کو بھگتیں گی۔ کیا ہم نے کبھی سوچا کہ اس بدترین تہذیب کی چھوڑی ہوئی رسوم کو گلے لگا رہے ہیں یا ہم اہل ہنود کے اکھنڈ بھارت والے خواب کی تکمیل کر رہے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب ہم نے کہیں سے بھی نہیں لینا، بس ذرا گردن جھکا کر اپنے آپ سے سوال کرنا ہے۔ وائرس وہیں پھیلتا ہے، جہاں قوت مدافعت کم ہو اور اس کے پھیلنے کی گنجائش ہو۔ جنسی بے راہ روی وہیں پھیلتی ہے جہاں بے مقصدیت، بے شعوری، بے عملی اور مادیت پرستی ہوگی۔ کیا ہم بحیثیت قوم خود کو ناسور کا شکار کر لیں گے؟

''نہیں،'' میرے اندر سے کوئی زور سے پکارا۔ ''نہیں، جہاں تک میری دسترس ہوگی، میں پوری شدت سے اس کا مقابلہ کروں گا۔'' میں یکدم اضطرابی کیفیت میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری یہ کیفیت لاشعوری تھی، میرے تصور نے مجھے بڑی بھیانک تصویر دکھائی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سب اپنے خون آلود نوکیلے پنجوں اور تیز دانتوں سے ہماری آئندہ نسل پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں تنہا اس میدان میں ان کے سامنے کھڑا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچتا، میرے دماغ میں ٹیس اٹھی۔ درد کی شدت اتنی تیز تھی کہ مجھ سے برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر انتظار کرنے لگا کہ یہ درد کب کم ہوگا۔ ایسا ہونا ہی تھا، ذہنی ریاضت ہی اس درد کا باعث بن جایا کرتی تھی۔ اچانک اٹھنے والا درد دھیرے دھیرے کم ہو جاتا تھا۔ پھر کوئی بھی عام سی پین کلر لے لینے پر وہ درد محو ہو جاتا لیکن اس وقت وہی تیز کیفیت تھی، کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک یونہی سر دبائے بیٹھا رہا یہاں تک کہ اے سی کی خنک ہوا میں بھی مجھے پسینہ آگیا۔ مجھے لگا جیسے میں بے بس ہو رہا ہوں، میرا شعور جیسے میرا ساتھ چھوڑ جائے گا۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ ایسے لمحات میں مجھے کچھ اور سمجھائی نہ دیا، بس اپنا سیل فون اٹھایا اور عدیم کے سیل فون کے نمبر پش کر دیئے۔ کچھ دیر بعد کال ریسو کر لی گئی۔

''جی، شجاع بھائی! اتنی رات گئے؟'' اس کے لہجے میں غنودگی تھی۔

''تم فوراً آؤ، میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''آپ ہیں کہاں؟'' وہ گھبراہٹ میں بولا۔

''گھر میں۔۔۔'' مجھ سے اتنا ہی کہا گیا اور نڈھال ہو کر بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر ایسے احساس کا دورانیہ بڑھتا چلا گیا کہ نہ تو میں بے ہوش ہوا اور نہ ہی پوری طرح حواسوں میں تھا۔ کافی دیر بعد دروازہ زور سے بجنے کی آواز آئی، اس کے ساتھ ہی آرتی کی آواز سنائی دی جو اونچی اور تیزی آواز میں مجھے پکار رہی تھی۔ دروازہ اندر سے لاک تھا، میری ہمت نہیں ہو پا رہی تھی کہ اٹھ کر دروازہ کھول سکوں۔ بمشکل تمام میں وجود کو قابو میں کیا اور دروازے تک پہنچ کے کھول دیا، دروازہ کھلتے ہی آرتی نے مجھے تھام لیا اور انتہائی تشویش سے بولی۔

''کیا ہوا، بولئے، کیا ہوا آپ کو؟'' میں اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن لفظ گنگ ہو گئے، بولا ہی نہیں گیا۔ میں نے اشارے سے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا اور پھر بے جان سا بیڈ کی طرف بڑھا۔ وہ شاید سمجھ چکی تھی کہ وہی پرانا درد جاگا ہے۔ اس لیے وہ مجھے اچھی طرح لٹا کر اپنی پچ تھراپی آزمانے لگی مگر شاید یہ درد اب اس کے بس کی بات نہ رہی تھی وہ ویسا ہی رہا۔ وہ اپنی پوری کوشش کر رہی تھی اور میں اس درد کو برداشت کر رہا تھا۔ اس دوران میرا اسیل فون بج اٹھا، میں نے آرتی کو اشارہ کیا کہ وہ سن لے۔ اس نے سنا اور پھر مجھے بتانے لگی۔

''ندیم کا فون تھا۔ پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے، ہم نے بتا دیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ایمبولینس پہنچنے والی ہوگی اور وہ راستے میں ہیں۔''

میں نڈھال ہو رہا تھا اور آرتی مجھے اپنی گود میں لیے مسلسل اپنی صلاحیت آزما رہی تھی، درد تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ میں بے بس ہو رہا تھا اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ مجھے ہوش آیا تو میرے اردگرد ڈاکٹر اور نرسیں موجود تھیں، نگاہوں کے سامنے سے دھند ہٹی تو شعور نے بھی احساس دلایا کہ یہاں کوئی موجود ہوں۔ میرا دھیان اپنے سر درد کی طرف گیا جو اب نہیں تھا لیکن ایک بے وجہ سی سنسناہٹ تھی جیسے ویران صحرا میں پاگل ہواؤں کا شور ہو۔ میری آنکھیں کھلتے ہی ڈاکٹر نے انگریزی میں پوچھا۔

''کیا محسوس کر رہے ہو؟'' اس کے پوچھنے پر میں نے اپنی کیفیت بتائی۔ تب اس نے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''نوجوان! ابھی خطرے کی کوئی بات نہیں ہے لیکن درد کی علامات بتا رہی ہیں کہ خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ حتمی رپورٹ کچھ ٹیسٹ ہوں گے، تب تک آپ ہسپتال میں رہیں گے اور ہاں ایک بات اور، زیادہ سوچنا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے نا؟'' اس ادھیڑ عمر ڈاکٹر نے شفقت سے کہا پھر کچھ دیر بعد مجھے ایک اور کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ اگلی شام تک میں مختلف ٹیسٹوں سے

مراحل سے گزرتا رہا۔اس دوران حیدر شیخ بھی آچکا تھا اور باقی لوگ بھی موجود تھے۔شام ڈھلے مجھے اسی ڈاکٹر کے آفس میں لے جایا گیا جہاں حیدر کے ساتھ سعد الموطاوی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں جا کر بیٹھا تو ڈاکٹر نے انتہائی نرم مسکراہٹ سے مجھے خوش آمدید کہا، کچھ دیر باتوں کے بعد ڈاکٹر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''نوجوان! میں تمہیں تمہاری بیماری سے متعلق بتا کر خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا لیکن بہر حال تمہیں اپنی بیماری کے بارے میں آگاہ ہونا چاہئے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو رکا، پھر بولا۔

''تمہارے یہ سر کا درد ایک طرح سے برین ٹیومر ہے۔میری تشخیص کے مطابق یہ ابھی انتہائی ابتدائی سطح پر ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ درد تشنج کی ایک کیفیت ہو لیکن بہر حال ہم اسے دواؤں سے ختم کرنے کی کوشش کریں گے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا ہو جائے گا۔'' وہ ڈاکٹر کافی دیر تک مجھے اس سے متعلق مختلف احتیاطیں اور دوا کے باقاعدہ استعمال کے بارے میں بتاتا رہا، پھر ہم وہاں سے اٹھ آئے۔سعد الموطاوی اپنی گاڑی میں چلا گیا اور حیدر مجھے گھر لے آیا۔گھر پہنچے تو سبھی موجود تھے۔ستیش، کنول جیت، آرتی اور ندیم۔کچھ دیر ان کے درمیان رہا اور پھر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ندیم میرے پاس تھا، وہ میرے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھ گیا اور میرا سر دبانے لگا۔ میں مسکرا دیا۔

''چھوڑو، یار! یہ کیا کر رہے ہو؟''

''ایسے ہی، میرا دل چاہتا ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''او چل چھوڑ، سیدھا ہو کر بیٹھ اور مجھ سے باتیں کر۔''

''ڈاکٹر نے آپ کے لیے یہ احتیاط۔۔۔''

''یہ ہسپتال نہیں، گھر ہے۔ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اگلے ہی لمحے مجھے الطاف پاشا کا خیال آیا تو میں نے اس سے متعلق پوچھ لیا۔

''ہم رابطے میں ہیں۔اسے آپ کے متعلق پتہ ہے، دلیپ سنگھ سے ہونے والی ملاقات اور اس میں ہونے والی باتوں سے بھی آگاہ ہے۔''

''اسے کیسے پتہ ہے؟'' میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''پاکستانی لوگوں کا بھی پورا نیٹ ورک ہے یہاں پر لیکن وہ کوئی منفی کام نہیں کرتے، بس پاکستانی مفادات کی نگرانی کرتے ہیں جو حق ہے۔اینٹی انڈیا لوگوں سے بھی ان کے روابط ہیں۔''

''ندیم! اس طرح تو ہو سکتا ہے، بات پھیل جائے ہو سکتا ہے ان لوگوں کے اندر

بھی۔۔۔“

”نہیں، یہ فقط چند لوگوں تک محدود ہے۔ زیاد سے زیادہ پانچ یا چھ لوگ ہیں جو انتہائی قابل اعتماد ہیں۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ انتہائی محتاط اور خفیہ انداز سے اس مسئلے سے نپٹا جائے۔ آپ اس معاملے میں بے فکر رہیں۔“

”ہاں، ظاہر ہے۔ اگر اس معاملے میں ذرا سی بھی بھنک نکل گئی تو سارا معاملہ ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”بس آپ جلدی سے تندرست ہو جائیں۔ تا کہ آئندہ کا لائحہ عمل بنایا جائے۔“ ندیم نے خوشگوار لہجے میں کہا اور اپنے سیل فون پر نمبر پش کر دیئے، پھر فون سیٹ میری طرف بڑھا کے بولا۔ ”یہ الطاف سے بات کریں۔“

رابطہ ہو جانے پر ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے دلیپ اور کنول جیت کے تعلق کے بارے میں بتایا اور آئندہ کیا کرنا ہے، اس بارے میں ہلکا سا اشارہ دیا۔ میں بہر حال مطمئن ہو گیا اور پھر فون بند کر دیا۔ میں شاید ندیم سے کچھ دیر اور باتیں کرتا کہ آرتی آ گئی، اس کے ہاتھ میں میری دوائیں تھیں۔

”یہ لیں، یہ کھائیں پہلے۔۔۔“ اس نے پانی کا گلاس بھی میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے وہ دوا نگلی اور گلاس اسے واپس کر دیا، تب ندیم بھی اٹھ گیا۔

رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلی تو میرے بیڈ کے ساتھ ہی نیچے فرش پر گدا بچھائے آرتی لیٹی ہوئی تھی۔ میں چند لمحے تک اسے دیکھتا رہا اور پھر بے آواز قدموں سے اٹھ کر واش روم چلا گیا، واپس آیا تو آرتی اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ تب میں نے کہا۔

”سوری آرتی! میں نے کوشش تو کی تھی کہ تم ڈسٹرب نہ ہو لیکن۔۔۔!“

”ہم سوئے کب تھے، جاگ رہے تھے ہم۔“ اس نے کہا، پھر اٹھ کر میرے قریب آ گئی اور بولی۔ ”آپ سو جاؤ۔“ اس کے کہنے پر میں نے سو جانا چاہا لیکن نیند نہ آئی۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر نجانے کب پپوٹے بھاری ہونے لگے اور میں سو گیا۔ میں بیدار ہوا تو دن چڑھے خاصا وقت ہو گیا تھا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر اپنا سیل فون تلاش کر رہا تھا کہ آرتی آ گئی۔ اس صبح وہ خاصی تر و تازہ لگ رہی تھی۔ نجانے کہاں سے موتیئے کے پھول منگوا کر اپنے بالوں میں سجائے ہوئے تھے، ان پھولوں سے ایک خوشگوار تاثر ابھر رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر آنکھوں سمیت مسکرا دی پھر دھیرے سے پوچھا۔

”کیسے ہیں آپ؟“

"ایک دم ٹھیک ۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔"وہ میرا سیل فون کدھر ہے؟" میں نے پوچھا تو اس نے الماری میں سے نکال دیا۔ وہ آف تھا، میں نے اسے آن کیا اور چارجر پر لگا دیا۔ وہ واپس مڑ گئی۔ ناشتہ کر لینے کے بعد میں نے دفتر فون کیا۔ ستیش نے فون رسیو کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی آئے ہوئے ہیں۔ میں نے آنے کے بارے میں کہا تو وہ بولا۔

"آپ آرام کریں، یہاں کوئی اتنا اہم کام تو ہے نہیں۔"

"یہاں اکیلے میں بور یت ہوگی، یار! وہاں آپ لوگوں کے ساتھ دل تو لگا رہے گا۔"

"کیا آرتی گھر پہ نہیں ہے؟" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا تو میں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں اٹھنے لگا تو آرتی نے حیرت سے پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"آفس، اور کہاں؟" میں نے عام سے انداز میں کہا۔

"آپ بیمار ہیں اور۔۔۔"

"اور میں اگر صحت مند بھی ہوا تو یہ احتیاطیں مجھے بیمار کر دیں گی۔" میں نے کہا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔

زارا کی آمد چوتھے دن شام کے وقت تھی۔ ٹکٹ بکنے کے رجحان سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے شو کامیاب ہو جائیں گے۔ خود زارا، کنول جیت کے ساتھ رابطے میں تھی، مختلف جگہوں پر ریہرسل وغیرہ چل رہی تھی سو ان شوز کے لیے پورا اطمینان تھا۔ ہر کوئی اپنے کام سے مطمئن تھا۔ گپ شپ کے انداز میں کام بھی ہوتا رہا بلکہ دوپہر کے وقت آرتی کا فون آ گیا۔

"دوائی کھالی آپ نے؟"

"نہیں تو۔۔۔"

"آپ کو پتہ ہے کہ دوا وقت پر لینی چاہئے اور آپ کھائیں گے بھی کہاں سے، وہ اِدھر گھر میں پڑی ہے۔"

"چلو، واپس آ کے کھالوں گا۔"

"ابھی آ رہے ہیں یا ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دوں؟"

"میں آ جاتا ہوں تھوڑی دیر بعد۔"

"جلدی آجایئے گا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی، ذہن میں یہی خیال تھا کہ اگر یہی سب کچھ وہ کسی کے لیے پورے خلوص سے کرے تو۔۔۔اس سے آگے کئی آپشن تھے، جن پر سوچا جا سکتا تھا۔

اس شام میں پوری طرح فریش تھا۔ حیدر شیخ اور آرتی سے یونہی گپ شپ چل رہی تھی، ہم باتیں کر رہے تھے کہ حیدر کے سیل فون کی بیل بجی۔ اس نے ایک نظر اسکرین پر ڈالی اور فون کان سے لگا لیا۔ کچھ لمحے باتیں کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا، پھر آرتی سے کہا۔

"ماتا جی آرہی ہیں، بس گیٹ کے پاس ہیں۔"

"اوہ۔!" یہ کہہ کر وہ مستعدی سے اٹھ گئی، پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ "آپ آشرم میں ماتا جی سے ملے تھے نا!" اس کے یوں کہنے پر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو اس نے مزید کہا۔ "وہ آرہی ہیں اور وہ بھی آپ کے لیے۔"

"ارے واہ، اپنی یہ اہمیت۔" میں نے قدرے کچھ سمجھتے ہوئے خوشگوار انداز میں کہا، پھر ان کے ساتھ ہی اٹھ کر چل دیا۔ تبھی آرتی نے صدقے واری ہو جانے والے انداز میں کہا۔

"آپ کی اہمیت کتنی ہے، کوئی ہم سے پوچھے۔" اس کے یوں کہنے پر حیدر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے، آرتی تم اس پر عاشق ہو گئی ہو۔"

"یہ تو وقت بتائے گا کہ ہم ان کے لیے کیا ہیں۔" میں نے کچھ نہیں کہا، بس یہی سوچ کر رہ گیا کہ سانپ کیا کر سکتا ہے، وہی آرتی کرے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ اب مجھے سانپوں سے کھیلنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ہم تینوں برآمدے میں کھڑے تھے۔ کچھ ہی لمحوں بعد گیٹ سے لگژری جیگوار آتی دکھائی دی اور پھر اگلے چند لمحوں میں وہ پورچ میں آرکی تو اس میں سے "ماتا جی" برآمد ہوئیں۔ وہی سفید سلک کی ساڑھی، برف کی مانند سفید بال، بچوں کی طرح جلد اور دوشیزہ کی طرح سرخ گال۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے ساڑھی کا پلو سنبھالا ہوا تھا، دوسرے ہاتھ میں سیاہ رنگ موتیوں والی مالا پکڑی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی مالا والا ہاتھ ہلایا۔ ہمارے درمیان چند قدم کا فاصلہ تھا، وہ آئیں تو آرتی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ پھر حیدر شیخ کی گردن اور کندھا تھپتھپایا اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولیں۔

"تو یہ ہیں۔" انہوں نے گونجتے ہوئے لہجے میں کہا اور میری طرف گہری نظر سے دیکھا۔ میں ان کی نگاہوں میں وہی ازلی تشنہ عورت دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے قریب ہوئیں اور مالا والے ہاتھ کی انگلیاں میری گردن پر رکھ دیں۔ میں پہلے ہی ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس لیے وہ

سنسناہٹ جو پہلی بار میرے بدن میں ہوئی تھی، نہیں ہوئی۔ کوئی ہلکی سی تبدیلی نہ پا کر "ماتا جی" کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور لمحہ میں گزر گیا۔ میں مسکرا دیا اور کہا۔

"اب نہیں ہوں؟"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو، بالک؟" ماتا جی نے اسی گونج دار لہجے میں کہا۔

"آئیں، ماتا جی! اندر پدھاریں۔" آرتی فرش راہ ہوتی ہوئی بولی۔

کچھ دیر بعد سٹنگ روم میں ہم اطمینان سے بیٹھ چکے تھے۔ میرے سامنے والے صوفے پر "ماتا جی" اور اس کے ساتھ آئی ایک لڑکی تھی جو بالکل روبوٹ کی طرح لگ رہی تھی، اس نے بھی ویسا ہی لباس پہن رکھا تھا۔ میرے دائیں طرف حیدر اور آرتی تھے۔

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائی ہیں۔" حیدر نے نہایت ممنونیت سے کہا تو وہ دھیرے سے بولیں۔

"یہ بالک آیا تھا آشرم، بڑا مضطرب لگتا تھا۔ ہم نے اسے تب بھی کہا تھا کہ یہ آشرم شانتی دان کرتا ہے مگر ان کے لیے جو شانتی چاہتے ہیں۔ پھر آج ہی آرتی نے بتایا کہ یہ بالک بیمار ہے۔ ہمیں اسے دیکھنا تو تھا۔ تمہیں پتہ ہے کہ جو ہمارے پاس آجائے، ہم اسے بھولا نہیں کرتے۔" کہنے کو تو وہ کہہ گئیں کہ یہ وہاں ٹھیک نظریہ لے کر نہیں گیا، اس لیے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ میں ان کی بین الفاظ بات سمجھ گیا تھا لیکن خاموش رہا۔

"آپ دھن وان ہیں، ماتا جی! یہی آپ کا بڑاپن ہے۔" آرتی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر نے جو رپورٹ دی ہے، وہ ہم آرتی سے سن چکے۔ کیا تم اس پر یقین رکھتے ہو بالک؟" انہوں نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے۔ وہ بہت قابل ڈاکٹر ہیں۔ اب انہوں نے جو کہا ہے، وہ تو ماننا ہی پڑے گا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"مطلب تمہیں وشواس ہے بھی اور نہیں بھی۔" انہوں نے شک کا بیج میرے ذہن میں ڈال دیا۔

"کہہ لیں آپ۔" میں نے مزید بحث سے بچنے اور فقط ان کی سننے کے لیے ہاں میں ہاں ملا دی۔

"اگر ہم کہیں کہ تمہارا علاج بغیر کسی دوا کے ہو جائے اور چند دنوں میں تمہارے سر کا یہ درد ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے تو اس پر تم کیا کہو گے؟"

''کیا ایسا ممکن ہے؟'' میں نے آرتی کی تھراپی کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا جو اب اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔

''اس دنیا میں کیا ممکن نہیں ہے، بالک! بس من سے رابطہ ہو تو نگاہوں کے سامنے پڑے ہوئے سارے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ چند دنوں کی ریاضت ہے جو تمہیں آشرم کے پوتر ماحول میں کرنا ہوگی۔'' انہوں نے کہا تو حیدر شیخ جلدی سے بول اٹھا۔

''اگر ایسا ممکن ہے تو میرے خیال سے آشرم میں چند دن گزار لینے میں کوئی قباحت نہیں۔'' اس کے یوں کہنے پر میں زیرلب مسکرا دیا۔ ان لوگوں کی پتہ نہیں کیا نیت تھی لیکن آشرم میں جانے کا مطلب میرے نزدیک یہ تھا کہ مجھے وہاں اپنا آپ ان کے حوالے کرنا پڑے گا۔ وہ میرے بدن اور ذہن کی کیا حالت کرتے ہیں، اس سے قطع نظر پہلی بات جو سمجھ میں آتی تھی، وہ یہی تھی کہ یہ لوگ مجھے اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں یا پھر جانچنا چاہتے ہوں کہ میں ان کے لیے کارآمد ہوں بھی یا نہیں؟ یہی جمود میں بھی توڑنا چاہتا تھا۔ میں نے ابھی یہ سوچنا تھا کہ وہ کون سی راہ ہے جس پر چل کر میں ان کے لیے دیوار بن سکتا ہوں لیکن وہ راستہ خود چل کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ قدرت کے اس عطیہ پر میرے اندر اعتماد بڑھ گیا۔

''کس سوچ میں پڑ گئے آپ؟'' آرتی نے پوچھا تو میں نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے ماتا جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں روحانیت کو مانتا ہوں اور مجھے یہ احساس بھی ہے کہ روحانیت کے ذریعے یا راہ سلوک میں انسان بہت اعلیٰ مدارج طے کر لیتا ہے مگر یہ بات آپ بھی مانیں گے کہ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں، جنہیں مادی ذرائع ہی سے حل کرنا ممکن ہوتا ہے۔ یہ حقیقت۔۔۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ بعض اوقات بات کچھ اور ہوتی ہے اور انسان اسے کچھ اور ہی خیال کرتا ہے۔ جو تم سمجھ رہے، بالک! وہ نہیں ہے اور جو ہم سمجھ رہے ہیں، یہ وہی ہے۔ ڈاکٹر نے اپنے حساب سے اندازہ ہی لگایا ہے، ہم اسے اپنی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، تمہارا یہ انداز ہی بتا رہا ہے کہ جو ہم نے سوچا ہے، وہی ٹھیک ہے۔'' ماتا جی نے بات ختم کی۔

''یار! تم نے علاج کروانا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب ماتا جی خود آ کر کہہ رہی ہیں تو تمہارا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ چند دنوں کی تو بات ہے۔'' حیدر نے میری طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

''ڈیئر! میں انکار تو نہیں کر رہا، بس ایک ذرا تذبذب ہے کہ۔۔۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔'' یہ کہہ کر اس نے ماتا جی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔''یہ کب آ جائے آشرم؟''

''چاہے تو ابھی چلے۔'' انہوں نے مسکراتی آنکھوں سے کہا۔

''میں ابھی کچھ دیر بعد آشرم آجاتا ہوں۔'' میں جلدی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، ہم تمہارا آشرم میں انتظار کریں گے۔'' انہوں نے شاہانہ انداز سے کہا اور اٹھ گئیں۔ ہم سب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگلے چند لمحوں میں ان کی گاڑی گیٹ کراس کر کے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ یہ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ وہاں وہ سب کچھ ممکن ہوسکتا ہے، جس کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس کے پاس وہ تمام ہتھکنڈے تھے جن سے کسی بھی شخص کی ذ ہنی کیفیات کو اپنی مرضی کے تابع کیا جا سکتا تھا۔ شکاری نے مجھے اپنے جال میں پھانس لیا تھا یا میں رضا ورغبت سے اس جال میں خود بخود پھنس گیا تھا۔ میں سٹنگ روم میں بیٹھنے کی بجائے اپنے کمرے میں آگیا۔ کچھ دیر سوچ کر میں نے اپنے سیل فون پر ندیم سے رابطہ کیا اور اسے موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا۔

''یہ چند دن کتنے ہو سکتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''پتہ نہیں، لیکن گمان یہی ہے کہ جب تک میں پوری طرح ان کے زیر اثر نہیں آجاتا۔''

''تو مت جائیے وہاں، بہانہ کر دیں کہ ابھی آپ ڈاکٹر کے زیر علاج ہیں۔ اگر کوئی افاقہ نہ ہوا تو پھر دیکھیں گے۔''

''میں ایسا کہہ سکتا تھا لیکن میں خود چاہتا ہوں کہ ان کے نزدیک جاؤں۔ یہ ایک موقع ہے جو انہوں نے خود مجھے فراہم کیا ہے ورنہ پھر ہوسکتا ہے کہ میں کوشش بھی کروں اور ان تک نہ پہنچ سکوں۔ برائی کا سرچشمہ وہیں پر ہے اور مجھے ان تک پہنچنا ہے۔''

''وہ کچھ ایسا نہ کر دیں کہ آپ کی ذہنی حالت۔۔۔'' ندیم کہتے کہتے رک گیا۔

''اللہ خیر کرے گا۔'' یہ کہہ کر میں نے تفصیل سے سمجھایا کہ کیا کرنا ہے، مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے ایک بیگ میں چند جوڑے کپڑے اور دیگر ضرورت کا سامان رکھا۔ ایسے ہی تیاری کرتے ہوئے سورج غروب ہوگیا۔ میں نے وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر اپنے رب کے حضور کھڑا ہو گیا جو خالق کائنات ہے اور تمام قوتوں کا منبع ہے۔ میں نے پوری عاجزی سے اس کے حضور اپنا آپ پیش کر دیا پورے جذب سے دعا مانگی۔

''اے میرے مالک! تو نیتوں کے بھید جانتا ہے، تیرے سامنے وہ خیال بھی عیاں

ہوتے یں، جنہیں ہم خود سے بھی چھپا لینا چاہتے ہیں ۔اے اللہ ! میری رہنمائی فرما۔ میں اگر اپنی نیت میں سچا ہوں اور جو کام میں کرنے جا رہا ہوں، انسانیت کے لیے فلاح رکھتا ہے تو مجھے قوت عطا فرما۔ مجھے وہ اعتماد بخش دے جس کے بل بوتے پر میں شیطانیت پر غلبہ پالوں۔اے میرے اللہ ! مجھے فتح ونصرت سے ہمکنار کر کیونکہ میں تیری مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔'' میں نے اپنے رب کے حضور دل سے دعا کی، پھر جائے نماز لپیٹ کر ایک طرف رکھی اور بیگ اٹھا کر نیچے آ گیا۔ حیدر اور آرتی میرے انتظار میں تھے،آرتی نے بڑھ کر بیگ میرے ہاتھوں سے لے لیا۔ ہم خاموشی سے چلتے ہوئے گاڑی تک آئے۔ حیدر ڈرائیونگ پر بیٹھ گیا، گاڑی گیٹ سے نکلی تو حیدر نے خوشگوار انداز میں کہا۔

''آرتی! یہ تمہارے چہرے پر اتنا دکھ کیوں پھیلا ہوا ہے؟''

''نہیں تو۔۔۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''تمہیں کیا خبر ہوگی، دیکھ تو ہم رہے ہیں۔'' اس نے باقاعدہ بحث کرنے والے انداز میں کہا۔

''چلیں، ہوگا۔'' اس نے گویا ہتھیار ڈال دیئے۔

''یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟'' حیدر نے پوچھا تو وہ خاموش رہی۔ جب اس نے چند لمحے جواب نہ دیا تو حیدر نے بات آگے بڑھائی۔ ''مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ تم شجاع سے اس قدر دل لگا بیٹھو گی۔ سویٹی ! یہ محض چند دنوں کے لیے جا رہا ہے، واپس آجائے گا۔ یہ تو جیسے تیسے گزر جائیں گے لیکن جب تم بھارت چلی جاؤ گی، تب کیا ہوگا؟'' حیدر نے اسے احساس دلایا۔

''تب کی بات، تب ہوگی۔'' اس نے کہا اور میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ بلاشبہ آرتی ایک اچھی اداکارہ تھی۔ وہ تو بالی وڈ میں اسے کسی نے پوچھا نہیں اور انڈر ورلڈ مافیا کے ہتھے چڑھ جانے کے باعث سلور سکرین تک نہ پہنچ سکی۔ اگر اسے کسی فلم میں کام مل جاتا تو یقیناً وہ اچھی اداکارہ ثابت ہوتی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

''آرتی! تم اپنے بھگوان سے پراتھنا کرنا۔ میں صحت یاب ہو کر واپس آجاؤں تو کچھ ایسا کریں گے کہ تم اِدھر ہمارے پاس ہی رہو۔''

''لیکن اس کے لیے اسے ایک بار تو بھارت واپس جانا پڑے گا......''

حیدر نے کہا اور امیگریشن کے قانونی تقاضوں کی تفصیل بتانے لگا ایسی ہی باتوں میں سفر کٹتا چلا گیا اور ہم اس عالیشان بنگلے کے سامنے جا پہنچے۔ وہاں پارکنگ میں خاصی گاڑیاں

کھڑی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ یہی وقت سوامی ہری داس کے بھاشن دینے کا ہوتا ہے۔ سیکورٹی وغیرہ کے مراحل سے گزر جانے کے بعد ہمیں اسی کمرے میں بٹھایا گیا، جہاں ہم پچھلی بار بیٹھے تھے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد چند خادماؤں کے جلو میں ''ماتا جی'' وہی سفید رنگ ساڑھی، ہاتھ میں کالے موتیوں کی مالا لیے نمودار ہوئیں۔

''مجھے پوری امید تھی کہ تم آجاؤ گے، بالک! اب کسی چنتا کی ضرورت نہیں۔'' انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں، تبھی آرتی نے انتہائی ادب سے پوچھا۔

''ماتا جی! یہ مجھے پوچھنا تو نہیں چاہیے لیکن پھر بھی شجاع جی کے صحت مند ہونے میں کتنے دن لگیں گے؟''

''بہت جلد۔۔۔'' ماتا جی نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا اور پھر حیدر سے باتیں کرنے لگیں۔ یہ باتیں نہایت مختصر سی تھیں۔ سوامی ہری داس کا بھاشن سننے کے لیے لوگ آئے ہوئے تھے۔ سو مصروفیت کے باعث وہ زیادہ وقت نہیں دے پائیں۔ کچھ دیر بعد حیدر اور آرتی چلے گئے اور میں وہیں اس کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر چند خادمائیں وہاں آگئیں، ان میں سے ایک نے کہا۔

''آیئے۔۔۔'' میں اٹھ کر ان کے ساتھ چلنے لگا۔ میرا بیگ ایک اور لڑکی نے اٹھالیا اور باقی لڑکیاں ہمارے پیچھے چلنے لگیں۔ میں ان کے جلو میں مختلف راہداریوں میں چلتا گیا۔ وہ لڑکی ایک کمرے کے سامنے رک گئی اور درواز کھول کر اندر چلی گئی۔ کافی کشادہ اور جدید ترین انداز میں سجا ہوا بیڈ روم تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا، میں ارد گرد دیکھ ہی رہا تھا کہ اس ایک لڑکی کے سوا باقی سب چلی گئیں جس کے ساتھ چلتا ہوا میں یہاں تک آیا تھا۔

''آئیں، پدھاریں۔'' اس لڑکی نے کہا تو میں ایک طرف پڑے صوفے پر بیٹھ گیا اور وہ میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ ''مجھے رکمنی کہتے ہیں، ماتا جی نے آپ کی دیکھ بھال کرنے کی ذمہ داری مجھے دی ہے۔ یہ کمرہ آپ کا ہے اور آپ یہیں رہیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ مجھے وہاں کے ماحول کے بارے میں معلومات دینے لگی۔ اس دوران میں نے اسے غور سے دیکھا، خاصی جاندار لڑکی تھی۔ خوشگوار چہرہ، پرکشش جسم اور باتیں کرنے کا دلکش انداز۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں بہت زیادہ سکون تھا۔ اتنا گہرا سکون جیسے کسی برفیلے علاقے میں جمے ہوئے پانی کی جھیل ہو۔ اس نے محسوس کیا کہ میں اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں، اس نے بھی میرا جائزہ لیا اور چلی گئی۔ میں بیڈ پر پھیل گیا۔ کچھ وقت گزرا ہوگا کہ رکمنی آ

گئی۔ اس بار اس کا لباس قدرے مختصر تھا۔ جیسے لباس کے نام پر چند دھجیاں جسم پر لپیٹ لی گئی ہوں۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں ایک گلاس دھرا ہوا تھا، اس نے وہ ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور بڑے رسان سے بولی۔

''اسے پی جائیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا، پھر اٹھ کر اس گلاس کو لبوں سے لگا لیا۔ بہت ہی خوش ذائقہ مشروب تھا۔ میں نے خالی گلاس واپس رکھا تو اس نے انتہائی خمار آلود لہجے میں کہا۔

''آئیں، چلیں۔''

میرے جی میں آئی کہ اس سے پوچھوں، کہاں جانا ہے لیکن میں خاموش رہا اور چپ چاپ اس کے ساتھ چل دیا۔ پھر کئی راہداریاں پار کرنے کے بعد وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گئی جو نیم تاریک سا تھا اور اس کے عین درمیان میں ایک چھوٹا سا حوض پانی سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں موجود پانی کا رنگ گدلا تھا اور اس کی سطح پر پھول تیر رہے تھے۔ کمرے کے نیم تاریک ماحول میں ایک ایسی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جس نے میرے دماغ میں تازگی بھر دی تھی۔ رکمنی سحر زدہ سی میری قمیص کے بٹن کھولنے لگی۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا جو کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ دھیرے دھیرے اس نے مجھے لباس کی قید سے آزاد کر دیا، یہاں تک کہ ستر پوشی کے لیے ایک انڈر ویئر میرے جسم پر رہ گیا۔ ایک خوبصورت اور گداز بدن لڑکی میرے سامنے تھی جس کے جسم پر انتہائی مختصر لباس تھا۔ نیم تاریک ماحول اور سکون تنہائی۔ اچانک ہی پرسکون ماحول میں ہلچل ہوئی، میری سانسیں تیز ہوئیں تو میں نے رکمنی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے ہاتھ رکھتے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے ایک سسکاری لی، کندھے پر رکھے ہوئے ہاتھ سے چکنی جلد کا احساس ہوا جس سے آرتی کا بدن میرے شعور میں در آیا۔ اس کے ساتھ ہی سانپ کی پھنکار میرے ذہن میں گونج کر رہ گئی۔ اس کی بازگشت اس قدر تیز تھی کہ میں پورے وجود سے ہل گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور میرا دھیان ان باتوں کی طرف چلا گیا جو کبھی مجھے مبین اختر نے سکھائی تھیں۔

''جذبات انسان کے اپنے کنٹرول میں ہوتے ہیں، شجاع! ایسا اس لیے ہے کہ ہم ان کے مالک ہیں، یہ ہمارے جسم میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری اجازت ہی سے بھڑکتے ہیں اور ہم ہی انہیں سرد کر سکتے ہیں، بس ذرا سی توجہ چاہیے۔ یہ جذبات بالکل اس سدھائے ہوئے کتے کی مانند ہیں جنہیں ہم چاہیں تو اپنی رکھوالی کے لیے رکھ لیں یا پھر شکار کرنے کے

لیے یا پھر چیر پھاڑ کرنے کے لیے اور میرے بھائی! جان لو کہ رکھوالی بھی اپنی ہوتی ہے، شکار خود ہونا ہوتا ہے اور چیر پھاڑ بھی اپنی ہی ہوتی ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے مبین اختر میرے قریب بول رہے ہوں، ایسے جیسے وہ میرے من کے اندر موجود ہوں۔ اگلے ہی لمحے حیرت انگیز طور میں اپنے جذبات پر قابو پا گیا، یوں جیسے تاریک کمرے میں بٹن آن کرنے کی ہلکی سی کلک سے ہر طرف روشنی پھیل جائے۔ میں نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کے کاندھے سے ہٹا لیا۔ تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے تو وہ حواسوں میں آ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور حوض کنارے پڑی ہوئی دری پر لٹا دیا، میں لیٹ چکا تو وہ اٹھ کر دیوار میں بنی ہوئی ایک الماری تک گئی، وہاں سے اس نے کانچ کی بوتل اٹھائی اور میرے نزدیک آ گئی۔ اس میں خوشبو دار تیل تھا، نجانے کیسی مہک تھی جسے میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ کسی ماہر مشاطہ کی طرح مساج کرنے لگی۔ جس سے پہلے تو میرے بدن پر ہلکی ہلکی جلن ہوئی اور پھر ڈھیروں پسینہ آ جانے سے دھیرے دھیرے سکون ہوتا چلا گیا۔ وہ کافی دیر تک مساج کرتی رہی اور پھر اس نے مجھے اٹھا کر اس حوض میں اتار دیا۔ وہ پانی بھی نہایت خوشبودار تھا۔ میں گردن تک ڈوب گیا۔ وہ حوض کے کنارے یوں بیٹھ گئی کہ اس کی پنڈلیاں پانی میں ڈوب گئیں۔ پھر وہ برتن بھر بھر کے میرے سر پر انڈیلنے لگی۔ پتہ نہیں، کتنا وقت یونہی بیت گیا۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا لیکن میرا دماغ سن ہوتا چلا گیا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر حوض سے باہر نکالا اور ساتھ ہی بنے ہوئے ایک بڑے سے حمام میں لے گئی۔

"آپ خوب اچھی طرح نہا لیں۔" میں شفاف پانی سے نہانے کے بعد باہر نکلا تو اس نے مجھے سفید رنگ کی دو چادریں دیں، ایک میں نے دھوتی کی طرز پر باندھ لی اور دوسری کاندھوں پر پھیلا لی۔ پھر وہ مجھے انہی راہداریوں سے لیتی ہوئی واپس بیڈ روم میں لے آئی۔ میں نے جب تک بال بنائے اور ہاتھ دھو کر صوفے پر بیٹھا، تب تک دوسری خادمائیں کھانا لگا چکی تھیں۔ کھانا نہایت لذیذ تھا، میں نے ڈٹ کر کھایا۔ وہ برتن اٹھا چکیں تو پھر سے مجھے مشروب پلایا گیا جس سے ایک خوشگوار تاثر میرے بدن میں اتر گیا اور حیرت انگیز طور پر مجھے سگریٹ کی طلب نہیں ہوئی۔ میں کمرے میں تنہا تھا اس لیے میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس وقت مستی اور سرور مجھ پر چھا چکا تھا۔ پھر پتہ نہیں کتنا وقت گزرا ہوگا کہ رکمنی کمرے میں آئی۔ اس نے بڑے، سٹائل سے مجھے اٹھایا اور پھر اپنے ساتھ چلنے کو کہا، وہی راہداریاں گھومتے گھماتے نجانے کدھر چلتے رہے۔ اچانک ایک کمرے میں داخل ہو کر وہ تہہ خانے میں اترنے لگی۔ کافی ساری

سیڑھیاں اترنے کے بعد وہ مجھے ایک کمرے میں چھوڑ کر واپس پلٹ گئی، تبھی روشنی ہوگئی اور میرے سامنے ''ماتا جی'' آلتی پالتی مارے ایک چوکی نما جگہ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنے سارے سفید بال اوپر کی طرف جوڑے کی صورت میں باندھے ہوئے تھے، بدن پر پیلے رنگ کی دو چادریں تھیں جس پر ہندی زبان میں جابجا کچھ ایسا لکھا ہوا تھا جیسے ڈیزائن بنا ہوا ہو اور سامنے ایک برتن میں لوبان سلگ رہا تھا، جس کی خوشبو نے پورے کمرے کو معطر رکھا تھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں وہی کالے موتیوں والی مالا تھی، وہی ہاتھ بلند کر کے انہوں نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

''آؤ بیٹھو۔'' ان کی گونج دار آواز کمرے میں پھیل گئی، ان کے سامنے بیٹھ گیا تو وہ بولیں۔ ''میرا نام شیوتیا ہے، میں لوگوں کے لیے ماتا جی ہوں لیکن تمہارے لیے صرف شیوتیا۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھ پر یہ مہربانی کیوں۔؟'' میں نے براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس لیے کہ تم مجھے پسند آگئے ہو اور جسے میں پسند کر لیتی ہوں، اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش ضرور کرتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''مجھ میں ایسی کون سی خوبی ہے جو تمہیں پسند آگئی؟'' میں نے بھی اس کی سطح پر بات کی۔

''ایک نہیں، کئی ساری خوبیاں ہیں تم میں جو وقت آنے پر میں تمہیں بتاتی چلی جاؤں گی۔''

''پھر بھی، میں ایک آدھ تو جاننا چاہوں گا تاکہ مجھے اندازہ ہو جائے کہ تم کس نہج پر سوچ رہی ہو؟''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' پھر چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ ''انسان جذبات میں گندھا ہوا ہے۔ انسانی سرشت سے جذبات الگ کر دیئے جائیں تو پھر باقی کچھ بھی نہیں بچتا۔ بہت کم لوگوں میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ دولت، طاقت اور عظمت ان کی لونڈی بن جاتی ہے ورنہ جو لوگ جذبات کے منہ زور طوفان میں بہہ جاتے ہیں وہ حالات کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ رکمنی نے مجھے تمہارے متعلق بتایا ہے اور میں سمجھ گیا گئی ہوں کہ تم واقعی نایاب ہیرا ہو لیکن اس کی قدر و قیمت کا تمہیں احساس نہیں۔''

''میں خود میں ایسی کوئی خوبی نہیں پاتا۔''

''ایسا اس لیے ہے کہ تمہیں اپنے بارے میں پتہ نہیں ۔ ہیرے کو اپنی قدرو قیمت کا احساس کہاں ہوتا ہے اُسے تو جہاں رکھ دیا جائے پڑا رہتا ہے۔اتنی گہری نظر والا کوئی شخص تمہیں نہیں ملا ہوگا جو احساس دلا سکے کہ تم کیا ہو کیونکہ احساس دلانے والے کو بھی صاحب نظر ہونا چاہیے۔''

''کیا میں اسے اپنے علاج کا ایک حصہ تصور کروں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارے علاج کی شروعات ہو چکی ہیں۔اس کا اختتام کہاں ہوگا، یہ محض چند دن کی بات ہے۔ میں جو کچھ تمہارے متعلق کہہ رہی ہوں، یہ وہ سچ ہے جو تمہاری ذات کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔''

''کیا مجھے میرے علاج کے دوران آشرم سے جانے آنے کی اجازت ہوگی؟''

''نہیں، تم یہیں رہو گے ورنہ علاج کا تسلسل ختم ہو کر رہ جائے گا، گرو مہاراج کا ہی حکم ہے۔''

''کیا میں سوامی جی کے زیر علاج ہوں؟''

''اس میں کوئی شک نہیں، وہی تمہارا علاج کر رہے ہیں۔''

''میری ایک درخواست ہے۔۔۔''

''وہ کیا؟''

''میرے لیے اگر کوئی خدمت گار مقرر کرنا ہی ہے تو کسی مرد کو کیجئے۔''

''تمہاری خواہش کا احترام کیا جاتا لیکن اس آشرم کے اندر گرو مہاراج کے علاوہ مرد نہیں ہوتے، سبھی لڑکیاں ہیں۔ مرد خدمت گار آشرم سے باہر موجود ہیں جنہیں اندر آنے کی اجازت نہیں۔ اگر تم رکمنی کو پسند نہیں کرتے تو اور بات ہے، اس کے علاوہ تم کسی بھی خادمہ کو چن سکتے ہو۔''

''ابھی تم نے کہا تھا کہ میری ہر خواہش پوری کرو گی؟''

''مگر تمہاری یہ خواہش آشرم کے اصول کے خلاف ہے اور شجاع! تمہیں اس سے کیا کہ خدمت گار کوئی مرد ہو یا عورت؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا تو وہ کچھ دیر تک ''انسانی من'' کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا، یہاں تک کے مجھے زبردست نیند آنے لگی۔تب پھر شیوتیا نے مجھے وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔ میں اس کمرے سے باہر آیا تو رُکمنی باہر مستعد کھڑی تھی، وہ مجھے لے کر میرے کمرے میں آگئی۔ میں جو بیڈ پر پھیلا تو میری آنکھ اگلے دن

کھلی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک خالی الذہن بیڈ پر پڑا رہا، پھر اٹھ کر واش روم چلا گیا۔ میں واپس آیا تو رکمنی ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں سوال اٹھا کہ کیا وہ مجھے کہیں سے دیکھ رہی تھی کہ میں کب بیدار ہوتا ہوں، کیا وہ کسی خفیہ کیمرے سے میرے ایک ایک پل پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں؟ اس سوچ کے آتے ہی میں قدرے پریشان ہو گیا لیکن اس کا اظہار اپنے چہرے پر نہیں ابھرنے دیا۔

''آئیں، چائے پی لیں۔'' رکمنی نے کہا تو میری نگاہ میز پر دھری ہوئی ٹرے پر پڑی۔ میں اس کے سامنے جا بیٹھا۔ وہ چائے بناتے ہوئے بولی۔

''نیند کیسی آئی؟''

''بہت اچھی۔'' میں نے مختصراً کہا اور اس کے ہاتھ سے کپ لے لیا۔ جب تک میں چائے پیتا رہا، وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔ میں نے خالی کپ ٹرے میں رکھا تو وہ بولی۔

''آپ تیار ہو جائیں، کچھ دیر بعد گرو مہاراج آپ سے ملاقات چاہیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس لمحے رکمنی کے گداز بدن نے مجھے ذرا سا بھی متاثر نہیں کیا۔ میرا ذہن الجھ گیا کہ سوامی ہری داس سے کیا باتیں ہوں گی؟ چند لمحے یونہی بیٹھے رہنے کے بعد میں نے بے وقت کی سوچ کو ذہن سے جھٹکا اور اٹھ کر اپنے بیگ کی طرف بڑھا۔ اس وقت مجھے سگریٹ کی شدید خواہش ہو رہی تھی۔ میں نے پورا بیگ دیکھا لیکن سگریٹ کہیں نہیں تھے۔ تبھی میں نے سوچا کہ میرا سیل فون بھی بیگ میں تھا وہ بھی غائب تھا میں نے ایک بار پھر سے پورا بیگ چھان مارا مگر وہ دونوں چیزیں غائب تھیں۔

''کیا میں قید کر لیا گیا ہوں؟'' اس وقت میرے ذہن میں یہی سوال گونج رہا تھا۔ سگریٹ کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ وہ میرے علاج کے دوران نقصان دہ ہو سکتی ہے لیکن سیل فون کا نہ ہونا اس امر کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ میں فون کے ذریعے باہر کی دنیا سے رابطہ رکھوں۔ اگرچہ یہ ایک منفی سوچ تھی لیکن اس کا پیدا ہونا بعید از قیاس اس لیے نہیں تھا کہ وہ میری اجازت کے بغیر میرے بیگ سے لیا گیا تھا۔ ظاہر ہے، انہوں نے میرے بیگ کی تلاشی لی تھی اور انہیں میرے بیگ سے یہی قابل اعتراض اشیاء ملیں جو انہوں نے میرے پاس نہیں رہنے دیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے باور کرانا چاہتے ہوں کہ میں یہاں ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی کئی خیال ایک کے بعد ایک آ کر گزرتے چلے گئے۔ میں نے بیگ کی زپ بند کی اور واپس صوفے پر آن بیٹھا۔

من میں اٹھنے والی باتوں کا کوئی نہ کوئی رخ ضرور ہوتا ہے۔ یہ اگر مثبت راہ پر چل

نکلیں تو ذہن پرسکون ہوتا چلا جاتا ہے لیکن اگر یہی منفی سمت اختیار کرلیں تو پھر الجھاوے ہی الجھاوے ہیں جن میں انسان پھنس کر رہ جاتا ہے۔ میں اس وقت ایسے ہی الجھے ہوئے دائروں میں گھوم رہا تھا۔ پھر اچانک اس خیال کے ساتھ پرسکون ہوتا چلا گیا کہ میں یہاں کس مقصد کے لیے آیا ہوں۔ وہ اگر محتاط رویہ اپنائے ہوئے ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ مجھے اپنے کسی عمل سے انہیں یہ احساس نہیں ہونے دینا چاہئے کہ میں علاج کے لیے نہیں کسی اور مقصد کے لیے یہاں موجود ہوں۔ یہی سوچ کر میرا تپتا ہوا دماغ ٹھنڈا ہوتا چلا گیا اور پھر ذرا سی دیر میں پرسکون ہو گیا

رکمنی مجھے کہہ گئی تھی کہ وہ تھوڑی دیر بعد مجھے ہری داس کے پاس لے جانے کے لیے آئے گی، وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں اسی انتظار میں بیٹھا رہا کہ وہ کب آتی ہے۔ میں اس وقت خالی الذہن ہو بیٹھا تھا کہ نجانے کیوں مجھے نائلہ یاد آ گئی۔ ان دنوں جب میں زخمی ہوا تھا، اس نے میری تیمارداری کچھ اتنے خلوص سے کی تھی کہ میں اس کا احسان مند ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اب پاکستان میں تنہا تھی، یقیناً زندگی کی راہ پر وہ خود کو اکیلا محسوس کرتی ہو گی۔ میں اگر پاکستان میں ہوتا تو ضرور اس کے لیے کچھ کرتا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ تنہائی کہیں اس کے من میں نہ اتر جائے۔

''تم اس کے لیے کیا کر سکتے ہو؟'' اچانک ہی میرے ذہن میں یہ خیال گونجا۔ یہ ایک سنجیدہ سوال بھی تھا جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ کیا تم اسے اپنا سکتے ہو، اپنے جیون ساتھی کے طور پر قبول کر سکتے ہو؟ انہی سوالوں نے مجھے دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ میں ہاں اور ناں کی صلیب پر لٹک کر رہ گیا، میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ رکمنی آن وارد ہوئی۔

''آئیں، شجاع جی! گرو مہاراج آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ نکھری ہوئی تھی، اس کا لباس پہلے سے زیادہ مختصر ہو گیا تھا۔ اس وقت رکمنی نے ہلکے کاسنی رنگ کا تنگ سا بلاوز اور منی اسکرٹ قسم کی چولی پہن رکھی تھی، پیروں میں اسی رنگ کے ہلکے سلیپر اور بالوں میں زرد رنگ کے پھول سجائے ہوئے تھے۔ شاید وہ نہا کر آئی تھی کیونکہ اس کے بال گیلے تھے۔ رکمنی نے محسوس کیا کہ میں اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا ہوں، وہ پوری آنکھوں سے مسکرا دی اور تبھی میں نے کہا۔

''رکمنی! بیٹھو۔'' میرے کہنے پر وہ کسی روبوٹ کی طرح بالکل میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی، بیٹھنے کا انداز آگ لگا دینے والا تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جہاں برف

باری ہو رہی ہو، وہاں آگ کم ہی لگا کرتی ہے۔''میرے بیگ میں سگریٹ اور سیل فون نہیں ہے۔'' میں نے کہا تو اس کا چہرہ یکدم بجھ گیا۔ پھر دھیرے سے بولی۔

''جی، ماتا جی نے کہا تھا کہ میں یہ دونوں چیزیں سنبھال کر رکھ لوں۔ جاتے سمے یہ آپ کو لوٹا دی جائیں گی۔''

''لیکن مجھے اس وقت سگریٹ کی شدید طلب ہو رہی ہے اور میں بات بھی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میں یہاں رہتے ہوئے ان چیزوں کا استعمال نہیں کر سکتا؟''

''دیکھیں، مجھے جو حکم دیا گیا، میں نے اس پر عمل کیا۔ اب آپ کی یہ بات میں ماتا جی کو بتا دیتی ہوں مگر ابھی تو آپ گرو مہاراج جی کے پاس چلیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ میں نے مزید کوئی بات نہیں کی اور اس کے ساتھ چل دیا۔ اس بار جب میں کمرے سے باہر نکلا تو پورے حواسوں میں تھا۔ میں کمرے اور راہداریاں اور ان کی سمت ذہن میں رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ چلتا رہا، تھوڑی دیر بعد وہ ایک کمرے کے سامنے آن رکی۔

''گرو مہاراج جی اسی کمرے میں ہیں، آپ جائیں۔'' یہ کہہ کر وہ چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔ بڑے سے کمرے میں سوائے شویتا کے اور کوئی نہیں تھا۔ اس وقت وہ سفید چادروں کے لباس میں اور چمکتی ہوئی کالی مالا کے ساتھ تھی، مجھے دیکھتے ہی اٹھ گئی۔

''آیئے، شجاع جی! میں آپ کو گرو مہاراج سے ملواؤں۔'' اس نے دائیں طرف ایک دروازے کی سمت اشارہ کیا تو مجھے ان کی یہ پراسراریت عجیب سی لگی۔ بہر حال میں نے اس پر دماغ نہیں کھپایا اور اس دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ ہری داس میرے سامنے موجود تھا اور وہ میری ہی جانب دیکھ رہا تھا، اس کی سرخ انگارہ آنکھیں مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں۔

''آؤ، شجاع! بیٹھو۔'' اس نے انگریزی میں کہا تو میں کچھ کہے بغیر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ کمرے کے ماحول نے مجھے بے چین کر کے رکھ دیا تھا۔ گہرے پینٹ کی گئی دیواروں پر کالے پردے تھے۔ جس مسند پر ہری داس بیٹھا تھا، وہ بھی سیاہ تھی اور جو دو چادریں اس نے بدن پر لپیٹ رکھی تھیں وہ بھی کالی تھیں۔ مدہم روشنی میں یہ ماحول قدرے بھیانک لگ رہا تھا۔ کمرے میں وہی نامانوس سی مہک پھیل ہوئی تھی جس سے نشہ طاری ہوتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا تو وہ بولا۔

''بالکل سکون سے بیٹھ جاؤ۔ سارے خیال، فکر اور اندیشے ذہن سے نکال باہر کرو۔ ان میں سے کوئی شے بھی تمہارے ساتھ نہیں ہونی چاہئے۔ ایسا کہہ رہا ہوں کہ تم فقط مجھ پر اعتماد

کرو۔ ایسا کر کے تم محسوس کرو گے کہ تم کتنے پر سکون ہو گئے ہو۔ تمہیں پتہ ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت کیا ہے؟'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو رکا اور سوالیہ انداز سے میری جانب دیکھا۔ میں خاموش رہا تو وہ بولا۔ ''دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے پر سکون ذہن ہے، جو دنیا میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔''

''یہ تو ممکن نہیں، سوامی جی! کہ انسان سوچے ہی نہ، جب وہ زندہ رہنے کے لیے دنیا کے معاملات سے نبرد آزما ہوگا تو وہ پر سکون کہاں رہے گا؟''

''یہی بات تو میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ مسائل ہی کی وجہ سے پیدا ہونے والے پراگندہ خیال، ذہن کو بے سکون کر کے رکھ دیتے ہیں اور مسائل تبھی پیدا ہوتے ہیں جب وسائل دستیاب نہ ہوں۔ دنیا مادے سے تعلق رکھتی ہے اور مادیت ہمیشہ فنا کی سمت اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ ایسی صورت حال سے دو طرح سے نپٹا جاتا ہے یا تو وسائل کی تگ و دو چھوڑ دی جائے جیسے یوگی، سنیاس لینے والے سیناسی یا جوگی مہاراج بن باس لیتے ہیں۔ یہ ایک مثبت عمل ہے۔ وہ اپنے من سے رابطہ کرتے ہیں اور صلاحیتوں سے مالا مال ہو جاتے ہیں، تب وسائل پیدا کرنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا اور پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک وہ ہوتے ہیں جو وسائل کی تگ و دو میں لگ جاتے ہیں۔ جن کی بانہوں میں قوت ہوتی ہے اور ان پر قسمت بھی مہرباں ہو تو وسائل ان کے سامنے ڈھیر کی صورت میں آن موجود ہوتے ہیں۔ تب پھر ذہنی پراگندگی نہیں رہتی اور ذہن پر سکون ہو جاتا ہے۔ اصل میں درمیان والی جو کیفیت ہے، یہی بے سکون کر دیتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ انسان کو انتہا پسند ہو کر سوچنا چاہیے کہ وہ یا تو اتنی طاقت رکھتا ہو کہ ہاتھ بڑھائے اور وسائل کو اپنی دسترس میں کر لے یا پھر یکسر اس سے بے نیاز ہو جائے۔ یہی انتہا پسندی اسے اوج کمال پر لے جاتی ہے۔''

''کیا یہ انتہا پسندی مزید مشکلات کا باعث نہیں بنتی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس وقت، جب انسان کے پاس کسی طاقت کا سہارا نہیں ہوتا۔ جس قدر طاقت ور سہارا ہوگا، اسی قدر مشکلات بھی کم ہوں گی اور میں بتاؤں کہ وہ طاقت ہے روحانیت پر یقین کامل، انسان کیوں نہیں سمجھتا کہ ہمارا جسم جو محض مادہ ہے، اس میں جان کہاں سے آتی ہے۔ رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے، کس قوت کے بل بوتے پر؟ وہ ہے روح۔ جب روح نہیں رہتی تو یہ مادہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر سوائے اسے جلانے کے اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا مگر روح باقی رہتی ہے، وہ کسی اور روپ میں ظاہر ہو جاتی ہے۔''

''سوامی جی! یہ تو آپ ایک مخصوص نظریہ کا پرچار کر رہے ہیں۔ دنیا میں زندگی اور اسے پیش آنے والے مسائل ایک ٹھوس حقیقت ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ روح اور مادے کی یکجائی سے زندگی کی نمو کی ہے لیکن سارے معاملات محض روحانیت پر انحصار نہیں کرتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں روحانیت کا قائل نہیں مگر میں مادے کی ٹھوس حقیقت کو [illegible]ں۔ بھوک ایک احساس کا نام ہے لیکن کب تک؟ آخر مادی شے سے اس احساس کو ختم کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''بات وہیں آجاتی ہے، بالک! محض ایک عنصر پر انحصار کر کے انسان مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ وسائل جب دستیاب ہوں تو پھر نہ صرف خود اس سے استفادہ کرے بلکہ اسے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے۔ میں یہی بات تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میرے پاس تمہارے علاج کے لیے دونوں طرح کے وسائل ہیں، روحانی بھی اور مادی بھی، میں انہی سے تمہیں صحت مند کروں گا لیکن اس کے لیے تمہاری توجہ اور اعتماد ضروری ہے ورنہ میں جتنی بھی محنت کروں گا، وہ ضائع جائے گی۔''

''یہ آپ پر اعتماد ہی ہے، سوامی جی! کہ میں یہاں پر ہوں ورنہ میں یہاں کیوں آتا؟''

''مجھے اس کا احساس ہے اور میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری باتیں یاد ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا۔ ''آؤ، میرے قریب آؤ۔''

مجھے پنچ تھراپی کا تجربہ ہو چکا تھا اور دوسری بار شویتا نے میری گردن پر انگلیاں رکھی تھیں تو میرے اندر ہلچل ہوئی تھی۔ ایک لمحہ سے بھی کم وقت میں مجھے احساس ہو گیا کہ ہری داس بھی کوئی اس قسم کا ''چمتکار'' دکھائے گا۔ اگر ایسا ہے تو خطرے والی کوئی بات نہیں تھی لیکن اگر وہ ہپناٹائز وغیرہ کرنے کے چکر میں ہے تو قدرے مشکل ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے اندر کی تمام تر قوتوں کو جمع کیا اور بڑھ کر اس کی دسترس میں آگیا۔ اس نے اپنا چرخ قسم کا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کے چہرے کی جانب دیکھتا رہا جہاں کسی قسم کا کوئی جذبہ نہیں تھا، بالکل سپاٹ جیسے کسی مردے کا چہرہ ہو۔ کتنے ہی لمحے یونہی بیت گئے۔ وہ میرے ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ پھر میرے ماتھے پر یوں انگلیاں پھیرنے لگا جیسے ان دیکھے درد کو اپنی انگلیوں سے اکٹھا کر رہا ہو، یہاں تک کہ آخر میں اس نے یوں کیا کہ جیسے تمام جمع شدہ درد اس نے انگلیوں سے پکڑ لیا ہے اور ماتھے سے اٹھا کر پھینک دیا۔ تبھی اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہارا یہ درد کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی سائنسی توجیہات کیا

ہیں اور طبی ماہرین اس کی وجہ کیا بیان کرتے ہیں۔ میرا گیان کہتا ہے کہ یہ محض تمہاری اپنی سوچ کا نتیجہ ہے، اس کا علاج ہو جائے گا۔ پورے یقین سے کہتا ہوں کہ یہ درد پھر کبھی دوبارہ نہیں ہوگا۔''

''شکریہ، سوامی جی!'' میں نے آہستگی سے کہا اور قدرے فاصلے پر آرام دہ حالت میں بیٹھ گیا۔

''نہیں، تم میرے شکرگزار مت بنو بلکہ دوست بنو۔ دوستوں میں ایسی مضحکہ خیزیاں نہیں ہوا کرتیں۔'' اس نے یہ کہا اور پھر دوستی سے بات اٹھا کر بھاشن دینے لگا۔ اس کی بات کرنے کا انداز، مثالیں اور دلیلیں سب ہندی طرز فکر پر مبنی تھیں۔ میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کا لب لباب یہی تھا کہ انسان اس دنیا میں اپنی مرضی سے نہیں آیا اور اب جبکہ وہ یہاں آ ہی گیا ہے تو مجبور محض ہے۔ اسے یہاں زندہ رہنے کے لیے ایک قوت کی ضرورت ہے۔ یہ قوت کسی بھی قسم کی ہو۔ روحانی، مادی یا دونوں طرح کی۔ قوت حاصل کرنے کے بعد، اس سے بھرپور استفادہ ہی دراصل زندگی ہے ورنہ انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ تقریباً دو گھنٹے کی اس طویل ملاقات کے بعد اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں اس کے پاس سے اٹھا اور باہر نکل آیا جہاں شویتا کی بجائے رکمنی بیٹھی ہوئی تھی جو مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور چند قدم کے فاصلے پر دروازہ کھول کر کھڑی ہوگئی۔ میں باہر آ گیا تو وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ میں نے رکمنی سے کوئی بات نہیں کی بلکہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا اور صوفے پر یوں گرا جیسے بہت تھک گیا ہوں۔ وہ میرے دائیں طرف کھڑی رہی۔ جب کتنے ہی لمحے گزر گئے تو میں نے پوچھا۔

''رکمنی! کھڑی کیوں ہو؟''

''آپ نے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا اور نہ ہی جانے کے لیے، آپ کے کسی حکم۔۔۔'' اس نے کہنا چاہا مگر میں نے بات کاٹ کر کہا

''میں نے تمہیں یہاں آنے کے لیے بھی نہیں کہا، اس صورت میں تم کیا کہو گی، یہ پوز ختم کرو۔''

''میں یقیناً پوز نہیں کر رہی۔ آشرم کا حکم ہی یہی ہے میں آپ کی خدمت کروں، جیسی بھی خدمت آپ چاہیں، وہ حکم تو میں نے ماننا ہی ہے مگر میرا دل کرتا ہے کہ میں آپ کی خدمت کروں۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں چونک گیا۔ شاید یہ ہری داس یا شویتا کا نیا ''انداز ستم'' ہو، تب میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''ایسا کیوں ہے، رکمنی؟''

''کوئی تو شخص ہے اس دنیا میں جس نے میرے جسم کو نظرانداز کیا اور ایسا شخص جس میں عورت کو جیت لینے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہو، یہی بات متاثر کرنے والی ہے ورنہ جس کے پاس یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی وہ اگر ایسا پوز کریں تو یہ ان کی مجبوری ہوگی۔''

اس نے کہا تو مجھے لاہور ہی میں موجود ایک بوڑھے کی باتیں یاد آگئیں [redacted] مجھے اکثر سٹوڈیو میں ملا کرتا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ فلمی لوگوں کی دنیا اندھیر نگری ہے، یہاں ہر طرف اندھیرا ہے۔ یہ فلم اندھیرے میں بنتی ہے اور اندھیرا کر کے دیکھی جاتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے ان کے مقدر میں اندھیرا لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اسی بوڑھے شخص نے مجھے ایک بات سمجھائی تھی کہ بیٹا! مجھے تمہارے اطوار اور رویے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اعلیٰ نسب ہو مگر یہ مت بھولنا کہ یہاں قدم قدم پر گھڑھے ہیں۔ اگر ان میں گر گئے تو ساری اعلیٰ نسبی گڑھوں میں موجود کیچڑ میں پڑی رہ جائے گی۔ ایک طوائف، کال گرل یا اس قبیل کی دوسری عورتوں کے پاس سرمایہ کیا ہوتا ہے، فقط ایک جسم، اسی سے وہ لبھاتی، ریجھاتی اور اپنے دام کھرے کرتی ہے۔ اس کا جسم ہی اس کا جال ہے جس سے وہ دوسروں کو پھانستی ہے۔ تم جب اس کے جسم ہی کو نظرانداز کر دو گے تو اس کے پاس بچے گا کیا سوائے حیرت کے؟ ایسا کرنا جگر والوں کا کام ہوا کرتا ہے۔ اس بوڑھے شخص کے کہے ہوئے لفظوں کی تاثیر میں کئی بار محسوس کر چکا تھا اور ہر بار ایک ایسی لذت سے آشنا ہوا تھا جو بالکل منفرد اور انہونی تھی، شاید میں کسی کا جسم حاصل کر کے ایسی لذت نہ پا سکتا۔ رکمنی نے کوئی نئی بات نہیں کہی تھی، اس کا حیرت زدہ ہو جانا عین ممکن تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور اشارے سے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

''رکمنی! مجھے پرکشش جسم اور خوشگوار چہرے اچھے لگتے ہیں۔ اب یہی دیکھو تم مختصر لباس میں رہتی ہو جو مجھے اچھا نہیں لگتا مگر میں تمہیں کہتا اس لیے نہیں ہوں کہ مجھے روک ٹوک کا کوئی حق نہیں اور ۔۔۔ چھوڑو، مجھے تمہیں سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے ایک بڑا سوالیہ نشان چھوڑ کر اسے مزید اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں کیا کہنا چاہتا تھی، یہی تجسس کافی تھا جو امر بیل کی طرح اس سے لپٹ جاتا۔ وہ میری طرف دیکھتی رہی اور میں خاموشی سے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا جہاں التجائیں ہلکورے لے رہی تھیں۔ کتنے ہی لمحے یونہی گزر گئے۔ تب اس نے اپنی اسکرٹ میں ہاتھ ڈالا اور میرا سیل فون میرے سامنے کر دیا۔

''آپ چاہیں تو بات کر لیں مگر ماتا جی کو معلوم نہ ہو۔''

''نہیں، رکمنی! ایسے نہیں۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے میرا احساس کیا مگر میں ایسے لاچاری والے لمحوں سے فائدہ نہیں اٹھایا کرتا۔ اسے لے جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

''کیا میری باتیں بھی آپ کو اچھی نہیں لگتیں؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''تم کیا بات کرو گی، تمہاری باتوں سے تو شویتا کے احکام ادا ہوتے ہیں، تم جاؤ۔'' میں نے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ میں صوفے سے اٹھ کر بیڈ پر چلا گیا، لیٹتے ہی نیند نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ میری نیند اچانک ہی ٹوٹ گئی تھی اور پھر میں جیسے ہی حواسوں میں آیا تو مجھے نیند ٹوٹ جانے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ میرے بیڈ پر پاؤں جانب رکمنی سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ میری طرف مسلسل دیکھ رہی تھی، تب اچانک ہی غصہ میرے دماغ میں سما گیا اور میرا جی چاہا کہ نیچے پٹخ دوں مگر اگلے ہی لمحے خیال آیا کہ یہ تو بے چاری ملازمہ ہے، یہ تو وہی کرے گی جو اسے کہا جا رہا ہے۔ اسے احکامات کون دے رہا تھا، شویتا یا ہری داس؟ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔

''خیریت، تم یوں کیسے بیٹھی ہو؟''

''ماتا جی نے کہا ہے کہ کھانا کھا لیں، دوپہر ڈھل رہی ہے۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔

''انہیں کہو کہ مجھے بھوک نہیں ہے اور میں سونا چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں دوبارہ لیٹ گیا۔

''ٹھیک ہے، آپ آرام کریں۔'' یہ کہہ کر وہ بیڈ سے اتری اور واپس چلی گئی۔ وہ کمرے سے نکلی تو یونہی اوٹ پٹانگ سوچیں ذہن میں آنا شروع ہو گئیں۔ پھر نیند تو نہ آئی لیکن یونہی سوتے جاگتے خاصا وقت بیت گیا۔ دوپہرے ڈھلے رکمنی پھر آ گئی۔ اس نے پلیٹ میں ایک گلاس رکھا ہوا تھا، مجھے جاگتا ہوا پا کر بولی۔

''یہ پی لیں تو پھر چلیں۔''

''اب کہاں جانا ہے؟'' میں نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے میں حد درجہ نرمی تھی۔

''اشنان کے لیے۔'' اس نے بنا تاثر کے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں نے مشروب کو سونگھا، بڑی خوشگوار مہک تھی۔ ایسا مشروب وہ مجھے پہلے بھی پلا چکی تھی۔ میں نے گلاس خالی کیا اور اٹھ کے اس کے ساتھ چل دیا۔ میں نے راستے میں محسوس کیا کہ اس مشروب کے پی

لینے کے باعث میرا دماغ نشے کی سی کیفیت میں آ گیا ہے۔ وہ مجھے اس کمرے میں لے گئی جہاں چھوٹا سا تالاب تھا اور جس میں گدلا مگر خوشبودار پانی تھا۔ اس کی سطح پر تازہ پھول تیر رہے تھے۔ کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا، تبھی مجھے وہاں دو اور لڑکیاں نظر آئیں۔ وہ بھی رکمنی جیسا مختصر لباس پہنے ہوئے تھیں اور ان کی مسکراہٹ بے تکلف ہو جانے کا عندیہ دے رہی تھی۔ میرے بدن میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ صنف مخالف کے لیے کشش اپنا آپ منوانے کے درپے ہوگئی تو مجھے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ میں اس کیفیت سے ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ تھاما اور بڑی نازکی سے فرش پر بچھی دری تک لے آئی۔ اتنے میں رکمنی خوشبودار تیل لے آئی، وہ تینوں میرے بدن پر مساج کرنے لگیں اور میں اپنی اسی کیفیت میں ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ میں بہک جانے کی حد کے قریب تھا کہ مساج سے ہونے والی ہلکی ہلکی جلن نے میری توجہ میرے اندر ہلکورے لیتی ہوئی کیفیت سے ہٹا دی اور میں پرسکون ہوتا چلا گیا، یہی وہ لمحہ تھا جب میں خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت تک مجھے احساس ہو گیا کہ وہ میرے بدن کا راز پا چکی ہیں۔ کچھ دیر بعد میرا جسم پسینے سے تر ہو گیا تو وہ مجھے اٹھا کر تالاب تک لے گئیں۔ میں پانی میں داخل ہوا تو اک سکون کا احساس میرے رگ و پے میں سرائیت کر گیا، اک سرشاری مجھ پر طاری ہونے لگی۔ تبھی انہوں نے مجھے تالاب سے نکالا اور حمام کی راہ دکھائی۔ میں نہا چکا تو رکمنی دو سفید چادریں لیے کھڑی تھی۔ میں نے انہیں اوڑھا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس وقت تک سورج اپنی صف لپیٹ چکا تھا مگر مجھ پر سرشاری والی کیفیت طاری تھی اور میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا...... پتہ نہیں کتنا وقت گزرا ہوگا کہ رکمنی آ کر مجھے ساتھ لے گئی۔ وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گئی جہاں میں پہلی بار آیا تھا۔ اس کمرے کی آرائش بہت زبردست تھی، گلابی رنگ ہر شے سے ٹپک رہا تھا۔ فرش پر بچھے قالین پر دستر خوان سجا ہوا تھا۔ میں ابھی بیٹھا بھی نہیں تھا کہ شویتا آ گئی، وہ میٹھی مسکان سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''پدھاریئے، شجاع جی۔!'' میں نے آلتی پالتی ماری تو وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد کھانا چن دیا گیا۔ کھانے کے دوران وہ مجھ سے میرے متعلق یونہی ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی اور میں جواب دیتا رہا۔ یہ سب میرے پروفیشن سے متعلق باتیں تھیں، تب کھانا بھی ختم ہو گیا مگر باتیں چلتی رہی۔ یوں مجھے بھی کافی دن بعد کھل کر باتیں کرنے کا موقعہ ملا تھا اور دوسرا نشیلی کیفیت بھی مجھ پر طاری تھی۔ مجھے وقت کا احساس نہیں تھا، یونہی باتوں کے دوران شویتا نے کہا۔

''آئیں، ذرا محفل کا رنگ جما دیں۔''

''محفل اور رنگ؟'' میں نے قدرے کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

''یہ جو لڑکیاں یہاں پر ہیں یہ محض خادمائیں ہی نہیں، ہر طرح کا ہندی ناچ بھی ان پر ختم ہے، آئیں۔'' شویتا نے اٹھتے ہوئے کچھ اس ادا سے کہا کہ اس میں اور کوٹھے کی نائیکہ میں کوئی فرق دکھائی نہ دیا۔ میں اس کے ساتھ اٹھ گیا۔ انہی دروازوں میں گزرتے ہوئے ہم ایک ہال نما کمرے میں آ گئے۔ وہاں پر کئی لڑکیاں ''دعوت نظارہ'' دیتے ہوئے لباس میں موجود تھیں۔ وال ٹو وال کارپٹ پر فرشی نشست تھی۔ ایک طرف قالینوں سے بنی مسند پر میں اور شویتا جا بیٹھے تو ہلکی ہلکی موسیقی گونجنے لگی، یقیناً دیواروں میں اسپیکر نصب تھے۔ ہلکی موسیقی کا ردھم تیز ہوتا گیا اور سامنے موجود جسم جھولنے لگے۔ یہاں تک کہ ان میں ہیجان آ گیا۔ بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ اگر محفل نشاط میسر آ جائے تو انسان کے حواس گم ہو جانا یقینی امر ہوتا ہے۔ میرے حواس بھی میرا ساتھ چھوڑنے لگے۔ جنس مخالف، ہیجان اور امتحان کے درمیان لٹکا ہوا شخص بلاشبہ کرب و اذیت کے مرحلے میں ہوتا ہے، اس وقت میں بھی ایسی ہی کسی حالت میں تھا۔ حواس کس قدر بے وفا ہوتے ہیں، یہ میں نے ان لمحوں میں جانا۔ عام حالات میں تو انسان بڑے بلند و بانگ دعوے کرتا رہتا ہے مگر ان دعوؤں کی حقیقت اس وقت کھلتی ہے جب کوئی امتحان درپیش ہو۔ گم ہوتے ہوئے حواسوں کے درمیان میں نے خود کو سرزنش کی اور اس خیال کو ذہن میں جگہ دی کہ میرے سامنے کون لوگ ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں، کیا میں پگھل کر ان کی خواہشوں کے مطابق نہیں ڈھل رہا۔ میں کیا ہوں اور مجھے یہاں کس طرح رہنا ہے؟ یہی بات اپنے آپ کو یاد دلائی تو شاید میرے حواسوں کو غیرت آ گئی، میں اپنے آپ میں آنے لگا۔ پھر وہ میرے اندر ہیجان برپا کرنے کے لیے کر رہی تھیں تو ان کی ساری محنت رائیگاں گئی تھی۔ رات گئے جب میں وہاں سے اٹھا تو میرے اندر امتحان سے کامیاب ہونے کی خوشی تھی اور یہ خوشی عجیب منفرد لذت رکھتی تھی۔

وہ آشرم میں میرا پانچواں دن تھا۔

میں کمرے میں پڑا یونہی بے سر و پا خیالوں سے الجھا ہوا تھا۔ انہوں نے وہ سب کچھ کیا جس سے میں اپنی روش چھوڑ کر ان کی راہ پر آ جاؤں لیکن میں نہ ٹوٹ سکا۔ مجھے ان لمحوں کا انتظار تھا جب وہ اس راستے کو چھوڑ کر دوسری طرح اپنا مدعا میرے سامنے رکھتے اور ایسا مجھے دور دور تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ طے شدہ انداز سے میرے ساتھ پیش آ رہے تھے۔ علی الصبح

مجھے اٹھا دیا جاتا، رکمنی مجھے یوگا کی مشقیں کروانے لگتی۔ اس دوران وہ ساحل سمندر پر پہنے جانے والے لباس میں ہوتی۔ میں نے ایسی مشقیں کبھی نہیں کیں تھیں مگر جس طرح وہ کہتی، میں کرتا چلا جاتا۔ پھر سوئمنگ پول میں نہانے کے بعد ناشتہ کرتا اور مجھے سو جانے کی ہدایت کی جاتی۔ ناشتے میں ایک خاص قسم کا جوس پلایا جاتا جس کا ذائقہ نمکین ہوتا تھا۔ دوپہر سے ذرا پہلے مجھے ہری داس کے پاس جانا پڑتا جہاں ایک بھاشن تیار ہوتا۔ پھر کھانے کے بعد مجھے آرام کرنے کے لیے کہہ دیا جاتا۔ میں کچھ دیر ٹہلتا۔ پھر وہی مشروب، سرشاری کی کیفیت، اشنان، نئی چادریں کھانا اور آئے دن نئے ہیجان خیز مناظر کے حوالے کر دیا جاتا۔ میں بے سکون تو ہوا، میں نے سمجھ لیا کہ یہ اک معمول اور امتحان ہے جس سے بہر حال مجھے کامیاب گزرنا ہے میں ان منظروں سے الجھتا، ہری داس کی باتوں کو سمجھتا، شویتا کے اطوار دیکھتا اور رکمنی کی خدمت جانچتے ہوئے محسوس کرنے لگا کہ ان لمحات تک میں کامیاب ہوں۔ یہ خالصتاً ایک اعصابی جنگ تھی۔ اس میں قوت برداشت اور صبر ہی وہ ہتھیار تھے جن سے میں اپنے دشمنوں کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ میں ان ہتھیاروں کو کند نہیں ہونے دے رہا تھا۔ یہ حوصلہ مجھے اس یقین سے ملا کر سوامی ہری داس کے پاس ہو سکتا ہے چند عام قسم کے چمتکار ہوں اور وہ بڑا سنیاسی بھی ہو سکتا ہے لیکن ان روحانی صلاحیتوں سے محروم تھا جس سے کسی کے من کا بھید پایا جا سکتا ہے۔ اس کے بارے میں عجیب و غریب قسم کے افسانے گھڑ کے اسے بزعم خود بڑے استھان پر بٹھا دیا گیا تھا تا کہ اس کی دھاک بیٹھ جائے جبکہ ایسا کچھ نہیں تھا، محض دوکانداری تھی جسے اس لے حواریوں نے چمکایا ہوا تھا۔ میں اسے بھی سمجھ رہا تھا اور اس کے ساتھ آشرم کے اندر اور باہر جو تا سکیورٹی کا نظام تھا، اس سے پوری طرح واقف ہو گیا۔ آشرم فرنچ طرز پر بنی ہوئی عمارت تھی جسے ہندوانہ سٹائل سے سجایا گیا تھا اور امریکن طرز پر سکیورٹی تھی جسے توڑنا اتنا مشکل نہیں تھا میں مطمئن تھا اور میں دن بہ دن حوصلہ مند ہوتا چلا جا رہا تھا۔

سہ پہر ہو چکی تھی اور میں بیڈ پر پڑا لاشعوری طور پر اس انتظار میں تھا کہ رکمنی آ گی، مشروب پلانے کے بعد اشنان کے لیے تالاب تک لے جائے گی۔ تبھی شویتا آ گئی۔ معمول سے ہٹ کر تھا۔ اس کا یوں آنا اور وضع قطع بھی۔ وہ ہمیشہ سفید چادروں میں رہا تھی اور اس کے ہاتھ میں کالے موتیوں کی مالا رہتی تھی۔ میں نے اسے پہلی چادروں سوائے ایک رات کے پھر کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اس سہ پہر وہ گہرے کلر کی ساڑھی میک اپ اور پھولوں کے زیور سے سجی ہوئی آن وارد ہوئی۔ اس نے ایسا پرفیوم لگا رکھا تھا کمرے میں آتے ہی مسحور کن خوشبو پھیل گئی۔ بس ایک لمحہ مجھ پر حیرت طاری ہوئی اور

سمجھ گیا کہ اب یہ نئی طرح کی افتاد مجھ پر آن پڑی ہے۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور وہ میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے انگریزی میں بولی۔

''کیسے ہو؟'' اس کے لہجہ میں قدرے طنز تھا جس کی مجھے سمجھ نہیں آئی، تبھی میں نے دھیرے سے کہا۔

''ٹھیک ہوں۔''

''ہاں، تمہیں ٹھیک ہی ہونا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی جس میں تضحیک تھی۔

''میں سمجھا نہیں، تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

''تم اس لیے نہیں سمجھ سکتے، پیارے! کہ تم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ تم نے وہ محاورہ سنا ہے، بندر کیا جانے ادرک کا سواد؟'' اس نے کہا تو میں خاموش رہا۔ میں اس کے انداز سے کچھ اور سمجھا تھا لیکن وہ کسی اور پٹڑی پر چل نکلی تھی۔ اس کے طنزیہ اور تضحیک بھرے لہجے سے میرے اندر غصہ ابھرنے لگا۔ وہ میرے متعلق بالکل بے سروپا باتیں کرنے لگی جس میں میری ہتک کرنے کا پہلو تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے میرے نزدیک ہوتے ہوئے اپنا ہاتھ میری گردن پر رکھ دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس طرح میرے بدن میں جھرجھری پیدا ہوگی اس لیے میں ذہنی طور پر تیار تھا لیکن پھر بھی ہلکا سا اثر میرے جسم پر ضرور ہوا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے میرے شانوں پر پھیلی چادر اتارنے لگی تو میں نے کوئی مزاحمت نہ کرتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''شویتا! تم چاہتی کیا ہو؟''

''ایک بندر کو ادرک کے مزے سے آشنا کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا تو اچانک ہی غصے کی گرمی میرے دماغ کو چڑھ گئی۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ آشرم میں کوئی اہمیت رکھتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اپنا قیدی یا غلام تصور کرتے ہوئے حقارت سے پیش آئے۔

''شویتا! کیا تم میری مرضی کے بغیر اپنی خواہش پوری کر سکتی ہو؟''

''تمہاری اوقات ہی کیا ہے۔ ایک ایسا شخص جسے میں جب چاہوں، اپنی دسترس میں رکھ سکتی ہوں۔ تمہیں میرے اشاروں پر ناچنا ہوگا اور وہ بھی میوزک کے بغیر۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے چادر کھینچ کر پرے پھینک دی تو میں تن کر بیٹھ گیا اور انتہائی غصے سے کہا۔

''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہارا قیدی ہوں؟''

''احمق لوگوں کی طرح باتیں مت کرو بلکہ کسی اچھے غلام کی طرح خاموشی سے میرے تلوے چاٹو۔''اس نے کہا تو میر دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں نے بیڈ سے اترتے ہوئے کہا۔

''میں اس آشرم سے جا رہا ہوں، تم اگر روک سکتی ہو تو روک لو۔''

''تم اپنی یہ خواہش بھی پوری کر کے دیکھ لو۔''اس نے اطمینان سے کہا اور بیڈ پر دراز ہوگئی۔ میں نے سلیپر پہنے اور باہر جانے کے لیے لپکا تو وہ بولی۔

''تم برآمدہ بھی پار نہیں کر سکتے، باہر سیکورٹی۔۔۔''

''کوئی بھی ہو، مزاحمت کرنے پر گولی ماردیں گے تو ماردیں۔''

''کون کہتا ہے کہ تمہیں قتل کیا جائے گا؟ بس تمہیں اس صلاحیت سے محروم کر دیا جائے جس پر تم فخر کرتے پھر رہے ہو۔ پھر تمہیں ہیجڑوں کی ٹولی کے ساتھ چھوڑ دیا جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ زہریلے لہجے میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔''اب بھی تم کون سا مرد ہو، ہیجڑہ ہی تو ہو۔''

''میں عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہاری گردن بھی نہ دبا سکوں۔''میں نے شدت غضب سے کہا تو اچانک میرے سر میں درد کی شدید لہر اٹھی، یہ اس قدر تیز تھی کہ میں گھوم کر رہ گیا۔ میں اس سے سنبھلا بھی نہیں تھا کہ میری ناک میں سرسراہٹ ہونے لگی اور یکدم ہی خون بہہ نکلا۔ اس وقت میرے گمان میں یہی تھا کہ انتہائی غصے کے عالم میں میرے دماغ کی کوئی شریان پھٹ گئی ہے اور میں برین ہیمرج کا شکار ہو گیا ہوں۔ میں نے لاشعوری طور پر ناک سے بہنے والے خون کو روکنا چاہا تو شویتا چیختے ہوئے بولی۔

''بہنے دو، اس خون کو بہنے دو۔''پھر وہ رکمنی کو آوازیں دینے لگی، شاید وہ کہیں باہر کھڑی تھی اس لیے لمحوں میں آگئی۔ اتنی دیر تک میرا منہ، سینہ اور چادر خون سے لتھڑ گئے۔ شویتا نے مجھے پکڑا اور ملحقہ باتھ روم میں لے گئی اور میرے سر پر پانی ڈالنے لگی۔ دھیرے دھیرے میرے دماغ میں سلگنے والی آگ ٹھنڈی ہونا شروع ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا، میرے سر میں درد نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد خون بند ہو گیا، اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد شویتا نے کہا۔

''خوب اچھی طرح نہا لو۔'' یہ کہہ کر وہ باتھ روم سے نکل گئی، اس کی ساڑھی بھی میرے خون سے تر ہو چکی تھی۔ نہانے کے دوران ہی ایک سوچ میرے دماغ میں گردش کرتی رہی کہ میں کہیں ان دشمنوں کے درمیان نہ مرجاؤں۔ اگر خدانخواستہ خون بند نہ ہوتا اور ہسپتال

جانے کی نوبت آ جاتی تو کیا یہ لوگ مجھے ہسپتال لے جاتے؟ نہیں، وہ مجھے قطعاً نہ لے کر جاتے۔ اس طرح ان کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو جاتا کہ وہ مجھے مکمل صحت مند کر دیں گے۔ وہ جو ان کے عقیدت مندوں پر ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، ختم ہو کر رہ جاتی اور پھر شویتا کا یہ گھٹیا برتاؤ آشرم میں رہنے پر لکیر پھیر رہا تھا۔ میں نے جلدی کی جو علاج کے چکر میں یہاں آ گیا، مجھے صحت مند ہو کر یہاں آنا چاہئے تھا اور بہانہ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ ایسا ہی سوچتے ہوئے میں نہایا اور پھر تولیہ لپیٹ کر باہر آ گیا۔ میرے خیال میں تھا کہ رکمنی چادریں لیے کھڑی ہو گی اور میں اسے منع کر کے اپنے کپڑوں پہنوں گا لیکن بیڈ پر نئی چادر کے اوپر ایک سوٹ رکھا ہوا تھا، شویتا وہاں نہیں تھی

''آپ یہ سوٹ پہن لیں۔'' رکمنی نے کہا تو میں نے ان کپڑوں کی طرف دیکھا۔ یہ ان میں سے نہیں تھے جو میں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ میں نے کوئی بات نہیں کی، انہیں غنیمت سمجھتے ہوئے پہننے لگا۔ میں ٹائی کی گرہ لگا چکا تو رکمنی میرے لیے جوتے اور موزے لے آئی جو بالکل نئے تھے۔ میں نے وہ پہنے اور بیگ اٹھانے کی زحمت کیے بغیر باہر کی طرف جانے لگا تو رکمنی نے بہت پیار سے کہا۔

''آپ ٹھہریئے، ماتا جی ابھی آتی ہوں گی۔''

''مجھے یہاں سے جانا ہے، ابھی اور اسی وقت، سیکورٹی والوں سے میں خود نپٹ لوں گا۔'' میں نے کہا اور قدم بڑھا دیئے، تبھی شویتا دروازے میں آن موجود ہوئی۔ وہ اپنے معمول کے لباس میں تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور پیار بھرے انداز سے کہا۔

''تم جانا چاہتے ہو یہاں سے؟''

''روک سکتی ہو تو روک لو۔'' میں نے کہا تو وہ نرمی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔

''میں تمہیں خود چھوڑ کر آتی ہوں، آؤ، چلیں۔'' یہ کہہ کر وہ انہی قدموں پر پلٹ گئی میں نے ایک لمحہ کو سوچا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ مختلف راہداریوں سے گزرتے ہم پورچ میں آ گئے، جہاں چمچماتی لیموزین کھڑی تھی۔ آشرم سے باہر آئے تو میرے ساتھ بیٹھی شویتا نے کہا۔

''ہم پہلے ڈاکٹر کے پاس جائیں گے، اسی ڈاکٹر کے پاس جس نے تمہارے ٹیسٹ لیے تھے۔ وہاں پر ایک بار پھر سارے ٹیسٹ ہوں گے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمارے خیال میں اب تمہارا وہ ''برین ٹیومر'' نہیں رہا۔''

’’یہ کیسے ممکن۔۔۔‘‘میں کہتے کہتے رک گیا تو وہ بولی۔

’’شجاع! گرومہاراج کا حکم تھا کہ میں جان بوجھ کر اتنا غصہ دلاؤں کہ تم پھٹ جاؤ۔ ایسا ہی ہوا اور تمہاری ناک سے خون بہہ نکلا۔ انہوں نے جس طرح کہا تھا، ویسے ہی ہوا۔ یہ چمتکار ہے گرومہاراج کا۔ تم چاہو تو ٹیسٹ کروا کے اپنا اطمینان کر سکتے ہو۔‘‘اس نے کہا تو میں خاموش رہا۔ شویتا کے چہرے پر سنجیدگی پھیل چکی تھی۔ کافی دیر بعد میں نے کہا۔

’’اس ڈاکٹر سے تو پہلے وقت لینا پڑتا ہے۔‘‘

’’میں نے اسے فون کر دیا ہے، وہ ہمارے انتظار میں ہے۔‘‘اس نے اطمینان سے کہا اور میری طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرا دی۔ میں ہسپتال آ جانے تک خاموش رہا۔ ڈاکٹر ہمارے انتظار میں تھا۔ اس وقت شام ڈھل چکی تھی جب ٹیسٹ وغیرہ کے بعد ہم وہاں سے نکلے، پارکنگ میں آ کر شویتا نے کہا۔

’’تمہیں پتہ ہے، کل صبح ہی فائنل رپورٹ ملے گی، اب بولو، گھر جانا چاہتے ہو یا آشرم؟‘‘میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً کہا۔

’’آشرم۔‘‘میں پہلے ہی سوچ چکا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ واپس آشرم ہی جانا ہے تا کہ میں انہیں یہ باور کرا سکوں کہ برف ٹوٹ گئی ہے۔ واپسی کا سارا راستہ خاموشی سے کٹ گیا۔ پورچ میں گاڑی رکی تو چند خادماؤں کے ساتھ رکمنی وہاں موجود تھی۔ وہ ہمیں لیتی ہوئی اسی کمرے میں چلی گئی جہاں کھانا کھایا جاتا تھا۔ دستر خوان ویسے ہی بچھا ہوا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی کھانا چنا جانے لگا۔ اس دوران شویتا باتیں کرتی رہی۔ میرے پاس کہنے کے لیے اس وقت کچھ بھی نہیں تھا اس لیے بس سنتا رہا۔ کھانے کے بعد مجھے وہیں ساتھ والا کمرہ دے دیا گیا۔ میں کچھ دیر حالات پر غور کرتا رہا پھر نجانے کب مجھے نیند آ گئی۔

اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں کتنی دیر تک یونہی بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر کھڑکی سے پردے ہٹا دیئے۔ باہر صبح روشن ہو چکی تھی، سامنے ہی لان تھا اور اس میں بہت زیادہ تعداد میں خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے۔ میں کتنی ہی دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ پھر کسی کی آمد کے احساس کے ساتھ پلٹا، رکمنی چائے کی ٹرے اٹھائے کھڑی تھی۔ اس وقت وہ پورے لباس میں تھی، وہ مجھے بہت خوبصورت لگی۔

’’شجاع جی! چائے پی لیں۔‘‘اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور میز پر ٹرے رکھ دی۔

’’میں نہیں پیئوں گا۔‘‘میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

''وہ کیوں؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''اس لیے کہ تم صرف ایک کپ لاتی ہو۔ اگر تم میرے ساتھ بیٹھ کر چائے۔ پیؤ تو پھر میں پی لوں گا۔''

''ایسا ہے کیا۔؟'' اس نے شوخی سے کہا اور بیڈ کے ساتھ رکھے فون سیٹ سے کسی کو ایک کپ مزید لانے کو کہا، پھر میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ چند منٹ میں ایک خادمہ خالی کپ دے گئی۔ رکمنی نے چائے بنائی، پہلا سپ لے کر اس نے پوچھا۔

''شجاع جی! ایسی تبدیلی کیوں؟''

''تم پہلی بار پورے کپڑے پہن کر آئی ہو، اس خوشی میں۔'' میں نے کہا تو اس کے چہرے پر عجیب سی اداسی چھا گئی جیسے میں نے کوئی اچھی بات نہ کہی ہو۔ میں نے اپنا اس تاثر کا اظہار اس پر کیا تو وہ اداس لہجے میں بولی۔

''ایسا نہیں ہے، شجاع جی! انسان ہوں نا، بعض اوقات بھول جاتی ہوں کہ ہم اپنی مرضی کسی کے ہاں گروی رکھ چکے ہیں، چائے کیسی بنی ہے؟ میں نے خود بنائی ہے۔'' آخری فقرہ کہتے ہوئے وہ ہنس دی۔

''بہت اچھی ہے۔'' میں نے کہا اور پھر یونہی باتیں کرتے رہے۔ چائے پی چکے تو اس نے کہا۔

''آپ فریش ہو جائیں۔ میں کچھ دیر میں ناشتہ لاتی ہوں، پھر آپ نے گرو مہاراج جی کے پاس جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ برتن اٹھا کر چلی گئی۔

میں سوامی ہری داس کے سامنے جا بیٹھا تو اس نے ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور سامنے دھری چھوٹی سی فائل میرے آگے کر دی۔

''یہ ہے تمہارے کل والے ٹیسٹوں کی فائنل رپورٹ، جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اب تمہیں کوئی بیماری لاحق نہیں۔ یہ اسی ڈاکٹر کی رپورٹ ہے جس نے تمہیں برین ٹیومر کے بارے میں بتایا تھا۔''

''سوامی جی! رپورٹ اتنی جلدی آ گئی؟''

''رات دو بجے یہ میرے پاس پہنچ چکی تھی۔ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے، بالک!'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا، پھر قدرے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہو سکتا ہے، اس سے تم یہ سمجھو کہ دولت کے بل بوتے پر خود ساختہ رپورٹ تیار کروالی گئی ہے لیکن میرے خیال

میں یہ ایک بچکانہ سوچ ہوگی۔''

''سوامی جی! میں نے بداعتقادی کا اظہار نہیں کیا، میں تو بس حیران تھا کہ رپورٹ اتنی جلدی آ گئی۔؟''

''اتنا حیرت زدہ نہیں ہوتے ، طاقت اپنے وسائل خود لاتی ہے، جیسے یہ دولت کی طاقت۔۔۔''

''میں دولت کی طاقت کو مانتا ہوں، سوامی جی! اس دور میں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے سوامی کے چہرے کی طرف دیکھا اور وہ بات کہہ دی جس کے لیے میں سوچ چکا تھا۔'' آپ نے مجھے پر دیا کی ہے، میں آپ کے اس احسان کا بدلہ تو نہیں چکا سکتا البتہ آپ کی خدمت ضرور کر سکتا ہوں۔ اگر چہ یہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے لیکن پھر بھی مجھے بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' میں نے کہا تو اس کی آنکھیں یکدم چمک اٹھیں مگر وہ سوچنے والے انداز میں خاموش رہا، تب میں نے کہا۔'' کیا سوچنے لگے، سوامی جی! کیا میں کسی خدمت کے لائق بھی نہیں ہوں؟''

''بات یہ نہیں، بالک! تم کس لائق ہو، یہ ہم جانتے ہیں ۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ایسی کون سی خدمت ہو سکتی ہے جو تمہارے شایان شان ہو؟'' یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا دیا اور میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اس خاص نکتے پر لا رہا ہے جس کے لیے انہوں نے اتنی محنت کی تھی۔

''ایسا بھی کیا، سوامی جی! میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔''

''تم ایک بات بتاؤ، بالک! تمہارے سامنے دولت کا انبار لگا دیا جائے اور ایسا کام کرنے کے لیے کہا جائے جس سے انسانوں کی بھلائی بھی ہو لیکن کچھ لوگوں کی بھرپور مخالفت کا سامنا ہو، ایسے میں تمہارا فیصلہ کیا ہوگا؟''

''یقیناً میں دولت کے حق میں فیصلہ دوں گا کیونکہ یہی سب سے بڑی حقیقت ہے اور پھر میں کوئی سوشل ورکر تو ہوں نہیں کہ معاشرے کی خدمت ہی کرتا چلا جاؤں۔''

''لیکن جہاں تک مجھے تمہارے بارے میں معلوم ہے، تم نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی؟''

''میں آپ کے سوال کا جواب ضرور دوں گا لیکن آپ مجھے کب سے جانتے ہیں؟''

''جب لاہور میں تم پر قاتلانہ حملے ہو رہے۔'' اس نے ڈرامائی انداز میں کہا تو میں قدرے سمجھ گیا کہ وہ مجھے تب سے جانتا ہوگا پھر بھی میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

''تب سے، سوامی جی۔۔۔''

"میرا خیال ہے کہ میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا ہے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا تو میں نے اصرار کرنے کی بجائے کہا۔

"دولت مند ہو جانے کی خواہش میں نے اپنے دل میں ضرور رکھی، اس کا اظہار نہیں کیا لیکن میں محض محنت سے وہ گراف حاصل نہیں کر سکتا، اس معیار تک نہیں پہنچ سکتا جس کی تمنا میرے اندر روز بروز مضبوط ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے لیے ایسا ضرور کرنا پڑتا ہے جس میں اخلاقیات وغیرہ کی کوئی گنجائش نہ ہو، میرا اپنا معیار ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اگر مجھے بکنا ہی ہے تو کم قیمت پر نہ بکوں۔ اپنی قیمت اچھی لگواؤں، ایسی قیمت جو میرے معیار اور میری اپنی شرائط کے مطابق ہو اور کام اس کی مرضی کا جس نے مجھے دولت دینی ہے۔ اگر آپ میرے بارے جانتے ہیں تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ آج تک مجھے ایسا کوئی موقعہ نہیں ملا سوامی جی، آج تک مجھے میرا خریدار نہیں ملا تو میں ایسی کوشش کیوں کرتا؟"

"بہت خوب، اچھے وچار ہیں۔ ہم قدر کرتے ہیں تمہاری، ہمارے پاس ایسا ایک کام ہے جس میں تمہاری تمنا سے بھی ماورا دولت تمہارے قدموں میں ہو گی لیکن اس کی ضمانت کیا ہے کہ تم جذباتی رو میں نہیں بہہ جاؤ گے؟"

"کہاں کی جذباتی رو؟ ۔ کالے کاموں کا ایک ہی اصول مجھے پتہ ہے کہ اس کام میں بے ایمانی کا کام بھی پوری ایمانداری سے کیا جاتا ہے، دولت کا نشہ ایسے جذباتی پن کو قریب نہیں آنے دیتا لیکن اعتماد پھر بھی کرنا ہوتا ہے مگر ضمانت کون دے گا؟ میں نہیں پوچھوں گا کہ کام کیا ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے معیار اور شرائط کے مطابق ہو، خوابوں کی حقیقت میں بدل کر رکھ دوں گا۔"

"اگر تمہیں اپنے ہی ملک کے خلاف سازش کرنا پڑ جائے؟"

"یہ تو کوئی کام نہ ہوا، سوامی جی! یہ تو ایک عام آدمی کر لیتا ہے۔ میری سوچوں میں سرحدیں حائل نہیں ہیں۔"

"چلو، شویتا تم سے بات کرے گی، تمہارا معیار اور شرطیں بھی سن لے گی؟"

"اور دولت، سوامی جی؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ تمہیں تمہاری سوچ سے بھی بڑھ کر ملے گی۔" یہ کہہ کر اس نے میری جانب اپنا استخوانی ہاتھ بڑھا دیا۔ جسے میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہماری باتیں تقریباً ختم ہو چکی تھیں، اس لیے میں وہاں سے آ گیا۔ رکمنی مجھے دوبارہ اس کمرے تک چھوڑ گئی۔ میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا سوائے شویتا کا انتظار کرنے کے، وہ یا تو مجھ سے بات کرتی یا پھر

مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیتی۔ کتنا سارا وقت گزر گیا اور میں اس دوران حالات کی تبدیلیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے سوچتا رہا۔ میں صوفے میں دھنسا انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ شویتا آن وارد ہوئی، اس کے پیچھے ایک دراز قدم شخص تھا جس کے چہرے پر خاصی کرختگی تھی۔ اس نے بہترین تراش کا نفیس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر فوجی کٹ قسم کے چھوٹے چھوٹے بال، قدرے کنجی آنکھیں، بڑے سے چہرے پر بھاری مونچھیں اور موٹے ہونٹوں کے نیچے کسی پرانے زخم کا اک نشان تھا۔

''یہ ہیں ہمارے دوست، شجاع الدین۔' شویتا نے تعارف کرایا تو میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ اس نے بھاری مگر اجنبی لہجے میں رسمی کلمات کہے۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر اس کا تعارف کرانے لگی۔ ''یہ ہیں یشونت پانڈے، ہمارے بہت اچھے دوست اور پارٹنر، یہاں کے سارے معاملات کی دیکھ بھال یہی کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئی تو ہم نے بھی نشستیں سنبھال لیں۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی جو تمہاری گرو مہاراج سے باتیں ہوئی ہیں، وہ خاصی خوش آئند ہیں۔''

''ہونا بھی ایسے ہی چاہیے، شویتا جی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں مانتا ہوں کہ ایسے کاموں میں رسک لینا پڑتا ہے مگر، شجاع صاحب! آپ بھی یہ سمجھتے ہوں گے کہ فوری طور پر کسی ضمانت کے بغیر اعتماد کر لینا حماقت ہوتی ہے۔'' یشونت بولا۔

''دیکھیں، میں نے یہ نہیں پوچھا کہ کام کیا ہے مگر یہ ضرور کہا ہے کہ وہ کام ہو جو عام بندہ نہ کر سکے اور دولت میرے مطابق ہو۔ میں بھی نہیں کہوں گا کہ کام مجھے دیں اور یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ کام کیا ہے لیکن، مسٹر یشونت! مجھے یہ بتائیں کہ کیا ضمانت چاہتے ہیں آپ اور یہ ضمانت کون دے گا؟''

''کیا تم ایسی دستاویزات پر دستخط کر سکتے ہو جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ تم اپنی ملک سے غداری کر رہے ہو؟'' اس نے ڈرامائی انداز میں کہا تو میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا وہ کاغذات آپ اپنے ساتھ لائے ہیں؟ اگر لے آئے تو لائیے، میں دستخط کیے دیتا ہوں لیکن اس سے پہلے آپ مجھے یہ کنفرم کر دیں کہ میرے اکاونٹ میں کتنے لاکھ درہم پہنچ چکے ہیں۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا تو یشونت کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ لیکن لمحوں میں سنبھلتے ہوئے بولا۔

''یہ جانے بغیر کہ وہ کام کیا ہے؟''

''ظاہر ہے، وہ کام معمولی نہیں ہوگا اور آپ وہ کام یونہی پھوکٹ میں تو مجھے بتا نہیں دیں گے، آپ اپنا اطمینان کر لیں، پھر وہ کام مجھے دے دیں لیکن کام بتانے سے پہلے آپ ضمانت لیں گے اور مجھے دولت دیں گے۔ میں درہم کی تعداد سے کام کی نوعیت کا خود اندازہ کر لوں گا۔''

''دیکھو، شجاع! یہ ٹھیک ہے کہ تم باصلاحیت ہو لیکن تم خود کو ضرورت سے زیادہ عقل مند ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو؟''

''کیسے، مسٹر یشونت؟''

''یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں ایک موزوں بندے کی تلاش تھی۔ حیدر کے بتانے پر ہم نے تمہیں پرکھا، تم ہمارے معیار پر پورے اترتے دکھائی دیئے۔ کامرس رپورٹر ہونے کی وجہ سے تم مارکیٹ کو سمجھتے ہو، شوبز کو جان گئے ہو اور سب سے بڑی بات کہ لاہور کی انڈر ورلڈ سے تمہاری شناسائی ہے اور تم ان سے کام لے سکتے ہو مگر ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ تم لاکھوں درہم میں بات کرو گے۔''

''سوچ لیں، بات تو کروڑوں درہم تک جا سکتی ہے یشونت جی! میں اگر آپ کے کام کا ہوں اور آپ مجھے ادائیگی کر سکتے ہیں تو حاضر ہوں ورنہ آپ کوئی قیمت گھوڑا تلاش کر لیں۔'' میں نے انتہائی سنجیدگی سے حتمی لہجے میں کہا تو شویتا قہقہہ لگا کے ہنس دی۔

''گھوڑا۔۔۔ بہت خوب!'' یہ کہہ کر وہ یشونت کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''آپ پہلی بار اس سے مل رہے ہیں مگر میں پچھلے ایک ماہ سے اسے اپنی نگاہوں میں رکھے ہوئے ہوں۔ آپ نے دیکھا، یشونت جی!''

''ہوں، دیکھا۔'' اس کے کرخت چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ پھر اس نے اپنی جیب سے چند کاغذات نکال کر میرے سامنے کر دیئے۔ ''انہیں نکال کر میرے سامنے کر دیئے۔ ''انہیں پڑھو اور پھر دستخط کر دو۔''

''کیا میرے دستخط کرنے تک رقم میرے اکاونٹ میں جمع ہو جائے گی؟''

''اکاونٹ میں نہیں، ادائیگی نقد ہوگی۔'' شویتا نے کہا اور رکمنی کو آواز دی، لمحوں میں وہ اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں میرا بیگ تھا۔ شویتا نے بیگ کی زپ کھولی اور اوپر دھرے کپڑے ہٹا کر نوٹوں کی گڈیاں دکھائیں۔ پورے ایک لاکھ درم ہیں۔ یوں سمجھو، دو لاکھ درہم تمہاری طرف چلے گئے۔ ایک لاکھ درہم تمہارے دوست کو بچانے کے لیے حیدر نے پاکستان

بھجوائے تھے۔‘‘اس نے مجھے حساب سمجھاتے ہوئے کہا۔ میں نے وہ کاغذات پڑھے۔ وہ بھارتی خفیہ تنظیم کی طرف سے مختلف احکامات اعترافات اور ایسی ہی خرافات تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میں ان کا خاص آدمی ہوں اور پاکستان مخالفت عناصر کے ساتھ مل کر کئی کام کر چکا ہوں۔ ان میں ایسے کاموں کی بھی میری طرف سے رپورٹ تھی جن میں بم دھماکے اور بلوے کرانے کی ذمہ داری تھی۔ میں نے بلا جھجک دستخط کر دیئے اور سارے کاغذ یشونت کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے کاغذات اپنے ہاتھ میں لیے اور اپنی جیب سے ایک مزید کاغذ نکال لیا۔ وہ ایک فوٹو کاپی تھی جس پر میرے دستخطوں کے نمونے تھے، میرے کاغذات حیدر کے پاس تھے اور یقیناً انہوں نے یہ نمونے وہاں سے لیے تھے۔ دفتر میں ستیش بھی انہیں یہ دستخط مہیا کر سکتا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور صوفے کی پشت سے ٹک گیا۔ میں نے دستخط اصلی کیے تھے، شکاری اپنے جال میں پھنس چکا تھا۔ یشونت نے جائزہ لینے میں کافی وقت لگایا اور پھر مطمئن ہونے کے بعد بولا۔

’’شویتا جی! مبارک ہو، آپ کامیاب ٹھہریں۔‘‘ پھر میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ’’آج سے تم ہمارے دوست ہو۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ تم کتنی دولت کے حقدار بن گئے ہو۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالا۔ پہلے اس نے سگریٹ جلائی اور پھر لائٹر کے شعلے سے ان کاغذوں کو جلا ڈالا، یہاں تک کہ وہ راکھ ہو گئے۔ میں نے اس پر ذرا سی بھی حیرت ظاہر نہ کی، تبھی شویتا نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

’’شجاع! یہ ذمہ داری مجھ پر تھی کہ تمہیں پرکھوں، تمہاری کمزوریاں تلاش کروں اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں لیکن تم میری توقع کے بالکل برعکس نکلے۔ بلیک میلنگ میں مجبوری ہوتی ہے لیکن جب دوستی کی سطح پر ہاتھ بڑھایا جائے تو کوئی مجبوری نہیں ہوتی، بہر حال تم میری توقع سے زیادہ اہم نکلے ہو۔ تمہیں گرومہاراج کے بارے میں علم ہو ہی گیا ہوگا کہ وہ کتنے مہان ہیں اور کتنی زبردست شکتی کے مالک ہیں۔ وہ انسانیت کے لیے بہت بڑا کام کرنا چاہتے ہیں، ان کے پاس ایسی میڈیسن ہیں جن کی اس دنیا کو اشد ضرورت ہے۔ پاکستان میں بھارتی مصنوعات کے خلاف زبردست مزاحمت پائی جاتی ہے سوائے فلموں کے، ہمیں وہاں اس لیے مضبوط بندہ چاہئے کہ وہ گرومہاراج جی کی دیا سے تیار ہونے والی میڈیسن کو نہ صرف فروخت کر سکے بلکہ ان کے خلاف پروپیگنڈا کا سدباب کر سکے۔ تم مارکیٹ کو سمجھنے کے ساتھ صحافی ہونے کے ناتے اس مسئلے سے پوری طرح نپٹ سکتے ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ پبلسٹی کیسے کرنی ہے، وقت پڑنے پر مزاحمت کے خلاف کس طرح عمل کرنا ہے، یہ بھی تم جانتے ہو۔ تم

دولت کی طرف سے فکر مند نہ ہونا۔ تم ایک لاکھ درہم کی بات کرتے ہو، یہاں ڈالر تمہارے قدموں میں ہوں گے۔''

''کام کب شروع کرنا ہے؟''

''تمہارا کام آج ہی سے شروع ہو جائے گا۔ تم پاکستان میں اس کے لیے زمین تیار کرو۔ میڈیسن بھارت میں تیار ہوں گی۔ دنیا بھر کے لیے اور خصوصاً پاکستان کے لیے مارکیٹنگ یہاں سے ہوگی۔'' وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''پاکستان میں ہمارے بہت سارے دوست ہیں، وہ بھی تمہاری بھرپور مدد کریں گے لیکن وقت آنے پر۔ فی الحال تمہیں یہ کام اکیلے ہی کرنا ہوگا۔'' یشونت بولا۔

''اوکے، اس سے متعلق کوئی مزید بات؟'' میں نے مسکراتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔

'' ہوتی رہیں گی۔ ابھی تو تم دوبئی میں ہو، نا!'' شویتا مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں، میں ابھی یہیں ہوں۔' میں نے کہا تو یشونت اٹھ گیا اور میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اوکے، ینگ مین! ہمارا رابطہ ہوگا لیکن اس طرح کہ ہم نظر نہ آئیں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا، تب شویتا اٹھتے ہوئے بولی۔

''حیدر اور آرتی تمہیں لینے آئے ہوئے ہیں، محتاط رہنا، آرتی اب اہم نہیں رہی۔'' یہ کہہ کر وہ چل دی۔ رُکمنی نے میرا بیگ اٹھا لیا۔ ہم چلتے ہوئے ایسے کمرے میں آ گئے جہاں سوامی ہری داس بیٹھا ہوا تھا، مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی تو میں نے کہا۔

''اجازت دیجئے، سوامی جی!''

''آشرم کے دروازے تم پر ہمیشہ کھلے ہیں۔ جب چاہو، آؤ''

''مجھے آپ کی ضرورت رہے گی، سوامی جی! میں آپ سے رابطے میں رہوں گا۔'' میں نے کہا تو وہ تعلق کے موضوع پر چند منٹ بولتا رہا۔ ہم سب چپ چاپ سنتے رہے، پھر اس نے اپنے طور پر مجھے دعائیں دیں اور میں اس سے ہاتھ ملا کر بڑھ گیا۔ یشونت پانڈے وہیں سے الگ ہو گیا اور ہم ''انتظار گاہ'' میں پہنچے جہاں حیدر اور آرتی موجود تھے۔

''صحت مبارک ہو۔'' حیدر نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا تو آرتی بھی میری جانب بڑھی۔ اس نے بھی مجھے گلے لگا کر ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا۔ تب میں نے شویتا کی طرف دیکھا، اس نے مالا والا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔

''بھگوان تمہاری رکھشا کرے، بالک!'' میں نے غور سے اس کے چہرے کی

طرف دیکھا جہاں کہیں سے بھی یہ نہیں جھلک رہا تھا کہ وہ تقدس کے پردے میں کچھ اور بھی ہے۔ رُکمنی نے میرا بیگ، سیل فون اور سگریٹ میرے سامنے کر دیئے۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور سبھی چیزیں پکڑ لیں، پھر اسے گلے لگا لیا۔ وہ اس اچانک عمل پر شدید جذبات سے کانپنے لگی، میں نے دھیرے سے اس کان میں کہا۔

''تم اور تمہارا جسم یاد آتا رہے گا، رُکمنی!'' اپنے سے الگ کرنے کے بعد میں شویتا پر آخری نظر ڈالتا ہوا آشرم سے باہر آ گیا۔ آشرم سے باہر آ کر جب کار روڈ پر آئی تو میں نے اپنا سیل فون چیک کیا، صرف ایک حسن نے کال کی تھی اور وہ بھی اس دن جب میں پہلے دن آشرم میں تھا۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ سارے دوست سمجھ گئے ہوں گے۔ میں اسی میں مگن تھا کہ حیدر نے پوچھا۔

''کیسے رہے آشرم میں گزرے ہوئے دن؟''

''ظاہر ہے، اچھے رہے ہیں بلکہ کہوں کہ بہت اچھے، ایک خوفناک مرض ختم ہو گیا، اس سے بڑھ کر میرے لیے اور اچھا کیا ہو سکتا ہے؟'' میں نے سیل فون جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''بتائیں گے نہیں، وقت کیسا گزرا؟'' آرتی نے پوچھا۔

''بس یوں سمجھ لو، آرتی! کچھ ہوش میں اور کچھ مدہوشی میں۔''

''یہ خادمہ جس سے آپ گلے ملے، اس نے کتنا مدہوش کیا؟'' آخر آرتی سے رہا نہ گیا۔

''اس نے میری بہت خدمت کی ہے، اور باقی تمہیں پتہ ہے آرتی! میرے لیے جسم کس قدر اہمیت رکھتے ہیں۔ تمہارا جسم بھی تو بہت خوبصورت ہے، نا!'' میں نے اسی کی بات اس پر لوٹا دی، وہ خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں بعد اچانک مجھے یاد آیا۔ ''او، حیدر! زارا نے آنا تھا، کیا وہ آئی۔''

''ارے، اسے تو آئے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں۔ آج رات اس کا آخری شو ہے اور کل دوپہر تک وہ فلائی کر جائے گی۔ بہت یاد کر رہی ہے تمہیں۔''

''تم نے بتایا نہیں تھا اسے؟'' میں نے پوچھا۔

''بتایا تھا لیکن یہ تو مجھے پتہ نہیں تھا کہ تمہاری واپسی کب ہو گی؟ یہ تو آج صبح ہی ماتا جی نے فون کر کے مجھے صورت حال بتائی اور میں تمہیں لینے کے لیے آ گیا۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی، شجاع! کہ میں تب سے آشرم میں آ کر بیٹھا ہوا ہوں۔ کسی کو بھی نہیں پتہ، بس آرتی کو بتایا اور یہ میرے ساتھ آ گئی۔'' حیدر نے تفصیل سے بتایا تو میں نے فون سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی نمبر ہے جس پر زارا سے رابطہ کیا جا سکے؟''

''دھیرج، مہاراج، گھر پہنچو، پھر طے کرتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔ اسے یہاں بلوا لیں یا تم اس کے پاس جاؤ گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا اور حسن کے نمبر پش کرنے لگا۔ تیسری بیل پر حسن بولا۔

''او، جان جی! کیسے ہو، ٹھیک ٹھاک ہو، نا؟''

''ہاں، اب ٹھیک ہوں۔ بالکل صحت مند۔''

''یہ دوبئی جا کر تمہیں کیا روگ لگ گیا، جان جی؟''

''سارے دکھ دور ہو گئے ہیں۔''

''ہاں، یار! مجھے حیدر نے بتایا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ تم اب ٹھیک ہو۔ بہت سارے لوگ بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔''

''سب کو خوش کر دوں گا، یار! میں تفصیل سے تمہارے ساتھ بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے، اگلے ہفتے مجھے پاکستان آنا پڑے......''

''خیریت؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''کہا نا، تفصیل سے بتاؤں گا۔ ایک بہت بڑا پراجیکٹ ہے، سارے دوست نہال ہو جائیں گے۔ اب فون پر تمہیں کیا بتاؤں؟''

''چلو ٹھیک ہے'' اس نے کہا تو میں دوستوں سے متعلق پوچھنے لگا۔ سب کی خیریت جاننے کے بعد حیدر نے رسمی باتیں کیں اور فون آف کر دیا۔ میں نے جتنی باتیں کی تھیں، حیدر اور آرتی کو سنانے کے لیے کی تھیں تا کہ شویتا لوگوں کو معلوم ہو کہ میں نے آشرم سے نکلتے ہی کام شروع کر دیا ہے۔ دوسری طرف میں حسن کو بھی سمجھانے کی کوشش میں تھا کہ میں آشرم سے کامیاب لوٹا ہوں۔ میں نے اسے اشارے تو دے دیئے تھے۔ اب وہ سمجھتا ہے کہ نہیں؟ بہر حال مجھے اس کی عقل پر بھروسہ تھا۔

گھر پہنچے تو اک سناٹا تھا جس نے ہمارا استقبال کیا۔ سٹنگ روم میں آئے تو قدرے خوشگواریت سی محسوس ہونے لگی۔ اس سے پہلے کوئی بات کرتا، اچانک آرتی نے پوچھا۔

''شجاع! کیا واقعی آپ اگلے ہفتے پاکستان جا رہے ہیں؟''

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا لیکن زیادہ چانس جانے کے ہیں۔''

''واپسی کب تک ہو گی؟'' اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''جب جانے کا نہیں پتہ تو میں آنے کے بارے میں حتمی طور پر کیا بتا سکتا ہوں؟''

'' مطلب، آپ دوبئی چھوڑ کر جا رہے ہیں؟'' آرتی نے تیزی سے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، حیدر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو عارضی مسکن ہے پردیسیوں کے لیے، اب دیکھو، تم بھی تو جا رہی ہو۔''

''ہم جا رہے ہیں؟'' آرتی نے شدت حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، تم جا رہی ہو پرسوں شام کی فلائیٹ سے، آج یا کل تمہارا پاسپورٹ اور ٹکٹ آ جائیں گے۔'' حیدر نے اطمینان سے کہا۔

''کیا ہم اکیلے ہی یا ساتھ میں؟''

''تم اکیلی، مجھے تو یہی کہا گیا ہے کہ شاپنگ وغیرہ کے لیے تمہیں درہم دے دوں اور پرسوں شام ائیر پورٹ پر تمہیں سی آف کروں۔ اب یہ فیصلہ کیوں اور کیسے کیا گیا ہے، تم بھی سمجھتی ہو کہ میں نہیں جانتا۔'' اس نے تفصیل بتائی تو آرتی نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

''آپ نے تو کہا تھا کہ ہمیں شجاع جی کے ساتھ پاکستان بھجوا دیا جائے گا؟''

''یقیناً میں نے کہا تھا لیکن ۔۔۔'' حیدر نے مصنوعی بے چارگی سے کہا تو آرتی یکدم پژمردہ ہو گئی جیسے سخت دھوپ میں پھول کملا جائے۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا، وہ سوچوں میں ڈوب چکی تھی۔ ہم میں خاموشی چھا گئی، تبھی میں نے کہا۔

''آرتی! یوں افسردہ ہو جانے سے کیا فائدہ، ابھی پرسوں نہیں آئی۔''

''میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔'' اس نے غافل لہجے میں کہا اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تو مجھے اس کے ٹشو پیپر کی طرح استعمال ہونے پر قدرے افسوس ہوا۔ پھر میں نے اسے ذہن سے جھٹکا اور حیدر سے کہا۔

''اس بیگ میں ایک لاکھ درہم ہیں، اسے سنبھالو ان لوگوں نے ایک پراجیکٹ کا ایڈوانس دیا ہے۔''

''کیسا پراجیکٹ؟'' اس نے اطمینان سے پوچھا تو میں نے اسے تفصیل بتا دی اور پوچھا۔

''اب تم بتاؤ، میرے ساتھ پاکستان چلو گے یا یہیں دوبئی میں رہو گے؟''

''یہ تو تمہارے پلان پر منحصر ہے کہ تم کیا کرنا چاہو گے؟''

''ویری سمپل،'' عامر میڈیسن امپورٹ کرنے کی ایک کمپنی بنائے گا، زارا اور ندیم مل کر شوبز کا کوئی دھندا کریں گے، حسن اور میں کوئی اخبار نکالیں گے۔ تین طرف سے کام کو

اٹھائیں گے اور دولت کے بل بوتے پر جب یہ چلیں گے تو تعلقات کے دائرے وسیع ہوں گے، میرا نہیں خیال کہ ہم اس میں ناکام ہوں گے۔" میں نے کہا تو وہ تفصیلات پوچھنے لگا۔ یونہی دیر تک گپ لگانے کے بعد اس نے کہا۔

"پھر تو مجھے دوبئی میں رہنا چاہئے تو تم سمجھ رہے ہو کہ کیوں؟"

"بہر حال اگلے ہفتے میں کسی بھی دن میرے پاکستان جانے کا بندوبست کر دو، میرا پاسپورٹ تمہارے پاس ہی ہے نا؟"

"بندوبست ہو جائے گا لیکن اس ایک لاکھ درہم کا کیا کروں گا؟"

"اگر تم اپنے پاس سنبھال سکتے ہو تو ٹھیک، ورنہ آج ہی حسن کو بھجوا دو۔ اس کا ہمارے ساتھ رہنا بہت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں کھانے کے بعد ان کے بھجوانے کا بندوبست کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے بنگالی باورچی کو آواز دی اور اسے کھانا لگانے کو کہا۔ میں اپنے کمرے سے فریش ہو کر واپس آیا تو کھانا لگ چکا تھا۔ وہاں آرتی موجود نہیں تھی۔ میں نے باورچی سے پوچھا۔

"آرتی کدھر ہے؟"

"میں نے انہیں بتایا تھا جی، کہہ دیا کہ بھوک نا ہی ہے۔"

"جاؤ، اسے لے کر آؤ۔ کہو، میں نے بلایا ہے۔" میں نے کہا تو وہ پلٹ گیا۔ چند منٹ بعد وہ آ گئی۔ اس نے کچھ نہیں کہا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ انتہائی خاموشی میں کھانا کھایا گیا، پھر وہاں سے اٹھ کر ہم سٹنگ روم میں آ گئے۔

"یار! تم نے زارا کا نمبر دیا ہی نہیں۔ مان لیا وہ تمہاری دوست ہے، اتنا بھی۔۔۔" حیدر نے میری بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔

"لو، بھائی! نمبر لو ہم تو یونہی خواہ مخواہ درمیان میں پھنسے ہوئے ہیں۔" اس نے اپنا سیل فون نکال کر نمبر دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے نمبر لیے اور فیڈ کر کے پش کر دیئے، کچھ دیر بعد اس کی آواز ابھری۔

"زارا اسپیکنگ۔"

"میں شجاع ہوں۔"

"اوے، شجاع! تم خیریت سے تو ہو۔ کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

"میں ٹھیک ہوں، صحت مند ہوں اور گھر پہنچ گیا ہوں۔"

''گھر، مطلب پاکستان، لیکن نمبر۔۔؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ارے نہیں، یہاں حیدر کے گھر۔۔۔''

''تم پھر کسی کو بھیجو نا، مجھے لے جائے۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں، ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں، میں نے یونہی سوچا تھا کہ سارا ہفتہ تمہارے ساتھ رہوں گی لیکن۔۔۔''

''ایسا ہونا قسمت میں نہیں تھا، میں ابھی آیا ہوں، میرا دل بھی چاہ رہا ہے کہ تم سے فوراً ملوں۔ اب وقت ایسا ہے کہ میں تمہیں بلوا نہیں سکتا، تمہارے شو کا وقت ہو جائے گا۔ میں آتا ہوں تمہارے پاس، پھر پوری رات ہماری ہو گی۔''

''او کے، میں انتظار کر رہی ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے الوداعی فقرہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ تبھی حیدر نے کہا۔

''میں تو چلا حسن کے کام۔'' وہ اٹھ گیا تو میں نے آرتی سے کہا۔

''تم بھی تھک گئی ہو گی، تھوڑی دیر آرام کر لو۔''

''او کے۔'' اس نے کاندھے اچکائے اور اپنے کمرے کی طرف چل دی میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ تنہائی میسر آتے ہی میں نے سب سے پہلے ندیم کو فون کیا۔

''شجاع بھائی! خیریت؟'' میری آواز سن کر وہ بولا تو میں نے اسے اپنے بارے میں بتا کر کہا۔

''تفصیلی باتیں تو ہوتی رہیں گی لیکن سب سے پہلے تم الطاف پاشا سے ملاقات کا بندوبست کرو۔''

''آپ کی کوئی خاص مصروفیت تو نہیں۔؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے زارا کا شو دیکھنا ہے اور پھر وہیں اس کے پاس رہنا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، میں کچھ دیر بعد آپ کو بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے محتاط رہنے کے بارے میں چند باتیں کیں اور فون بند کر دیا۔ اب مجھے اس کے واپسی فون کا انتظار تھا، تب تک میں سکون سے آرام کر سکتا تھا۔ میں آنکھیں موند کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ پتہ نہیں، وقت گزر گیا۔ فون بیل بجنے سے میری آنکھ کھلی، ندیم کا فون تھا۔

''ہاں، بولو؟''

''سارا بندوبست ہو جائے گا، آپ صرف ہوٹل پہنچ جائیں، وہاں کنول جیت سب سنبھال لے گی۔''

''بات ہو گئی تھی اس سے؟''

"سب سے ہوگئی، آپ بس پہنچ جائیں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

اس وقت شہر کی روشنیاں جگمگا اٹھیں تھیں جب میں تیار ہوگیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے میری نظر آرتی پر پڑی، وہ بھی تیار ہوئی بیٹھی تھی۔ سیاہ پتلون اور ہلکے کاسنی رنگ کی شرٹ پہنے وہ خاصی اچھی لگ رہی تھی، کس کر باندھے ہوئے بال اور کانوں میں بالے تو غضب ڈھا رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی، بلاشبہ وہ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوئی تھی۔

"تم کہیں جا رہی ہو، آرتی؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"کہیں کیا مطلب؟ آپ کے ساتھ جا رہے ہیں ہم۔"

"او، آرتی! مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا، کیا تم یہ بات نہیں سمجھتی ہو کہ جب کسی عورت سے بہت دنوں کے بعد ملا جائے تو وہ کسی تیسرے فرد کا وجود برداشت نہیں کرتی؟"

"ہم اتنے ہی برے ہوگئے ہیں، شجاع؟" اس نے انتہائی حیرت زدہ لہجے میں حسرت سے کہا۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں، کیوں غلط سوچ رہی ہو؟" یہ کہہ کر میں نے اس کا کاندھا دبایا اور نرم سے انداز میں کہا۔ "وہ پتہ نہیں مجھ سے کیا کیا باتیں کرنا چاہتی ہوگی اور ہوسکتا ہے، تمہارے ہوتے ہوئے وہ ایسی باتیں نہ کر پائے۔ تم وہاں جا کر شدید بوریت محسوس کرو گی۔"

"ٹھیک ہے، ہم نہیں جاتے۔ آپ جاؤ۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"ایسے نہیں، مسکراتے ہوئے کہو، میں کوشش کروں گا کہ رات ہی واپس آجاؤں۔"

"آپ چاہے ساری رات رہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے زارا کے نمبر پش کر دیئے۔ وہ میرے انتظار میں تھی۔ میں نے اسے گھر سے چلنے کی بابت بتایا اور فون بند کر کے پورچ میں آگیا۔ جہاں ڈرائیور میرے انتظار میں تھا۔ ہوٹل پہنچتے ہی اسے میں نے واپس چلے جانے کو کہا اور خود ہوٹل میں چلا گیا۔ استقبالیہ پر کنول جیت میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس کے پاس ہی وہ مینجر کھڑا تھا جو ہر بار یوں ملتا تھا جیسے پہلی بار مل رہا ہو۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرا دی، میں قریب پہنچا تو ہاتھ ملاتے ہوئے انتہائی خوشگوار لہجے میں بولی۔

"صحت مبارک ہو۔"

"بہت شکریہ تمہارے پرخلوص جذبات کا، کیسی ہو؟"

"ایک دم ٹھیک۔" اس نے کہا تو میں نے مینجر سے ہاتھ ملایا۔ اس نے چند رسمی

باتیں کیں اور قدم بڑھا دیئے۔ میں اور کنول باتیں کرتے ہوئے لفٹ تک پہنچے۔ دوسری منزل پر لفٹ سے باہر آئے تو کنول نے کہا۔

''دائیں طرف چوتھا سوئٹ میڈیم کا ہے، الطاف وہیں ہے لیکن میڈم کو نہیں معلوم کہ ملاقات کی اصل نوعیت کیا ہے۔''

''اسے کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ وہ آپ کا دوست ہے، سپانسر کرنا چاہتا ہے میڈم کو اس لیے کسی کو اس ملاقات بارے پتہ نہیں چلنا چاہئے۔'' اس نے کہا تو میں نے پوچھا۔

''کنول! سیکورٹی کا کوئی خاص بندوبست نظر نہیں آتا؟''

''سب کچھ ہے۔ آپ اگر تنہا آتے تو آپ کو روک لیا جاتا۔ میں ہوں نا، ساتھ میں اور اس وقت تو خود میں نے یہ بوجھ ہٹایا ہے یہاں سے۔''

''اوکے۔'' میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ہم زارا کے دروازے پر جا پہنچے۔ کنول کے بعد میں داخل ہو گیا، سامنے ہی صوفے پر زارا بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ الطاف براجمان تھا۔ زارا والہانہ انداز میں ملی جیسے صدیوں سے بچھڑی ہوئی ہو۔ وہ الگ ہوئی تو الطاف سے ملا، تبھی کنول بولی۔

''بہت محدود سا وقت ہے، شجاع جی! میڈم کے پاس تو آپ ساری رات رہیں گے، اس لیے۔۔۔'' اس نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔ تو زارا جلدی سے بولی۔

''ساری رات کے عوض اگر تھوڑا وقت دے دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔'' ہم انہیں وہیں چھوڑ کر بیڈ روم میں آ گئے۔ میں نے اسے پوری تفصیلات سے آگاہ کیا جسے سن کر وہ بولا۔

''میرا شک صحیح تھا، یشونت پانڈے ہی اس نیٹ ورک کو چلا رہا ہے۔ اب مجھے اس کے نیٹ ورک کی بھی سمجھ آ گئی ہے۔ اتنی جلدی، اتنی بڑی کامیابی کا میں بھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا، شجاع صاحب!''

''ان کا پلان تو کنفرم ہو گیا اور اب۔۔۔''

''ہری داس والے زہریلے پلان میں ساری اہمیت ہری داس کی ہے، خباثت کی جڑ کو ختم کر دیا تو ہم کامیاب ہیں لیکن میں اس پورے نیٹ ورک کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔''

''مطلب، ہری داس ان سے الگ حیثیت رکھتا ہے؟''

''ہاں، اصل میں بھارتی خفیہ تنظیم نے ہری داس کو ایک قسم کی پناہ دی۔ اس کی

صلاحیتوں سے فائدہ اس لیے اٹھا رہے ہیں کہ وہ ان کے مقصد کے عین مطابق کام کر سکتا ہے، وہ کوئی تربیت یافتہ ایجنٹ نہیں لیکن اس کے ارد گرد جتنے بھی لوگ ہیں، سب تربیت یافتہ ہیں۔ وہ محض ایک سنیاسی ہے اور سمجھو، ایک اعلیٰ دماغ رکھتا ہے۔ اس کا تجربہ آپ بھی کر چکے ہیں۔ بھارتی خفیہ تنظیم اسے منفی انداز میں استعمال کرنا چاہتی ہے اور میرا پلان یہی ہوگا کہ جب دماغ ہی نہ رہے گا تو وہ کیسے استعمال کریں گے؟''

''تو پھر یہ کام میں کر دوں؟''

''ابھی نہیں، جس طرح آپ نے سیکورٹی کے بارے میں بتایا، میں اس میں الجھنا نہیں چاہتا۔ دوسرا وہ آپ پر اعتماد کرتے ہیں۔ میں بہرحال مشورہ کر کے پلان کرتا ہوں کہ کیا کرنا ہے، آپ اپنا اعتماد بحال رکھیں۔ ہو سکتا ہے، آپ کو یہاں سے فوراً نکلنا پڑے۔ یہ بھی آپ ذہن میں رکھیں لیکن ایسا ہنگامی صورت حال میں ہوگا۔ میری کوشش ہوگی کہ وہ آپ پر آخری دم تک شک نہ کریں۔''

''الطاف! حیدر میرا دوست ہے، اس بات کا خیال رکھنا۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' الطاف نے کچھ اور کہنا چاہا کہ حسن کا فون آ گیا۔

''او، جان جی! یہ تمہارا حیدر ایک لاکھ درہم بھجوانے کی بات کر رہا ہے۔''

''تمہیں پہلے بھی تو بھجوائے تھے نا؟''

''وہ بھی یونہی پڑے ہوئے ہیں، اس میں سے تو کچھ بھی خرچ نہیں ہوا۔''

''اسے بھی سنبھال رکھو اور ہاں، یہ الطاف پاشا میرے پاس ہی ہے۔ اس سے پوچھو، اگر اسے رقم چاہئے ہو تو اسے بھجوا دو۔'' یہ کہہ کر میں نے فون الطاف کو دے دیا۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتا رہا اور ضرورت ہونے پر منگوانے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ ہم مستقبل میں پلان کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ کنول آ گئی۔

''میڈم کے شو کا وقت ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ سیکورٹی والے آ جائیں۔''

''میں چلتا ہوں۔'' الطاف نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، پھر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ''زندگی رہی تو دوبارہ ملاقات ضرور ہوگی۔''

''کیوں نہیں، ضرور ہوگی۔'' میرے یوں کہنے پر وہ میرے گلے لگ گیا۔ پھر چند لمحوں بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

زارا کا دوبئی میں آخری شو بڑا کامیاب رہا تھا۔ میں جب ہال میں پہنچا تو حیدر کے

ساتھ سعد الموطاوی بھی بیٹھا ہوا تھا، میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں نہیں آیا کہ آرتی نے بھی آنا تھا۔ شو ختم ہو گیا تو ہم تینوں باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں کنول جیت میرے قریب آئی تو وہ چل دیئے، تب اس نے کہا۔

''تو پھر چلیں؟''

''یقیناً۔۔۔''میں نے کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم زارا کے پاس پہنچے تو اس کے پاس ستیش بیٹھا ہوا تھا، وہ بھارتی فلم انڈسٹری کی باتیں کر رہے تھے۔ ہمارے جانے سے قدرے ہلچل ہوئی، پھر ستیش نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

''آپ تو خیر اس وقت پاکستانی فلم انڈسٹری کی معروف اور مصروف ہیروئن ہیں لیکن آپ دیکھیں گی کہ کچھ وقت بعد پاکستانی اداکارئیں بھارتی فلموں میں کام کرنے کے لیے ترسیں گی۔ ایسا اس لیے ہوگا کہ بھارتی فلم انڈسٹری سے پاکستانی فلم انڈسٹری بالکل ختم ہو کر رہ جائے گی جو پہلے ہی انڈسٹری نہیں ہے، وجہ وہی جو میں نے کہی کہ بالی وڈ اب اپنی تکنیک اور وسائل کے لحاظ سے بہت زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ اور یہ دن بدن بڑھ رہی ہے۔''اس نے کہا تو کنول قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

''مطلب بڑی مچھلی، چھوٹی مچھلی کو نگل رہی ہے۔''پھر زارا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔''میڈم! کیا آپ اس سے متفق ہیں؟''

''دیکھیں، یہ گلیمر کی دنیا ہے جس سے آنکھیں تو چندیا ہی جاتی ہیں۔ ذہن بھی ماؤف ہو جاتے ہیں۔ ہمارا ایک وقت تھا جو اب گزر چکا۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں اب اس پوزیشن میں رہ سکوں گی لیکن ایک بات میں کہوں، ستیش! بھارتی فلم انڈسٹری جتنی بھی بڑی ہے، پراپیگنڈہ فلمیں تیار کرنے میں جتنا بھی سرمایہ خرچ کر رہی ہے مگر ایک دن آپ کو لگے گا کہ یہ سب فضول گیا۔ جتنی ہیبت آپ مجھے بتا رہے ہیں، وہ سب ختم ہو جائے گی۔''

''یہ کس بنا پر کہہ سکتی ہیں آپ؟''

''وہ ایسے کہ جھوٹ اندھیرے کی مانند ہوتا ہے اور آپ یہ تو جانتے ہیں کہ روشنی کی ہلکی سی کرن اندھیرے کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ میں کچھ عرصہ پہلے تک یہی سمجھتی رہی تھی کہ پاکستان فلم انڈسٹری میں اتنی جان نہیں ہے کہ وہ بھارت کے پراپیگنڈہ کا موثر جواب دے سکے لیکن پھر سمجھ میں آیا کہ نظرانداز کر دینا سب سے بڑا انتقام ہوتا ہے۔''

''نہیں، زارا! پاکستان کی فلمی دنیا میں اتنی رسائی رکھنے والے دماغ ہی نہیں ہیں جو ان کا جواب دیں۔ وہ تو نقال ہیں۔''میں نے کہا۔

"میں پراپیگنڈہ کی بات کر رہی ہوں، بھارتی جتنا بھی جھوٹ کہہ لیں، حقیقت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے، میڈم! کہ جھوٹ پر ہی سرمایہ خرچ کر دیا جائے اور پھر پراپیگنڈہ۔۔۔"

"میں بتاتی ہوں ۔۔۔" زارا نے کنول کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ "بھارت نے فلم "بارڈر" بنائی، اس کا بہت چرچا ہوا۔ بڑی محنت کی گئی، بہت سرمایہ خرچ کیا گیا لیکن اس میں جو کہانی بیان کی گئی وہ بالکل الٹ تھی۔ اس میں بالکل ڈھٹائی سے جھوٹ بولا گیا۔ فلم کے آخر میں ٹینکوں کی چڑھائی اور پھر تباہی کا منظر دکھایا جاتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ وہ حملہ بھارت نے کیا تھا اور جس کی زندہ مثال چونڈہ میں بھارتی ٹینکوں کی تباہی ہے۔ کس کی فضائیہ نے اس حملے کو نابود کیا، کیا تاریخی حقیقتوں کو مسخ کر کے آپ دوسرے کے ذہنوں پر قبضہ کر سکتے ہیں؟ قطعاً نہیں، ستیش صاحب!"

"لیکن بھارت کا مقصد تو حل ہو رہا ہے۔"

"کیسے، اپنی ہزیمت کو دوسروں پر ڈال کے آزادی کے دنوں میں اپنی قوم کو وہ فلم دکھا کے خوش ہونا۔ یا پاکستانی فوج پر الزامات والی فلمیں بنا کے؟ میں تمہیں بتاتی ہوں، سچ کی قوت کیا ہوتی ہے۔ چھوٹی سکرین پر نشان حیدر کے نام سے محض تین شہدا کی زندگی پر ڈرامہ بنایا گیا اور چھوٹی سکرین پر ہی دکھایا گیا تو بھارتی حکومت چیخ اٹھی، سچ نے اسے گھائل کر کے رکھ دیا۔"

"لیکن سچ تو یہ ہے کہ ایسی فلمیں بھی پاکستان میں دیکھی جا رہی ہیں جن میں پاک فوج اور پاکستانیوں کے خلاف بات ہوتی ہے۔ دراصل ایک بہت بڑا طبقہ پاکستانی معاشرے میں ایسا بھی ہے جس سے چڑ کر ردعمل کے طور پر بھارتی فلموں کو فروغ مل رہا ہے، بلی کے حملے پر کبوتر اگر آنکھیں بند کر لے تو صاف ظاہر ہے کہ کیا ہو گا۔" ستیش نے باقاعدہ بحث کرتے ہوئے کہا۔

"بجا ہے، ہم مانتے ہیں کہ ہماری کمزوریاں ہیں اور انہی کمزوریوں کے باعث آپ لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن اس سے تو آپ کی منافقت کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ ایک طرف دوستی کی بات تو دوسری جانب ایسی فلمیں ۔۔۔ میں تم سے ایک سوال کرتی ہوں۔ تم لوگ اپنی تہذیب کو کہاں لے جا رہے ہو؟ جنس یورپ میں مذہب کا حصہ نہیں، ان کی کیا حالت ہے لیکن تمہارے ہاں تو "کاما" مذہب کا حصہ ہے۔ تمہارا کیا حشر ہو گا؟ میں انتظار کر رہی ہوں اس

وقت کا جب پاکستانی فلم انڈسٹری ختم ہوگی، تب پھر دیکھنا کہ ہمارے معاشرے میں ایک نئی جہت سامنے آئے گی جس میں بالی وڈ کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔"

"زارا! یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو، بھارتی فلموں کا ٹارگٹ تو پاکستانی ذہن ہے نا! وہ سمجھتے ہیں کہ وہ انہیں خراب کرلیں گے اور جو نہیں سمجھتے، وہ اگر اثر قبول کر بھی لیں تو کچھ نہیں ہونے والا۔ ایک ایسا ذہن بھی تو ابھر رہا ہے جو بھارتی پروپیگنڈے کے ردعمل میں بھارت کے مخالف ہو رہا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔۔۔" ستیش نے کہا تو اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی، سبھی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ کنول نے دروازہ کھولا تو ویٹر تھے، وہ کھانا لے آئے تھے۔ کنول نے کہا۔

"فی الحال یہ بحث چھوڑیں اور کھانا کھائیں، ابھی بہت سارے کام کرنے والے پڑے ہیں۔"

کھانے کے بعد کنول اور ستیش چلے گئے اور میں زارا کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ اس نے بات لندن ٹور سے شروع کی اور پھر بھیگتی رات کے ساتھ باتیں پھیلتی گئیں، یہاں تک کہ صبح کے آثار واضح ہونے لگے۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس لیے میں سو گیا۔ بہت سارے کام جب مرضی مطابق ہو جائیں تو بندہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ ان پرسکون حالات میں اگر مستقبل کی پریشانیوں کے بارے میں سوچا جائے تو بے سکونی یونہی اپنے حصار میں لے لیتی ہے، صبح ناشتہ کرتے ہوئے میں یہی محسوس کر رہا تھا۔

"آج آپ کا شیڈول کیا ہے؟" زارا نے کپ رکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے آفس جاؤں گا، پھر تمہارے ساتھ لنچ ہوگا جس کا اہتمام حیدر نے گھر پر کیا ہے اور پھر تم لوگوں کو ائیر پورٹ پر سی آف کریں گے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔ "تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"نہیں، میں بس یونہی پوچھ رہی تھی۔"

"بس تم اپنی پیکنگ مکمل کر کے ندیم کو فون کر دینا، وہ تم لوگوں کو گھر لے جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ میں تم سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں۔" میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ پھر ہوٹل سے باہر آ کر ٹیکسی پکڑی اور دفتر پہنچ گیا۔ آفس میں قدرے سکون تھا۔ کنول جیت کی مصروفیت ختم ہو چکی تھی۔ میں اپنے آفس میں آیا، پھر دیر تک ان کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ زارا کے گھر پہنچ جانے کی اطلاع آئی تو میں اٹھ گیا۔ سٹنگ روم میں حیدر، آرتی اور زارا بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے

ایک طرف صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
''باقی لوگ نہیں پہنچے؟''
''بس اِدھر اُدھر شاپنگ کے چکر میں نکلے ہوئے ہیں میری پیکنگ مکمل ہوگئی تو میں اِدھر آ گئی، وہ بھی آتے ہوں گے۔'' زارا نے تفصیل بتائی۔ اتنے میں ندیم بھی وہیں آ گیا، وہ سب زارا کے ٹور کے بارے باتیں کرنے لگے۔ تبھی آرتی نے میرے قریب ہو کر پوچھا۔
''چائے پئیں گے آپ؟''
''فی الحال تو طلب محسوس نہیں ہو رہی۔'' میں نے کہا تو آرتی کے چہرے پر رنگ آ کے گزر گیا۔ میں اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ رات شو میں کیوں نہیں آئی لیکن میں ٹور کی باتوں میں زیادہ مزہ لے رہا تھا۔ تبھی میرا سیل فون بج اٹھا۔ نمبر اجنبی تھے، میں نے فون رسیو کیا تو دوسری جانب شویتا تھی۔ وہ ہنستے ہوئے انگریزی میں بولی۔
''ارے شجاع! تم تو ایک دن میں ہی ہمیں بھول گئے، ایسی بھی کیا مصروفیت؟''
''شویتا! میں کہاں بھولا ہوں اور رہی مصروفیت تو تم حیدر سے پوچھ لو۔ آشرم سے آنے کے بعد سے اب تک ایک منٹ بھی اپنا نہیں رہا۔''
''ہاں، حیدر نے یشونت جی سے تمہارا پلان ڈسکس کیا ہے، اچھا ہے، اس میں شوبز کو اہمیت دو گے تو تمہیں وہاں سے اچھا خاصا سپانسر مل جائے گا۔''
''وہی تو، شوبز سے متعلق جو میری ساتھی ہوگی، ابھی اس کی میزبانی کر رہا ہوں۔''
''لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس میرے لیے کب وقت ہے؟''
''جب چاہو، تمہارے لیے وقت ہی وقت ہے۔''
''تو پھر آج ڈنر میرے ساتھ کرو، تھوڑی باتیں بھی کر لیں گے۔''
''کیوں نہیں، مگر کہاں، آشرم؟''
''نہیں، آشرم بہرحال نہیں، میں تمہیں فون کر کے بتا دوں گی، تم بس ذہنی طور پر تیار رہنا، او کے، سی یو۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ تبھی نجانے کیوں ایک اجنبی سی بے چینی میرے اندر سرائیت کر گئی، شویتا کا انداز قدرے پراسرار سا تھا۔
''خیریت، شجاع! کیا کہہ دیا ہے شویتا نے جو آپ اس قدر مایوس ہو گئے ہو؟'' آرتی نے پوچھا تو میں مسکرا دیا۔
''کچھ نہیں، میری جان! بس یونہی ڈنر ساتھ میں کرنا چاہتی ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ بھی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ ہنس دی۔ آرتی کچھ دیر تو میرے پاس بیٹھی رہی، پھر وہ نجانے

کب اٹھ گئی۔ میں زارا اور حیدر کی طرف متوجہ تھا جو اسے ڈائریکشن کے لیے مشورے دے رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سبھی آتے گئے۔ ایک بھرپور لنچ پر خاصا اہتمام تھا۔ خوشگوار ماحول میں لنچ ختم ہوا تو مقامی چائے کا ایک دور چلا اور پھر قافلہ کی صورت میں ائیر پورٹ کی طرف چل پڑے۔

''آپ کب آرہے ہیں پاکستان؟'' جانے سے قبل زارا نے پوچھا تو میری بجائے حیدر بولا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ آئے گا۔ جو شوبز کے حوالے سے کام کرنے کی بابت کہا ہے، اس کے لیے زمین تیار کرو۔ اب یہ فلموں وغیرہ کی مصروفیت چھوڑو۔''

''وہ سب ہو جائے گا مگر شجاع ہوتا تو ذرا کام کرنے کا مزہ آتا۔'' اس نے یونہی چھیڑنے والے انداز میں کہا تو حیدر ہنستے ہوئے بولا۔

''بس جی، اپنی اپنی ڈیمانڈ ہے۔ مجھے تم کہتیں تو ابھی تمہارے ساتھ چل دیتا۔''

''ڈیمانڈ کی نہیں، معیار کی بات کرو جناب!'' زارا نے چوٹ کی تو سبھی ہنس دیئے۔

ائیر پورٹ سے واپسی پر کرائے کی گاڑیاں تو نجانے کہاں تھیں۔ حیدر کے ساتھ کنول، ندیم اور ستیش چلے گئے، میں آرتی اور ڈرائیور دوسری گاڑی میں تھے۔ سبھی نے گھر جانا تھا، واپسی میں آرتی نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''شجاع! کل ہم بھی چلے جائیں گے۔ کیا آپ آؤ گے ہمیں سی آف کرنے؟''

''یہ تو وقت بتائے گا۔'' میں نے یونہی گول مول سا جواب دے کر لطف اندوز ہونا چاہا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے وضاحت چاہی۔

''آنے والے وقت کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے، وہ کیسا ہو؟'' میں نے لاپرواہی سے کہا۔

''ہاں، کسی کو کیا پتہ کہ آنے والا وقت اس کے لیے کیا لا رہا ہے؟ خیر چھوڑیں ان باتوں کو ہمیں کچھ شاپنگ کرنا ہے، آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔'' اس نے کسی بچے کی طرح کہا۔

''کیوں نہیں ڈئیر! چلوں گا لیکن یہی بات تم مجھے گھر میں بتاتیں تو کم از کم میرا والٹ درہم سے بھرا ہوتا لیکن خیر، چھوٹا موٹا تحفہ تو اب بھی لے دوں گا۔''

''درہم ہمارے پاس بہت ہیں۔ جتنے چاہیں، لے لیں۔'' اس نے چمکتی آنکھوں

کے ساتھ کہا تو میں نے ہولے سے اسے اپنا ساتھ لگالیا، تب اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''تمہیں پتہ ہے، گولڈن سوق کدھر ہے؟''

''جی، ابھی جو کلاک ٹاور چوک آئے گا، اس سے سیدھا روڈ جاتا ہے۔'' اس نے مودب لہجے میں کہا۔

''چلو ٹھیک ہے، اِدھر ہی چلو۔'' اس نے کہا اور میرے کاندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ ڈرائیور گاڑی بھگاتا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں وہ ہمیں ایک پارکنگ میں لے گیا۔ یہاں سے پیدل جانا تھا۔ سونا بازار کافی کھلا اور لمبا تھا، درمیانی راستے لکڑی کی خوبصورت چھتوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہاں زیادہ تر میں نے ہندوؤں کی دوکانیں دیکھیں۔ آرتی ایک دوکان میں داخل ہوگئی۔ وہاں کا ہندو جیولر بڑے تپاک سے ملا، شاید وہ اسے پہلے ہی سے جانتا تھا۔ آرتی نے وہاں سے نیکلس خریدا اور میں نے اسے ایک نازک سا بریس لیٹ لے دیا۔ ہم وہاں سے نکلے تو آرتی نے ڈرائیور سے کہا۔

''اب سٹی سینٹر جانا ہے۔''

''جی بہتر۔۔۔'' ڈرائیور نے کہا اور چل دیا۔ پھر پتہ نہیں، کہاں سے گھومتے گھماتے وہ ہمیں سٹی سینٹر لے آیا۔

''شجاع! اسے ہم یونہی کھڑا رکھیں گے؟ یہ جائے، ہمیں یہاں شام تک رہنا ہے۔'' اس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی ریمارکس دیتا اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ''تم گھر جاؤ، ہم ٹیکسی سے آجائیں گے۔''

''جیسے آپ کہیں۔۔۔'' ڈرائیور نے یہ کہا اور چل دیا۔ مجھے آرتی کی سمجھ نہیں آئی لیکن میں ان آخری لمحوں میں اسے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ بس یہی ایک درمیان میں رات تھی، اس لیے خاموش رہا۔ سٹی سینٹر ایک بہت بڑا شاپنگ سینٹر تھا، ہر طرح کی اشیا سے بھرا ہوا۔ وہاں فوڈ کورٹس بھی تھے، ایسے ہی ایک انڈین فوڈ کورٹ کے سامنے جا کر آرتی نے کہا۔

''پہلے کچھ کھا پی لیں، پھر خریداری کرتے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں ہنس دیا۔

''ہنسے کیوں؟'' اس نے معصومیت بھری حیرت سے پوچھا۔

''تم بالکل اس دیہاتی عورت کی طرح کر رہی ہو جو شہر میں خریداری بعد میں کرتی ہے، پہلے کھانے پینے کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔''

''چلیں، ہمیں دیہاتی عورت سمجھ لیں۔'' اس نے اٹھلاتے ہوئے نخرے سے کہا اور انڈین چٹ پٹی ڈشیں لے آئی۔ ہم وہ کھاتے رہے، آرتی باتیں کرتی رہی اور میں سنتا رہا۔ کھا

پی کر ہم یونہی ٹہلنے لگے، کافی وقت گزر جانے کے بعد آرتی نے کچھ نہ خریدا تو مجھے حیرت ہوئی۔

''آرتی! کیا تمہیں یاد ہے کہ تم یہاں خریداری کے لیے آئی ہو؟''

''ہاں، یاد ہے۔ ونڈو شاپنگ ہی تو کر رہے ہیں ہم۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا پھر ایک لمحہ توقف کے بعد بولی۔ ''در ہم تو سارے نیکلس خریدنے میں خرچ ہو گئے۔ یہاں تو آپ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارا جا رہا ہے۔''

''وہ گھر میں بھی گزارا جا سکتا تھا، میں نے آج کی رات تمہارے لیے بچا کر رکھی ہے ،آؤ، چلیں۔'' میں نے کہا تو وہ اٹھلا کر بولی۔

''اور وہ شویتا، اس کا ڈنر؟''

''وہ بھی سمجھو، تمہارے لیے ہی ہے، ڈنر کے بعد میں نے وہیں تو نہیں رہ جانا، واپس گھر آنا ہے۔'' میں نے باہر کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ سٹی سینٹر سے باہر آتے ہی سامنے ایک ٹیکسی نظر آئی، ہم اس میں بیٹھے تو میں نے گھر کا پتہ بتایا۔ مجھے آرتی پر غصہ آ رہا تھا، یہ کیا احمق پن تھا مگر میں نے اظہار نہیں کیا۔ پھر کافی سارا وقت گزر جانے کے باوجود گھر نہیں آیا تو میں قدرے پریشان ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو گیا۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ کسی اور طرف سے ہمارے گھر کی طرف جا رہا ہے مگر اجنبی علاقہ ہونے کی وجہ سے پریشان ضرور تھا۔ پھر اس وقت مجھے ہوش آیا جب ٹیکسی ایک بڑے سے گھر کے گیٹ میں داخل ہوئی اور پورچ میں جا رکی، شاید انہیں ہمارے آنے کی پہلے ہی سے خبر تھی۔

''اے مسٹر! کہاں لے آئے ہو ہمیں؟'' میں نے کڑک کر پوچھا تو اس نے برآمدے کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہاں سے دو شخص ہاتھوں میں گن لئے برآمد ہوئے۔ وہ آناً فاناً ہماری طرف بڑھے، میں نے آرتی کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر میں قدرے اس کھیل کو سمجھ گیا۔ ایک گن مین میری طرف کا دروازہ کھول کر باہر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں سکون سے اتر کر باہر آ گیا تو دوسری طرف سے آرتی اتر گئی۔ وہ ہمیں لیتے ہوئے اندر چلے گئے۔ پھر چند لمحوں بعد انہوں نے ہمیں ایک سجے ہوئے بیڈ روم میں دھکیل دیا۔ میں نے پلٹ کر آرتی کی طرف دیکھا، وہ جوتے اتار کر اطمینان سے بیڈ پر دراز ہو چکی تھی۔ میرے یوں دیکھنے پر وہ بولی۔

''آ جا، میرے راجہ! یہاں ہمیں ڈسٹرب کرنے والا کوئی نہیں۔۔۔'' میں اس کا لہجہ سن کر حیران رہ گیا، کہاں آپ جناب اور کہاں تھرڈ کلاس عورتوں کی زبان، اس نے اصلیت

ظاہر کر کے رکھ دی تھی، میں نے اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

''آرتی! یہ سب تم نے کیوں کیا؟''

''دور دور سے ہی سوال کرتے رہو گے میری بانہوں میں نہیں آؤ گے؟ آؤ، میرے سینے سے لگ جاؤ۔ پھر جتنے سوال چاہے، کرتے رہنا۔'' آرتی نے زہریلی مسکراہٹ سے مصنوعی خمار آلود لہجے میں کہا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر کھینچ لیا۔ میں نے ان لمحوں میں طے کر لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

''آرتی! مجھے اغوا کر کے کیا ملے گا تمہیں؟'' میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''دیکھو، راجہ! میں کوئی چھوئی موئی طرح کی دیہاتی لڑکی ہوں نہیں اور نہ ہی لاوارث ہوں، تم سونے کی چڑیا ہو، ہم اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتے۔''

''تم نے یہ کیسے جان لیا کہ میں سونے کی چڑیا ہوں؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بے وقوف سمجھتے ہو مجھے؟ حیدر تمہارے دوست کے لیے لمحوں میں لاکھ درہم وار سکتا ہے، تم پر تو دس لاکھ وار دے گا اور اب تو آشرم والے بھی تمہاری چاہ کر رہے ہیں، وہ بھی تو کچھ دیں گے۔ پھر چاہے نہ دیں مگر ہمیں شوبتا کو بھی تو نقصان پہنچانا ہے، بڑے ڈنر کرتی ہے تیرے ساتھ۔۔۔''

''دیکھو، تم اپنے لیے بہت ساری مشکل بڑھا رہی ہو، تمہیں دولت چاہئے نا! بتاؤ کتنی رقم چاہئے؟''

''ارے اس کا فیصلہ تو ہم نہیں کرنے والے، ہمیں تو تمہارا غرور توڑنا ہے۔ ہمیں تو تمہاری چاہ ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے کہا تو وہ بڑھ کر میری شرٹ اتارنے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، تب وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''نہ، ایسا مت کرو۔ اب تو میری مرضی چلے گی۔۔۔''

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''دیکھو، شجاع! تم ہمیں پسند ہو۔ ہم نے اپنے اوپر والوں سے کہا تھا کہ ہماری دونوں کی مراد پوری ہو جائے، مطلب انہیں درہم اور مجھے تم مل جاؤ تو شجاع! تمہیں زندہ چھوڑ دیا جائے گا لیکن اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو پھر ایک اذیت ناک موت تمہاری قسمت میں لکھ دی جائے گی، تم نے ابھی تک میرا پیار دیکھا ہے، میرا انتقام نہیں دیکھا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور ایک ہی جھٹکے میں میری شرٹ پھاڑ دی، غصے کی تیز لہر ابھری اور میں نے ایک

زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اس کے گال پر میری انگلیوں کے نشان ثبت ہو گئے۔ ''چٹاخ'' کی زوردار آواز سے وہی گن مین اندر آ گئے تو آرتی نے کہا۔

''تم جاؤ، یہ ابھی نخرے کرے گا، میں سنبھال لوں گی اسے۔۔۔'' اس نے نخوت سے کہا تو وہ لوگ چلے گئے۔ تب آرتی ایک دم مجھ پر سوار ہو گئی۔ میں انہیں لمحوں میں سمجھا کہ آرتی لڑکے کے فن سے بھی آشنا ہے، اس نے میری دونوں کلائیوں کو اپنی گرفت میں لے کر کہا۔

''تم نے مجھے ہمیشہ دھتکارا جذباتی باتیں کر کے اور کبھی نظر انداز کر کے، تمہیں شاید پتہ نہیں کہ جسے میں چاہوں، اسے حاصل کر کے رہتی ہوں اس لیے مزاحمت نہ کرو۔ ان لمحوں کو خوشگوار موڈ میں یادگار بنا دو۔ تمہارے عوض دولت ملے گی اور میرا وعدہ ہے کہ تمہیں زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ ورنہ۔۔۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا تو میں ہنس دا۔

''آرتی! تم غصے میں بہت بری دکھائی دیتی ہو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ میں تمہاری خواہش پوری کردوں گا؟ قطعاً نہیں، ہاں تمہیں دولت چاہیے تو وہ میں تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں۔ اور میری طرف سے ضمانت ہے کہ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔'' اس سے پہلے کہ آرتی کچھ کہتی، میرا سیل فون بج اٹھا۔ میں نے جب تک فون کے لیے پتلون کی پچھلی جیب میں ہاتھ ڈالا، آرتی نے چشم زدن میں ایک پتلی دھار والا خنجر نکال کر میری گردن پر رکھ دیا۔

میرا سیل فون مسلسل بج رہا تھا۔ میں نے فون پر نمبر دیکھنا چاہے تو آرتی نے وہ فون چھین لیا، پھر نمبر دیکھ کر بولی۔

''یہ تو حیدر کا فون ہے۔''

''تم سن لو۔۔۔'' میں نے بے پرواہی سے کہا تو اس نے فون رسیو کر لیا۔

''ہاں، ہم شاپنگ سنٹر میں ہیں، بس ابھی آ جائیں گے، وہ ہمارے پاس ہی ہیں، لیں بات کریں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون میری طرف بڑھاتے ہوئے خنجر کا دباؤ بھی بڑھا دیا۔

''بول کیوں نہیں رہے؟'' میرے ''ہیلو'' کہنے پر وہ تقریباً چیخ اٹھا۔

''جب آرتی نے کہہ دیا کہ ہم آ رہے ہیں تو پریشانی کی کیا بات ہے؟''

''دیکھو، شجاع! کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟ صرف ہاں یا ناں میں جواب دے دو۔''

''کوئی ایسی بات نہیں یار! بس تھوڑی دیر مزید موج میلہ کر کے گھر آ رہے ہیں۔ تم پریشان نہیں ہونا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں فون جیب میں ڈالنا چاہتا تھا کہ آرتی

نے پکڑ لیا اور ایک طرف رکھ دیا۔

''ہاں، تو میرے راجہ! کیا خیال ہے تمہارا؟'' وہ تقریباً مجھ پر حاوی ہوتے ہوئے بولی۔

''تم نے جو سوچا ہے، وہی کرو، میری طرف سے انکار ہے۔''

''شجاع! سیدھی طرح لائن پر آجاؤ، میں نہیں چاہتی کہ تم دکھتے ہوئے وجود کے ساتھ میرا حکم ماننے پر مجبور ہو جاؤ۔''

''میں فقط تمہیں دولت دے سکتا ہوں۔ فون لاؤ، میں حیدر سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ تمہاری مطلوبہ رقم کا بندوبست کر دے۔ میرے جیتے جی یہ فائدہ حاصل کر لو، پھر شاید میرے مر جانے کے بعد تمہیں ایک کوڑی بھی نہ ملے۔''

''میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم یہ احسان مجھ پر کیوں کر رہے ہو؟''

''تم بہت کم ظرف ہو، اس لیے تم اسے سمجھ نہیں سکتیں۔'' میں نے کہا تو وہ شدت حیرت سے بولی۔

''میں کم ظرف، شجاع! میں کم ظرف؟ غلط کہہ رہے ہو تم، میرے شباب کو ٹھکرا دینے والا شخص مجھے ہی کم ظرف کہہ رہا ہے۔''

''ہاں، آرتی!'' میں نے یکدم اسے خود سے الگ کر دیا اور انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔ ''میں نے تمہارے لیے پتہ نہیں کیا کیا سوچا تھا، اتنا بہت کچھ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ کاش! تم میرے خیالوں کو دیکھ سکتیں یا کم از کم محسوس ہی کر سکتیں تو اتنی گھٹیا حرکت کے بارے میں کبھی نہ سوچتیں۔ تم نے بہت تھوڑا سوچا ہے اپنے لیے۔۔۔'' میں نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔ وہ جواباً کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ سیل فون بج اٹھا۔ آرتی نے لیٹے لیٹے ہی فون اٹھایا، نمبر دیکھے جو اجنبی تھے۔ وہ میرے قریب ہی لیٹی ہوئی تھی، اتنی نزدیک کہ جب اس نے فون آن کر کے ''ہیلو'' کہا تو جواباً شویتا کی آواز سنائی دی۔

''شجاع کہاں ہے، اس سے بات کراؤ۔'' شویتا نے رعب دار آواز میں کہا۔

''میں آرتی بات کر رہی ہوں۔ جو بات کرنی ہے، مجھ سے کرو۔'' وہ سرد سے لہجے میں بولی۔

''آرتی! تم، تم اس لہجہ میں بات کرو گی؟'' شویتا نے قدرے حیرت سے کہا۔

''میں بات ہی نہیں، اور کچھ بھی کروں گی۔ تم کہو، کیا کہنا چاہتی ہو۔'' آرتی نے ساری حدیں پھلانگ دیں۔

''شجاع سے بات کراؤ۔'' شویتا کے لہجے میں غصہ تھا۔

''تمیز سے بات کرو، مائی ڈیر ماتا جی! اور سنو، میں چاہوں تو اس سے بات کرا دوں یا نہیں۔ بالکل اسی طرح میں پل بھر میں اسے قتل بھی کر سکتی ہوں۔'' وہ اپنی رو میں کہہ رہی تھی۔ اس دوران وہ خنجر کی طرف سے دھیان ہٹا بیٹھی تھی۔ میں چاہتا تو اسی وقت اسے قابو میں کر لیتا مگر باہر نکلتے ہی پتہ نہیں کیسے اسلحہ بردار لوگوں سے واسطہ پڑ جاتا۔ میں نے یہ موقع ضائع کر دینا ہی مناسب سمجھا۔

''یہ کیا بکواس کر رہی ہو، تم ہوش میں تو ہو؟'' شوبتا چیختے ہوئے بولی۔

''میں نے کہا نا، تمیز سے بات کرو ماتا ہری! لیکن لگتا ہے، تمہیں ابھی عقل نہیں ہے۔ جب تمیز سے بات کرنا آ جائے تو دوبارہ فون کر لینا۔'' اس نے کہا اور فون آف کر کے بیڈ پر ہی پھینک دیا۔ پھر میری طرف گھائل نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''راجہ! اتنا اچھا ماحول ہے، تنہائی ہے اور وقت ہی وقت ہے، چھوڑو سب سوچوں کو اور آؤ ان لمحوں کو خوشگوار موڈ کے ساتھ یادگار بنا دو۔''

''سوری، آرتی! تمہیں دولت چاہیے، وہ میں دینے کے لیے تیار ہوں اور یہ ضمانت بھی کہ بعد میں بھی کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔'' میں نے انتہائی اطمینان سے کہا۔

''اتنی مہربانی مجھ پر کیوں......؟'' وہ طنزیہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں، آرتی! تم اسے مہربانی ہی تصور کر سکتی ہو، اس لیے کہ تم واقعی کم ظرف ہو۔ اگر تم نے ذرا سا بھی کھلے ذہن کے ساتھ سوچا ہوتا تو تمہیں سب سمجھ میں آ جاتا۔''

''مثلاً، کیا سمجھ میں آ جاتا؟'' اس کا لہجہ ہنوز طنزیہ تھا۔

''آرتی! میں تمہیں پاکستان لے جانا چاہتا تھا اپنے ساتھ ہمیشہ کے لیے، میں نے حیدر سے بات کی، اس کی اتنی رسائی نہیں تھی لیکن میری خاطر اس نے اپنے نیٹ ورک سے بات کی۔ وہ لوگ تمہیں کھونا نہیں چاہتے تھے لیکن انہوں نے ایک شرط پر تمہیں جانے کی اجازت دے دی کہ میں ان کے لیے پاکستان میں ایک غیر اخلاقی کام سر انجام دوں جو یہ نہیں کر سکتے، بہت بھاری قیمت لگائی تھی انہوں نے لیکن میں نے فقط تمہاری خاطر یہ قبول کر لیا۔ میں نے عندیہ دے دیا کہ میں پاکستان چلا جاؤں گا۔ انہوں نے اب تک مجھے کام نہیں بتایا تھا، آج رات شوبتا اسی سلسلے میں مجھ سے بات کرنے والی تھی جس کے ساتھ تم نے اتنی بدتمیزی کی۔''

''تم نے، تم نے، شجاع! ایک بار بھی مجھے اشارہ نہیں دیا؟'' آرتی حیرت زدہ رہ گئی۔

''کیا بات کرتا میں، ابھی تو ڈیل چل رہی تھی، بات کسی کنارے لگتی تو میں کہتا۔

میری ساری توجہ اسی مسئلہ کو حل کرنے کی طرف تھی۔“

”تم ایسا کیوں چاہتے تھے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں، آرتی! تم نے مجھے پہلی ملاقات ہی میں گھائل کر دیا تھا۔“ میں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

”پاگل بناتے ہو، تم اگر مجھ سے محبت کرتے ہوتے تو میں تمہارے اتنے قریب رہی لیکن تم نے مجھے ایک گھٹیا۔۔۔“

”یہ تمہاری سوچ ہے، آرتی! اس وقت تم اپنی خواہش کے لیے پاگل ہو رہی ہو، میری باتیں سمجھ نہیں آ رہی ہیں اور اسی لیے میں تمہیں کم ظرف کہتا ہوں۔ میرا مقصد تمہارا جسم حاصل کرنا نہیں تھا، میں تمہیں اپنانا چاہتا تھا۔ اپنی دلہن بنا کے اور اس کا احساس تم بھی کر سکتی ہو کہ اگر میں تم سے یہاں شادی کرنے کی بات بھی منہ سے نکالتا تو کیا ایسا ممکن ہو سکتا تھا۔ وہ لوگ کرنے دیتے؟ میں نے بہت بڑی قیمت دے کر تمہیں حاصل کرنا چاہا تھا مگر۔۔۔“ میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تبھی اس کا خنجر والا تنا ہوا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا، میرا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔

”اس کا ثبوت؟“ اس نے اپنی آواز میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی ثبوت نہیں ہے میرے پاس اور نہ ہی میں کوئی ثبوت دے سکتا ہوں۔ ہاں، اگر میں شوبیتا سے بات کر سکتا اور اس میں طے ہو جاتا تو شاید میں اس کی گواہی دلا سکتا۔“

”حیدر؟“

”ایسی صورت حال میں وہ کیا بتا سکتا ہے، تم خود سوچو۔ تم اپنا کام کرو۔ چاہو تو مجھے قتل کر دو۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کے خنجر والے ہاتھ کو ایک طرف جھکایا اور اطمینان سے پھیل کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ تبھی وہ بولی۔

”تم اتنی سی بات کی خاطر مر جانا ہی کیوں پسند کر رہے ہو؟“ اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

”اس لیے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ تم چاہے کچھ بھی ہو لیکن کم از کم میں تمہیں آلودہ نہ کروں، پوری پاکیزگی کے ساتھ اپنانا چاہتا تھا میں۔۔۔“

”کیا تم مجھے مسلمان کرنا چاہتے تھے؟“

”اگر تمہاری مرضی ہوتی، تب ورنہ میری دلہن، تم چاہو تو مجھے قتل کر دو۔“ میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ تو وہ کتنی ہی دیر تک مجھے دیکھتی رہی، پھر میرے چہرے پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے پوچھا۔

’’تم کیا واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھے پاکستان لے جانا چاہتے ہو؟‘‘

’’میری تو یہی خواہش تھی۔۔۔‘‘ میں نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

’’تھی، مطلب، اب نہیں؟‘‘ اس نے قدرے حیرانگی سے پوچھا۔

’’میں تو اب بھی تم پر اعتماد کر سکتا ہوں مگر ان حالات میں کیا تم میرا اعتبار کرو گی؟ قطعاً نہیں، کیونکہ اب تم خود پھنس چکی ہو۔‘‘ میں نے کہا تو میری بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

’’کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم نہ پاکستان جائیں اور نہ انڈیا، کسی تیسرے ملک چلے جائیں مثلاً تھائی لینڈ؟‘‘

’’تم کیا سمجھتی ہو، ان لوگوں کی پہنچ وہاں تک نہیں ہوگی۔ کیا بھارتی خفیہ تنظیم وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی؟‘‘

’’کرتی ہے تو کرے لیکن چھوٹا ارجن کے پاس پہنچ جانے پر ہمیں کوئی تنگ نہیں کر سکے گا۔ یہ لوگ ہمیں یہاں سے بحفاظت نکال کر لے جائیں گے۔‘‘ اس نے صدقے واری جاتے ہوئے مجھے سمجھایا۔

’’تو کیا وہ ہمیں جرائم کی دنیا میں نہیں دھکیل دیں گے؟ وہاں میری کوئی جڑیں نہیں ہیں لیکن پاکستان میں تو ہیں۔ میں نے ان کے کام کے لیے آمادگی اسی صورت میں ظاہر کرنا تھی جب وہ تمہیں میرے ساتھ بھیج دینے کو تیار ہو جاتے۔ میں یہی شرط رکھتا۔‘‘ میں بات کو گھما کر پھر وہیں لے آیا۔

’’تم واقعی ٹھیک کہتے ہو۔‘‘ اس نے تشویش سے کہا۔ ’’اب۔۔۔اب میں نے شویتا کو بھی ناراض کر لیا ہے اور یہ لوگ۔۔۔ یہ لوگ بھی تو ہمیں نہیں جانے دیں گے ہو سکتا ہے، اب تک یشونت یا حیدر سے رابطہ بھی کر چکے ہوں۔‘‘

’’دیکھو، میں شویتا کو سنبھال لیتا ہوں۔ میں اس سے کوئی بھی بہانہ کر دوں گا لیکن اصل مسئلہ تو یہاں سے نکلنے کا ہے، وہ راہیں تم خود ہی مسدود کر چکی ہو۔‘‘

’’یہاں ممکن ہیں صرف یہی دو گن مین اور ایک چوکیدار۔۔۔ ہو سکتا ہے مزید ہوں لیکن مجھے نہیں علم۔۔۔ انہوں نے مجھے صرف دو گھنٹے دیئے ہیں، پھر میں تمہیں ان کے حوالے کر کے چلے جانے پر مجبور ہوں گی اور اس میں سے خاصا وقت گزر چکا ہے۔‘‘ اس نے دکھ سے کہا اور خاموش ہوگئی، تبھی حیدر کا فون آ گیا۔

''تم اب تک پہنچے نہیں؟''

''بس، یار! نکلتے ہیں۔ تھوڑا موج میلہ کرلیں۔''

''آرتی کہاں ہے؟''

''میرے پاس ہے۔''

''تم مجھے صحیح کیوں نہیں بتاتے کہ تم اغوا ہو چکے ہو؟''

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''وہ تمہارے عوض پانچ لاکھ درہم مانگ رہے ہیں۔''

''تو پھر؟''

''میں بندوبست کر رہا ہوں، ہو جائے گا۔ مجھے ڈر یہی ہے کہ وہ تمہیں گزند نہ پہنچائیں۔ بہرحال تم پوری عقل کے ساتھ وقت گزارنے والی بات کرو''

''اوکے۔'' میں نے کہا تو آرتی نے فون پکڑ کر بند کر دیا اور تقریباً چیختے ہوئے بولی۔

''ختم کرو یہ سب اور جو میں کہہ رہی ہوں، وہ کرو۔''

''آرتی! چلو، باہر چلیں۔'' میں نے اس کا خنجر پکڑ کر کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' میرا لہجہ تبدیل ہو جانے پر وہ چونک گئی۔

''آرتی! میں سمجھ گیا ہوں کہ حیدر پانچ لاکھ درہم نہیں دے سکتا، ان لوگوں نے اس سے رقم ہی اتنی مانگی ہے اور یشونت وغیرہ کو مجھ پر اتنی رقم لگانے کی ضرورت ہی نہیں۔ لہٰذا یا تو تم مجھے قتل کر دو یا پھر انہیں سمجھاؤ کہ وہ ہمیں پاکستان جانے دیں۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ وہ مجھ پر اعتماد کرلیں گے لیکن۔۔۔''

''اس کا ثبوت میں ابھی دے دوں گا۔ یہاں ابھی چاہو تو کسی مولانا کو بلوا لو اور میرے ساتھ نکاح کرلو یا کسی پنڈت کو بلواؤ جو اگنی کے گرد پھیرے لگوا دے اور میں تمہارے گلے میں منگل سوتر ڈال کر تمہاری مانگ میں سندور بھر دوں۔ یہیں سہاگ رات ہوگی۔ پھر جو ہو، سو ہو۔۔۔'' میں نے یہ بات اس قدر جذباتی لہجہ میں کہی کہ آرتی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''شجاع! یہ تمہارا فیصلہ ہے؟''

''ہاں، آرتی! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اسے اپنے گلے لگا لیا، تبھی وہ ہچکیوں سے رو پڑی۔ میں نے اس کے آنسو صاف کیے پھر آرتی میرے ساتھ کمرے سے باہر جانے کو تیار ہوگئی۔ میں ان جذباتی لمحوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ اگلے پل میں کیا

فیصلہ صادر کر دے، اس بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن میں کمرے سے باہر کی فضا کا جائزہ لے کر ہی کوئی لائحہ عمل سوچ سکتا تھا۔ پھر میں نے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا اور اسے ساتھ لے کر کمرے سے باہر آنے کے لیے اٹھ گیا۔ دروازہ کھلتے ہی ہماری نظران گن برداروں پر پڑی جو سامنے ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی چوکنا انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے، تبھی آرتی نے ان میں سے ایک موٹے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ول! باس آچکا ہے یا؟'' اس نے سوالیہ انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اسے یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مطلب؟'' آرتی کے لہجے میں قدرے حیرت تھی۔

''مطلب یہ کہ اسے یہاں نہیں آنا ہمیں اس شخص کو لے کر باس کے پاس جانا ہے جہاں یہ بہت محفوظ رہے گا، تم نے اگر اپنا کام ختم کر لیا ہے تو واپس کمرے میں چلی جاؤ، اب کچھ لوگ تمہارے ساتھ وقت گزارنا چاہیں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''واٹ نان سینس، کیا بک رہے ہو تم؟'' آرتی نے انتہائی غصے میں کہا اور چند قدم کے فاصلے پر پڑے ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھی تو دوسرا شخص اس کا راستہ روک کر بولا۔

''فضول کوشش کرو گی، میری جان! میری بات مان لو اور چپ چاپ کمرے میں چلی جاؤ۔ ہمیں اپنا کام کرنے دو۔''

''منوج! میرے ساتھ ایسے لہجے میں بات مت کرو، ورنہ تمہیں پتہ ہے کہ تم کتنا پچھتاؤ گے۔'' آرتی نے غراتے ہوئے کہا تو منوج مسکراتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ فون تک پہنچی اور نمبر ملانے کے بعد رابطہ ہو جانے کا انتظار کرتی رہی۔ کچھ لمحوں بعد رابطہ ہوتے ہی چند تمہیدی باتوں کے بعد وہ بولی۔

''میں اس کے ساتھ پاکستان جانا چاہتی ہوں ۔۔۔ نہیں، رقم ملے گی۔ اس کا دوست بندوبست کر رہا ہے ۔۔۔ مجھے کوئی مجبوری نہیں ۔۔۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں ۔۔۔ نہیں، پاکستان جا کر نہیں۔ ابھی اور اسی وقت ہاں، کسی پنڈت کو بلوانا ہوگا ۔۔۔ میں مسلمان نہیں ہو رہی اور نہ ہم دونوں میں کوئی ایسی شرط ہے ۔۔۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے ۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ ۔۔۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتی ۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا، تم مجھے دھوکہ دے رہے ہو ۔۔۔ یہ غلط ہے ۔۔۔ سنو، میں اپنی جان دے دوں گی۔'' اس نے یہیں تک کہا تھا، پھر وہ ریسیور کو گھورنے لگی۔ یقیناً دوسری طرف سے رابطہ کٹ

گیا تھا۔ وہ کتنے ہی لمحوں تک کھڑی رسیور کو یونہی گھورتی رہی جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ بت بنی کھڑی تھی مگر پھر اچانک دھاڑتی ہوئی کسی زخمی شیرنی کی طرح ولی پر جھپٹی۔ یہی وہ موقع تھا جب مجھے کچھ کرنا تھا۔ میں نے منوج پر چھلانگ لگادی جو حیرت سے آرتی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک ہی جھٹکے میں گن اس سے چھین لی لیکن فائر کرنے سے خود کو بمشکل روکا۔ پتہ نہیں، باہر کتنے لوگ تھے۔ ایسے میں فائر کی آواز موت کی دعوت دینے کے مترادف تھے۔ ولی ،آرتی سے الجھا ہوا تھا۔ میں نے پوری قوت سے گن کا دستہ اس کے سر پر دے مارا، وہ لمحوں میں چکراتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر میں نے منوج پر گن تانتے ہوئے آرتی سے کہا۔

''ولی کو باندھ دو، پھر اسے دیکھتے ہیں۔''

''شوٹ کر دو اس کو مگر جلدی۔ وہ باس کا بچہ ادھر ہی آنے کو ہے۔'' آرتی نے پورے جوش سے کہا تو اس کے لہجے میں ممبئی کا رنگ آ ہی گیا۔ یہ لاشعور بھی بڑے عجیب تماشے دکھاتا ہے اور جیسے لاشعوری انداز میں آرتی کے سارے پرت لمحوں میں اتر گئے۔ تب میں دھیرے سے بولا۔

''میں نے جو کہا ہے، وہی کرو'' میرے کہنے پر آرتی نجانے کہاں سے بستر کی چادر اٹھا لائی اور اس نے ولی کو باندھ دیا جو اتنی دیر میں آہستہ آہستہ ہوش میں آرہا تھا۔

''منوج! دیکھو، تم موت سے بچ سکتے ہو؟ لیکن اگر ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو؟ ''میں نے سرد سے لہجے میں کہا تو اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ تبھی میں نے گن سیدھی کر لی۔ تو وہ بولا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟''

''تمیز سے بات کرو، منوج! اور یہ بتاؤ، باہر کتنے آدمی ہیں؟''

''ایک چوکیدار گیٹ پر ہے اور دو چھت پر ہیں۔'' اس نے قدرے اکھڑ لہجے میں کہا۔

''بکواس کرتے ہو؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اور اگر تم سمجھو کہ یہاں سے نکل جاؤ گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ ابھی ۔۔۔'' اس نے فقرہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ میں نے گن گھما کر اس کے منہ پر دے ماری، وہ ''اُوخ'' کی آواز کے ساتھ چکرا گیا۔ تب میں نے اسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا، چند منٹوں میں وہ زمین پر تھا۔

''آرتی! تمہارا خنجر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے پنڈلی سے لگا ہوا خنجر نکال

لیا اور میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''اسے دنیا سے مکتی دے دو، مہارانی!'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ آرتی تیزی سے آگے بڑھی، خون کی ایک دھار نکلی۔ وہ تڑپا اور پھر ساکت ہوتا چلا گیا۔ ول یہ سب دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کتنے آدمی ہیں باہر؟''

''منوج سچ کہہ رہا تھا۔'' اس نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہارا بھی مکتی حاصل کرنے کا ارادہ ہے کیا؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''چلو مان لیتا ہوں لیکن اب تم جھوٹ بولو گے کہ اس گاڑی کی چابی تمہارے پاس نہیں ہے جو باہر پورچ میں کھڑی ہے؟''

''منوج کے پاس ہے۔'' وہ بولا تو آرتی نے تیزی سے اس کی تلاشی لے ڈالی۔ اس کی جیب سے چابیاں مل گئیں۔ اب صرف گاڑی تک پہنچنا تھا۔ میں نے سیل فون نکالا اور تیزی سے الطاف پاشا کے نمبر پش کر دیئے، پہلی ہی بیل پر اس نے فون رسیو کر لیا۔

''کہاں ہو تم؟'' اس نے پوچھا تو مجھے اس کے لہجے سے اندازہ ہو گیا کہ اسے میرے اغوا کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔

''مجھے جگہ کا کوئی پتہ نہیں لیکن کیا تمہیں پتہ ہے، مجھے اغوا۔۔۔''

''مجھے پتہ ہے اور میں اس جگہ کے آس پاس ہوں جہاں تمہیں رکھا گیا ہے۔ کوئی نشانی دے سکتے ہو؟'' وہ انتہائی تیزی سے پوچھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایسا کچھ نہیں آیا جس سے میں اس کی رہنمائی کر سکتا، تبھی میں نے کہا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا لیکن ہو سکتا ہے، چند منٹ کے بعد تمہیں فائرنگ کی آواز سنائی دے۔ میں نکل رہا ہوں یہاں سے۔''

''تم نکل رہے ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، لیکن انتہائی خطرہ ہے۔ میں یہاں سے نکل کر تمہیں کال کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اب میں نے ول کی طرف دیکھا اور آرتی کو اسے کھول دینے کے لیے کہا، چند لمحوں بعد وہ آزاد ہو گیا۔

''چلو، مہاراج! ذرا گاڑی تک رہنمائی کرو۔'' میں نے کہا تو وہ جلدی سے اٹھ گیا۔ آرتی نے دوسری گن اٹھا لی۔ پورچ میں آ کر میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور آرتی اسے لے

کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور ایک دم سے بھگا دی۔ ہم پورچ سے گیٹ تک تقریباً آدھے منٹ میں ہی پہنچ گئے۔

اتنی تیزی سے آتی ہوئی کار دیکھ کر چوکیدار اپنے کیبن سے نکل آیا، وہ اپنا پستول بھی سیدھا نہیں کر پایا تھا کہ میں نے اس پر فائرنگ کر دی۔ وہ چیختا ہوا واپس پلٹا۔ اتنے میں چھت سے گولیاں برسنا شروع ہو گئیں۔ سامنے گیٹ بند تھا، میں نے ول سے کہا۔

"چلو، مہاراج! گیٹ کھولو۔"

"اوپر سے فائرنگ ہو رہی ہے۔" اس نے دہشت سے کہا۔

"گیٹ تو کھولنا ہے ورنہ یہیں اندر سے فائرنگ ہو جائے گی۔ یہاں تمہارے بچنے کے چانس نہیں ہیں لیکن گیٹ کھولتے ہوئے شاید بچ جاؤ۔"

"اب چلو۔" آرتی نے کہا تو ول بادل نخواستہ نیچے اتر گیا۔ پھر کار کی اوٹ لے کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ اوپر سے برستی گولیاں شدت اختیار کر چکی تھیں۔ ول نے گیٹ کھول دیا تو میں نے زن سے گاڑی نکال لی، تبھی میں نے ول کی چیخ سنی لیکن میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میں ایک طرف چل پڑا۔ مجھے راستے کا کوئی اندازہ نہیں تھا، میں نے اگلے لمحے سیل فون پر ری ڈائل کر دیا۔

"کہو، شجاع؟" الطاف کی پرجوش آواز سنائی دی۔

"تم اس وقت کہاں پر ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں تم قید ہو، میرا خیال ہے وہاں سے تھوڑی دور، میں فائرنگ کی آواز سن رہا ہوں۔"

"میں وہاں سے نکل آیا ہوں۔"

"اوئے دل خوش کر دیا۔" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے لوکیشن پوچھی۔ میں نے اسے سمجھایا تو اگلے پانچ منٹوں میں ہم مل گئے۔ وہ دو کاروں تھے۔ میں نے اپنی کار چھوڑی اور الطاف کے ساتھ جا بیٹھا۔ آرتی جب کار میں بیٹھی تو الطاف نے کار بھگا دی تب میں نے پوچھا۔

"تم لوگ یہاں کیسے؟"

"جسے ہم دوست بنا لیتے ہیں، اسے اکیلا نہیں چھوڑتے، ائیر پورٹ تک جانے والی کرائے کی کاریں ہمارے دوست ہی لے کر گئے تھے۔ ایک کار تمہاری نگرانی پر تھی۔ تمہاری کار طے شدہ راستہ چھوڑ کر کسی اور طرف نکلی تو مجھے اطلاع مل گئی۔ ہمارا دوست تمہاری نگرانی کرتا

رہا۔ سونا بازار سے سٹی سینٹر تک اور پھر آرتی نے جب کار واپس بھجوائی تو مجھے شک ہو گیا۔ میں نے نگرانی جاری رکھنے کو کہا اور پھر میرا شک صحیح نکلا، وہ تمہیں اجنبی جگہ لے گئے۔ کچھ دیر بعد ندیم کا فون آگیا کہ تمہیں اغوا کر لیا گیا ہے تو میں پوری تیاری سے یہاں پہنچ گیا مگر مصیبت یہ ہوئی کہ جس نے نگرانی کر کے یہاں کا پتہ معلوم کیا تھا، وہ تھوڑا الجھن کا شکار ہو گیا۔"

"الطاف! باتوں کا بالکل وقت نہیں ہے۔ اب میرے لیے اتنا خطرہ نہیں رہا لیکن آرتی کی زندگی شدید خطرے میں ہے، اس نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے وہاں سے نکالا ہے۔ اب کسی بہت ہی محفوظ مقام پر چلو۔۔۔" پھر ہم میں کوئی بات نہ ہوئی اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم جمیرہ بیچ ہی کے علاقے میں کہیں ایک گھر میں پہنچ گئے جو بہت خوبصورت تھا۔ میں نے جاتے ہی پھٹی ہوئی شرٹ بدلی، منہ ہاتھ دھو کر فریش ہوا اور جب ڈرائنگ روم میں واپس آیا تو الطاف متفکر چہرہ لیے بیٹھا تھا، وہ اس وقت تنہا تھا۔

"کیا بات ہے، یوں کیسے بیٹھے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"آرتی دوسرے کمرے میں فریش ہونے کے لیے گئی ہے۔"

"مطلب۔۔"

"بالکل تخلیہ ہے۔"

"میں بھی یہی چاہتا تھا، یہ آرتی کسی چھوٹا ارجن نامی گروپ سے تعلق رکھتی ہے لیکن یشونت وغیرہ کے بارے میں پوری معلومات رکھتی ہے۔ اس سے تم سب کچھ معلوم کر سکتے ہو لیکن تھوڑی عقل اور قدرے پیار سے، تشدد سے نہیں۔ میں اب تمہارے پاس چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ تم اپنا مطلب نکالو، پھر بعد میں اس کے متعلق فیصلہ کر لیں گے۔"

"میں یشونت کے نیٹ ورک کے متعلق تھوڑا بہت جانتا ہوں اور اگر یہ تفصیل بتا دے گی تو۔۔۔"

"یہ تمہارا کام ہے۔"

"کام تو میرا ہی ہے لیکن تم حیدر کو بتائے بغیر یہاں سے نکل جانا، ٹکٹ وغیرہ کا بندوبست رکھنا اور ہو سکے تو ندیم کو بھی۔۔۔ وہ بہت اچھا ہے، کہیں۔۔۔"

"الطاف! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ تم اپنا کام کرو، میں باقی سنبھال لوں گا۔" میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "آؤ، چائے پیتے ہیں۔" ہم ایک دوسرے کمرے میں پہنچے تو آرتی ایک لڑکی سے باتیں کر رہی تھی۔ ان کے درمیان میز پر چائے کے ساتھ دیگر لوازمات دھرے ہوئے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی وہ لڑکی اٹھ گئی اور آرتی چائے بنانے

لگی، تب میں نے کہا۔

"دیکھو، الطاف! ہم وہاں سے زندہ سلامت آ گئے، یہی غنیمت ہے لیکن میں جو کہنے جا رہا ہوں، اسے سن کر بھڑک مت جانا۔"

"کہو؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم میرے دوست ہو، میرے لیے فخر کی بات ہے مگر تم شاید نہیں جانتے کہ میں آرتی سے بے انتہا محبت کرتا ہوں، اتنی کہ جس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"یہ تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا؟" اس نے آرتی سے کپ لیتے ہوئے کہا۔

"اس کا موقع ہی نہیں ملا اور میں نے خود بھی کسی کو نہیں بتایا، یہاں تک کہ آرتی کو بھی آج ہی معلوم ہوا ہے۔"

"ایسا ہے کیا؟" الطاف مسکراتے ہوئے بولا اور آرتی کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

"مجھے نہیں پتہ، الطاف! یہ مجھے کتنا چاہتے ہیں لیکن میں ان سے بہت پیار کرتی ہوں۔"

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آرتی کے ساتھ شادی کر لوں، اس کے لیے تمہیں دو کام کرنے ہوں گے۔"

"وہ کیا؟" الطاف نے حیرت سے پوچھا اور بلاشبہ یہ حیرت مصنوعی تھی۔

"ایک تو کسی نہ کسی پنڈت کا بندوبست کرنا ہوگا جو ہمارے تعلق کو مذہبی رنگ دے دے اور دوسرے فوری طور پر اس کے لیے پاسپورٹ کا بندوبست کر دو تاکہ ہم یہاں سے نکل کر پاکستان چلے جائیں۔" میں نے تفصیل سے سمجھایا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس کے لیے کل تک کا وقت چاہیے ہوگا۔"

"ڈونٹ وری، ہم انتظار کر لیں گے۔" آرتی نے جلدی سے کہا۔

"لیکن انتہائی خفیہ ہمارے دشمن نہ ہم تک پہنچ جائیں۔"

"او کے، سب ہو جائے گا۔" ہمارے درمیان چند لمحوں کی خاموشی چھائی رہی تو الطاف نے پوچھا۔ "تم لوگوں کے دشمن کون ہو سکتے ہیں؟"

"بہت ہیں، آرتی تمہیں پوری تفصیل سے بتا دے گی اور تم اس پر اعتماد کر سکتے ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا، شاید بات چلتی مگر حیدر کا فون آ گیا۔

"کہاں ہو تم؟"

"مجھے خود نہیں پتہ، کہاں ہوں۔"

"تم اس وقت محفوظ تو ہو؟"

''ہاں، لیکن میں اب یہاں سے نکل رہا ہوں۔''

''تم وہیں ٹھہرو، ہمارے آدمی تمہیں پک کر لیتے ہیں۔ وہ یہیں تمہارے آس پاس کہیں ہوں گے۔''

''انہیں کیسے؟''

''آرتی نے ڈرائیور کو واپس جانے کے لیے کہا تو اسے یہ رویہ عجیب لگا، وہ واپس مڑ گیا لیکن مجھے فون کر دیا۔ میں نے اسے نگرانی کرنے کو کہا۔ میرا شک صحیح نکلا اور میں نے اپنے بندے وہاں بھجوائے تو وہاں پولیس اور لاشیں تھیں۔ تمہارا اور آرتی کا نام و نشان تک نہیں تھا، آرتی کدھر ہے؟''

''میں آرتی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، میں خود پتہ نہیں وہاں سے کیسے نکلا ہوں، بہر حال گھر آ کے بتاؤں گا، تم مطمئن رہو، میں پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مزید بات کرے۔

''شجاع! آپ نے حیدر سے بھی جھوٹ بولا؟'' آرتی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے تمہاری حفاظت چاہئے، جب ہم پاکستان پہنچ جائیں گے تو سب ٹھیک کر لوں گا میں۔'' یہ کہہ کر میں نے چائے کا لمبا سپ لیا، پھر آرتی سے کہا۔ ''یہ میرا بہت پیارا دوست ہے، جان بھی دے سکتا ہے میرے لیے۔ تم بغیر کسی خوف کے یہاں رہنا، میں رات کسی وقت واپس آ جاؤں گا۔''

''اپنا خیال رکھنا۔'' الطاف نے قدرے جذباتی انداز میں کہا تو میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپا دیا۔ میں وہاں سے نکلا اور کچھ دیر بعد مجھے ٹیکسی مل گئی۔ میں نے اپنا جائزہ لیا اور مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے شویتا کو فون کیا، میری آواز سنتے ہی وہ انگریزی میں بولی۔

''ہائے، سویٹ! سنا ہے کہ تم دشمنوں کے چنگل سے نکل آئے ہو؟'' اس کے لہجہ میں خوشی پھوٹ رہی تھی۔

''ہاں، اب تمہارے پاس آنا چاہ رہا ہوں۔'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''خوش کر دیا، پیارے! آؤ، میں تمہیں بھی خوش کر دوں گی۔'' اس نے کھنکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا تم ڈنر لے چکی ہو؟''

''ارے کہاں، تمہاری فکر نے ساری بھوک اڑا دی۔ اب جی بھر کے کھائیں گے۔''

''میں آ رہا ہوں لیکن کہاں آؤں۔؟'' میں نے پوچھا تو اس نے ہوٹل کا نام بتایا۔ وہ

دوبئی کا مہنگا ترین ہوٹل تھا اور مجھے وہاں لابی میں پہنچ کر شویتا کو فون کرنا تھا۔ کافی دیر بعد میں اس ہوٹل کی لابی میں موجود تھا۔ میرے فون کے جواب میں کچھ دیر بعد دو لڑکیاں میرے قریب آ کھڑی ہوئیں۔

''خوش آمدید، شجاع صاحب! آیئے، ماتا جی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔'' میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا، وہ بلاشبہ آشرم کی لڑکیاں تھیں جو میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ میں بھی مسکرایا تو انہوں نے قدم بڑھا دیئے۔ میں ان کے ساتھ چلتا چلا گیا، یہاں تک کہ ہم لفٹ میں داخل ہو گئے۔ جب تک ہم لفٹ سے باہر آئے، وہ بڑے فنکارانہ انداز میں میری تلاشی لے چکی تھیں۔ میں نے اسے محسوس تو کیا لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ مجھے مختلف راہداریوں سے گزارتی ہوئیں ایک کمرے کے سامنے جا رکیں۔ ہلکی سی دستک کے جواب میں ایک لڑکی نے دروازہ کھولا، میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں کمرے کے اندر آیا تو وہ بولی۔

''پلیز اپنا سیل فون دے دیں، ماتا جی کو اچھا نہیں لگے گا جب یہ ڈسٹرب کرے گا۔'' میں نے بحث نہیں کی اور فون سیٹ اسے دے دیا، تبھی وہ دونوں لڑکیاں مجھے لیے ہوئے ایک بیڈ روم میں چلی گئیں جہاں شویتا ایک جہازی بیڈ پر بڑے کروفر سے لیٹی ہوئی تھی، وہی دو سفید چادروں میں لپٹی ہوئی لیکن اس وقت انہی چادروں سے اس کا بدن چھلک رہا تھا، ہلکا ہلکا میک اپ مگر گہری لپ اسٹک، وہ کسی طور پر بھی ادھیڑ عمر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور آنکھوں سمیت پورے وجود سے مسکرا دی، پھر بڑے جذب سے بولی۔

''تمہیں اندازہ نہیں کہ میں تمہیں دیکھ کر کس قدر خوشی محسوس کر رہی ہوں ...۔ خوش آمدید! آؤ، میرے پاس بیٹھو۔'' اس نے انگریزی میں کہا اور بیڈ کی دوسری جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اطمینان سے بیٹھ چکا تو وہ بولی۔ ''آرتی اتنی ہمت دکھائے گی، میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ لڑکی اتنی بااعتماد کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ تمہیں اغوا کر لے گی مگر یہ ایک طرح سے اچھا ہوا۔'' اس نے ایسے لہجے میں کہا جس سے مجھے لگا کہ وہ نشے میں ہے۔

''کیسے؟'' میں نے بیڈ پر پھیلتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے بارے میں میرا ہی نہیں، یشونت کا بھی اعتماد بڑھ گیا ہے۔ تمہاری صلاحیتیں تو سامنے آئی ہی ہیں لیکن ہمیں یہ احساس ہوا ہے کہ یہاں کے پورٹ نیٹ ورک کو

دوبارہ دیکھیں اور وہ بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ۔ کون کس کا آدمی ہمارے درمیان میں ہے، اس کی چھان بین کرنا ہوگی۔'' وہ سرور کی کیفیت میں کہتی چلی گئی۔

''کیا پہلے اس طرف دھیان نہیں دیا گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ یشونت کی ذمہ داری ہے، ہماری نہیں۔ وہ ناکام رہا یا کامیاب، ہمیں اس سے بھی غرض نہیں۔ ہم نے پوری ذمہ داری سے اپنا کام کیا اور ہم کامیاب ہیں۔''

''یعنی میڈیسن پراڈکٹ؟''

''یقیناً یہ ہری داس بھی تو میری ہی تلاش کا نتیجہ ہے اور اب تم ---۔ اگر یشونت ناکام بھی رہا ہے تو ہمیں فرق نہیں پڑنے والا، نیا سیٹ اپ بنا لیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی پھر سائیڈ ٹیبل پر دھرا ہوا سگریٹ کیس اور لائٹر میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ''لو سگریٹ پیئو۔''

''آشرم سے آنے کے بعد میں نے سگریٹ نہیں پی، خواہش ہی نہیں ہوتی۔'' میں نے وہ دونوں چیزیں ایک طرف رکھتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دی۔ پھر خود ایک سگریٹ سلگا کر بولی۔

''خواہش کیسا لفظ ہے، انسان کی زندگی سے کس قدر جڑا ہوا۔'' اس نے یہ کہا اور بھرپور کش لے کر دھواں میری طرف پھینک دیا۔ میں نے برا منائے بغیر جواب دیا۔

''انسانی جدوجہد کی بنیاد خواہش پر ہی ہوتی ہے مگر انسان اپنی خواہشوں کے تعاقب میں خود اپنی خواہشوں کا غلام بن کر رہ جاتا ہے، جبکہ ہم فطری طور پر وقت کے تابع ہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو، شجاع! ہم اس دنیا میں آتے ہیں تو ہمیں زندگی کا یہ سفر بھی طے کرنا ہے۔ یہ ہماری مجبوری ہی نہیں، بے بسی بھی ہے۔ بس انسان لالچی ہو جاتا ہے تاکہ اس بے بسی کے سفر میں آسانیاں پیدا ہو جائیں۔''

''یہ قنوطیت ہے، شویتا! ہم بے بسی کو تو محسوس کرتے ہیں لیکن لفظ زندگی پر غور کیوں نہیں کرتے حالانکہ کتنا بھرپور لفظ ہے، مثبت قوتوں سے معمور خوبصورت لفظ! مگر ہوتا یہ کہ ہم اسے اپنی خواہشوں سے اس قدر آلودہ کر دیتے ہیں کہ زندگی کے معنی تک گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔''

''ہمارے اندر ایک اچھا انسان موجود ہے، وہ ہمیں زندگی کے حقیقی معنوں کا احساس دلاتا رہتا ہے لیکن ہم انجانے میں ایسے راستوں پر نکل پڑتے ہیں کہ جن کی نہ تو کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ ہی ہمارا اصل راستہ ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ بہر حال کہو، بھوک زیادہ تو نہیں لگی؟''

''نہیں، شویتا! ابھی کچھ دیر بعد سکون سے ڈنر لیں گے۔''میں نے کہا تو وہ ہنس دی۔ تبھی اس نے سائیڈ ٹیبل پر دھری پیتل کی چھوٹی سی گھنٹی اٹھا کر ہلائی۔ جس کے جواب میں ایک لڑکی آن وارد ہوئی، شیویتا نے اسے اشارہ کیا تو وہ پلٹ گئی۔ چند منٹوں بعد وہ لڑکی بیڈ پر ہی جام و مینا سجانے لگی۔

''پیئو گے؟''وہ اپنے لیے جام بناتے ہوئے بولی۔

''نہیں، تمہیں پتہ ہے کہ میں نہیں پیتا۔''میں نے سکون سے کہا اور بیڈ کے ساتھ ٹیک لگالی۔

''تمہارا گلاس خالی پڑا ہے۔ اگر جی چاہے تو بتا دینا، میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارے لیے جام بناؤں گی۔''

''شکریہ، لیکن اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''میں نے کہا تو وہ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گئی پھر اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولی۔

''شجاع! لگتا نہیں کہ تم سادھو، سنت یا کوئی درویش ہو سکتے ہو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم ابھی جرائم کی دنیا میں نہیں اُترے مگر اس دنیا میں دہشت کی علامت بن جانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہو۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی؟''

''وہ کیا؟''میں نے پوچھا۔

''برستی ہوئی بارش میں جب بندہ نکلتا ہے، چاہے اس کے پاس چھتری بھی ہو مگر بھیگتا ضرور ہے۔ جرائم کی دنیا میں آ کر شراب اور شباب سے کیسے بچ سکتے ہو، کب تک بچو گے؟'' وہ اپنے لیے دوسرا پیگ بناتے ہوئے بولی۔

''اس کا سیدھا سا جواب تو یہی ہے کہ جب تک بچ سکا۔ جرم کی دنیا میں جتنی ہوش مندی سے رہا جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ میں اس لیے بھی نہیں پیتا۔''

''مان لیا، شجاع! اگر نہ بھی پیئو تو کوئی بات نہیں لیکن یہ شباب، یہ جوان مہکتے ہوئے بدن، اتنا مدہوش کر دینے والا حسن، یہ تو ایک فطرتی شے ہے۔ کیوں بھاگتے ہو اس سے؟''

''میں کب بھاگتا ہوں اس سے لیکن اس سے متعلق میری اپنی ایک سوچ ہے۔''

''بتاؤ، پلیز، بتاؤ۔ میں جاننا چاہتی ہوں؟''

''کیوں؟''میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میری زندگی میں تمہارے جیسے مضبوط اعصاب کا بندہ نہیں آیا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کیا قوت ہے جس کے بل بوتے پر تم خود پر قابو رکھے ہو ورنہ اوپر سے جتنا مرضی خول

چڑھا لیا جائے، حسن کے آگے مرد کی فطری خواہش بغاوت کر کے سارے خول توڑ دیتی ہے۔ بے بس ہو جاتا ہے انسان، بتاؤ، وہ پراسرار قوت کیا ہے؟'' اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو میں دھیرے سے ہنس دیا۔ وہ پوری طرح میری طرف متوجہ تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے جام پکڑ لیا۔ اس نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا تو میں نے اس آدھے سے زیادہ شراب سے بھرے ہوئے گلاس میں تھوک دیا، پھر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''لو پیئو۔'' میرے یوں کہنے پر اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور اگلے ہی لمحے اس کے منہ سے یوں آواز نکلی جیسے ابھی قے کر دے گی۔

''یہ کیا حرکت کی ہے تم نے، شجاع؟'' وہ کراہیئت سے بولی تو میں نے پھر گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لو پیئو نا، شویتا!''

''نہیں، میں نہیں پی سکتی۔'' یہ کہہ کر اس نے پیتل کی وہ گھنٹی بجائی، فوراً ہی وہ لڑکی اندر آ گئی۔ شویتا نے میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے لے جانے کو کہا۔ پھر نیا پیگ بنا کر دو تین سپ لیے اور بولی۔

''یہ کیا کیا تم نے؟''

''میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک مدہوش کر دینے والی شے میں محض تھوکا ہے جس سے تمہیں اتنی نفرت ہوئی کہ گلاس تک خود سے دور کر دیا، بالکل ایسے ہی میرے لیے یہ سارے مدہوش کر دینے والے بدن تھوکے ہوئے جسم ہیں۔'' میں نے کہا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں پھر چند لمحوں بعد غصے میں بولی۔

''میں مانتی ہوں کہ تم وجیہہ ہو، خوبصورت ہو لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنے خود پسند بھی ہو سکتے ہو۔''

''مجھے نہیں پتہ کہ میں خود پسند ہوں یا نہیں مگر میرا اپنا معیار ہے اور اپنی ترجیح، جب مجھے وہ مل جائے گی تو میں خود بڑھ کر اسے حاصل کر لوں گا۔''

''مطلب کہ آرتی، رکمنی جیسی لڑکیاں جو ایک جہان کو مدہوش کر رہی ہیں، تمہارے معیار کی نہیں تو وہ کون سی اپسرائیں ہیں جو ۔۔۔'' وہ جذبات کی رُو میں اونچا بولنے لگی تھی۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''شویتا! وہ کوئی بھی ہو، اپنے جسم کی بنیاد پر دوسرے کو حاصل کرنے والی نہ ہو۔ وہ کچھ بھی کر لیں، تھوک ان کا مقدر ہوتا ہے۔''

"تم کال گرل یا طوائف کو انسان ہی نہیں مان رہے، وہ بھی اسی بدن میں جذبات رکھتی ہیں جس کو تم مرد لوگ نوچتے ہو۔ اسے بھی بھوک لگتی ہے اور معاشرہ اسے مفت روٹی نہیں دیتا۔ یہ تھوک کس پر ہوئی، تم پر، تمہارے معاشرے پر یا بدن کی بنیاد پر دوسروں کو حاصل کرنے والی پر؟"

"مجھے تمہاری بات سے اختلاف نہیں ہے۔" میں نے کہا تو جیسے اس نے سنا ہی نہیں، بولی۔

"طوائف بھی اسی معاشرے کا حصہ ہے جہاں سے تم اپنا معیار تلاش کر رہے ہو۔ طوائف بھی اپنے بدن کی بنیاد پہ کسی کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتی، یہ تمہارا معاشرہ اسے سب سکھاتا ہے، طوائف کا نام بھی اسی نے دیا ہے۔ یہ کہیں اور سے نہیں ٹپکی، تمہارے معاشرے نے اسے جنم دیا ہے جس سے تم نفرت کر رہے ہو۔"

"تمہاری ساری باتیں سچ ہیں۔ مجھے ان سے قطعاً انکار نہیں لیکن معاشرہ اگر طوائف کو جنم دے رہا ہے تو دیتا رہے۔ مجھے اگر نفرت کرنے کا حق نہیں تو محبت پر مجبور بھی نہیں کر سکتی ہو۔ میں تو بس پہلو بچا کے نکل جانا چاہتا ہوں اور تم مجھے اس کی بھی اجازت نہیں دے رہی ہو بلکہ اسی گندگی میں اتر جانے کو کہہ رہی ہو۔"

"یہ گندگی بھی تو تمہارے معاشرے کی ہے۔"

"تو کیا ضروری ہے کہ خود کو اس سے آلودہ کر لیا جائے؟ جو آلودہ ہونا چاہتے ہیں، وہ ہوتے رہیں میں کم از کم ایسا نہیں چاہوں گا لیکن یاد رکھو کہ تم اس گندگی پر جتنے بھی ورق چڑھا لو، جتنے بھی مہنگے انداز میں پیش کرو، یہ گندگی رہے گی۔"

"تمہارے معاشرے کی ڈیمانڈ ہے یہ، اسے مجبور کر دیا جاتا ہے۔"

"میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ یہ معاشرے کا مظلوم ترین طبقہ ہے لیکن کیا اس نے خود کوشش کی کہ اس مظلومیت سے نکل آئے۔ تمہارے بقول، معاشرہ اسے جنم دے رہا ہے تو پھر جنم دینے والا اسے کیسے ختم کر سکتا ہے؟ اسے خود کوشش کرنا ہوگی۔"

"وہ کیا خاک کوشش کرے گی، تم طوائف کی بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ اس اندھیر نگری میں کیا تم کہہ سکتے کہ تمہیں تمہارا معیار مل جائے گا۔ اس کے بدن پر بھی کوئی تھوک گیا ہوگا تو کیا تم اسے چاٹ لو گے؟"

"نہیں، شویتا! تم غلط رخ پر سوچ رہی ہو۔ سوچ یہ ہونی چاہئے کہ اگر میں نے کسی کے بدن پر نہیں تھوکا تو مجھے بنا تھوکے مجھے میرا ساتھی ملے گا۔" میں نے کہا تو...

سے بولی:

''کیا ثبوت ہوگا تمہارے پاس؟''

''میرا یقین، اور مجھے اپنے یقین پر پورا بھروسہ ہے۔ یہاں اتنے اُجلے لوگ ہیں کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ اُلّو تو اندھیرا چاہے گا، اس کے لیے اندھیرا روشن ہوتا ہے۔ پورے چمکتے ہوئے دن کی روشنی میں وہ بالکل اندھا ہوتا ہے۔ اُلّو نہیں بلکہ انسان کی نظروں سے دیکھو، سب نظر آئے گا۔''

''تمہاری باتوں سے تو یوں لگتا ہے کہ تم طوائف کو عورت ہی نہیں سمجھتے بلکہ اگلدان۔۔۔''

''نہیں، عورت مقدس ہے، اتنی مقدس کہ شاید تم اس کا تصور بھی نہ کرسکو۔ سونا جہاں بھی پڑا ہو۔ گندگی میں، مٹی میں، جوہری کی دوکان پر یا کسی بدن کا حصہ ہو، وہ سونا ہی رہتا ہے۔ مقام بدلنے سے اس کی حیثیت میں فرق نہیں آجاتا۔ وہ ناک کا لونگ بھی بنتا ہے، ماتھے کا جھومر اور پاؤں کی پائل بھی لیکن وہ اگر گندگی میں پڑا ہو تو کتنا دکھ ہوگا۔ اس کے دکھ کا اندازہ تم کرسکتی ہو جو اس شے کی اصل حقیقت سے واقف ہو۔ ماں بھی عورت ہے لیکن اس کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اعلیٰ تربیت دے۔ جہاں وہ اپنے مقام سے اِدھر اُدھر ہوئی، اس نے اپنی اہمیت گھٹالی۔ اس دنیا پر عورت تخلیق کا منبع ہے، شویتا دیوی! اور معاشرہ اگر اسی کوکھ کا بیوپار کرنا شروع کردے تو کیا اس کو جائز مان لیا جائے گا؟ کم از کم میں ایسا نہیں کرسکتا۔'' میں نے تحمل سے کہا وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس ایک طرف رکھ کر سوچ میں گم ہوگئی۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تم مہان ہو، شجاع! میں نے تمہارے بارے میں کتنا گھٹیا اندازہ لگایا تھا، مجھے معاف کردو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے پیروں پر رکھ دیئے۔ تو میں نے جلدی سے اپنے پاؤں ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا کررہی ہو تم۔۔۔''

''میرے اندر کی عورت مجھے ایسا کرنے پر مجبور کررہی ہے۔۔۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں ایسی کسی راہ پر چلوں گی جہاں میری کوکھ ہی میرا راستہ روک کر مجھ سے سوال کرے گی۔ بس، شجاع! میں کچھ اور نہیں سن پاؤں گی۔'' اس نے انتہائی دکھی لہجے میں کہا۔

''شانت ہو جاؤ، شویتا!'' میں نے اسے اپنے قریب کرکے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ کتنی ہی دیر تک میرے قریب آکر روتی رہی، پھر آہستہ آہستہ پرسکون ہوگئی تو میں نے کہا۔

"شویتا! بھوک لگی ہے، آؤ، کھانا کھائیں......" میں نے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ ڈنر کے دوران ہم آرتی، میرے اغوا اور پاکستان میں کام کا پلان کیا ہوگا، اس بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس نے کچھ قدرے چھوٹا ارجن گروپ کے بارے میں بھی بتایا اور کچھ اپنے بارے میں بھی باتیں کرتی رہی۔ پھر یونہی باتیں کرتی چلی گئی، اتنی کہ مجھے لگا جیسے وہ خود پر لدے ہوئے بوجھ اتار کر پھینک رہی ہے۔ تب میں نے وہاں سے اٹھ جانا چاہا، الوداعی باتوں کے بعد جب میں جانے لگا تو وہ بولی۔

"ٹھیک ہے، شجاع! پھر ملاقات ہوگی۔ بلاشبہ تم ایک منفرد شخصیت کے مالک ہو مجھے تمہارے ساتھ پر فخر ہوگا۔"

"شویتا! میں کوئی منفرد بندہ نہیں ہوں۔ میں تو بس ہر شے، رشتے اور تعلق کی حقیقت پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں جیسے ہم پہلی بار ملے تھے، تب اگر تمہاری آنکھوں میں ہوس کی بجائے ممتا ہوتی تو حالات کچھ اور ہوتے۔ تعلق بھی تو حالات میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ افسردہ ہوگئی اور میں اس کے بیڈ روم سے نکل آیا۔ اس لڑکی نے میرا سیل فون واپس کر دیا اور پھر میں ہوٹل سے نکل آیا۔ رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ میں جب گھر پہنچا تو حیدر اپنے بیڈ روم میں سو رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا، ایزی ہو کر بیڈ پر لیٹا تو نیند غائب تھی۔ میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ صبح حیدر کو کس طرح مطمئن کرنا ہے؟ یہی سوچتے ہوئے نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ اگلی صبح ناشتہ کی میز پر حیدر تنہا ہی تھا۔ میں جب کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھا تو اس نے پوچھا۔

"وہاں سے کیسے نکلے اور پھر کہاں رہے؟" یہ کہتے ہوئے اس نے جوس بھر کر میری طرف بڑھایا۔

"ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا تھا آرتی کو پہلے حاصل کرنے پر، اسی بھگدڑ میں مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ مجھے راستوں کا علم نہیں تھا، یونہی چلتا رہا ایک بازار میں آ گیا اور کافی دیر تک ایک کافی ہاؤس میں بیٹھا رہا۔ پھر وہاں سے ایک سٹور میں گیا، کپڑے تبدیل کیے اور شویتا کے پاس چلا گیا۔ اس کے ساتھ ڈنر کر کے گھر آ گیا۔" یہ کہہ کر میں نے گلاس منہ کو لگا لیا۔ وہ میرے اتنے سے جواب پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔ سو کرید کر پوچھتا رہا۔ میں اسے بتاتا رہا، ناشتہ کر چکے تو میں نے کہا۔

"ایک مشورہ کرنا ہے تم سے۔"

"بولو؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پاکستان میں نائلہ تنہا ہے اور ان دنوں بہت افسردہ ہے۔ ہم سب اسے نظر انداز کر رہے ہیں۔ میں اس کی شادی کے متعلق سوچ رہا ہوں، کیا خیال ہے تمہارا؟''

''کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

''نہیں، میں اس کے لیے لڑکا دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ نائلہ کو اس کے لیے ذہنی طور پر تیار کروں۔''

''خیال تو ٹھیک ہے مگر ایسا لڑکا کون ہو سکتا ہے۔''

''ندیم، اپنا ندیم۔''

''کیا وہ اس سے شادی کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ اسے معلوم ہے کہ وہ عامر کی رکھیل۔۔۔''

''بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے نہیں یقین کہ وہ مانے گا۔ پہلے کی بات اور تھی، اب نہیں۔۔۔''

''اب کیا ہو گیا ہے۔۔۔؟''

''اس کے پاس دولت آ رہی ہے، اسے وہ راستہ نظر آ گیا ہے جہاں سے دولت آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ، تم بات کر کے دیکھ لو۔''

''وہ تو میں آج ہی دفتر میں کروں گا۔ اگر اس نے ہاں کر دی تو پھر نائلہ کو سمجھانا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔''

''ہاں، ایسا تو ہے۔''

''بہر حال، یہ میری سر دردی ہے لیکن تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو دو ہفتے کے لیے اکیلا پاکستان جانا چاہوں گا اور اگر ہاں کر دی تو اسے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ تم ہماری ٹکٹ او کے کروانے کا بندوبست کرو ۔''میں نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا بات ہے، حیدر! تم سوچ میں پڑ گئے ہو؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، تم چلے جاؤ گے، اسے میں نے تھوڑا محسوس کیا ہے۔ تم مجھے فون کر دینا، میں پاسپورٹ لے کر جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا تو میں بھی دفتر چل دیا۔

دفتر میں وہ تینوں مجھے خوشگوار چہرے کے ساتھ ملے۔ میں اپنے آفس آیا تو وہ تینوں آ گئے۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہنے کے بعد کنول نے پوچھا۔

''چائے پئیں گے یا کافی؟''

''ابھی کچھ دیر ٹھہرو۔ مجھے ندیم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے، اس کے بعد۔۔۔''

''آپ کریں بات، ہم تھوڑی دیر میں آجاتے ہیں۔'' ستیش نے اٹھتے ہوئے کہا تو کنول بھی اٹھ گئی۔ میں نے انہیں روکا، وہ چلے گئے تو میں نے کہا۔

''نائلہ تمہیں کیسی لگتی ہے؟''

''اچھی بلکہ بہت اچھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ عامر کے ساتھ نہ رہتی تو۔۔۔''

''وہ بہت بلند اقبال ہوتی، کسی بہت اچھے گھرانے میں اس کا رشتہ ہو جاتا۔ اسے عزت ملتی، وہ معاشرے میں سر اٹھا کر جی سکتی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا، اب شاید وہ انسان نہیں رہی؟''

''ایسا نہیں ہے۔'' ندیم نے قدرے جوش سے کہا۔

''اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ اگر اس سے عامر کی رکھیل ہونے کا ٹائٹل اتار دیا جائے تو؟''

''تو وہ معاشرے میں عزت سے رہ سکتی ہے۔''

''کون دے گا عزت؟''

''کوئی کسی کو عزت نہیں دیتا، خود حاصل کرنا پڑتی ہے اور نائلہ نے تو کوشش بھی شروع کر دی ہے اپنا کاروبار شروع کر کے وہ اس راہ پر چل نکلی ہے۔''

''تم شادی کرو گے اس سے؟'' میں نے یکدم کہہ دیا۔

''اگر آپ فقط میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میرا جواب ہاں میں ہے لیکن اگر آپ بڑا بھائی ہونے کے ناطے سیدھے حکم دیں کہ میں نائلہ سے شادی کر لوں تو مجھے خوشی ہوگی، ایسا اس لیے کہ مجھے احساس ہوگا کہ آپ کو مجھ پر مان ہے۔''

''او، ندیم! خوش کر دیا ہے تم نے۔'' میں نے جوش جذبات سے کہا اور اسے گلے لگا لیا۔ ''مجھے تم پر مان ہے، میرے بھائی!'' میں نے اسے خود سے الگ کر کے بیٹھنے کو کہا، وہ بیٹھ گیا تو بولا۔

''اس کی فطرت میری نہیں ہے۔ جب آپ زخمی ہوئے تھے، تب اس نے کسی ماں کی طرح خدمت کی۔ میرے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، میرے لیے کسی پریشانی کا نہیں بلکہ سکون کا باعث بنی۔ میں ایسی عورت کی قدر کیوں نہ کروں گا۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ اسے کیسی ہونا چاہئے بلکہ اس سے غرض ہے کہ وہ کیا ہے؟'' ندیم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ تبھی میں نے کنول جیت اور ستیش کو بلوا لیا، وہ آئے تو میں نے کہا۔

''کنول! فوراً مٹھائی منگواؤ۔''

''کس خوشی میں۔'' وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔

''اپنا ندیم شادی کے لیے راضی ہو گیا ہے۔''

''ارے واہ، ابھی لیں پھر تو۔۔۔''

وہ انہی قدموں پر مڑی تو ستیش نے کہا۔

''ساتھ میں کڑک سی چائے بھی۔۔۔'' پھر وہ ندیم کو مبارکباد دینے لگا۔ وہ باتیں کرنے لگے تو میں نے حیدر کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، یار'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں نہیں کہتا تھا کہ وہ مان جائے گا۔''

''اچھی بات ہے، میں نے ٹریول ایجنٹ سے کہہ دیا ہے۔ وہ دوپہر سے پہلے کنفرم کر دے گا، میں تمہیں بتا دوں گا۔'' دوسری طرف سے رابطہ کٹ گیا تو میں نے حسن کے نمبر پش کیے، دوسری بیل پر اس نے فون رسیو کر لیا۔

''کیسے ہو، جان جی؟'' اس نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ، نائلہ کیسی ہے؟''

''یہ اچانک اور وہ بھی صبح صبح تمہیں نائلہ کا خیال کیسے آ گیا؟''

''یار! اگر ہم مل کر اس کی شادی کا بندوبست کر دیں تو؟'' میں نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

''جہاں تک روپے پیسے کی بات ہے، اسے تو میں نے اکیلا بھی افورڈ کر لوں گا مگر کسی بھی لڑکی کی شادی کسی لڑکے سے ہوتی ہے۔ مطلب، اس سے کون کرے گا شادی۔۔۔ لڑکا دیکھا ہے کوئی، اگر۔۔۔''

''یار! اپنے گھر کا لڑکا ہے، ندیم۔۔۔''

''ہائیں، کیا وہ مان جائے گا؟''

''مان جائے گا نہیں، مان گیا ہے۔ تمہارے ذمے یہ ہے کہ تم آج ہی نائلہ کا عندیہ لے کر مجھے بتاؤ، یہ بہت ضروری ہے؟''

''اتنی جلدی، یار؟''

''ایسا اس لیے ہے کہ میں کل یا پرسوں پاکستان آ رہا ہوں۔ اگر نائلہ ہاں کر دیتی ہے تو میں ندیم کو بھی ساتھ لے آؤں اور اگر انکار ہو تو پھر میں اکیلا آؤں۔''

''ٹھیک ہے، میں آج ہی بات کرتا ہوں بلکہ ابھی اس کے دفتر جاتا ہوں۔''

''لو، ندیم سے بات کرو۔'' میں نے کہا اور فون ندیم کو دے دیا۔ وہ تھوڑی دیر باتیں کرتا رہا، پھر فون بند کر دیا۔ مٹھائی کھانے کے دوران ہم کتنی ساری باتیں کر چکے۔ کنول کی خواہش تھی کہ وہ بھی ندیم کی شادی میں شامل ہو جائے۔ وہ تینوں چلے گئے تو میں نے الطاف کو فون کیا۔

''کیا خبریں ہیں؟''

''وہی، جن کی مجھے توقع تھی۔''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟''

''یہی کہ آرتی ہم سب کو دھوکا دے رہی ہے۔ اس نے جو بھی معلومات دی ہیں، سب غلط ہیں کیونکہ میں نے تمام ہوم ورک خود کیا ہے اور اب تو مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ تمہارے اغوا والا واقعہ محض ایک ڈرامہ تھا۔''

''ایسا کیوں محسوس کیا تم نے؟''

''میں رات بھر سویا نہیں ہوں بلکہ آرتی کو سمجھنے کی کوشش میں ہوں۔ غنیمت یہ ہے کہ وہ یہاں سے باہر کسی سے رابطہ نہیں کر سکتی ورنہ اب تک کچھ نہ کچھ ہو چکا ہوتا۔''

''مثلاً کیا ہو گیا ہوتا؟''

''شروعات تم سے ہوتیں کہ تم ان کے درمیان میں ہو۔ اس بار تمہارے ساتھ ڈرامہ نہیں ہوگا۔ آرتی کہاں ہے، یہ سوال تم سے کر رہے ہوتے۔ تم بہت زیادہ محتاط رہنا، کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''یہ معاملہ تو خاصا الجھ گیا ہے۔''

''میں نے کہا ہے نا، کہ تم بس محتاط رہنا، باقی میں سنبھال لوں گا۔ میرے پاس ابھی بہت سارے راستے ہیں۔''

''اوکے، رابطہ رکھنا'' میں نے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ الطاف نے مجھے پریشان کن صورت حال بتائی تھی۔ میں وہیں بیٹھا حالات پر غور کرتا رہا۔ کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟ میں خیالوں کے سفر پر بہت دور تک گیا لیکن کسی بھی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ حالات مجھے وہاں تک لے آئے تھے کہ کسی بھی پل میری زندگی کا فیصلہ ہو سکتا تھا۔ میں ان کے درمیان میں تھا اور مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ تیر کدھر سے آ سکتا ہے ۔سیل فون کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا، وہ حیدر کا فون تھا۔

''آج رات تقریباً گیارہ بجے یا کل شام چار بجے، کب جانا چاہو گے؟''

''آج رات گیارہ بجے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ٹکٹ لے کر گھر آ رہا ہوں، تم گھر پہنچو اور وہاں، ندیم سے کہو کہ اگر شاپنگ وغیر کرنی ہے تو کر لے۔ ہم نو بجے ائیر پورٹ کے لیے نکل جائیں گے۔''

''میں کہہ دیتا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا ۔ میں ہال سے نکلا تو وہ تینوں ہال میں بیٹھے کسی نئے پراجیکٹ پر بات کر رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی میری طرف متوجہ ہو گئے تو میں نے کہا۔

''ندیم! ہم گیارہ بجے کی فلائیٹ سے پاکستان جا رہے ہیں۔تم نے اگر کوئی شاپنگ وغیرہ کرنی ہو تو کر لو۔''

''نہیں، مجھے کچھ نہیں خریدنا ۔ اتنی جلدی کیا ہو سکتا ہے، پیکنگ بھی بہت مشکل ہو گی۔'' اس نے وہی جواب دیا جو میں سوچ چکا تھا۔

''آپ جا رہے ہیں، یوں اچانک؟'' کنول نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں، کنول! جانا تو ہے لیکن دو ہفتے بعد واپس آنے کے لیے۔ ہو سکتا ہے، تم لوگوں کو ندیم کی شادی میں آنا پڑے۔''

''اگر ویزہ مل گیا تو؟'' ستیش نے کہا تو کنول بولی۔

''میں نے پتہ کیا سوچا تھا، آپ لوگوں کے جانے سے پہلے ایک بار پھر اپنے ہاتھوں سے چٹنی اور پراٹھا بنا کے کھلاتی لیکن۔۔۔''

''تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔تم بناؤ، بہت شوق سے بناؤ۔ میں تیار ہو کر تمہارے پاس آ جاؤں گا، پھر یہیں سے ائیر پورٹ چلیں جائیں گے، اب مسکرا دو۔'' میں نے کہا تو اس کے چہرے پر بہار آ گئی۔ وہ سب اٹھ کر اپنے کمروں میں گئے، ندیم میرے پاس کھڑا رہا تو میں نے کہا۔

''بہت محتاط رہنا ہے تمہیں، بس ان لوگوں کے درمیان سے نکلنا ہے اور یہاں سے ہمیں ائیر پورٹ نہیں جانا، باقی باتیں میں تمہیں تفصیل سے بعد میں سمجھا دوں گا۔''

میں گھر پہنچا تو حیدر نہیں آیا تھا۔ میں کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا، دو سے زیادہ وقت ہو گیا تھا اور میرے فلائی کر جانے میں صرف آٹھ گھنٹے تھے۔ بنگالی باورچی پانی دے گیا تو میں نے خوب سیر ہو کر پیا اور پھر آنکھیں موند لیں۔ میں اس وقت سکون محسوس کر رہا تھا۔ انہی لمحوں میں، میں نے سوچا کہ مجھے پھر سے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لینی چاہئے۔ محض آٹھ گھنٹوں بعد میں سکون سے پاکستان کے لیے فلائی کر سکتا ہوں، مجھے چلے جانا چاہئے یا پھر

الطاف کی مدد کے لیے یہیں رکنا ہوگا اور وہ کام جو ابھی ادھورا ہے، اسے پورا کرنا چاہئے؟ مجھے اس پر زیادہ نہیں سوچنا پڑا۔ میرے ضمیر نے مجھے اجازت ہی نہ دی کہ میں یوں چپکے سے چلا جاؤں، تبھی میں نے الطاف پاشا کو فون کیا۔ چند باتوں کے بعد میں نے اسے اپنے جانے کے بار میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''حیدر میرے لیے ٹکٹ لے کر آ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ میں دیکھ رہا ہوں نا سب۔''

''لیکن میں جا نہیں رہا۔ میں کوشش کروں گا کہ حیدر میرے ساتھ ائیر پورٹ تک نہ جائے مگر یہ ممکن نہیں ہوگا۔ میں اس کے مطابق یہاں سے فلائی کر جاؤں گا لیکن مجھے ابھی یہاں سے جانا نہیں ہے بلکہ تمہارے پاس آنا ہے، میں کام ادھورا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

''اوہ۔!'' اس کے منہ سے حیرت زدہ لفظ نکلا، پھر اگلے ہی لمحے اس نے کہا۔

''شجاع! جو کچھ آپ نے کیا ہے، شاید ہی کوئی اور کر پاتا۔ میں سمجھتا ہوں، قدرت نے آپ کو میرے لیے یہاں بھیجا تھا جو سب کچھ اتنی آسانی سے ہوگیا۔ میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ آپ نے اپنے حصے کا کام کرلیا، اب میرا کام ہے۔'' اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو مجھے ہنسی آگئی۔ وہ بے خیالی میں تم سے آپ پر آگیا تھا۔ میں نے اس جانب اس کی توجہ دلائی تو وہ بولا۔

''ٹھیک ہے، ہم بے تکلف تو ہو گئے لیکن میں آپ کا جتنا بھی احترام کروں، کم ہے البتہ۔۔۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس وقت کچھ ایسی صورت حالت میں گھرا ہوں کہ حتمی طور پر کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ ہوسکتا ہے، کچھ دیر بعد یہ صورت حال واضح ہو جائے۔ آپ دونوں آپشن کے لیے تیار رہنا، میرے پاس آنے کے لیے بھی اور فلائی کر جانے کے لیے بھی۔''

''ایسا کیوں ہے، مجھے کچھ بتاؤ؟''

''پلیز، شجاع! میں آپ سے کوئی بات خفیہ نہیں رکھ رہا۔ اب جب بات ہے ہی نہیں تو۔۔۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''او کے، جیسا تم بہتر خیال کرو۔ میں بہر حال آخری وقت تک تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔'' اس کے بعد چند الوداعی باتیں ہوئیں اور میں نے فون بند کر دیا، میں کچھ دیر تک یونہی خالی الذہن بیٹھا رہا۔ اس وقت میرے پاس سوائے پیکنگ کے اور کوئی کام نہیں تھا

لہٰذا میں یونہی بیٹھا رہا۔ میرے خیالات کی رو یہاں کے حالات کے ساتھ بہہ نکلی تھی، میں چونکا اس وقت جب حیدر آگیا۔ اس نے کھڑے کھڑے ٹکٹ اور پاسپورٹ میری طرف بڑھائے اور بولا۔

''چیک کرلو، ٹھیک گیارہ بجے فلائیٹ ہے۔ اس لیے ہمیں تقریباً دس بجے سے پہلے ایئر پورٹ پہنچ جانا چاہئے۔'' میں نے وہ ٹکٹ اور پاسپورٹ پکڑے اور انہیں ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ اتنے میں وہ باورچی کو کھانا لگانے کے بارے میں کہہ چکا تھا۔ ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے، تبھی وہ بولا۔

''آؤ، کھانا کھاتے ہیں۔'' میں اس کے ساتھ اٹھا اور کھانے کی میز تک چل دیا۔ وہیں کھانے کے دوران ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے بتایا کہ کنول جیت کے ہاں سے ہوتے ہوئے ایئر پورٹ نکلنا ہے۔ وہ میرے آئندہ پروگرام کے بارے میں پوچھتا رہا، یہاں تک کہ باورچی چائے رکھ گیا اور اس نے برتن سمیٹ لیے۔ تبھی چائے کا سپ لیتے ہوئے اچانک حیدر نے پوچھا۔

''شجاع، میرے دوست! سچ بتاؤ، آرتی کہاں ہے؟'' اس سوال سے مجھے شدید قسم کے شک کی بو آئی، میں نے قدرے الجھتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں میری بات غلط لگ رہی ہے اور تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟''

''بات شک کی نہیں، میری جان! وہ غائب کہاں ہو سکتی ہے؟''

''تم تو یوں کہہ رہے ہو کہ جیسے اسے غائب ہونا تھا اور میرا اغوا ایک ڈرامہ تھا جس کی ہدایات تم دے رہے تھے، کیا ایسا ہی ہے؟'' میں نے غصے میں کہا تو وہ انتہائی تحمل سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میرا مطلب یہ بھی نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا مطلب ہے؟'' میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''وہ اگر چھوٹا ارجن گروپ کے ہتھے چڑھی ہے یا وہ ان کے گروپ سے تعلق رکھتی ہے تو وہ انہیں ہمارے بارے میں بتا سکتی ہے۔''

''یار! میں نہیں سمجھتا کہ تم اتنے احمق بھی ہو سکتے ہو۔ وہ جب ان کے گروپ کی تھی تو انہیں ہمارے بارے میں پتہ ہوگا۔'' میں نے کہا اور پھر چند لمحے رک کر اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''حیدر! کھل کر کہو، آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''کوئی بات نہیں، بس الجھن سی ہے، آرتی کا اگر پتہ چل جاتا تو سکون ہو جاتا۔''

''اب تم جانو اور تمہارا کام، مجھے آرتی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ میری توجہ اب پاکستان میں طے شدہ پلان پر ہو گی۔'' میں نے بڑے نرم لہجے میں بات کا رخ بدلنا چاہا۔

''مطلب، تم شوبتا کے پلان پر عمل کرو گے؟'' وہ دبی دبی حیرت سے بولا۔

''تو کیا نہیں کرنا چاہیے؟ یار، حیدر! تم کہیں نشے میں تو نہیں ہو۔ میں اگر ایسا نہیں کروں گا تو کیا وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے، کیا پاکستان میں ان کی گولی میرے بدن میں سوراخ نہیں کر سکتی؟ میں نے ان کے ساتھ ڈیل کی ہے، ان سے رقم لی ہے اور میں مزید دولت کمانا چاہتا ہوں جس میں تم بھی حصے دار ہو۔''

''او کے، او کے۔۔۔'' اس نے جلدی سے کہا اور پھر چند لمحے خاموشی کے بعد بولا۔

''تم تیاری کر لو، پھر تھوڑے آرام کرنے کے بعد کنول جیت کے ہاں جائیں گے اور پھر ایئر پورٹ۔'' اس نے کہا اور چائے کا ایک لمبا گھونٹ لے کر اٹھنا چاہا، وہ ابھی میرے پاس ہی تھا کہ حسن کا فون آ گیا۔

''ہاں، حسن جی! بولو، نائلہ سے بات ہوئی؟''

''اس کے پاس ہی ہوں، اس کے دفتر میں۔'' وہ چہکا۔

''کیا فیصلہ ہوا؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''یہ تم خود ہی پوچھ لو۔'' اس نے کہا اور پھر چند لمحوں بعد فون پر نائلہ کی مدھر آواز گونجی۔ حال احوال کے بعد اس نے کہا۔

''شجاع! کیا میں خوش قسمت نہیں ہوں کہ آپ میرے بارے میں سوچتے ہیں؟ حسن نے مجھ سے تفصیل کے ساتھ بات کی ہے کہ آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ آپ ایسا چاہتے ہیں تو میں آپ کی بات مان لیتی ہوں۔ ایسا نہیں ہے، شجاع! مجھے واقعتاً ایک نام اور سہارے کی ضرورت ہے۔ میں آپ کی احسان مند ہوں کہ آپ میرے لیے فکر مند ہیں، بس ایک سوال کا جواب چاہوں گی۔''

''بولو؟'' میں نے کہا۔

''ندیم کا یہ فیصلہ زور، زبردستی یا۔۔۔''

''میں ایسا چاہوں گا بھی نہیں۔ میں نے اپنا ایک خیال اس کے سامنے رکھا، اس نے مجھ سے اتفاق کیا کیونکہ وہ پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس کا عندیہ پا کر ہی میں نے حسن کو تمہارے پاس بھیجا تھا۔''

’’میری طرف سے ہاں ہے، شجاع۔‘‘ اس نے کہا اور پھر خود ہی فون حسن کو تھما دیا۔
’’شکریہ! تم لوگوں نے میرا مان رکھ لیا اور ہاں، میں گیارہ بجے کی فلائیٹ سے آرہا ہوں۔‘‘
’’کیا ندیم نہیں آرہا؟‘‘ اس نے پوچھا۔
’’وہ بھی آرہا ہے۔‘‘
’’میرا خیال ہے، میں نے یہی کہا ہے یا تمہارے کان کچھ اور سننا چاہتے ہیں؟‘‘ میں نے قدرے زور سے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔
’’میں آجاؤں گا ائیر پورٹ۔‘‘
’’بس تو پھر باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔‘‘ میں نے کہا اور فون بند کر دیا، تبھی پاس کھڑے حیدر نے کہا۔
’’تم تو نائلہ کے بارے میں واقعی ہی سنجیدہ ہو گئے ہو، اپنا کیا جاتا ہے۔‘‘ اس نے کندھے اچکائے۔
’’آؤ گے نہیں پاکستان؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’وقت ملا تو ضرور آؤں گا، بس تم تاریخ بتا دینا۔‘‘ اس نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا، نجانے کیوں اس وقت حیدر شیخ مجھے بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔
اس وقت سورج ڈھل چکا تھا جب میں نے اپنی پیکنگ وغیرہ مکمل کر کے سامان نیچے بھجوا دیا، صرف ایک یوزی پسٹل کے ساتھ میگزین رہ گئے تھے۔ وہ مجھے کسی آڑے وقت کے لیے الطاف نے دیا تھا۔ میں فوری طور پر اس سے متعلق حیدر کو نہیں بتا سکتا تھا، وہ نجانے کیا خیال کرے۔ میں نے انہیں الماری ہی میں رہنے دیا اور تیار ہو کر نیچے آگیا۔ حیدر ابھی تک کمرے سے نہیں نکلا تھا، میں اس کے انتظار میں صوفے پر بیٹھ گیا اور ٹی وی آن کر دیا۔ میں مختلف چینل پر طبع آزمائی کر رہا تھا کہ الطاف کا فون آگیا۔
’’کیا پروگرام ہے آپ کا؟‘‘ اس کا لہجہ خوشگوار تھا۔
’’یہ تو تمہی نے بتانا ہے۔‘‘ میں نے بھی اسی انداز میں کہا۔
’’تو سنو، یشونت پانڈے اور ہری داس اس وقت ہمارے پاس ہیں اور بڑی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہو گیا؟‘‘ اس نے دبے دبے جوش سے بتایا تو میں نے تیزی سے پوچھا۔
’’کیا کہہ رہے ہو، کیسے ہو گیا یہ سب؟‘‘

''یہاں کی حکومت سوئی ہوئی نہیں، اگر انہوں نے ڈھیل دی ہوئی ہے تو وہ نگرانی کرنا بھی جانتے ہیں۔ یہ سب معاملہ خفیہ چل رہا تھا مگر ہری داس اینڈ کمپنی کے بارے میں کوئی واضح ثبوت نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ گمراہ کن خیالات کی تبلیغ کرتا ہے اس لیے یہاں کی فورس ان کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے پا رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یشونت کا نیٹ ورک بہت مضبوط تھا لیکن وہ منشیات اور اسلحہ کی ڈیل میں ملوث تھے، یہ مجھے پتہ تھا سو میں نے یہاں کے ذمہ دار افراد سے بات کی۔ ان سے میرا پہلے ہی رابطہ تھا اور وہ میری مدد کر رہے تھے۔ ان دونوں کو میں نے اٹھایا ہے اور باقی اہم لوگوں کو وہ اٹھا رہے ہیں، میں اس لیے کوئی حتمی بات نہیں کہہ پا رہا تھا۔''

''اب صورت حال کیا ہے؟''

''پوری طرح قابو میں ہے، میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے کہ اگر تم آسانی سے آج رات نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ ورنہ یہاں کے قانونی چکروں میں پھنس کر رہ جاؤ گے۔ اگر چہ ہوگا کچھ نہیں لیکن تمہارے کئی دن یونہی ضائع ہو جائیں گے، باقی میں سب سنبھال لوں گا۔''

''اور وہ شیویتا، اصل شے تو وہی ہے؟''

''اس کے بارے میں ابھی تک پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کدھر گئی لیکن، پتہ چل جائے گا۔'' اس نے اطمینان سے کہا تو میں اپنی روانگی سے متعلق بتا دیا۔ وہ بولا۔

''اچھی بات ہے، خواہ مخواہ قانونی جھمیلوں میں مت پڑیں۔''

''آرتی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی یہیں ہے، کچھ دیر بعد بات کراؤں گا، زندگی رہی تو بہت جلد پاکستان میں ملاقات ہوگی۔'' اس نے جلدی سے کہا، مجھے لگا کہ وہ بات سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ میں نے الوداعی بات کی اور رابطہ منقطع کر دیا، مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ الطاف اپنے مشن میں کامیاب رہا تھا۔ ان بے ضمیروں کی تباہی سے کنول جیت کس قدر خوش ہوگی، میں اس کا اندازہ کر سکتا تھا۔ میں اسے سامنے بٹھا کر یہ خبر سنانا چاہتا تھا تا کہ اس کا ردعمل دیکھ سکوں۔ تب میری ذہنی رو شویتا کی طرف مڑ گئی۔ وہ غائب ہوگئی تھی، میں یہی سوچ رہا تھا کہ کنول کا فون آگیا۔ میرے ''ہیلو'' کے جواب میں کنول کی تیز مگر سرگوشی میں آواز ابھری۔

''شجاع جی! غضب ہوگیا، شویتا یہاں ندیم پر تشدد کروا رہی ہے اور آرتی کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''میں زیادہ بات نہیں کر سکتی، بہت مشکل سے یہ فون میں نے قابو میں کیا ہے اور واش روم میں کھڑی آپ سے بات کر رہی ہوں۔''

''کتنے لوگ ہیں اس کے ساتھ؟''

''چار ہیں، ستیش بھی ان کے ساتھ ہے۔''

''میں آرہا ہوں۔''

''لیکن بڑی احتیاط سے، وہ آپ کی گھات میں ہیں، انہیں پتہ ہے کہ آپ یہیں آئیں گے۔'' تبھی فوراً میرے ذہن میں خیال آیا، میں نے کہا۔

''تم فون کو آن ہی رکھنا، اسے چھپالو اور کوشش کرو کہ شویتا کے آس پاس رہو۔''

''اوکے۔'' اس نے کہا اور پھر فون پر جیسے سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد فون پر شویتا کی آواز گونجی۔

''ستیش! تم اتنے کمزور ہو اس سے یہ نہیں اگلوا پا رہے کہ آرتی کدھر ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ اسے پتہ نہیں ہے، وہ شجاع ہی کو معلوم ہے۔''

''اسے بھی آلینے دو۔ میں دیکھتی ہوں وہ کیا شے ہیں، تڑپا تڑپا کے ماروں گی، بہت سیانا بنتا ہے۔ اے کنول! اسے فون لگاؤ کہ جلدی آئے۔'' اس آواز کے ساتھ ہی وہ بولی۔

''اے ستیش! اسے ہوش میں لاؤ اور استری سے اس کا جسم داغو، پتہ ہوگا تو بکے گا۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ فون پر سناٹا پھر سے آیا اور میں تڑپ کر رہ گیا۔ کیا ندیم پر تشدد کی انتہا ہو رہی ہے؟ اس وقت اپنا فون بند کرنا میری مجبوری بن گیا۔ میں نے تیزی سے الطاف کے نمبر پش کیے، پہلی بیل پر اس نے فون رسیو کر لیا۔

''شویتا، اس اپارٹمنٹ میں ہے جہاں کنول رہتی ہے اور وہ لوگ ندیم پر تشدد کر کے آرتی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔''

''اوہ'' اس کے منہ سے افسوس زدہ آہ نکلی، پھر تیزی سے بولا۔ ''فکر مت کریں، میں زیادہ سے زیادہ پندرہ، بیس منٹ بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

''میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا اور فوراً اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ میں نے پسٹل اٹھایا جو اس وقت مجھے کسی نعمت سے کم نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے میگزین جیب میں رکھے اور واپس نیچے آگیا، حیدر باہر آچکا تھا اور ملازم میرا سامان گاڑی میں رکھ رہے تھے۔ جلد ہی حیدر چل پڑا، وہ انتہائی تیز رفتار سے جا رہا تھا۔ میں نے اسے صورت حال کے بارے میں بتا دینا چاہا لیکن یہی سوچ کر خاموش رہ گیا

کہ بعد میں ہوسکتا ہے، کنول زیرِ عتاب آجائے چند منٹوں بعد اسے خود ہی معلوم ہو جانا تھا مگر پتہ نہیں، کیا صورت حال بنتی ہے؟ میں اپنے طور پر فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے ندیم تھا جس کا جسم داغا جا رہا تھا، اس کی چیخیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ تقریباً دس منٹ بعد ہم اس اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ گئے تو حیدر نے کہا۔

''تم چلو، میں گاڑی پارکنگ میں لگا کر آتا ہوں۔'' میں نے اس کی مزید کوئی بات نہیں سنی اور تیزی سے لفٹ کے پاس پہنچا۔ پھر چند منٹوں بعد میں اس اپارٹمنٹ کے سامنے تھا۔ دستک دینے سے پہلے میں نے اردگرد کا جائزہ لیا، راہداری سنسان تھی۔ میں نے پسٹل ہاتھ میں لیا، اس کا لاک ہٹایا اور دروازے پر دستک دے دی۔ دروازہ کھلا اور میں نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اندر کا جائزہ لے لیا۔ شویتا صوفے پر بیٹھی تھی، وہ چاروں گارڈ پوری طرح تیار عین دروازے کے سامنے تھے اور دروازے کے چوکھٹے میں کنول جیت کھڑی تھی۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر ان پر فائرنگ کرتا ہوا شویتا کے سر پر جا پہنچا۔ سائیلنسر کی وجہ سے قطعاً شور نہیں ہوا مگر دو تین لمحوں میں وہ گارڈ خون میں لت پت فرش پر تڑپ رہے تھے۔ جس سے قالین گندا ہو رہا تھا۔ میں نے انہیں یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی گن سیدھی کر لیں۔ میں نے پسٹل شویتا کی کنپٹی پر رکھ دیا اور اس کے پہلو میں جا بیٹھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے خوف سے سن ہو چکی ہو۔ میں نے اس کی گردن میں بازو ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہیلو، ڈیئر شویتا! میں آگیا۔'' یہ کہہ کر میں نے اونچی آواز میں ہانک لگائی۔

''ستیش ڈیئر! باہر آؤ، کہاں ہو تم؟'' وہ صوفے کے پیچھے چھپا ہوا تھا، باہر نکلا تو اس کے ہاتھ خالی تھے۔ میں حیدر کے آنے سے پہلے پہلے تمام کارروائی مکمل کر لینا چاہتا تھا۔ میں نے ستیش سے کہا۔

''تمہیں ان لوگوں نے گولی چلانا نہیں سکھائی؟''

''شجاع، بھائی! میں بے قصور ہوں۔ یہ تو۔۔۔ یہ تو۔۔۔ پلیز، مجھے مت مارنا۔''

''میں تمہیں کیوں ماروں گا۔۔۔ ندیم کدھر ہے؟'' میں نے کہا۔

''وہ۔۔۔ وہ کمرے میں۔۔۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا تو میں ان دونوں کو اس کے کمرے میں لے گیا۔ وہ فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ یکدم ہی غصہ میری کنپٹی پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ میں نے پوری قوت سے پسٹل کا دستہ ستیش کے سر پر دے مارا، وہ ایک لمحہ کو چکرایا اور فرش پر لڑھک گیا۔ میں نے پلٹ کر شویتا کو دیکھا، وہ ہونق سی بنی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے

اسی کی چادروں سے اس کو باندھ دیا، تبھی وہ بولی۔

’’میں مان گئی ہوں کہ میرا انتخاب غلط نہیں تھا لیکن اب سمجھی ہوں کہ میں نے تمہارے بارے میں اندازے غلط لگائے تھے لیکن اس وقت ۔۔۔ اس وقت مجھ سے کہاں غلطی ہوئی۔‘‘ وہ خود کلامی میں بڑبڑانے لگی۔

’’شویتا! مجھے مکالمے بولنے کی عادت نہیں، سیدھے سبھاؤ عمل کرتا ہوں۔ تم مکالمے زیادہ بولتی ہو ۔۔۔‘‘ میں نے کہا اور ندیم کو ہوش میں لانے لگا۔ جلد ہی وہ ہوش میں آگیا۔ مجھ پر نظر پڑی تو وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا، ساتھ ہی اس کی کراہ نکل گئی۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے داغا ہوا تھا اور تشدد کے کئی نشان موجود تھے۔ اس نے ماحول کا جائزہ لیا تو خاصا حوصلہ مند ہوگیا، تب میں نے کہا۔

’’فکر نہ کرو۔ میں نے سارے ڈھیر کر دیئے ہیں۔ تم اس ستیش کو ہوش میں لاؤ اور اپنا حساب برابر کرو۔‘‘ ندیم اٹھا اور اسے ہوش میں لانے لگا۔ میں شویتا کے پہلو میں پھر سے جا بیٹھا۔ میں نے وہاں سے دروازے پر بھی نگاہ رکھی کہ حیدر کب آتا ہے جبکہ کنول دروازہ بند کر چکی تھی۔ ستیش ہوش میں آیا تو ندیم اس پر پل پڑا۔ وہ ذرا بھی مزاحمت نہیں کر پا رہا تھا، کچھ ہی منٹوں بعد وہ گر گیا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ استری ابھی گرم تھی۔ میں نے سیدھی اس کی پیٹھ پر رکھ کر دباؤ دیا، وہ تڑپ کر رہ گیا۔

’’اتنا ہی درد ہوتا ہے، میری جان۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے دوسری بار استری اس کی پیٹھ پر رکھ دی۔ وہ برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہوگیا۔ میں نے پسٹل اس کی کھوپڑی پر رکھا اور گولی داغ دی۔ وہ بس ایک دفعہ پورے وجود سے ہلا تھا، پھر بے حس ہوگیا۔ میں نے ندیم کو کپڑے پہن لینے کے لیے کہا اور شویتا کے سامنے جا کر کہا۔

’’دل تو کرتا ہے کہ تمہارے جسم کا تار تار الگ کر دوں مگر شکر کرو، میں عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا اور پھر تم نے مجھ پر ایک احسان کیا ہے۔ میں تمہیں اس احسان کے بدلے معاف کرتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے مجھ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

’’لیکن میں اسے معاف نہیں کر سکتی ۔۔۔‘‘ اچانک ہی کنول جیت چیخ اٹھی۔ تب شویتا پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، یقیناً وہ اسے اپنی بااعتماد ساتھی خیال کر رہی تھی۔

’’کنول! تم ۔۔۔‘‘ اس نے بے چارگی سے کہا۔

’’ہاں، میں جسویر سنگھ کی رکھیل اور تمہارے لیے وہ جا جس پر تجربے کیے جاتے ہیں۔‘‘ اس نے کہا اور پوری قوت سے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ ’’شجاع! آپ نے اسے

معاف کر دیا لیکن میں اس کا گلہ دبا کر یہیں ختم کر دوں گی۔'' وہ بپھر گئی تھی۔ تبھی سیل فون بجنے کی آواز آئی جو ڈرائنگ روم میں پڑا تھا۔ میں نے بڑھ کر اٹھایا تو اسکرین پر حیدر کے نمبر تھے۔ میں ساکت ہو گیا۔ فون شویتا کا تھا اور حیدر اسے کال کر رہا تھا۔ جبکہ فون تو اسے مجھے کرنا چاہئے تھا۔ وہ آیا کیوں نہیں، فون کیوں کر رہا ہے اور پھر شویتا ہی کو کیوں، شک کا ناگ پورا پھن پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جب تک میں نے فون شویتا کے کان سے لگایا، تیسری بیل بج چکی تھی۔ اس وقت میں بھی فون سن سکتا تھا۔ شویتا بولی تو حیدر کی آواز آئی۔

''کیا شجاع قابو میں آ چکا ہے؟'' اس کے لفظ میرے دل کے آر پار ہو گئے۔ وہ دوست تھا اس لیے ایک لمحہ کو میرے بدن سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن یہ دُنیا تھی۔ اس میں تو اپنے سگے قتل کر دینے سے باز نہیں آتے، میں تو فقط دوست تھا جسے وہ ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرنا چاہتا تھا، میرے اشارے پر شویتا نے کہا۔

''ہاں، مگر تم ابھی تک اوپر کیوں نہیں آئے؟''

''میں یہی کنفرم کرنا چاہتا تھا، کیا اس نے آرتی کے بارے میں بتا دیا؟''

''ہاں، ہمارا شک صحیح نکلا تم آ جاؤ۔'' اس نے کہا اور میں نے فون بند کر دیا۔ اس وقت شویتا میری طرف طنزیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی پرواہ نہیں کی، وہ بولی۔

''رات جب تم ہوٹل میں ملے تھے، میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہارے جیسے دو چار رکھنے والا بندہ ہمارے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں اسی وقت تمہیں ختم کر دیتی لیکن یشونت نہیں مانا، وہ آرتی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔''

''شویتا! میرا یقین اس پر بہت پختہ ہے کہ زندگی اور موت میرے رب کے ہاتھ میں ہے اور پھر قسمت کے یہ کھیل بڑے نرالے ہیں، یشونت اور ہری داس تمہاری طرح ہی کہیں بندھے پڑے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ ہی جو تم سمجھ سکتی ہو، تم لوگوں کا کھیل ختم ہو گیا۔ تم نے اندھیرا پھیلا کر اس میں برائی کو روشن کرنا چاہا مگر ہوا کیا، ذرا سے لے نے تمہارا سب کچھ ختم کر کے رکھ دیا اس جادو کی طرح جو نگاہوں کو کیا عقل تک کو خیرہ کر کے رکھ دیتا ہے۔''

یہ لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کنول کو

اشارہ کیا، اس نے دروازہ کھول دیا۔ حیدر کے ساتھ ہی الطاف کا چہرہ نمودار ہوا۔ پھر کئی لوگ اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ انہوں نے کنول کو اپنی گرفت میں لینا چاہا مگر میں نے منع کر دیا۔

”خطرے کی کوئی بات نہیں، بس حیدر کو باندھ لو۔“ میں نے کہا تو حیدر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، وہ گنگ ہو کر رہ گیا۔ الطاف کے اشارے پر انہوں نے حیدر کو باندھ دیا۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو، شجاع! میں تمہارا دوست ہوں اور یہ لوگ کون ہیں؟“ حیدر نے کہا تو میں نے پوری قوت سے ٹھوکر اس کے منہ پر دے ماری اور کہا۔

”وہی لوگ، چھوٹا ارجن گروپ جنہوں نے آرتی کو اغوا کیا تھا۔“ میرے لہجے میں طنز پا کر وہ سب کچھ سمجھ گیا اس لیے نگاہیں جھکا دیں۔ الطاف نے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا اور پھر آ کر بولا۔

”آپ نے بہت بڑا کام کر دیا۔ شویتا کے نہ ملنے سے جو مصیبت ہونا تھی، آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اب سمجھو مشن مکمل ہو گیا، میرا خیال ہے، اب آپ ائیر پورٹ نکل جائیں اور باقی وہیں گزار لیں۔ انہیں اب یہاں سے لے جانا ہوگا۔“ اس نے کہا تو میں نے جیب سے ٹکٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

”یہ ٹکٹ مجھے حیدر نے دیئے ہیں۔ انہیں کنفرم کراؤ، میں یونہی ائیر پورٹ پر نہ بھٹکتا پھروں۔“

”یہ ابھی کنفرم ہو جائے گا۔“ اس نے اپنے ایک ساتھی کو وہ ٹکٹ تھما دیئے۔ وہ فون پر کسی سے بات کرنے لگا، تبھی الطاف نے مسکراتے ہوئے حیدر کی طرف دیکھا اور کہا۔

”اب بتائیں، اس کا کیا کرنا ہے۔ آپ نے تو اس کو بچا لینے کی بہت سفارشیں کی تھیں؟“

”غدار کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ تم جو چاہو، اس کے ساتھ کرو۔“ میں نے کہا اور نڈھال سا صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایسا کہتے ہوئے مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ میں نے اس کی طرف سے دھیان ہٹاتے ہوئے کنول سے کہا۔ ”شویتا تمہاری مجرم ہے، چاہو تو اس سے اپنا انتقام لے سکتی ہو۔“

الطاف اسے روکتے ہوئے بولا۔ ”میں اس کے جذبات سمجھتا ہوں لیکن یقین رکھو، شویتا کو کنول ہی ختم کرے گی لیکن ابھی کچھ دیر بعد۔۔۔“ میں اس کی مجبوری سمجھ گیا، تبھی اس کے ساتھی نے کہا۔

''ٹکٹ صحیح ہیں، یہ سفر کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں نکل رہا ہوں لیکن پہلے ندیم کی ڈریسنگ ضروری ہے۔''

''اس اپارٹمنٹ میں تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ عبید تمہارے ساتھ جائے گا، ڈریسنگ سے لے کر ائیر پورٹ چھوڑنے تک ذمہ داری ہو گی اس پر، آپ بس نکلیں یہاں سے،'' میں نے اس کا پسٹل واپس کرتے ہوئے کہا۔''یہ میرے بہت کام آیا، اپنی امانت واپس لے لو۔'' میں نے حیدر کی جیب سے گاڑی کی چابی لی اور ندیم کے ساتھ باہر نکل آیا۔ عبید میرے آگے آگے تھا۔ میں نے نیچے پہنچ کر کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چابی اسے دے دی۔ ندیم نے اپنا مختصر سامان رکھا۔ عبید انتہائی تیز رفتاری سے ہمیں ایک نجی کلینک میں لے گیا۔ ڈاکٹر نے زخم دیکھے، ڈریسنگ سے پہلے اس نے انجکشن لگائے۔ دوائیاں دیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہمیں اس نے فارغ کر دیا۔ کلینک سے نکلے تو نو بج چکے تھے۔ پھر ائیر پورٹ تک ہمیں دس بج گئے۔ میں نے کار چھوڑی اور عبید کو خدا حافظ کیا۔ وہ چلا گیا تو ہم سامان لے کر آگے بڑھے۔ ائیر پورٹ پر خاصی گہما گہمی تھی۔ کچھ کھاتے پیتے اور لوگوں کو دیکھتے وقت گزر گیا۔ یہاں تک کہ لاؤنج میں آ گئے۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں نے ندیم سے پوچھا۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''دواؤں کے اثر سے درد نہیں ہو رہا، بس احساس سا ہے۔''

''ڈاکٹر نے کہا تھا، یہ اثر تین چار گھنٹے تک رہے گا۔'' میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ الطاف کا فون آ گیا۔

''یار! ایک بات بھول گیا تھا میں۔۔۔''

''کیا؟''

''یہ آرتی سے تمہاری بات کروانا تھی لو، بات کرو۔'' اس نے کہا اور پھر چند لمحوں بعد آرتی کی آواز گونجی۔

''شجاع! تم یادر ہو گے۔ میں نے تم سے بری طرح شکست کھائی۔''

''یہ تمہاری قسمت ہے، آرتی! تمہارے بڑوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ سارے پاکستانی تمہارے جیسی عورتوں کے کھلے بدن پر پاگل نہیں ہوتے۔''

''مجھے پورا یقین تھا کہ تم مجھے محبت کا یقین دلا کر جھوٹ بول رہے ہو لیکن مجھے اچھا لگا۔ میں اگر اپنے مشن پر نہ ہوتی تو تم سے محبت کرنے کا مزہ آتا۔''

''میں نے کہا نا، یہ تمہاری قسمت۔'' کتنے لمحے خاموشی میں گزر گئے، تبھی الطاف کی

آواز سنائی دی۔

”اس وقت آپ کہاں ہیں؟“

”لاؤنج میں۔“

”اور ہم اس وقت کھلے سمندر میں ہیں۔ بہت دور دوبئی کی روشنیاں ٹمٹماتے ستاروں کی مانند نظر آرہی ہیں اور اسی سٹیمر پر چند لاشوں کے ساتھ ہری داس اور آرتی موجود ہیں جبکہ شویتا بے چاری بے جان جسم کے ساتھ موجود ہے۔ آرتی تمہیں اپنی یادوں میں محفوظ رکھنے کی بات کر رہی ہے لیکن اسے نہیں پتہ کہ ابھی تھوڑی دیر بعد یہ سمندری مچھلیوں کی خوراک بن جانے والے ہیں یعنی خس کم جہاں پاک۔“

”اور وہ حیدر اور یشونت۔۔۔“

”وہ لوگ یہاں کی فورسز کے حوالے کر دیئے ہیں، منشیات اور اسلحہ کے کاروبار میں ملوث تھے۔ سزائے موت ہو جائے گی۔ خیر، اللہ کرے کہ آپ کا سفر خوشگوار گزرے۔“

”وہ، یار! کنول کا خیال رکھنا۔ اس نے ہماری بہت مدد کی ہے۔“

”وہ دلیپ سنگھ کے ساتھ ہے، وہ اسے اپنے ساتھ کینیڈا لے جائے گا۔ میرے رابطے میں ہیں وہ دونوں۔“

”او کے، زندگی رہی تو ملیں گے“ میں نے کہا اور رابطہ ختم کر دیا کیونکہ فلائیٹ تیار تھی۔ ہم پاکستان کے لئے فلائی کر گئے۔

نیچے بہت نزدیک روشنیاں نظر آئیں تو لاہور پہنچ جانے کا احساس ہوا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دوبئی سے چلتے ہوئے سوچوں کا اک لامتناہی سلسلہ میرے ساتھ جڑ گیا تھا، اسی مدو جزر میں ڈوبتا ابھرتا یہاں تک پہنچا تھا۔ میں نے وہ ساری سوچیں ایک طرف جھٹک کر رکھ دیں۔ ایک سرشاری کی کیفیت مجھ پر طاری ہو چکی تھی۔ ائیر پورٹ کے مراحل سے گزرنے کے بعد جب میں ہال میں آیا تو حسن اور نائلہ سامنے کھڑے تھے۔ ان دونوں کے چہروں پر خوشگواریت تھی، اتنے میں ندیم پورٹر کے ساتھ سامان لے کر آ گیا تھا۔

”اُو آ، جان جی۔!“ حسن نے خالص لاہوری لہجے میں کہا اور مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ وہ الگ ہوا تو نائلہ میرے گلے لگ گئی۔ تبھی ندیم کو اونچی کراہ گونج اٹھی۔ میں نے وحشت سے مڑ کر دیکھا۔ حسن حواس باختہ سا ندیم کو دیکھ رہا تھا۔ حسن کو کیا خبر تھی کہ ندیم کا نہ صرف انجر پنجر ڈھیلا ہے بلکہ اسے ”ڈینٹ“ بھی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے جب وضاحت کی تو ایک قہقہہ فضا میں بکھر گیا۔ میں نے نائلہ کو دیکھا، وہ ندیم کے قریب ہو چکی تھی۔

''اپنا ندیم سمارٹ ہوگیا ہے، یار۔!''حسن نے اسے دیکھتے ہوئے کہا، پھر سامان اٹھانے لگا۔ جب کار میں بیٹھنے لگے تو میں جان بوجھ کر حسن کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس سے پوچھا۔

''یار! وہ تو ساری باتیں ہوتی رہیں گے۔تم یہ بتاؤ، ہم شادی کی تاریخ لینے کب آئیں؟''

''مطلب، جان جی؟''حسن نے حیرت سے پوچھا۔

''تم لڑکی والے ہو اور میں لڑکے والا، جان جی!''میں نے کہا تو ہمارا قہقہہ ایک ساتھ بلند ہوا اور نائلہ شوخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ سمٹ گئی۔اس وقت مجھے اس پر بہت پیار آیا۔میری نگاہیں سڑک پر جم کر رہ گئیں، تبھی ایک شعر میری یاد میں ابھرا۔

روشنی تھک کے رونے لگتی ہے
جب اندھیرا مزاج ہو جائے

